دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اپریل 2010

نگران اعلیٰ

معراج رسول

www.pkdigest.com

للکار

تجسس اور ایکشن سے بھرپور داستان

طاہر جاوید مغل کے قلم سے

مدیرِ اعلیٰ

11 **چینی نکتہ چینی** — مدیرِ اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

18 **بدخصلت** — سنبل فاروقی
اپنے موضوع اور جدت کے لحاظ سے منفرد انداز کی تحریر خاص

59 **نمبر پلیٹ** — شبنم شفیق
قتل کی متواتر وارداتیں..... جو معمے کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھیں

69 **موجد** — رضوانہ منظر
مغربی معاشرے کی اقدار و ثقافت کی عکاس مختصر کتھا

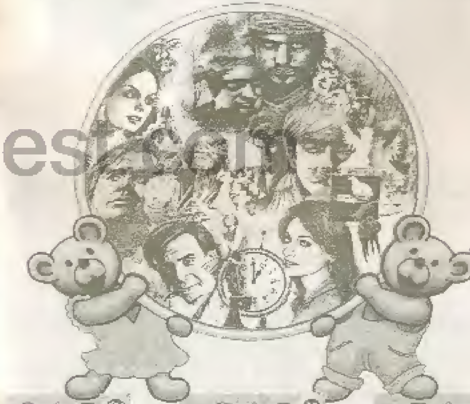

73 **مردہ فروش** — مریم کے خان
حیران کن اور ملال انگیز حقیقت کا انکشاف کرتا جرم پارہ

88 **للکار** — طاہر جاوید مغل
محبت کے محاذ پر بکھرے ہوئے شخص کی جدوجہد... اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

131 **بدمعاش** — آصف ملک
نیکی و بدی کے درمیان حائل فاصلے کو عبور کرتی سبق آموز کہانی

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

147 **اصل سرمایہ** — محمد عفان آزر
استقلال ہمت سے ہم آہنگ
سنگین حالات و حقائق کی ترجمان

140 **گرداب** — لبنیٰ قادری
تقدیر کی انگلی پکڑ کر قسمت کی چوپال پر مقدر کا کھیل کھیلنے اور بکھر جانے والوں کی کہانی

195 **بلامعاوضہ** — ثمر عباس
جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے ایک بے تاج بادشاہ کے انوکھے کارنامے

214 **مذاق** — سلیم انور
قاتل اداؤں کی مالک ایک پیکرِ جمال ... مائیاں

224 **معما** — فوزیہ ظہیر
ہلکے پھلکے انداز میں الجھنوں کو سلجھاتی ڈرامائی کہانی

229 **دلدار وادی** — منظر امام
وادیٔ محبوب سے نکل کر دربدر ہو جانے والے خاندان کا پراثر ماجرا

254 **دشمن دوست** — کاشف زبیر
غیرت، دہشت، ظلم، دوستی اور دشمنی کے معاشرے میں جنم لینے والی داستان

جلد 39 • شمارہ 04 • اپریل 2010 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 40 روپے • سعودی عرب 12 ریال
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 5895313(021) فیکس 5802551(021) email: jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: 63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیر اعلیٰ

عزیزانِ من!
السلام علیکم!

اپریل 2010ء کا تازہ شمارہ پیش خدمت ہے۔ یہ مہینہ موسم بہار سے عبارت ہے لیکن کیا کہیے کہ اس برس تو گرمی کو آنے کی اتنی جلدی تھی کہ گزشتہ ماہ کے نصف سے ہی اس کے جلوے نظر آنے لگے۔ موسم کی حدت بڑھے اور بجلی سے محرومی نہ ہو، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا... گزشتہ کئی برسوں سے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ بات طے ہو گئی ہو کہ گرمی اور بجلی، ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس آپس کی عداوت کی برق گرتی ہے تو بے چارے گرمی کے مارے غریب عوام پر جو جنریٹر کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ گزشتہ چند برسوں کے دوران پاکستان میں لوڈشیڈنگ کے نام پر بالخصوص موسم گرما میں، بجلی سے محرومی ایک عام بات ہو چلی ہے لیکن غور کریں تو یہ صورت حال ایک دن میں پیدا نہیں ہوئی۔ ترقی یافتہ ممالک میں وسائل اور طلب کو پورا کرنے کے لیے آبادی کی شرح اضافہ کو خاص طور پر نظر میں رکھا جاتا ہے۔ اگر وسائل کی مقدار کم ہو تو اس کے لیے متبادل وسائل بروئے کار لائے جاتے ہیں لیکن ہمارے ہاں تو وہی معاملہ ہے کہ بجلی جاری ہے خدا کے سہارے... پاکستان کے قیام کے بعد سے ملک میں بجلی کے حصول کا نظام بنیادی طور پر پانی سے مشروط ہے۔ اب حال یہ ہے کہ عالمی موسمیاتی تبدیلیوں کے سبب دنیا بھر کے کئی ممالک کو آبی قلت کا سامنا ہے اور ہم خود سنگین آبی قلت کا شکار چند ممالک کی فہرست میں موجود ہیں۔ پن بجلی گھر چلیں گے تب... جب ڈیم پانی سے لبالب ہوں گے، یہاں تو آبی قلت کا یہ حال ہے کہ دریا اور ڈیموں کی تہ میں جھانک لو۔ یہ بات نہیں کہ آج جن بحرانوں کا ہمیں سامنا ہے، ان کا ہمارے منصوبہ بندوں کو ادراک نہیں تھا۔ یہ حالات ماہرین کے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں تھے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ توانائی کے متبادل ذرائع کو بروئے کار لانے کے حوالے سے جس نوع کی سنجیدہ کوششیں ہونی چاہیے تھیں، وہ نہیں ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب گرمی کے ساتھ ہی بجلی غائب۔ بجلی کیا بند ہوتی ہے کہ معیشت کا پہیا ہی رُک جاتا ہے۔ جہاں معیشت کا پہیا ہی رُک رُک کر چلتا ہو تو وہاں ترقی کی شرح کیا ہوگی... یہ بات سمجھنے کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وطنِ عزیز کے صرف چند فیصد 'معزز شہریوں' کو چھوڑ کر معاملہ وہی ہے کہ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے... حالات کی زلفِ گرہ گیر میں سب ہی اُلجھے ہوئے بے حال ہو رہے ہیں۔

[illegible] آپ کے نامے دیکھتے ہیں کہ گزشتہ شمارے کو آپ نے کیسا پایا۔

[illegible] سفر کے دوران دوسرے شہر سے ملا۔ جاسوسی میں ایسا کھوئے کہ جب ڈوب کر اُبھرے تو پتا چلا کہ بائنڈنگ دو تین کہانیوں کے ساتھ ہمارے ساتھ بھی ہاتھ کر گئی ہے۔ سفر کے اگلے پڑاؤ میں ایک بک اسٹال والے کو چکر دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہے اور ناچار ایک اور کاپی خریدنا پڑی۔ سرورق اس بار سوسو ہی تھا۔ آتش زدہ لڑکی کے چہرے پر شاید اسی وجہ سے وحشی مسکان تھی کہ اس کی وجہ سے ایک مصنف کرخت موت کے گھاٹ اتر چکا تھا اور دوسرا عنقریب ہونے والا تھا۔ انکل نے اداریے میں اہم توجہ طلب مسئلہ اٹھایا۔ پانی ہماری روز بروز بنجر ہوتی زمینوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ 90ء کی دہائی کے شروعات سے آج تک انڈیا، راوی، جہلم، چناب اور سندھ پر 50 کے لگ بھگ ڈیم بنا چکا ہے اور کئی تکمیل کے مراحل میں ہیں مگر ہماری محب وطن حکومتوں کی ترجیحات میں شاید یہ مسئلہ شامل نہیں۔ محفل میں جناب نہال سنگھ کو اوسط سے قدرے بہتر تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر اکڑوں بیٹھے پایا۔ میری طرف سے دلی مبارک باد۔ چٹکی بکٹو چٹیں میں بشمول میرے 10 نئے نام تھے۔ نئے دوستوں کو خوش آمدید۔ آسیہ خان کی دو میرہ پر توجہ کچھ مشکوک سی لگی۔ چودھری سرفراز صاحب! آپ نے دشت کی سیاحی میں کیا کھویا کیا پایا، یہ بھی بتائیے گا۔ عامر خان حسینہ کی آنکھوں سے نکل آئیں، آپ کا خط شائع ہو گیا ہے۔ عبدالغفور خان خٹک صاحب آپ کہانیوں پر تبصرے کے معاملے میں ٹریل ایس کے اسماعیل کی کاربن کاپی لگے۔ انجلین انجلی کو ارسلان رضا کا خط قابلِ تعریف لگا، حیرت ہے۔ دلنشین بلوچ کو بلیک لسٹ میں اول آنے پر مبارک باد۔ تبصروں میں بالخصوص چودھری محمد سرفراز اور بالعموم عابد جان، اعجاز احمد اور روشانے صنم بلوچ کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے سلیم فاروقی کی بدخصلت پڑھی، کہانی کی اٹھان تو اچھی تھی مگر جوں جوں پڑھتے گئے توں توں تحریر میں [illegible] کی کمی محسوس ہوئی۔ کہانی کا پلاٹ پرانا ہونے کے باوجود دلچسپ تھا مگر تحریر میں ربط کی کمی اور فلمی... چویشن بھی۔ گرداب کی یہ قسط شاندار رہی۔ آفتاب اور کشور آسانی سے ایک ہو گئے، ساتھ ہی شہریار سازش میں پھنس کر بھی اپنے حواس برقرار رکھتے ہوئے عقل مندی سے بچ نکلا۔ کہانی کا کینوس اس دفعہ تھوڑا وسیع ہوا ہے اور بھارتی ایجنسیوں کی ریشہ دوانیوں کو بھی موضوع بنایا گیا۔ طاہر جاوید مغل کی للکار کا لہجہ انتہائی تیز تھا۔ اس قسط میں مغل صاحب کا مخصوص رومانی طرزِ تحریر تو نظر نہیں آیا مگر پھر بھی حالات و واقعات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے۔ لگتا ہے مغل صاحب تابش کو عمران جیسے دوست کے ذریعے حالات کے سانچے میں ڈھال کر کندن بنانا چاہتے ہیں۔ مغل صاحب کہانی کے کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بڑی خوب صورتی سے واکر رہے ہیں اور ہر کردار اپنی نفسیات کے لحاظ سے مکمل کر سامنے آ رہا ہے۔ اتنا اچھا سلسلہ شروع کرنے پر ڈیٹون طاہر جاوید مغل صاحب۔ رنگوں میں پہلا رنگ دوسرے پر اور دوسرا پہلے پر بھاری رہا۔ پہلا رنگ اس حقیقت کا غماز تھا کہ جب کسی کو فطری طرزِ زندگی سے کاٹ دیا جائے تو وہی ہوتا ہے جو جیرو کے ساتھ ہوا۔ انسانی رویے کی پیچیدگیوں اور بے جا پابندیوں پر لکھی گئی منفرد انجام کی خوب صورت تحریر تھی۔ دوسرے رنگ میں احمد اقبال صاحب کے مخصوص شعلہ بیاں قلم سے کافی عرصے کے بعد پڑ [illegible]

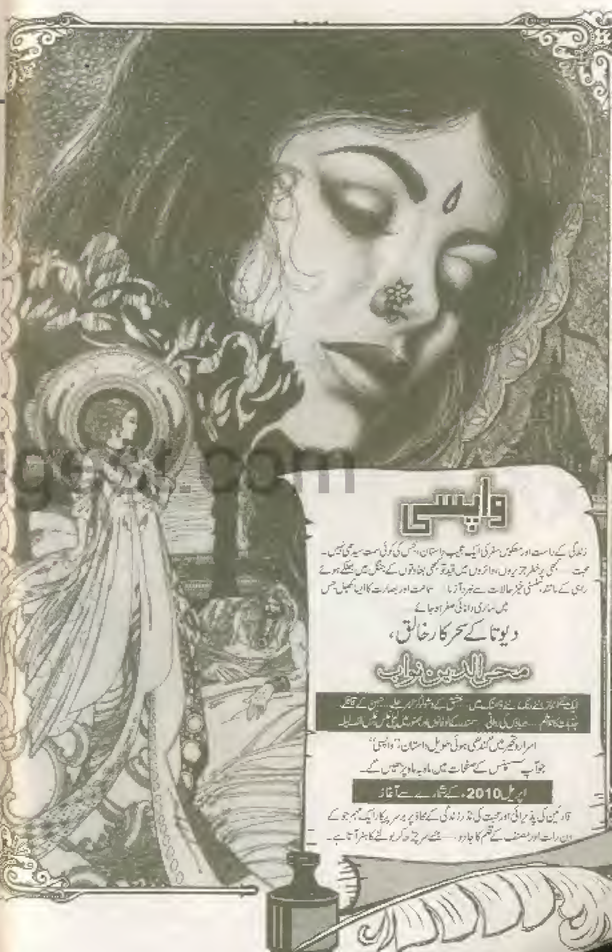

صاحب کی بہادری اچھی لگی۔ غیر متوقع طور پر روبی کہانی کے اختتام پر قاتل کے طور پر سامنے آئی۔ بزدل میاں خود تو الو ہوئے بغیر حالات و واقعات کو منطقی انجام تک لے کر گئے۔ مختصر کہانیوں میں آزادی ایک پُراثر تحریر تھی۔ تخت آدم میں تھیوز نے ایلن کی محبت میں بے خبری میں اہم پیشہ ور گروہ کو بے نقاب کر دیا۔ توریہ یانس کی انتقام نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ وعدہ ایک جدید بھری اور تجسس کی دھند میں لپٹی ایک پراسرار کہانی تھی۔ چھ بے دان میں حسن دولت کے لالچ میں سر جوش ولیم کے تجربے کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ثمر عباس کی احمق نے خاصا متاثر کیا۔ جستجو، لگن اور محنت کی عکاس نوجوان نسل کو کچھ کر کے دکھانے پر اکساتی ایک جاندار تحریر تھی۔ ماں، بیٹی منفی طرز سوچ کو اجاگر کرتی اچھی کہانی تھی۔ جب انصاف نہ ملے تو انسان خود ہی منصف بن جاتا ہے۔ تقاضائے انصاف اس ماہ کی سب سے بہترین اور موضوع کے تنوع کے لحاظ سے منفرد اور الگ ڈگر کی کہانی تھی۔ پوری کہانی نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔"

ایم عزیر اسعد کے خیالات چکوال سے "چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے، ہم بھی چمن جاسوسی میں کچھ گل کھلانے، کچھ پھول چننے آ گئے ہیں۔ آمنہ پٹھانی اور قیصر عباس ناتوری بہت بہت شکریہ جی۔ ارسلان رضا اور کل دوستوں کو سلام۔ الکار میں تابش میں مردانگی پیدا ہو رہی ہے اور جلد ہی تماش جوبان (ٹریننگ) شروع ہو جائے گی۔ گرداب میں ماہ بانو کی جھلک دکھائی گئی اور اسما جی نے کشور اور آفتاب کا نکاح کروا کے اچھا ہی کیا ورنہ ہمیں تو ان کی نیت کھٹکنے لگی تھی۔ ڈاکٹر ماریا بدا چھا بدنام بُرا اداوے تقریب پر چلتے ہوئے گناہوں کے گرداب میں پھنس گئی اور شہریار حالات کا دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے بچ ہی گیا۔ پہلا رنگ تماشا گر مصنوعی سا تھا جبکہ دوسرا رنگ پُرتجسس تھا۔ بدخصلت ایک خوب صورت تحریر ہے جو کافی تیز رفتار ہے۔ اس کے حالات کے پیش نظر جلد ختم ہو جانے کا امکان ہے۔"

کوٹیو اور دوداں جن ایم اے عاصی کی قلابیں "میں جاسوسی میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہا ہوں (آئندہ بھی کیجیے گا)۔ جاسوسی سے میری وابستگی بہت پرانی ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید گہری ہوتی جا رہی ہے۔ بلاشبہ جاسوسی بہترین شمارہ ہے۔ ہمیشہ کی طرح جاسوسی ہاتھ میں آیا تو خوشی سے نہال کر گیا۔ سرورق کی شاہکار صنف نازک اپنے تیکھے نین کٹوروں اور گلاب پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں سے ہمیں گھائل کر گئی۔ دلکش چہرے سے نگاہیں ہٹیں تو گہرے پانی کی نیلاہٹ پر دور از اپنا حال آپ بیان کرتی لاش نہایت وحشت اثر تھی جبکہ دوسرا مفلس حال شخص اپنی آنکھوں میں انجام زندگی کی خوف زدگی کا گہرا تاثر لیے نظر آیا۔ ہمیشہ کی طرح سرورق بہت پسند آیا۔ ذاکر انکل نے اس مرتبہ بھی بہت عمدہ نقش گری کی۔ محفل میں قدم رنجہ ہوئے تو تمام دوستوں کو پایا۔ کرسی صدارت پر دوست نہال سنگھ براجمان تھے۔ اوئے دوستا! وڈیاں وڈیاں مبارکاں۔ ٹریل ایس والے بے کسانہ، گل شاہ رخ، بلیک زیرو، لوشی چودھری آپ سب سے میری گزارش ہے کہ محفل میں دوبارہ آ جاؤ کیونکہ محفل آپ تمام دوستوں کے بغیر بہت سونی سونی ہو گئی ہے۔ کہانیوں کی ابتدا اپنی دل پسند کہانی گرداب سے کی۔ گرداب نے اپنے مخصوص انداز میں ایسا جکڑا ہے کہ ہم اس کے سحر سے نکل ہی نہیں پاتے۔ [illegible] ظلم و ستم کے ہزاروں پردوں کی تہ میں چھپی چودھری کی ذات سے [illegible] آئندہ قسط کا بہت شدت سے انتظار ہے۔ محترمہ اسما صاحبہ آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک باد۔ ہماری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اپنے نہایت ہی پسندیدہ مصنف طاہر انکل کی الکار پڑھی تو بس ایک دم تازہ دم ہو گیا۔ پُراثر تحریر نہایت روانی سے پرت در پرت کھل رہی ہے۔ بلا خوف و خطر جان کی بازی لگا دینے والے عمران کا جوشیلا کردار بہت پسند آیا اور خاص طور پر سرکس کے اسٹیج پر تابش اور ہیرو بھائی کی کارکردگی نے کہانی میں رنگ بھر دیا۔ سیم قادری کی بدخصلت پڑھ کر میں بھی مارے خوشی کے ہائی جمپ لگانے لگا۔ کہانی کافی ایکشن لیے ہوئے تھی۔ ایکشن سے بھرپور کہانیاں مجھے ہمیشہ سے بہت پسند ہیں۔ اگلی قسط کا بہت شدت سے انتظار ہے۔"

سائرہ مسعود میرپور سے تبصرہ کرتی ہیں "9 مارچ کی خوش گوار معطر شام کو جاسوسی کی آمد نے اور بھی مسحور کن بنا دیا۔ سرورق پہ نگاہ پڑی تو خوبرو حسینہ کی جھلملاتی آنکھیں ہماری نگاہوں کو پُرکیف مسکراہٹ سے نواز رہی تھیں۔ ساحل سمندر کی نیلگوں جھلملاہٹ پر ساکت پڑی نیم برہنہ لاش وحشت ظاہر کر رہی تھی جبکہ موت کی گھڑیاں گنتے صنف کرخت کے چہرے پر سوائے مایوسی و لاچاری کے کوئی تاثر نہ تھا۔ محفل ناز میں وارد ہوئے تو نہال صاحب کو مسند صدارت پر براجمان پایا۔ بہت بہت مبارک نہال صاحب۔ انجلین انجل ہمیں آپ کا یونیک سا نام بے حد پسند آیا۔ حسب روایت آغاز کیا شان جاسوسی گرداب سے۔ جوں جوں اس لاجواب سرگزشت کو پڑھتے رہے، اس کے سحر میں ڈوبتے چلے گئے۔ اتنی پُراثر تحریر کی تعریف کے لیے واقعی ہمارے پاس الفاظ نہیں۔ گرداب کے بعد دوڑتے چلے گئے طاہر انکل کی الکار پہ۔ جاسوسی، ایکشن، سسپنس سے بھرپور شاہکار کاوش کے انداز بیان نے شروع سے آخر تک اپنے سحر میں مسحور کیے رکھا۔ رضوانہ منظر کی تقاضائے انصاف اپنی طرز کی انوکھی اور منفرد انداز تحریر نے حقیقی معنوں میں گنگ کر دیا۔ آصف ملک کی ماں بیٹی میں ایک ماں اپنی اکلوتی بیٹی کی جدائی کے غم میں دیوانگی کی انتہا پر پہنچ کر کئی بے گناہ عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار کر بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ دنیا کے رنگ اس مرتبہ پھر روکھے پھیکے سے لگے۔ پہلے رنگ میں مراد نے ایک طرف شک کی بنیاد پر اپنی شریک حیات کی زندگی برباد کر دی اور دوسری طرف اپنی بیٹی کو معاشرے سے کاٹ کر رکھ دیا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اپنے ہی باپ کی بیٹی اسی کے آفس میں کام کرتی رہی جبکہ بے خبر باپ اسے سارے شہر میں ڈھونڈتا رہا۔ دوسرے رنگ میں بزدل نے بھی کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ حالانکہ بات بالکل صاف تھی کہ کیا سازش چل رہی ہے اور سچائی کیا ہے۔ اس تحریر نے بھی کوئی خاص تاثر نہ چھوڑا۔"

آمنہ پٹھانی، فتح پور لیہ سے حاضر ہیں "خدا کی پناہ! کیم، دو تک بہ آسانی مل جانے والا رسالہ 9 مارچ تک بھی بک اسٹال پر دستیاب نہیں تھا۔ جب مستقبل قریب میں پرچے کی دستیابی کے امکانات معدوم نظر آنے لگے تو مجبوراً فیصل آباد سے منگوانا پڑا۔ تاخیر نواب شاہ کے قریب ترین حادثہ تلاش جاری ہے۔ کیسے...؟ یہ ایک الگ اور طویل کہانی ہے۔ آسیہ خان! موسٹ ویلکم۔ ڈیئر! یہ آپ کی محبت ہے کہ میرے عام سے خطوط نے آپ کے قلم کو ایسا متحرک کیا

کہ آپ کے الفاظ محبت کی زبان بن کر ہم تک پہنچے۔ بہو تھینکس۔ محمد سلیم شبلی او وضاحت کریں کہ نوبی اے کا نام دیکھ کر آپ اداس کیوں ہو جاتے ہیں؟ اعجاز احمد ساہیوال! آپ کا انداز تحریر بہت پسند آیا۔ پلیز باقاعدگی سے تبصرے بھیجا کریں۔ روشانے صنم، محمد سرفراز اور ہمایوں سعید روہیہ آپ کے تبصرے بھی لاجواب تھے۔ گرداب پڑھتے ہوئے اب کچھ بوریت سی ہونے لگتی ہے۔ اس کی وجہ شاید کہانی میں کرداروں کی بھرمار ہے۔ اگر اسٹوری فقط شہریار، ماہ بانو اور چودھری کے گرد گھومتی تو... خیر الکار میں تابش آہستہ آہستہ ردھم میں آ رہا ہے۔ امید ہے طاہر جاوید مغل کی یہ کہانی بھی یادگار ثابت ہوگی۔"

اعجاز احمد کی عرق ریزی ساہیوال سے "موسم بہار کی ایک مہکتی ہوئی صبح 9 مارچ کو جاسوسی جو کہ کافی تاخیر سے ملا۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی امجد اسلام امجد کا یہ شعر یاد آ گیا۔

ستارے آسماں کے دیکھ اچھے
کسی کی آنکھ میں اترے ہوئے ہیں

کنول سے چہرے والی آنکھوں میں کاجل، سرخ ہونٹوں پر شوخ تبسم، حسینہ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے بہاروں میں کھلتا ہوا پھول۔ ساتھ ہی ساحل پر ایک لاش، عاشق نامراد پر تنا ہوا خنجر، اندھیرے میں ڈوبی عمارت... سرورق بہترین لگا۔ محفل یاراں میں پہنچے جہاں سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ پاکستان کے بارے میں لکھی گئی آپ کی فکر انگیز باتیں پڑھ کر لبوں سے دعا نکلی۔ یا اللہ ملک پاکستان کو سلامت رکھنا (آمین) فیصلہ کے نہال سنگھ تحفۂ شاہی جیت کے مبارکاں جی۔ محمد سلیم شبلی جاسوسی نارمل نام نہیں تا تم نکال کر پڑھا کریں۔ فاطمہ گل فرام لاہور مانا کہ آپ کا تجربہ ہے۔ ادھر اودھم مت مچاؤ۔ محمد رمضان ہوت! اتنا لمبا چوڑا تبصرہ۔ انجل فرام فورٹ عباس جاسوسی غائب کون کرتا ہے۔ تصویر یاسمین فرام اوکاڑہ تخلیق کائنات میں پہلا نمبر مردوں کا ہے، لحاظ رکھا کریں۔ کبیر عباسی نوٹی فرام بہاولپور کہاں ہو یار؟ قاری صاحب بھی نظر نہیں آئے۔ اپنا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، خط شائع کرنے کا شکریہ۔ سب سے پہلے مغل صاحب کی الکار پڑھی۔ تابش اور عمران ساہیوال آ کر چلے گئے پتا ہی نہ چلا۔ مغل صاحب میرے فیورٹ رائٹر ہیں کیونکہ بطور شاعر مجھے ان کی وصل اور فراق کے لمحوں میں لکھی گئی باتیں غزل لکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ کشور اور آفتاب ایک ہو گئے۔ اے بی صاحب بھی کافی متحرک ہو گئے ہیں۔ اتنی اچھی کہانی لکھنے پر اسما قادری کو مبارک باد۔ رنگوں میں پہلا رنگ، پابندیوں میں مقید ایک باعصمت لڑکی سے ملاقات ہوئی۔ ساتھ ہی یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ عورت مرد سے اتنی بھی کم تر نہیں کہ جو جی چاہے کرے۔ اس کا اپنا تقدس ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے ہماری ہمدم و ہمراز۔ بچہ اس سے اچھا سلوک ضروری ہے۔ دوسرا رنگ احمد اقبال کا ہلکے پھلکے طنز و مزاح کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ یہ کہانی بھی زن، زر، زمین کے گرد گھومتی ہے۔ کسی [illegible] کا طریقہ بھی فطری ہے۔ واقعی حسین عورت شیطان کا جال ہوتا ہے جس میں پھنس کر رہ جانے والا مر کے نکلتا ہے۔ ایسے ہی لمحوں کی عکاسی کرتی [illegible] سیم قادری کی بدخصلت [illegible] کہانی کا انتظار ہے۔ مختصر کہانیوں میں آزادی میں [illegible] کا انتقام لیا۔ تخت آدم میں [illegible] محبت اور غلط فہمی کی بنا پر ایک خطرناک گروہ کا خاتمہ کیا۔ چھ بے دان میں حسن پھنس گیا۔ ثمر عباس کی کہانی احمق میں بھی ایک قابل اور خود اعتماد آدمی تھا لیکن سادہ لوحی کی وجہ سے احمق سمجھا جاتا تھا۔ آخر اس نے اپنے آپ منوا لیا۔ انتقام اور وعدہ اچھی کہانیاں تھیں۔"

ملتان سے ہمایوں سعید روہیہ کی التجا "حسب معمول اس بار بھی ہمارا اور جاسوسی کا ملاپ قابل دید تھا۔ کئی افراد کو تو ہماری دماغی صحت پر بھی شبہ ہوا۔ سرورق پر نظر ڈالی تو ساحل سمندر پر پڑی بے آسرا لاش اور قریب الذبح شخص نے اتنا اداس کیا کہ خوب صورت نینوں والی حسینہ کو اتنی توجہ سے نہیں دیکھا جتنا وہ حق رکھتی تھی۔ بہت عرصے بعد محفل میں گرما گرمی دکھائی دی۔ خلاف معمول کسی سردار جی کو کرسی صدارت پر براجمان پا کر خوشی ہوئی۔ نہال جی! اچھا اپنے تبصرے کو ٹاپ آف دی لسٹ دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئے ہوں گے۔ جعفر صاحب کے مفصل تبصرے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے فاطمہ گل کی نانو جان کی صحت کے لیے دعاگو ہوئے۔ آسیہ خان! ہمیں آپ کی طرز تعریف بالکل پسند نہیں آئی۔ کیا آپ نے جنوں والوں کو اتنا گیا گزرا سمجھا ہے کہ وہ اپنی قومی زبان بھی نہیں بول سکتے؟ قصور آپ کا نہیں میڈیا کا ہے جو ہر فلم، ڈرامے میں پٹھان کو چوکیدار کے فرائض سرانجام دیتے اور ٹوٹی پھوٹی اردو بولتے دکھاتے ہیں۔ شبلی ملتانی، ایس ایس ناز کی یادوں میں ٹھنڈی آہیں بھرتے نظر آئے۔ روشانے صنم، اے ڈی سیال کو للکارتی اور آمنہ پٹھانی، سائرہ کی تصحیح کرتی نظر آئیں۔ بلاشبہ الکار تجسس اور ایکشن سے بھرپور تھی۔ عمران کا کردار بے حد پسند آیا۔ مغل جی! کیا کہوں آپ کے لیے؟ آپ سچ مچ بہت گریٹ ہو۔ گرداب بھی حسب معمول اپنی پوزیشن مستحکم رکھنے میں کامیاب رہی۔ اے بی صاحب کو ایکشن میں دیکھ کے خوشی ہوئی۔ بدخصلت بلاشبہ اس شمارے کی سب سے زبردست کہانی تھی۔ پاکستان بے شک جنت ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ تب ہوتا ہے جب آپ اس سے دور کسی ناگہانی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔ رنگوں میں دوسرا رنگ بازی لے گیا۔ مکان اور مکین کے غیر متوقع انجام نے چونکا دیا۔ میں خواجہ اور ڈاکٹر زیدی کو مجرم سمجھتا رہا تھا مگر حقیقت سے بہت دور نکلی۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی اپنی بیٹی پر اتنی شدید پابندیاں لگائے؟ تخت آدم بھی انتہائی دلچسپ کہانی تھی مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ گورے بھی محبت میں جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔ چھ بے دان اور احمق دونوں بے حد پسند آئیں۔"

سویا خان اور ندیم کی مشترکہ کاوش فورٹ عباس سے "ٹائٹل کی کیا تعریف کریں... بہت ہی حسین... بہت بہت زیادہ خوب صورت تھا۔ ہمیشہ سے ذرا مختلف نظر آیا۔ جاسوسی حسینہ کی آنکھیں انکل ہمیشہ توجہ سے بناتے ہیں اور ساتھ میں کسی جاپانی کو یرغمال بنا کر دہشت گرد رقم نہ ملنے پر بے چارے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور وہ بے چارہ تو کوا اڑانے کی سوچ رہا ہے اور تیسرا بے چارہ بھوک یا اس معاشرے کے ہاتھوں مر گیا ہے۔ ویلڈن انکل جی! ٹائٹل میں آپ بہت اچھی طرح پیغام دیتے ہیں۔ کہانیوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہم اسٹیل ہال میں پہنچے۔ واہ، کیا بات ہے انکل جی! اس بار نہال سنگھ کو کرسی صدارت پر براجمان پا کر

تھوڑی حیرت ہوئی۔ باتیں بہت دل خوش کرنے والی کرتے ہیں۔ آگے بڑھنے کے بجائے ہم گرداب میں پھنس گئے جو کہ آپ پر جاری ہے اور لگتا ہے جلد ہی للکار بھی چھاپ پر آنے والی ہے۔ گرداب سے فارغ ہو کر دوبارہ محفل میں آئے اور بہت سے لوگوں کو منہ چڑاتے اور مناتے دیکھا۔ فاطمہ گل جی پورا ڈائجسٹ پڑھ کر آتا تھا آپ کو۔ بہت سے لوگ غیر حاضر تھے لیکن پھر بھی محفل میں اودھم مچا ہوا تھا۔ کہانیوں میں للکار پڑھی جو نہایت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ سرورق کے رنگ مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہیں۔ پہلا رنگ زبردست رہا، خاص کر ہیرو کا کردار اچھا تھا۔ دوسرا رنگ مجھے بور لگا، شاید دوسروں کو اچھا لگا ہو۔ اس ڈائجسٹ کی سب سے اہم کہانی بدخصلت تھی۔"

عبدالغفور خان، اٹک سے فرماتے ہیں "محبوب دوست جو کہ اس ماہ 7 کو ملا۔ ٹائٹل تو بہت خوب صورت ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ بانی اس میں لاش، خنجر کے ساتھ ذبح کرتے ہوئے منظر بہت خوب صورت ہیں۔ لمبی چھلانگ لگا کر للکار کو پڑھنا شروع ہوئے تو ہر موڑ، ہر جگہ سسپنس منتظر ہوتا۔ خاص کر عمران کا کردار بہت اچھا جا رہا ہے۔ مزید برآں تابش بھی اچھا جا رہا ہے اور عمران نے سیٹھ سراج کا بالکل صحیح کھوج لگایا ہے۔ مزید انتظار رہے گا اور میری طرف سے طاہر جاوید مغل صاحب کو ویل ڈن، بہت بہت۔ اس کے بعد اسما قادری کی کہانی گرداب پڑھی۔ آفتاب اور کشور کی جوڑی خوب جا رہی ہے لیکن اس میں اصل کردار اے بی شہریار کا ہے جس کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے ابھی تک للکار اور گرداب کی دو اقساط پڑھی ہیں لیکن دونوں پیار و قتل اور ایکشن سے بھرپور ہیں۔ سلیم فاروقی کی بدخصلت ایک ایسی کہانی ہے کہ بھارت جیسے ملک میں معصوم لوگوں کے ساتھ کیا کچھ ہوتا ہے۔ دل پسند اور اچھی کہانی کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔ آزادی ایک اچھی اور سبق آموز تحریر تھی۔ چوہے دان، احمق، ماں بیٹی بھی کچھ بہتر کہانیاں تھیں۔ تماشا گر منظر امام کی کہانی ایک ایسے باپ کی کہانی تھی جس کو مرد ذات سے نفرت تھی کیونکہ وہ اس میں نظر کا دھوکا کھا چکا تھا اور وہ اپنی بیٹی کو مردوں سے بچا کر رکھتا تھا۔ مکان اور مکین میں بھائی بھائی کو کاٹنے پر تلا ہوا تھا کہ زر زمین جو ہے۔ باپ بیٹے سے اور بھائی بھائی سے جھگڑا کر لیتے ہیں۔ یہ عکاسی تھی کہانی کی۔ کنیز بھی بہت اچھی تھیں۔"

عابد جان کی پسند چارسدہ سے "بہار کی آمد آمد ہے۔ محفل پر اس بار نئے دوستوں کا قبضہ تھا۔ نہال سنگھ! ابھی بلے بلے، تینوں بہت بہت مبارکاں۔ صنم بلوچ! آپ اپنی فکر کریں، آپ کی دوستیں تو ہو گئیں اڑن چھو۔ جنوبی برادر! شاید آپ کے پاؤں میں بہت ہی کانٹے چبھے ہیں اس دشت کی سیاحی کرتے کرتے۔ اس کے ساتھ ہی بابدولت پرواز کر گئے اور سیدھے للکار پر جا کر ہی لینڈ کیا۔ واہ! کیا سسپنس ہے۔ یہ اپنا ہیرو بھائی کچھ زیادہ ہی دلیر نہیں؟ پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑانا اچھی بات نہیں۔ مکان اور مکین میں احمد اقبال اپنے خاص اسٹائل کے ساتھ موجود تھے لیکن کہانی بہت الجھی ہوئی تھی۔ اس لیے زیادہ مزہ نہیں آیا۔ تماشا گر بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ گرداب بہت زبردست جا رہی ہے۔ سلیم فاروقی کی کہانیاں میں پڑھتا نہیں کیونکہ ان کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ چھوٹی کہانیوں میں آزادی بہت متاثر کن کہانی تھی۔"

ایس ایس ناز کی وضاحت وہاڑی سے "مارچ کا شمارہ حسب معمول 8 تاریخ کو ملا۔ اپنے بھیا جی شہزادہ ال کی وجہ سے غیر حاضر رہی۔ جن دوستوں نے مجھ ناچیز کو بہت یاد کیا، ان سب کا شکریہ۔ خاص طور پر شبلی صاحب آپ کا۔ آمنہ پٹھانی آپ آج کل کیا کر رہی ہیں؟ عبدالسلام صدیقی! انتقید کرتے وقت ہمارا بھی خیال کر لیا کریں۔ آپ نے ہمیں بھی نہیں چھوڑا، ہم بھی تو آپ کے شہر ملتان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمایوں سعید روسو! واقعی آپ کی اردو بہت اچھی ہے۔ ایس زیڈ بخاری والے ایس کیانی آپ نے بھی ہماری طرح نام رکھنے شروع کر دیے۔ یوں کریں آپ اپنا اصل نام بتا دیں ہم بھی بتا دیں گے۔ روشانے صنم بلوچ، قرۃ العین، محمد سرفراز کے تبصرے بھی بہت پسند آئے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی بہت پسند آئے۔ تمام دوست میرے لیے دعا کریں کہ میرے اچھے ہو جائیں۔"

جواد اویس کا تبصرہ چارسدہ سے "مارچ کا شمارہ 5 تاریخ کو ملا۔ انکل! اتنا انتظار تو مت کرایئے۔ سرورق پر نظر پڑتے ہی چین اور پاکستان کی دوستی خطرے میں نظر آئی کیونکہ ایک چینی ٹائپ بندہ بے چارہ موت کے قریب نظر آ رہا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ موت کے منہ میں ہونے کے باوجود وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ مس جاسوسی کی خوب صورت آنکھوں میں مجھے شکوؤں کے دیے جلتے نظر آئے لیکن اس کے باوجود وہ بہت خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ اوپر اس کی زلفوں کے سمندر میں کوئی غرق ہوتا نظر آ رہا تھا۔ محفل یاراں میں نہال سنگھ صاحب صدارت کی کرسی پر براجمان نظر آئے۔ نہال صاحب آپ تو خوشی سے نہال ہوں گے۔ آسیہ خان کو صرف آمنہ پٹھانی اور روسو کے تبصرے اچھے لگے۔ محفل یاراں سے نکلتے ہی گرداب میں پھنس گئے۔ شہریار کا کردار بہت پسند آیا۔ للکار میں تابش کی تربیت شروع ہو گئی۔ پانچ چھ قسطوں میں وہ مکمل ہیرو بن جائے گا۔ سرورق کا پہلا رنگ پڑھتے ہوئے مجھے اپنی دادی یاد آ گئیں وہ بچپن میں مجھے ایسی ہی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ دونوں رنگ نہایت بور اور فضول تھے جو سرورق سے بالکل بھی میچ نہیں کر رہے تھے۔ باقی کہانیاں دلچسپ تھیں۔"

کراچی سے جناب جی یزدانی کا تجزیہ "کافی عرصے سے ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں۔ اس کے حوالے سے کچھ لکھنے کا کبھی نہیں سوچا۔ فی الوقت چینی، نکتہ چینی میں تحریروں کے اثرات سے متاثر ہو کر میں اس محفل میں شامل ہونا چاہ رہا ہوں۔ شاید کہ جگہ مل جائے۔ بہت قیمت سمجھتا ہوں کہ ڈائجسٹ کی صورت میں معیاری چیزیں میسر آ جاتی ہیں۔ طرح طرح کے کردار، مختلف رنگ و روپ میں ہمارے اردگرد گھومتے ہوئے معاشرے کا آئینہ دکھاتے ہیں۔ ان میں ایک زمانہ قید ہوتا ہے اور قاری سلیقے پر صفحات پلٹ کر ان کرداروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ نواب صاحب، صاحب اور اک ہیں، یہ ان کا خاصہ ہے کہ جب معاشرتی گوشوں پر انگلیاں پھیرتے ہیں تو ہمیں کتنے چہروں سے روشناس کرا دیتے ہیں جن کا خیال بھی دل میں نہیں ہوتا۔ طاہر جاوید مغل صاحب اور محترمہ اسما صاحبہ کی تحریریں ایک محفل سی سجا دیتی ہیں۔ قاری پڑھتے پڑھتے سنبھلے کو تو ذکر اٹھتا نہیں چاہتا۔ اپنی طرز کی کہانی لکھنے والے معدودے چند میں صاحبان منفرد ہیں۔ اصل وجہ خط لکھنے کی یہ ہے کہ اقبال کاظمی صاحب کا ریت کا دریا پڑھا تو حیرت سے ریت ہی میں غرق ہو گیا۔ کیا ترجمے کا حوالہ دینا ضروری نہیں تھا؟ اسی طرح مغربی ماحول کی عکاسی کرتی کہانیاں ترجمے کی مرہون منت ہیں لیکن اصل مصنف کا نام نہیں ہوتا۔ چنانچہ داؤد حسین مترجم ہی

کے کمالات میں چلی جاتی ہیں۔ مجھے یہ زیادتی لگتی ہے۔ (ریت کا دریا خود تھی... اور چھوٹی کہانیاں طویل عرصے سے ترجمہ شدہ شائع ہو رہی ہیں)۔ سرورق کے بارے میں کچھ کہوں تو اچھا ہے۔ صرف یہ کہوں گا کہ توجہ کی اشد ضرورت ہے۔ ویسے مارچ میں ٹائٹل بیچ خوب صورت لگا۔ البتہ یہ پتا نہیں چلتا کہ چھری کی دھار گردن کے پاس سیدھی ہے یا الٹی ہے۔"

شیخ محمد سجاد وہالی کی تعریف دھمن شیخاں حویلی سے "ماہ مارچ کا شمارہ بک اسٹال کے کئی چکر لگانے کے بعد ذرا دیر سے ملا تو قدرے بے چینی کم ہوئی۔ سرورق انتہائی جاذب نظر تھا۔ چینی، نکتہ چینی میں مدیر کی تحریر ہمیشہ بہت دلچسپ ہوا کرتی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب کا مطالعہ کیا۔ کہانی اچھی سمت سفر کر رہی ہے۔ ماسٹر آفتاب اور کشور تو انتہائی باہمت نکلے۔ انہوں نے تو پل صراط کو لمحوں میں عبور کر لیا مگر آگے بھی چودھری صاحب ہوں گے۔ اے بی صاحب نے اپنی جان بچانے کے لیے بروقت اور زبردست فیصلہ کیا۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔ للکار، طاہر جاوید صاحب لگتا ہے اپنے ہیرو صاحب کے اوپر سے بزدلی کا پردہ جلد کھینچنے والے ہیں اور لگتا ہے ہیرو بھائی تابش کو بھی چند دنوں میں ہیرو بنا ہی دیں گے۔ بدخصلت، سلیم فاروقی کی تحریر اتنی پسند آئی کہ شاید بیان نہ کر سکوں۔ بالکل لگتا ہے کہ حقیقت کھو رہے ہیں۔ جب بھی کوئی پاکستانی بھارت گیا، ہمیشہ اسے آئی ایس آئی کا ایجنٹ سمجھا گیا اور ہاں، کامران میاں نے کچھ کام ہی ایسے کیے جس سے ظاہر ہے انہیں ایجنٹ تصور کیا جانا لازمی تھا۔ سلیم فاروقی صاحب کو اتنی زبردست تحریر لانے پر ہماری طرف سے ڈھیروں مبارک لیکن اگلے ماہ کا بڑی بے چینی سے انتظار رہے گا۔ رنگوں میں منظر امام کی تحریر تماشا گر انتہائی زبردست اور سبق آموز تحریر تھی۔ ایسی تحریریں معاشرے میں قدم قدم پر بکھری پڑی ہیں مگر اسے ایک مایہ ناز رائٹر کی نظر دیکھ سکتی ہے۔ مکان اور مکین احمد اقبال کی تحریر بھی بہت شاندار اور اتنی ہی سبق آموز بھی۔"

ارسلان رضا کی باتیں چکوال سے "بہار کی آمد ہے۔ ہر طرف سبزہ چمک چکا ہے اور پھولوں نے آہستہ آہستہ سر نکالنا شروع کر دیا ہے۔ اپنے گھر کے سرسبز و شاداب باغیچے میں بیٹھ کر جاسوسی سے مخاطب ہونا اور دوستوں کی محفل میں شریک ہونا اچھا لگ رہا ہے۔ جاسوسی خریدا تو پہلے بزم یاراں دیکھی۔ ہم خارج از انجمن تھے۔ ٹائٹل بہت شان دار تھا، خصوصاً سمندر کا نظارہ۔ سرورق کو خوب صورتی اور کشش دے رہا تھا۔ ساحل کے پیچھے آئینہ جاسوسی نے اپنے خدوخال کی وجہ سے سرورق کو زینت بخشی جبکہ خنجر کی زد میں آیا شخص کچھ ضدی اور ڈھیٹ لگتا ہے جسے شاید قتل ہونے کی پروا نہیں۔ چینی، نکتہ چینی میں پہنچے۔ مدیر علی کے خیالات پڑھ کر عجیب سے جذبات ابھرے۔ بھارت شروع سے زیادتیوں پر اترا ہوا ہے۔ باتیں سچی اور کھری تھیں۔ خیر، نہال سنگھ کو مبارک۔ محفل میں میدان مارنا خاص بات ہے۔ آسیہ خان پہلی دو وجوہات تو ٹھیک ہیں تیسری اور اہم وجہ تھوڑی مشکوک ہے۔ سلیم شبلی صاحب کیا واقعی آپ نے دل چھڑ صرف جاسوسی کے حصول کے لیے لگائے؟ روسو کوئی سے انتخاب کیجیے گا۔ اعجاز احمد صاحب، یار عمر کب بتائی ہے میں نے تو یہ بتایا ہے کہ میں بھی جوان ہوں، کوئی کچھ بھی پوچھ سکے۔ ہمایوں سعید صاحب آپ مجھے دل پھینک محسوس ہو رہے ہیں۔ ہاتھ سے بنی تصویر پر آپ دل تھام لیتے ہیں تو جب اصل سامنے ہو تو اس وقت کیا حال ہوتا ہو گا؟ انجمن انجلی بہت بہت شکریہ اور محفل میں موسٹ ویلکم۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ مغل صاحب کے پاس کمال فن ہے اور موضوع بھی پچھلی تحریروں سے الگ ہوتا ہے۔ اس بار انہوں نے ایک کمزور لڑکے کو مضبوط بنانا ہے۔ اس کہانی میں عمران کا کردار نہایت قابل ستائش ہے۔ نہ جانے وہ محسن پسندی سے ایسا کر رہا ہے یا تابش کی مدد کر رہا ہے۔ اسما قادری بھی ٹھیک جا رہی ہیں۔ فاروقی صاحب نے بھی اچھا موضوع لیا ہے۔"

انجمن بلوچ کا احتجاج ٹیکسلا سے "دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ ہمدم، ہردلعزیز جاسوسی بہت بہت دیر سے ملا۔ سرورق سے نظریں ہٹائیں اور پیاری محفل میں قدم رکھا... یہ کیا؟ ہر صفحہ الٹ پلٹ کر دیکھ لیا مگر اپنا خط نہ پا کر دل بہت اداس ہوا۔ کرسی صدارت پر میرے پڑوسی نہال سنگھ تھے۔ چلو پڑوسیوں کی خوشیاں بھی اپنی ہی ہوتی ہیں۔ بہت مبارک ہو نہال سنگھ۔ جعفر حسین آپ نے یاد کیا شکریہ۔ محمد سلیم شبلی میں تو جاسوسی اور سسپنس کے علاوہ ملتان سوہن حلوہ، آگاہی کے دہی بھلے اور کینٹ کی فروٹ چاٹ اور گھنٹا گھر کے گول گپے کھانے کے لیے وہاں بھی پہنچی ہوتی ہوں۔ ویسے جن کے عزیز، رشتے دار، دوست احباب نہ ہوں وہ کتابوں سے ہی اپنا رشتہ جوڑ لیتے ہیں۔ اعجاز احمد آپ کو خوش خطی کے نمبر بھی مل گئے، مبارک ہو۔ محمد سرفراز! اگر ذرا سی عقل ہوتی تو بک اسٹال کے دو چکر نہ لگتے۔ سمجھے ہوئے لوگوں کے ساتھ یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ مجھے بے عقل کہا تو کوئی نئی بات نہیں، بے عقلی پر تو مجھے پہلے ہی کافی شیلڈز مل چکی ہیں۔ اب تو الماری میں جگہ ہی نہیں بچی۔ بے عقلی کی داستان بہت طویل ہے۔ (کہانیوں پر تبصرہ کرتی لیکن ہو... اور پھر مٹکا مثین اتنی زیادہ خط نہ شائع کرنے پر... اپنی اداؤں پر خود ہی نظر کیجیے)۔"

غلام مصطفیٰ کا تارے والی پلی شہر سلطان سے خط "مارچ کا جاسوسی بہت لیٹ ملا۔ دو تین چکر لگانے پڑے، بک اسٹال کے۔ آخر مل ہی گیا۔ محفل میں پہنچے تو عجب سماں تھا۔ گلے شکوؤں سے ہر خط بھرا پڑا تھا اور نہال سنگھ کرسی صدارت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا تبصرہ اچھا تھا۔ فاطمہ گل صاحبہ پرواز کہاں سے آئی؟ یہ تو للکار چل رہی ہے۔ کیا خواب دیکھ رہی ہیں یا آنکھیں بند کر کے پڑھ رہی ہیں؟ آسیہ خان صاحبہ! آپ کو جاسوسی میں خوش آمدید۔ طاہر جاوید مغل صاحب! آپ جو بھی کہانی لکھتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے کہانی چل رہی ہے، پڑھنا تو دور کی بات۔ بدخصلت بھی اچھی کہانی ہے، آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ گرداب تو ویسے ہی اچھی جا رہی ہے۔ گرداب میں کبھی ماہ بانو مر جاتی ہے اور کبھی زندہ ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اسما قادری صاحبہ کا کمال ہے مار کر بچا لیا۔ آخر میں سب بہنوں بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے پیپرز 13 اپریل سے شروع ہو رہے ہیں، دعا کریں میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں۔"

محمد سلیم شبلی کا محبت نامہ ملتان سے "مارچ کا سرورق کوئی خاص پسند نہیں آیا۔ ویسے بھی ٹائٹل پر تبصرہ کرنا ہمارے لیے جان جوکھوں کا کام ہے۔ چینی،

www.pkdigest.com

نکتہ چینی میں بھارت کے مکروہ چہرے کے بارے میں ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ تمام مسائل کی خرابی صرف بھارت کی ہٹ دھرمی ہے۔ محفل باذوق میں نہال سنگھ صاحب آپ کی ہمت کی داد دیتے ہیں۔ اعجاز احمد آپ کا خوش خط محبت نامہ بہت پسند آیا۔ روشانے صنم صاحبہ! اگر آپ کی یہ دلکش واقعی پیاری لیکن سدھار گئی ہیں تو پھر کہاں واپس آئیں گی! آمنہ پٹھانی ذرا ہمیں بھی تو بتا چلے کہ آپ کس قسم کے تعلیمی شیڈول میں مصروف ہیں؟ ہمایوں سعید رومیو! یار بڑے مشہور ہوتے جا رہے ہو، بڑی پسند کی جا رہی ہے تمہاری اردو۔ عطا اللہ اعوان کی شکایت واقعی صحیح تھی کہ جاسوسی لیٹ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ رومیو، قرأۃ العین اور محمد سرفراز آپ کے تبصرے بہت پسند آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بدخصلت پڑھی۔ سلیم فاروقی کی یہ کہانی بہت پسند آئی۔ سلیم فاروقی ہو سکے تو کامران اور نوشین کا ملاپ کروا دیں، ہمیں خوشی ہوگی۔ گرداب کی یہ قسط کافی سنسنی خیز تھی۔ آفتاب نے کشور سے نکاح کر کے واقعی اچھا فیصلہ کیا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ وہ چودھری افتخار کے غضب سے کیسے بچتے ہیں۔ دوسری طرف چودھری افتخار اب کھل کر شہریار کے سامنے آگیا ہے۔ شہریار کو زیر کرنے کا منصوبہ وشی کھنہ تو تھا لیکن شہریار نے اپنی تیز جوش فطرت سے چودھری کو مات دے دی۔ للکار کی دوسری قسط بھی خوب رہی۔ کہانی اب اپنے جوبن پر آتی جا رہی ہے۔ پیلا رنگ تماشا گر بہت عجیب لگی لیکن کہانی اچھی تھی۔ مجیرو نے حویلی سے نکل کر فیصلہ تو صحیح کیا لیکن اگر اس کی میڈم ماں اس کا ساتھ نہ دیتی تو پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ دوسرا رنگ بھی پسند آیا۔ بزدل کا کردار ہمیں پسند ہے۔ اقبال صاحب! اب ان کی شادی ڈاکٹر صاحبہ سے کروا دیں۔ تنگ آمد میں منصور نے اپنی کو بچاتے ہوئے انجانے میں ایک خطرناک گروہ کا خاتمہ کیا۔ وعدہ کہانی بہت پُراسرار لگی جبکہ بقیہ ایک دو کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔“

محمد پور دیوان سے شاہد احمد تشکوری کا مکتوبات پر تبصرہ ”سرورق پر موجود خاتون خاصی عیار اور بے رحم نظر آ رہی ہیں جو ایک زخمی شخص کو مزید زخمی کرنے والے چھری بردار ہاتھ کو دیکھ کر بھی بالکل مطمئن ہیں۔ چینی، نکتہ چینی میں آپ نے نہایت اہم ترین مسئلے کا تذکرہ کیا ہے۔ پانی تو زندگی کی علامت ہے۔ پانی نہیں تو کچھ نہیں۔ نہال سنگھ صاحب اپنا تبصرہ پہلے نمبر پر دیکھ کر یقیناً نہال ہو گئے ہوں گے۔ گن کی موجودگی کا نوٹس تو سب نے لیا ہوگا۔ اگر انکل گن کلچر کا خاتمہ چاہتے ہیں تو کیا بُرا چاہتے ہیں۔ آسیہ خان آپ غالباً ٹین ایجر ہیں جس کی وجہ سے آپ کے جذبات میں شدت ہے۔ گرداب کے متعلق آپ کے تبصرے سے مجھے سخت اختلاف ہے۔ اسے بالکل بھی بند نہیں ہونا چاہیے بلکہ یونہی جاری رہنا چاہیے۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی اہم صنف مصنفہ اتنا اچھا لکھ رہی ہیں۔ اگر ہمایوں صاحب کی اردو اتنی اچھی ہے تو اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟ حیرانی اس وقت ہوتی جب وہ ان پڑھ ہوتے۔ اسما قادری کی گرداب بہت اچھی جا رہی ہے۔ ایک طرف تو جہاں عیاش اور دنیا میں گم چودھری افتخار جیسے بدکردار لوگوں کو اسما قادری بے نقاب کر رہی ہیں تو دوسری طرف شہریار اور ماسٹر آفتاب جیسے دیانت دار لوگوں کو وضع داری سے اپنا کام کرتے ہوئے دکھا رہی ہیں۔ اس بار اتنا ہی کافی ہے۔“

محمد اقبال بھٹی کی ستائش ستو کی قصور سے ”جاسوسی 8 مارچ کو ملا۔ ذاکر انکل نے کیا خوب صورتی سے سرورق بنایا ہے۔ دوشیزہ عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی جبکہ اس کے پیچھے ساحلِ سمندر پر کسی آدمی کی لاش پڑی تھی اور ایک آدمی کے گلے پر چھری رکھ کر کسی کی طرف [illegible] تھا۔ چینی، نکتہ چینی میں پہنچے، نہال سنگھ کا تبصرہ پسند آیا۔ اس کے بعد کہانیوں کی طرف آئے اور اپنے پسندیدہ رائٹر طاہر جاوید مغل صاحب کی للکار پڑھی۔ کہانی بہت ہی زبردست ہے لیکن ہیرو ابھی کمزور نظر آتا ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب ہیرو کو پھر متین بنائیے تاکہ اپنے دشمنوں کا صفایا کر سکے۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ گرداب بھی اچھی سلسلے وار کہانی ہے لیکن ہیرو کمزور ہے۔ سلیم فاروقی کی بدخصلت اچھی کہانی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ ترجمہ شدہ کہانیوں میں آزادی، تنگ آمد، وعدہ اور ماں بیٹی پسند آئیں۔ سرورق کے دونوں رنگ ہی زبردست تھے۔“

کوئٹہ بلوچستان سے انعام علی مہمند کی درخواست ”سرورق جاسوسی کے شایانِ شان تھا۔ تمام دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے، اس دفعہ نئے دوستوں کی شرکت کچھ زیادہ تھی۔ سب کو ویلکم۔ آسیہ خان فرام پشاور کو بھی سویٹ ویلکم کیونکہ ہمارا تعلق بھی ادھر سے ہے۔ سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ اسما قادری کی یہ کہانی بہت ہی زبردست ہے اور قاری ختم کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ ہر قسط شاندار ہوتی ہے۔ دوسری ٹاپ کہانی للکار، واہ طاہر انکل! آپ کے بغیر جاسوسی بالکل سونا سا لگتا ہے۔ امید ہے یہ کہانی بھی دوسرے سلسلوں کی طرح خوب رنگ جمائے گی۔ باقی شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ اجازت اس امید کے ساتھ کہ پلیز ہمارے خط کا کچھ خیال کریں کیونکہ ہم کافی دور سے بھیجتے ہیں۔“

تصور نعیمن کا تصویری تبصرہ اوکاڑہ سے ”جاسوسی کے ٹائٹل پر اس دفعہ دوشیزہ بہت پیاری تھی۔ اپنی خوب صورت آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے وہ ہمیں ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کے سر کی طرف ایک نامعلوم شخص سمندر میں مرا ہوا تھا یا مرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیچے کی طرف چاقو تھامے ہوئے ایک ہاتھ ایسے شخص کو مارنے کی کوشش کر رہا تھا جو پہلے ہی نیم جان تھا۔ چینی، نکتہ چینی میں اپنا نام دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ مگر ہم محفل میں بیٹھنے کے بجائے گرداب کے پاس پہنچے، بہت زبردست۔ آخر اسما قادری نے کشور کا نکاح آفتاب سے پڑھا ہی دیا۔ آخر میں شہریار کے ایکشن نے کہانی میں تھوڑا تھرل پیدا کیا۔ یعقوب جمیل کی وعدہ بہت زبردست کہانی تھی۔ پر اسرار ایک آسیب ہی سہی لیکن اس نے ایک انسان کی مدد کی۔ للکار میں آخر عمران نے تابش کے اندر تھوڑی سنسنی پیدا کر دی لیکن ابھی اصل للکار باقی ہے۔ لگتا ہے طاہر انکل جلد ہی کہانی کو اپنے اصل رنگ میں لے آئیں گے۔ آصف ملک آپ نے ماں بیٹی میں سسپنس پھیلانے کی کوشش کی لیکن ہم بھی تھوڑے سے تیز ہیں۔ ہمیں بھی اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ یہ بوڑھی عورت ہی قاتل ہوگی۔ منظر امام کی تماشا گر واقعی اچھی کہانی تھی۔ کوئی بھی انسان فطرت کے خلاف نہیں جا سکتا۔ مکان اور یٰسین احمد اقبال نے زبردست لکھا اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ معصوم صورت نظر آنے والی روبی قاتل ہوگی مگر آپ نے کمال کر دیا۔ آخر میں نکتہ چینی کی محفل میں پہنچے جہاں حسبِ معمول خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ نہال سنگھ اپنی پوری

شان و شوکت سے صدارت کی کرسی پر براجمان نظر آئے۔ فاطمہ گل آپ کا نام بہت پیارا ہے۔ آپ کی نانو کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اللہ انہیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ آسیہ خان آپ کو دل تو چاہ رہا تھا کہ خوش آمدید کہیں مگر گرداب کے بارے میں آپ کے تبصرے نے دل ہی دکھا دیا۔ ہر انسان کی علیحدہ پسند ہوتی ہے۔ گرداب کو بھی پڑھنے والے ہزاروں، لاکھوں قارئین ہیں۔ اب آپ کے لیے ان کے دل تو نہیں توڑ سکتے نا۔ آپ گرداب مت پڑھیں جب بور لگتی ہے۔ اور ہمایوں سعید رومیو! آپ کو مبارک ہو آپ کی بھی ایک فین نکل آئی۔“

چودھری سسٹرز کی آمد رحیم یار خان سے ”ٹائٹل اس دفعہ کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ نہال سنگھ کو کرسی صدارت حاصل کرنے پر مبارک باد۔ قیصر عباس ویلکم کہنے کا شکریہ۔ جعفر حسین ہماری آمد سے کچھ جلے ہوئے نظر آئے۔ کبیر عباسی اور زبیدہ زیدی اینڈ فیملی کے تبصرے بہت پسند ہیں۔ قیمتی صاحب واپس آ جائیں۔ سلیم شبلی صاحب معذرت کس بات پر، ہم نے آپ کو بالکل بھی مس نہیں کیا۔ عامر صاحب، حمید پر اپنی حریصانہ نظریں جمانے سے کہیں بہتر تھا کہ آپ تفصیلی تبصرہ پیش کرتے۔ عابد جان صاحب، خان نہیں آپ اپنے نام کے ساتھ نان لگائیں، زیادہ بہتر رہے گا۔ اس دفعہ صنف نازک مصنف خواتو او کو ووٹ کرتی نظر آئی۔ بہنوں کے خطوط پر کوئی تبصرہ نہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ گرداب میں اپنے شیری بھائی ڈائریکٹ ایکشن میں آ ہی گئے، بھئی واہ مزہ آ گیا۔ للکار کی دوسری قسط زبردست رہی۔ اس کہانی کو پڑھ کر آتش لشتاں اور شکاری کی یاد تازہ ہو گئی۔ پلیز انکل! اسے اسی رنگ میں آگے چلنے دیجیے گا اور ہیرو بھائی کو کہانی کا اصل ہیرو بنا دیں۔ سلیم فاروقی کی بدخصلت ٹھیک... ہی لگی۔ ان کا ہیرو ہمیشہ لینڈ لارڈ ہی ہوتا ہے۔ کبھی بے چارے غریب ہیرو کو بھی موقع دیں۔ کاشف زبیر کی تنگ آمد زبردست اور سسپنس سے بھرپور تحریر تھی۔ انسانی اسمگلنگ جیسے گھناؤنے فعل کی روک تھام بہت ضروری ہے۔ منصور اپنی بھتیجی کی تلاش کرتے کرتے بہت سی لڑکیوں کا مسیحا بن گیا۔ آزادی افریقا کے دہشت گردوں کے پس منظر میں لکھی گئی دل گداز تحریر تھی۔ دہشت گرد نہ جانے کتنی ماؤں کی گود اجاڑتے ہیں۔ یہ کسی بھی ملک کی معیشت اور استحکام کے لیے سخت خطرہ ہوتے ہیں۔ دہشت گردی صرف ایک ملک کا مسئلہ نہیں بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ رنگ اس دفعہ کچھ بے رنگ سے لگے۔ پیلا رنگ منظر امام کا تماشا گر کچھ بہتر لگا۔ مجیرہ کو ساری زندگی مرد کے سائے سے بھی دور رکھا گیا جو کہ ایک غیر فطری بات تھی اور فطرت اپنا راستہ خود تلاش کر لیتی ہے جیسا کہ اس کہانی میں دکھایا گیا۔“

ٹوبی اے بہاولپور سے لکھتے ہیں ”ان تھک چکر لگانے کے بعد جاسوسی نے 6 کو درشن کروائے۔ ذاکر انکل کے فن کے تو ہم ہمیشہ سے دلدادہ ہیں۔ پھر محفل یاراں میں پہنچے، نہال سنگھ کی ہمت پر مبارک باد۔ آسیہ خان کی باتیں اچھی لگیں کہ پشاور میں مکھن وافر مقدار میں دستیاب ہوتا ہے جو کھانے کے کم اور لگانے کے زیادہ کام آتا ہے۔ اوہو! سلیم شبلی صاحب، عابد جان صاحب! روشانے صنم کے تبصرے سے جلنے کی بو آ رہی تھی۔ آپ خوشامد کرنے کے لیے آپ کی صنف کافی ہے۔ آمنہ پٹھانی نوازش۔ عامر خان اگر موٹے کھانے کچھ گئے تو اگلی بار ضرور شرکت کرنا۔ اس بار ڈبل ایس کے اسماعیل کا کردار عبدالغفور خان نے نبھایا۔ یار! ہم کہانی پڑھ لیتے ہیں، آپ صرف تبصرہ کریں۔ انجلین صاحب مشورے کا شکریہ۔ پر کیا کریں آیت الکرسی پڑھ کے بھی آپ کی صنف سے ڈر لگتا ہے۔ عابد جان شاید غصہ کر گئے۔ نئے دوستوں کو دل سے خوش آمدید۔ للکار شاندار چل رہی ہے پر ہیرو عمران ہے یا تابش، یہ سمجھ نہیں آیا۔ گرداب کافی تیز جا رہی ہے۔ ویلڈن اسما قادری صاحبہ۔ تماشا گر قدرے مختلف انداز کی تحریر تھی۔ مکان اور یٰسین مزاحیہ پر تھوڑی عجیب کہانی تھی۔ اینڈ خلافِ توقع نکلا۔ بدخصلت میں وہی پرانی بات، ایک ہیرو کا دس پہ بھاری ہونا۔ خیر کہانی اچھی تھی، اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔“

عصمت علی سوات سے کش لگا کے لکھتے ہیں ”ایک بار پھر کش لگا کے محفل میں حاضر ہو رہا ہوں حالانکہ اس پر بہت سارے اعتراضات ہوتے ہیں اس ماہ کش لگا کے۔ جعفر حسین صاحب! کش تو یا سگریٹ کا ہوتا ہے یا پھر حقے کا۔ جو آپ کا جی چاہے کھینچے کش لگا کے۔ محمد سلیم شبلی صاحب! آپ تھوڑے سے دھوئیں سے گھبرا گئے، نہ جانے آپ پاکستان کے اس دھواں دھار ماحول میں گزارہ کیسے کرتے ہوں گے۔ روشانے صنم صاحبہ! میرے نام میں لڑکیوں والی کون سی بات ہے؟ تو ذرا وضاحت فرمایئے کش لگا کے۔ انجلین انجلی اور اے ایس کیانی صاحب! آپ دونوں کو خوش آمدید کش لگا کے۔ اور ہاں، اس تین مارچ کو ہم نے اپنی سالگرہ منائی جس دن ہم نے پورے اٹھارہ کش لگائے۔ چلو دوستو! سب یک زبان ہو کر پلیز بڑھ بڑھ کے کش لگا کے (جنم دن مبارک ہو)۔ پہلے ایک لمبا کش اور پھر ایک لمبا جمپ لگا کے سیدھے للکار تک جا پہنچے۔ یہ قسط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہ سلسلہ دیوی سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل کرے گا۔“

انتباہ

جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

www.pkdigest.com

باخصلت

سلمہ فاروقی

دوسرا اور آخری حصہ

نفرت۔ ناانصافی اور خود غرضیوں کے گرداب میں پھنس کر انسان شرفِ انسانیت کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے ..... وہ انسانیت جو دردِ دل بن کر خاک کے پُتلوں کو فرشتوں سے افضل بنا دیتی ہے ..... آج کے ترقی یافتہ دور میں انسان کے پاس سب کچھ ہے لیکن جو ہر انسانیت ..... دوستی ..... اور محبت ارض و سما کی وسعتوں میں کھو چکے ہیں ..... انسانوں کے ساتھ مختلف ممالک کے درمیان بھی کشیدگی بڑھنے کی نمایاں وجہ دوستی سے دوری اور نفرت سے قربت ہے ..... ایک ایسے ہی نوجوان کے شوقِ آوارگی کا اعجاز کہ قدم قدم پہ ایک داستاں منتظر تھی۔

بے غرض و بے لوث...... بے ٹھکانا و بے وطنوں کو پیش آنے والے سنگین حالات و واقعات

سب سے زیادہ فکر مجھے امی کی تھی۔ یہ خبر سنتے ہی ان کا تو ہارٹ فیل ہو سکتا تھا۔ پھر مجھے خالہ نسیمہ، انکل اور ان کی فیملی کا خیال تھا۔ میرے نام کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا نام بھی میڈیا میں اچھلتا اور برسوں کی بنی ہوئی عزت لمحوں میں خاک ہو جاتی۔ انڈین پولیس کی نظروں میں وہ الگ مشکوک ٹھہرتے۔ گویا انڈیا میں ان کی زندگی عذاب ہو جاتی۔

میں نے سیل فون نکالا اور ہمت کر کے تیمور کا نمبر ملایا۔ اس نے دوسری ہی گھنٹی پر فون ریسیو کر لیا اور چہک کر بولا۔ ''تو وہاں جا کر جینی میں ایسا گم ہوا کہ ہم لوگوں کو بھلا بیٹھا۔ تجھے آج میری یاد آئی ہے؟''

''یار تیمور! میں بہت مصیبت میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

تیمور نے شاید میرے سنجیدہ لہجے سے محسوس کر لیا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، سچ ہی ہے۔

''کیا بات ہے کامی! خیریت تو ہے؟'' اس کے لہجے میں تشویش اور فکرمندی کے تاثرات تھے۔

''خیریت نہیں ہے یار!'' میں نے کہا۔ ''میں تجھے فون پر بتا بھی نہیں سکتا۔ ممکن ہے میرا فون ٹریپ ہو رہا ہو اور ہماری گفتگو کوئی اور سن لے۔ تو فکر مت کر، میں آدھے گھنٹے میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

امریکا میں ہمارا ایک مشترکہ دوست راشد تھا۔ میں نے سوچا کہ میں راشد کو فون کر کے سب کچھ بتا دیتا ہوں۔ وہ تیمور کو سارے حالات سے آگاہ کر دے گا۔

میں نے راشد کا نمبر کئی بار ملانے کی کوشش کی لیکن اس کا سیل فون بند تھا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آیا کہ سیل فون رکھنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟

میں نے پھر جھنجلا کر ٹی وی کھول لیا۔ دو تین چینلز تبدیل کرنے کے بعد مجھے ایک نیوز چینل مل گیا۔ اس چینل پر بھی قتل کی وہی خبر تھی۔ اس معاملے میں مجھے اپنے میڈیا اور بھارت کے میڈیا میں ذرا بھی فرق محسوس نہیں ہوا۔ ہمارا میڈیا بھی ایک خبر کو اتنی بار دہراتا ہے کہ وہ خبر بچے بچے کو حفظ ہو جاتی ہے۔ اب اس خبر میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ اقدام قتل کی اس واردات میں بچ جانے والے ایک زخمی اور سابق پولیس کمشنر مسٹر شرما کو ہوش آ گیا تھا اور انہوں نے اس واقعے کو پاکستانی ایجنسی کے سر تھوپ دیا تھا۔ ان کی طرف سے مزید انکشافات کی توقع تھی۔

مزید انکشافات یہی ہو سکتے تھے کہ وہ میڈیا پر میری تصویر جاری کر دیتا اور مجھے پاکستانی ایجنٹ ثابت کر کے اس واقعے کو پوری دنیا میں اچھالتا اور دنیا بھر کی ہمدردیاں سمیٹتا۔

میں ٹی وی دیکھ دیکھ کر تھک گیا تو نہانے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ نہانے کے بعد مجھے تازگی کا احساس ہوا۔ مجھے کافی کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کچن میں جا کر کافی بنائی اور اسے لے کر دوبارہ لاؤنج میں آ گیا۔

ابھی تک جینی یا سنیتا کی طرف سے کوئی ٹیلی فون کال موصول نہیں ہوئی تھی۔ جینی سے بھی میری بات ڈھائی گھنٹے پہلے ہوئی تھی۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر جینی کا نام تھا۔ میں نے جلدی سے کال وصول کر لی۔

''کامران! تم شدید خطرے میں ہو۔'' جینی نے

ہذیانی لہجے میں کہا۔
''ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے۔ تم فوراً وہاں سے نکلو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔ جلدی کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں ہیلو ہیلو ہی کرتا رہ گیا۔
میں نے عجلت میں کپڑے بدلے۔ اپنا بٹوا اور اے ٹی ایم کارڈ لیا۔ دونوں ریوالور اور ان کے فاضل میگزین جیب میں ڈالے اور دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔
''کون ہے؟'' میں نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔
''پولیس!'' باہر سے ایک کرخت آواز گونجی۔
یہاں سے فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ سنیتا کا وہ فلیٹ آٹھویں منزل پر تھا اور داخلی دروازہ صرف ایک تھا۔
میں نے چند لمحے توقف کیا پھر ہمت کر کے دروازہ کھول دیا۔
ایک پولیس انسپکٹر اور چار سپاہیوں نے مجھے دھکا دیا اور اندر آ گئے۔
''یہ سب کیا ہے آفیسر؟'' میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کسی کے گھر میں داخل ہونے کا... کیا چاہتے ہیں آپ؟''
''تمہارا نام کامران ہے؟'' انسپکٹر نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔
''کامران!'' میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''کون کامران؟ میرا نام تو اجے کمار ہے اور میرا تعلق رام پور سے ہے۔''
''جھوٹ بولنے سے کام نہیں چلے گا مسٹر کامران۔'' اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''تم اجے کمار ہو یا وجے کمار... تمہیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔''
''چلیے... میں تیار ہوں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ اس طرح مجھے پولیس اسٹیشن لے جائیں گے؟ آپ حکم کرتے تو میں خود ہی حاضر ہو جاتا۔ خیر، چلیے یوں ہے تو یوں ہی سہی۔''
چاروں سپاہیوں نے مجھ پر رائفلیں یوں تان رکھی تھیں کہ اگر میں ان کی مرضی کے خلاف خفیف سی حرکت بھی کرتا تو وہ مجھے بھون کر رکھ دیتے۔
''پہلے اس کی تلاشی لو۔'' انسپکٹر نے حکم دیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی اعشاریہ چار پانچ کا خوف ناک ریوالور تھا۔
میں نے خود ہی دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ''آپ ہر طرح سے اپنی تسلی کر لیں۔'' پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ کی اجازت ہو تو میں ایک ٹیلی فون کر لوں؟''
''اب کسے فون کرنا ہے او ئے؟'' انسپکٹر نے انتہائی حقارت سے کہا۔
''میں ہوم سیکریٹری سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ پھر میں آپ کے ساتھ چل تو رہا ہی ہوں۔''
''ہوم سیکریٹری!'' انسپکٹر نے تذبذب کے عالم میں کہا۔ ''تم سنہا کو کیسے جانتے ہو؟''
اس بے وقوف نے ہوم سیکریٹری کا نام بتا کر میری مشکل آسان کر دی تھی۔
''سنہا صاحب شملہ میں میرے کلاس فیلو تھے۔ وہ مجھے برسوں سے جانتے ہیں۔''
''فون کر لو۔'' انسپکٹر نے بادلِ ناخواستہ مجھے اجازت دی۔ میں نے لاؤنج میں رکھے ہوئے فون کو اپنی طرف کھسکایا اور اس پر یونہی ایک نمبر ملایا۔ میں نے جان بوجھ کر ایک عدد کم ڈائل کیا تھا۔ ظاہر ہے پھر نمبر کیسے ملتا۔ میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''ہیلو! کون؟... مجھے ہوم سیکریٹری صاحب سے بات کرنی ہے۔ میرا نام اجے کمار ہے... [illegible] ہیں... ان کا کوئی سیل نمبر... لکھوا دیجیے۔'' میں نے [illegible] پڑے ہوئے پیڈ پر سنہا کا سیل نمبر لکھا اور انسپکٹر سے کہا۔ ''سنہا صاحب اس وقت شہر سے باہر ہیں۔ بہر حال، آپ لوگ اپنی ڈیوٹی پوری کریں۔ میں سنہا سے بعد میں بات کر لوں گا۔ ہاں، پہلے آپ میری تلاشی لے لیں۔''
انسپکٹر اور سپاہیوں کے تیور اب بدل گئے تھے۔ ان میں پہلے جیسی سختی نہیں تھی۔ انسپکٹر پھر بھی کھاگ تھا۔ وہ ایک کانسٹیبل سے بولا۔ ''اجے صاحب کی تلاشی لو اور انہیں بہت باعزت طریقے سے پولیس اسٹیشن لے چلو۔ میں ہوم سیکریٹری صاحب سے بعد میں خود معافی مانگ لوں گا۔''
کانسٹیبل میری طرف بڑھا تو میں پُرسکون انداز میں کھڑا ہو گیا۔ وہ جو نہی میرے نزدیک پہنچا، میں نے اچانک اس کی رائفل جھپٹ لی اور اسے انسپکٹر پر اچھال دیا۔ وہ انسپکٹر کو لے کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ بقیہ تین کانسٹیبل ہونق بنے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں چار رائفلوں اور ایک ریوالور کی موجودگی میں یہ حرکت کروں گا۔
اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے، میں نے نزدیک ترین کھڑے ہوئے سپاہی کو زوردار لات ماری جو اس کے سینے پر پڑی۔ دوسرے سپاہی کے چہرے پر میرا بھرپور گھونسا پڑا۔ تیسرا سپاہی کسی حد تک سنبھل گیا تھا لیکن میں نے گھوم کے اس کے چہرے پر بھی زوردار لات رسید کر دی۔ اس دوران میں انسپکٹر اور کانسٹیبل اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔
انسپکٹر اپنی گری ہوئی گن کی طرف بڑھ رہا تھا۔
میں نے برق رفتاری سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال لیا۔
''اپنی جگہ سے حرکت بھی کی تو تمہاری یہ بھوسا بھری کھوپڑی اڑا دوں گا۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔
''تم جیسے چوہے مجھے گرفتار کرنے آئے تھے... اونہہ۔''
اس موقع پر بچ جانے والے کانسٹیبل نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔
مجھے خود بھی امید نہیں تھی کہ وہ یہ پاگل پن کی حرکت کرے گا۔ میں اس دھوکے میں مارا گیا اور اس کے جسم کی ٹکر سے زمین پر گر گیا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن پر زوردار پنچ رسید کر دیا۔ سوکھی لکڑی کے چٹخنے کی سی آواز آئی تو مجھے لمحے بھر کو افسوس ہوا۔ وہ بے چارہ اپنے فرض کی خاطر قربان ہو گیا تھا۔
اس دوران میں انسپکٹر ریوالور تک پہنچ گیا اور ریوالور اٹھانے ہی والا تھا۔ وہ میری پہنچ سے دور تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا مگر وہ کم بخت عین وقت پر پلٹ گیا اور گولی اس کے ہاتھ کے بجائے سینے میں پیوست ہو گئی۔
میں پھرتی سے اٹھا کیونکہ فائر کے دھماکے سے نہ صرف اردگرد کے لوگ اکٹھے ہو جاتے بلکہ ان کے ساتھ آئی ہوئی پولیس کی نفری بھی چوکنا ہو جاتی۔
کوریڈور میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میں نے ریوالور جیب میں رکھا اور جلدی سے باہر آ گیا۔
لفٹ کے پاس پولیس کا ایک ڈھیلا سا سپاہی موجود تھا۔ میں نے خوف زدہ لہجہ بنا کر کہا۔ ''سنتری صاحب! اندر کسی فلیٹ میں فائرنگ ہو رہی ہے۔''
اس وقت دو چار حواس باختہ مرد اور کچھ عورتیں بھی باہر نکل آئیں۔ میں پھر چیخا۔ ''بھاگو... اندر کہیں فائرنگ ہو رہی ہے۔ ڈاکوؤں نے ہماری بلڈنگ پر دھاوا بول دیا ہے... بھاگو۔''
سب گرتے پڑتے لفٹ کی طرف بھاگے۔ میں جانتا

''لو سناؤ برخوردار...! کیسی گزریں چھٹیاں؟''

تھا کہ اتنے آدمی لفٹ میں نہیں آسکیں گے۔ اس لیے میں نے لفٹ کے بجائے زینے کو ترجیح دی۔ ساتھ ساتھ میں چیختا بھی جا رہا تھا۔ ''بھاگو ہماری بلڈنگ میں ڈاکوؤں نے دھاوا بول دیا ہے۔ وہ پوری بلڈنگ کو بم سے اڑانے کی بات کر رہے ہیں۔''
میرے ساتھ بھاگنے والوں کا ایک مجمع تھا۔ وہ سب یہی باتیں دہرا رہے تھے کہ ڈاکو ہماری بلڈنگ کو بم سے اڑا رہے ہیں۔ انہوں نے فائرنگ کر کے کئی فلیٹوں کے لوگوں کو مار دیا ہے۔
ہر فلور پر بھاگنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ میں اب خاموش تھا۔ میرا کام اب دوسرے خوف زدہ مرد اور عورتیں کر رہے تھے۔
ہم گراؤنڈ فلور پر پہنچے تو وہاں پولیس کی دو جیپیں موجود تھیں۔ ان میں چار چار سپاہی اور ایک ایک انسپکٹر تھا۔ تیسری جیپ خالی تھی۔ غالباً یہ انہی لوگوں کی جیپ تھی جو مجھے گرفتار کرنے گئے تھے۔
ہجوم دیکھ کر پولیس والے بھی بوکھلا کر جیپوں سے کود کود کر باہر آ گئے اور لوگوں سے صورتِ حال پوچھنے لگے۔
ان میں سے ایک انسپکٹر نے میگا فون پر لوگوں کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ آپ لوگ شانت ہو جائیں۔ عمارت پر ڈاکوؤں نے دھاوا نہیں بولا ہے بلکہ یہاں ایک خطرناک دہشت گرد چھپا ہوا ہے۔ ہمارے بہترین کمانڈو اسے گرفتار کرنے گئے ہیں۔ وہی لوگ فائرنگ بھی کر رہے ہوں گے۔
میں لوگوں کے مجمع میں کھڑا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ ''جھوٹ بول رہا ہے یہ۔ اگر وہ دہشت گرد اتنا ہی خطرناک ہے تو یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ مارو اسے۔''
پھر تو مجمع بے قابو ہو گیا اور پولیس والوں پر پتھراؤ

چپل اور جوتے پھینکے جانے لگے۔ بہت سے لوگ حواس باختہ ہو کر بلڈنگ کے باہر بھاگے۔ میں بھی ان حواس باختہ لوگوں میں شامل تھا۔

بلڈنگ کے باہر آ کر میں کچھ دور تک تیز رفتاری سے پیدل چلتا رہا پھر کافی دور آنے کے بعد مجھے ایک ٹیکسی نظر آئی۔ میں نے اس سے ریلوے اسٹیشن چلنے کو کہا۔

اسٹیشن پہنچ کر میں نے دوسری ٹیکسی پکڑی اور اس سے کہا کہ مجھے کسی مارکیٹ تک پہنچا دو۔

"کون سی مارکیٹ جاؤ گے صاحب؟" اس نے پوچھا۔

"میں یہاں نیا ہوں بھیا! مجھے کسی ایسی مارکیٹ میں پہنچا دو جہاں میں سستی سی شاپنگ کر سکوں۔"

ٹیکسی والے نے آدھے گھنٹے میں مجھے چاندنی چوک کے نزدیک اتار دیا۔

وہاں سب سے پہلے تو میں نے سستا سا ایک سوٹ کیس خریدا۔ دو تین جوڑے کپڑوں کے خریدے اور ضرورت کا دوسرا سامان لے کر پھر ایک ٹیکسی پکڑی اور ڈرائیور سے کہا۔ "مجھے کسی سستے سے صاف ستھرے ہوٹل میں پہنچا دو۔"

"راج کمار ہوٹل چلے گا؟" اس نے پوچھا۔

"میں اس شہر میں نیا ہوں بھیا! اگر راج کمار ہوٹل اچھا ہے تو تم مجھے وہیں پہنچا دو۔"

"وہ ہوٹل تھوڑا مہنگا ہے لیکن ہے بہت اچھا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا اور تھوڑی دیر بعد مجھے راج کمار ہوٹل پہنچا دیا۔

وہ ہوٹل ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اچھا تھا۔ یوں سمجھیں کہ وہ ہمارے کراچی کے مہران کے معیار کا تھا۔ کمرے بھی ائرکنڈیشنڈ اور کشادہ تھے اور سروس بھی بہترین تھی۔

میں نے وہاں اپنا نام ارجن رام لکھایا اور بتایا کہ میں ہریانہ سے آیا ہوں۔

ان لوگوں نے رسمی خانہ پری کی پھر مجھے ہوٹل کی چابی دے دی۔

کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلے تو میں نے روم سروس سے چائے اور سینڈوچز منگوائے کیونکہ اس بھاگ دوڑ میں میری بھوک چمک گئی تھی۔ خالی پیٹ یوں بھی میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہتا۔ پھر میں نے جینی کا نمبر ملایا تو اس نے فوراً ہی فون ریسیو کر لیا۔ "کامی! کہاں ہو تم... خیریت سے تو ہو؟"

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔ بس اس دفعہ تو بال بال بچا ہوں۔ تم اگر آ سکتی ہو تو یہاں آ جاؤ۔ مارکیٹ سے کوئی برقع خرید لینا۔ میں یہاں کے راج کمار ہوٹل کے روم نمبر 412 میں ارجن رام کے نام سے ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"مجھ سے برقع پہن کر ایک قدم بھی نہیں چلا جائے گا۔" جینی نے کہا۔

"پلیز جینی! یہ بہت ضروری ہے۔ ورما تمہیں میرے ساتھ دیکھ چکا ہے۔ وہ یا اس کا کوئی آدمی تمہارے تعاقب میں آ سکتا ہے۔"

"اچھا... میں کوشش کرتی ہوں۔"

"تم سیدھی روم نمبر 412 میں آنا اور دروازے پر دستک دینے کے بجائے مجھے سیل فون پر کال کر دینا۔"

اس دوران میں ویٹر سینڈوچز، چپس اور چائے لے کر آ گیا۔ میں نے ان تمام چیزوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔

جب میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو مجھے خیال آیا کہ پولیس کو سینا کے اس فلیٹ کے بارے میں کیسے علم ہو گیا؟ کیا سینا نے خود ہی انہیں بتا دیا؟ میرا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اسے بتانا ہوتا تو وہ اسی وقت بتا دیتی جب وہ شاپنگ کے لیے باہر گئی تھی۔

میں نے وقت گزاری کے لیے ٹی وی کھول لیا۔ اس دفعہ ٹی وی پر کچھ نئی خبریں آ رہی تھیں۔

"پاکستانی ایجنٹ نے سنہا آرکیڈ کے ایک فلیٹ میں تین آدمیوں کا خون کر دیا۔ پھر وہاں فائرنگ کی آواز سے ہڑبونگ مچ گئی اور دہشت گرد اس کا فائدہ اٹھا کر وہاں سے فرار ہو گیا۔ پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔"

میں نے سوچا کہ مجھ سے تین آدمی کیسے ہلاک ہو گئے؟ انسپکٹر کے تو خیر سینے میں گولی لگی تھی۔ ایک سپاہی گردن ٹوٹنے سے ہلاک ہوا تھا۔ تیسرا شاید وہ تھا جس کے سینے پر میں نے بھرپور قوت سے زوردار لات رسید کی تھی۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بج کر خاموش ہو گئی۔ کال کرنے والی جینی تھی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک برقع پوش خاتون کھڑی تھی۔

"اندر آنے دو گے یا احمقوں کی طرح مجھے دیکھتے ہی رہو گے؟" جینی کی آواز آئی تو میں نے اسے راستہ دے دیا۔

اس نے آتے ہی پہلے برقع اتار کر پھینکا۔ وہ اس وقت جدید تراش کے شلوار سوٹ میں تھی اور پہلے سے کہیں

زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

"شکر ہے کہ تم بچ گئے کامی۔" جینی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "تمہیں اگر کچھ ہو جاتا تو..."

"جینی پلیز! یوں آنسو بہاؤ گی تو..." میرا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ جینی مجھ سے لپٹ کر زار و قطار رو رہی تھی۔ میں نے بمشکل تمام اسے خاموش کرایا۔ پانی کا ایک گلاس پی کر اس کی جان میں جان آئی لیکن وہ ابھی تک سسکیاں لے رہی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ پولیس اس فلیٹ پر چھاپا مارنے والی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ورما ایک نمبر کا کمینہ اور گھاگ آدمی ہے۔ اس نے نہ جانے کیسے اندازہ لگا لیا کہ تم کھڑکی کے ذریعے دائیں یا بائیں طرف کے فلیٹ کی طرف گئے ہو گے۔ اس نے دیوار سے تمہاری انگلیوں کے نشان اٹھوائے تو اسے معلوم ہو گیا کہ تم سینا کے فلیٹ میں گئے تھے۔ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے اس کی مزید تصدیق ہو گئی۔ ان لوگوں نے سینا کو گھیر لیا۔ وہ نرم و نازک لڑکی ہے۔ زیادہ دیر پولیس تشدد کا مقابلہ نہ کر سکی اور تمہارے ٹھکانے کے بارے میں بتا دیا۔ تم نے شاید اسے میرا سیل نمبر دے رکھا تھا۔ اس نے ایک عقل مندی [illegible] تمہیں فون پر اطلاع دینے کی کوشش کی مگر شاید اس وقت تمہارا سیل فون بند تھا یا نیٹ ورک کام نہیں کر رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر مجھے اطلاع دی کہ تمہارے دوست کی جان خطرے میں ہے۔ پولیس کو اس کے موجودہ ٹھکانے کا علم ہو گیا ہے۔ پھر شاید کسی نے اس کے ہاتھ سے سیل فون چھین لیا۔ میں نے فوری طور پر تمہیں انفارم کیا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔"

"دیر ہو چکی ہوتی تو میں تمہارے سامنے نہ بیٹھا ہوتا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو؟"

"میں پرانی دلی کے اسی گندے سے ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔"

"تمہارے ساتھ کیا پرابلم ہے؟" میں نے کہا۔ "تم تو آنٹی نسیمہ کے گھر بھی رہ سکتی ہو۔"

"میں ان لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتی۔" جینی نے کہا۔

"تو پھر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں منتقل ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں طعنہ نہیں دے رہا ہوں۔ تمہارے پاس امریکن پاسپورٹ ہے۔ وہ لوگ تم پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ اگر تم سے میرے بارے میں پوچھیں تو تم بہت اطمینان سے کہہ سکتی ہو کہ کون کامران؟ میں کسی کامران کو نہیں جانتی۔ میں کراچی سے ممبئی آئی تھی پھر دہلی آ گئی۔ میں نے سوچا کہ پہلے دہلی اور آگرہ وغیرہ دیکھ لوں، ممبئی بعد میں گھوموں گی۔"

"تمہیں اس مصیبت میں چھوڑ کر میں خود فائیو اسٹار ہوٹل میں منتقل ہو جاؤں؟" جینی کے انداز میں شکوہ تھا۔

"میں بھی اب مصیبت میں نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ ہوٹل بہت آرام دہ ہے۔ تم دیکھ ہی رہی ہو کہ اس کے کمرے اور فرنیچر وغیرہ کتنا بہترین ہے۔"

"لیکن تمہیں یہاں بھی خطرہ ہے کامی!" جینی نے کہا۔ "پولیس سب سے پہلے ایسے ہی ہوٹلوں کو چیک کرتی ہے۔ تمہاری تصویر ابھی تک میڈیا پر نہیں آئی ہے۔ جس دن تمہاری تصویر اخبارات اور ٹی وی چینلز پر آ گئی، انڈیا کی زمین تم پر تنگ ہو جائے گی۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "ہاں، ایک اہم بات تو رہ ہی گئی۔ تیمور سے میری بات ہوئی تھی۔ میں نے اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ ابھی یہ خبر انکل، آنٹی اور تمہاری بہن تک نہ پہنچے۔ وہ بھی بہت زیادہ پریشان ہو گیا۔ کہہ رہا تھا کہ میں بھی دو ایک روز میں انڈیا آ رہا ہوں۔"

"اسے روکو جینی۔" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ وہ بھی پھنس جائے گا۔ وہ یہاں آ کر کیا کرے گا؟"

"میں نے کوشش تو بہت کی ہے لیکن وہ میری بات نہیں مان رہا۔ آخر وہ بھی دوست تو تمہارا ہی ہے۔ پلیز! میری ایک بات مانو کامی! یہ ہوٹل چھوڑ دو۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔"

اچانک مجھے آر کے اور امجد خان کا خیال آیا۔ آر کے کا کارڈ میرے بٹوے میں موجود تھا۔ میں نے جینی سے کہا۔

نکتہ

طلاق کے ایک دلچسپ کیس میں جج نے عورت سے پوچھا۔ "طلاق حاصل کرنے کا سبب؟"

"یہ ہر ہفتے مجھ سے اپنی کمر دھلواتا ہے۔" عورت نے شکایت کی۔

"تو کیا آپ کے خیال میں طلاق حاصل کرنے کے لیے اتنی سی بات کافی ہے؟" جج نے قدرے خشک لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں جناب! جب گزشتہ ہفتے میں اس کی کمر دھونے لگی تو پہلے سے دھلی ہوئی تھی۔ جانے یہ کس کس سے اپنی کمر دھلوا تا رہا ہے!" عورت نے تلخی سے جواب دیا۔

www.pkdigest.com

''ایک نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کرلو۔ یہ یہاں کے انڈر ورلڈ کے بہت بڑے ڈان کا نمبر ہے۔ اگر مجھے بات کرنے کا موقع نہ ملے تو کم سے کم تم تو بات کرسکتی ہو۔ تم اسے صرف امجد خان کا حوالہ دینا اور میرا نام بتا دینا۔ وہ ہر صورت میں تمہاری مدد کرے گا۔''

جینی نے آر کے کا نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کرلیا۔

میں نے بھی وہ نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کرلیا اور اس سے بولا۔ ''تمہارے لیے چائے منگواؤں یا کھانا کھاؤ گی؟ میرا خیال ہے کہ تم آج رات یہیں رک جاؤ۔ پھر نہ جانے ہمیں بات کرنے اور ملنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔''

''ایسی باتیں کرو گے تو میں ابھی چلی جاؤں گی۔''

''اچھا... پھر کیسی باتیں کروں کہ تم ابھی نہ جاؤ۔'' میں نے مسکین صورت بنا کر کہا۔

جینی بے اختیار ہنسنے لگی۔

''میں نے دنوں بعد تمہاری کھنکتی ہوئی ہنسی سنی ہے۔ میری بات مانو جینی... آج رات یہیں رک جاؤ۔''

''یہ شریفوں کا ہوٹل ہے۔ ہوٹل والے تمہیں عیاشی کے الزام میں پولیس کے حوالے کردیں گے۔'' جینی نے ہنس کر کہا۔ پھر سنجیدہ ہوکر بولی۔ ''کامران! میں پھر کہوں گی کہ یہ ہوٹل چھوڑ دو۔''

''چھوڑ دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ایک شرط پر... میں جہاں بھی رہوں گا، تم میرے ساتھ رہو گی۔''

''تم سمجھتے کیوں نہیں؟'' جینی جھنجلا کر بولی۔ ''ورما اور اس کے ساتھیوں نے ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھا ہے۔ تم کیا چاہتے ہو وہ ہم دونوں کو ایک ساتھ گرفتار کرلے؟ اس سلسلے میں میرا سفارت خانہ بھی کچھ نہیں کرسکے گا۔ یہ ایک سیاسی کیس بن جائے گا۔ سب سے پہلا سوال مجھ سے یہی کیا جائے گا کہ تم پاکستان کے ایک خطرناک ایجنٹ کے ساتھ کیوں تھیں؟ پھر شاید میرا سفارت خانہ تو مجھے بچالے لیکن تمہارے بچنے کے مواقع تو نہ ہونے کے برابر... بلکہ ہیں ہی نہیں۔ میری بات مان لو اور یہ ہوٹل آج ہی چھوڑ دو۔''

''میں نے تم سے کہا ہے نا کہ آج کی رات تو میں یہاں تمہارے ساتھ گزاروں گا۔ کل ہو نہ ہو۔ تم اپنا برقع یہاں چھوڑ دو۔ میں استقبالیہ پر لکھوا دیتا ہوں کہ میری مسز بھی آنے والی ہیں۔ انہیں میرے کمرے میں بھیج دینا۔ ہاں، تمہارا نام شاردا ہے۔''

''تم واقعی بہت ضدی ہو۔ جو بات ایک دفعہ کہہ دیتے ہو، وہ ... کرکے رہتے ہو۔''

میں نے استقبالیہ پر فون کردیا کہ ابھی تھوڑی دیر میں میری وائف شاردا آنے والی ہیں۔ انہیں میرے روم میں بھیج دیں۔

جینی چند منٹ بیٹھی پھر برقع وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ کمرے میں آگئی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہاری زبان سے انہیں شبہ تو نہیں ہوا کہ تم دیسی نہیں بلکہ بدیسی ہو؟''

''میں نے زیادہ بات ہی نہیں کی، بس اتنا کہا۔ آئی ایم مسز ارجن رام۔ انہوں نے مجھے کمرے کا نمبر بتایا اور بس!''

جینی کے پاس ایک ہینڈ بیگ بھی تھا۔ اس نے وہ بیگ کھولا تو اس میں سے عجیب عجیب چیزیں نکلیں۔ جرمن ماؤزر اور اس کے بہت سے فالتو راؤنڈز۔ دھوئیں کے دو چھوٹے چھوٹے بم... ایک چین پسٹل اور لمبے پھل والا شکاری چاقو۔

''اس میں بس توپ، ٹینک اور راکٹ لانچر کی کمی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ورنہ پورا اسلحہ خانہ موجود ہے۔''

''میں نے تمہیں جو دو ریوالور دیے تھے، وہ کہاں ہیں؟'' جینی نے میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''وہ میرے پاس ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم تو یوں پوچھ رہی ہو جیسے کوئی مال اسے بیچنے سے پوچھتی ہے کہ میں نے تمہیں پچھلے ہفتے جو پنسل دی تھی، وہ کہاں گئی؟''

جینی نے میری بات کا جواب دیے بغیر پھر اپنا بیگ کھولا اور ان ریوالورز کے مزید کئی راؤنڈز میرے حوالے کردیے۔ ''انہیں رکھ لو... ان کی ضرورت کسی بھی وقت پڑ سکتی ہے۔''

''اب یہ گولہ بارود کی باتیں چھوڑو اور اچھی اچھی باتیں کرو۔ مثلاً تم شلوار سوٹ میں قیامت لگتی ہو لیکن ٹائٹ جینز کی تو بات ہی اور ہے۔ ویسے اگر تم ساڑی باندھو تو اس میں مزید اچھی لگو گی۔''

''میں نے ساڑی باندھنے کی کوشش... کی تھی لیکن مجھے باندھنا نہیں آئی۔'' جینی نے پہلی دفعہ مسکرا کر کہا۔

پھر ہم لوگوں نے کمرے ہی میں کھانا منگوالیا۔ جینی نے دو چار لقمے لے کر ہاتھ کھینچ لیا اور بولی۔ ''بس، اب نہیں کھایا جائے گا۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔''

اس نے کافی بھی بس دو چار گھونٹ پی کر چھوڑ دی۔

''تم آخر اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں ہو؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''میں اکھڑی اکھڑی تو نہیں ہوں۔'' جینی نے جواب دیا۔ ''بس بعض اوقات تم بچوں کی طرح ضدی ہوجاتے ہو، اس بات سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔''

''اچھا، اب چھوڑو ان باتوں کو... اچھی اچھی باتیں کرو۔''

''تیمور بھی یہی کہہ رہا تھا۔'' جینی نے کہا۔ ''تم دونوں کی سوچ بھی ایک ہی جیسی ہے۔''

''تم جس گھٹیا سے ہوٹل میں رہ رہی ہو، وہاں تو تمہیں بہت زیادہ تکلیف ہوگی۔'' میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

''مجھے وہاں کوئی تکلیف ہوتی تو میں وہاں رہتی ہی کیوں؟'' جینی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر اس نے لائٹ آف کردی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

مجھے بھی غصہ آگیا۔ موصوفہ کے مزاج ہی نہیں مل رہے تھے۔ سونے سے پہلے البتہ اس نے دو بھرے ہوئے ریوالور اور ان کے میگزین تکیے کے نیچے رکھ لیے تھے۔ میں اس کے رویے سے غصے میں کھولتا رہا پھر نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میری آنکھ بے وجہ نہیں کھلی تھی بلکہ دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا تھا۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی تالے میں چابی گھما رہا ہو۔ میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال کر بائیں طرف قلابازی کھا گیا۔ اب میں بیڈ کے پیچھے تھا۔ میں نے دیکھا کہ جینی اپنی جگہ سے غائب ہے۔ ممکن ہے وہ باتھ روم میں ہو۔ اس وقت مجھے جینی سے زیادہ دروازے پر آنے والے کی فکر تھی۔

پھر دروازہ آہستہ آہستہ کھل گیا اور ایک سایہ سا اندر داخل ہوا۔

اس نے دروازے کے پاس کھڑے ہوکر چند منٹ اردگرد کا جائزہ لیا پھر دروازہ آہستگی سے بند کرکے آگے بڑھا۔

میں اس کی مخالف سمت میں تھا۔ وہ مزید آگے بڑھا تو اچانک صوفے کے پیچھے سے کسی نے اس پر چھلانگ لگائی اور اس کے سینے پر بھرپور گھونسا مارا۔ آنے والے کے حلق سے ''اوغ'' کی کربناک آواز نکلی اور وہ اپنا سینہ پکڑ کر جھک گیا۔

اس پر چھلانگ لگانے والی جینی تھی۔

میں نے اٹھ کر اچانک لائٹ جلا دی۔ کمرے میں داخل ہونے والا پینتیس چالیس سال کا پستہ قد شخص تھا۔ وہ روشنی میں الوؤں کی طرح پلکیں جھپکا رہا تھا۔

''کون ہو تم اور اندر کیسے آئے؟ دروازہ تو بند تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''مجھ سے غلطی ہوئی سر!'' وہ گھگیا کر بولا۔ ''میں اسی ہوٹل کا ملازم ہوں۔ یہاں کے ہر کمرے کی ایک مزید چابی میرے پاس ہوتی ہے۔ ہریانہ سے آنے والے اپنا کیش ساتھ ہی رکھتے ہیں۔ ان کی عورتیں بھی اپنا زیور اپنے پاس ہی رکھتی ہیں۔ میں لالچ میں آگیا تھا۔''

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ رسید کیا اور بولا۔ ''سچ سچ بتاؤ... یہاں کیوں آئے تھے؟ ورنہ مار کے یہیں پھینک دوں گا۔''

''میں سچ بول رہا ہوں سر!''

''تم سچ نہیں بول رہے۔'' میں نے اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کردیا۔

''وہ جی... پولیس کے اسسٹنٹ کمشنر نے سارے بڑے ہوٹلوں کو ہدایت کی ہے کہ اگر کوئی ایسا جوڑا ہوٹل میں ٹھہرے جس میں مرد مقامی ہو اور بیوی غیر ملکی تو فوراً پولیس کو اطلاع دی جائے۔ اطلاع دینے والے کو انعام دیا جائے گا۔''

''کتنا انعام؟'' میں نے پوچھا۔

''پانچ لاکھ روپے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ تم پولیس کو اطلاع دیتے اور اطمینان سے پانچ لاکھ روپے وصول کرلیتے۔ ہمارے کمرے میں گھسنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''پولیس والے تو اکثر ایسے اعلان کرتے ہیں لیکن آج

ہے۔ پیٹس جیسے شخص کے لیے اس تقریب کا دعوت نامہ حاصل کر لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہالی ووڈ میں اس کے تعلقات کسی طرح اینگس سے کم نہیں تھے۔ یہ جان کر اینگس مزید فکر مند ہو گیا کہ وہاں پیٹس بھی ہوگا۔ پھر اسے ایک خیال آیا کہ اگر پیٹس خود اس تقریب میں آ رہا ہے تو اس بات کا امکان تھا کہ وہاں اینگس پر حملہ نہیں ہوگا۔

☆☆☆

پاپا دو دن پہلے آیا تھا۔ اس دوران میں وہ فارغ نہیں رہا... بلکہ مستقل کام کرتا رہا... اس نے ایک آن لائن جاسوس ایجنسی سے رابطہ کیا اور اسے یہ کام سونپا کہ وہ مقامی ہوٹل میں مقیم فرانس کے فلم ڈائریکٹر کی نگرانی کرے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ کوئی اور تو اس کی نگرانی نہیں کر رہا ہے۔ اس نے بارہ گھنٹے میں رپورٹ مانگی اور اس سے اگلے دن وہ صبح سے شام تک پروموٹر کی طرف سے مقرر کی ہوئی اپنی میزبان خاتون کے ہمراہ ہالی ووڈ کے مختلف اسٹوڈیوز کے دورے کرتا رہا۔ شام تک اس نے بہت ساری جگہیں دیکھ لی تھیں۔

اس نے چالاکی یہ کی کہ کسی بھی جگہ زیادہ دیر نہیں رکا... آیا اس سے فلم کے بارے میں سوال جواب شروع کر دیے جائیں۔ اس کا اصل مقصد زیادہ سے زیادہ گھومنا تھا۔ شام کو جب وہ ہوٹل آیا تو اس نے آن لائن... جاسوس ایجنسی سے رابطہ کیا اور ان سے رپورٹ مانگی۔ انہوں نے اسے رپورٹ میل کر دی..... جب اس نے رپورٹ پڑھی تو اس کے ماتھے پر شکنیں آ گئیں۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے پروموٹر سے رابطہ کیا۔

"کیا اس تقریب میں غیر فلمی شخصیات بھی شریک ہیں؟"

"ہاں اس میں شہر اور ریاست کی کئی نامور... شخصیات بھی شریک ہیں۔" پروموٹر نے تصدیق کی۔

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں اسے غیر فلمی شخصیات پر ضائع کر سکوں۔" پاپا نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ فرانسیسی ڈائریکٹر کے روپ میں وہ چڑچڑا اور معمولی بات پر دوسروں پر چڑھ دوڑنے والا شخص بنا ہوا تھا۔ پروموٹر نے اسے یقین دلایا۔

"آپ بالکل بے فکر رہیں جناب وہاں موجود کوئی غیر فلمی شخصیت آپ کا وقت ضائع کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔"

پاپا امریکیوں اور خاص طور سے ہالی ووڈ والوں کی نفسیات سمجھ گیا تھا۔ وہ یورپ کے فن کاروں اور فلم آرٹ سے تعلق رکھنے والوں سے بہت متاثر تھے اور انہیں کوئی الگ ..... مخلوق سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہالی ووڈ میں ان لوگوں کی بھی خوب آؤ بھگت ہوتی تھی جن کو عام طور سے اپنے ملک میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہی وجہ تھی اس نے خود کو آرٹ فلموں کا ڈائریکٹر ظاہر کیا تھا اور ایسے لوگوں کو کچھ زیادہ ہی توجہ دی جاتی ہے۔ یہ پروموٹر جسے ایک دنیا جانتی تھی وہ پاپا کے اس بہروپ سے اتنا مرعوب ہوا کہ اس نے پاپا کے بارے میں کوئی تحقیق کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

پاپا کی فکر کی وجہ اس تقریب میں پیٹس شولینڈر کی موجودگی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ ایک ایسی تقریب میں کیوں آ رہا تھا جس میں اس کا جانی دشمن موجود تھا اور جسے قتل کرنے کے لیے پیٹس نے پاپا جیسے مہنگے قاتل کی خدمات حاصل کی تھیں؟ کیا اسے معلوم ہو گیا تھا کہ پاپا اس تقریب میں اینگس پر وار کرے گا؟ جاسوس ایجنسی نے اسے جو رپورٹ دی تھی، اس میں یہ تشویش ناک انکشاف تھا کہ آج سارا دن مختلف لوگ اس کا تعاقب کرتے رہے تھے اور ان میں سے کم سے کم دو افراد کی شناخت ہوئی تھی جو پیٹس شولینڈر کے لیے کام کرتے ہیں۔ پیٹس شولینڈر اس کا تعاقب کروا رہا تھا لیکن کیوں؟

پاپا کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ پیٹس کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔ بھی وہ اپنے آدمیوں سے اس کی نگرانی کروا رہا ہے اور نگرانی کا یہ سلسلہ یقیناً فرانس سے جاری تھا۔ ورنہ پیٹس کو کیا معلوم تھا کہ وہ دوبارہ کس حیثیت سے لاس اینجلس آئے گا۔ پیٹس کے آدمی پیچھا کرتے ہوئے فرانس تک اس کے ساتھ آئے ہوں گے اور وہاں انہوں نے کسی طریقے سے پاپا کا سراغ لگا لیا تھا۔ اگر یہ درست تھا تو پاپا کے لیے بہت ہی تشویش ناک خبر تھی کیونکہ اس کی اصل شخصیت پیٹس شولینڈر کے علم میں آ چکی تھی۔

پاپا نے اپنے سوٹ کیس سے ایک بوتل نکالی۔ یہ خاص اس کے لیے تیار کی جانے والی سونف کی شراب تھی اور جب اسے کسی معاملے پر بہت گہرائی سے غور کرنا ہوتا تو وہ یہ بوتل نکال لیا کرتا تھا۔ وہ بوتل لے کر اپنے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ اس نے میوزک سسٹم پر ایک دھن لگائی اور سوچنے میں مشغول ہو گیا۔ وہ حالات اور واقعات کی کڑیاں ملاتا رہا اور انہیں ایک کاغذ پر نوٹ کی صورت میں اتارتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ ٹریپ کیا جا چکا ہے۔

پاپا ہر مسئلے کو درجہ بہ درجہ حل کرنے کا قائل تھا۔ وہ کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح مسئلے کو مرض کی طرح تشخیص کرتا... اور اس کی شدت اور ہلاکت خیزی کا اندازہ کرتا اور پھر اس کا علاج یا

حل سوچتا تھا...... اس نے تسلیم کر لیا کہ وہ پھنس گیا ہے۔ پیٹس شولینڈر نے ایک طرف تو اسے اپنے دشمن کے خاتمے پر مامور کیا اور دوسری طرف اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے پاپا کی اصل شخصیت کا راز جان لیا۔ وہ ایک طرح سے پیٹس کی مٹھی میں آ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب اس صورتِ حال سے نکلنے کے لیے کیا کرے؟ وہ رات دیر تک اس مسئلے کے حل پر سوچتا رہا۔ حتیٰ کہ بوتل اور دھن دونوں ختم ہو گئیں... مگر وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے مسئلے کا حل نکال لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔

پاپا نے اٹھ کر بوتل ڈسٹ بن میں ڈالی اور اپنے سامان سے ایک چھوٹی سے لیکن کسی قدر موٹی ڈائری نکالی۔ اس نے اس کے کور والا حصہ الگ کیا تو اندر سے ایک چھوٹا سا کیپسول نکل آیا۔ اس نے پہلے خاص قسم کے دستانے پہنے جو اس کی کہنیوں تک آ رہے تھے۔ پھر اس نے چہرے پر ماسک چڑھایا اور کمرے کی ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے یہ کیپسول اٹھایا۔ اس نے پہلے لائٹر کا وہ خفیہ خانہ کھولا جو اس نے خاص طور سے بنوایا تھا۔ پھر کیپسول کھولا اور اس میں موجود بہت ہی باریک پاؤڈر نما سفوف لائٹر کے اس خانے میں ڈال دیا۔ اس کی کوشش تھی کہ اس دوران میں سفوف کا ایک معمولی سا ذرہ بھی باہر نہ گرنے پائے۔ یہ کام کر کے اس نے پوری احتیاط سے کیپسول بند کیا اور اسے واپس ڈائری میں رکھ دیا۔

لائٹر کا خانہ بند کر کے اسے میز پر رکھ دیا۔ وہ اب تک پوری احتیاط کر رہا تھا۔ ان دونوں کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنے سوٹ کیس سے ایک چھوٹی سی مشین نکالی اور اسے آن کر کے اس کی مدد سے پہلے لائٹر اور پھر اپنی ڈائری کو چیک کیا۔ مشین پر ہری روشنی جل اٹھی تھی۔ اس نے سکون کا طویل سانس لیا لیکن دستانے اور ماسک اتارنے سے پہلے اس نے اچھی طرح اطمینان کر لیا... اس کے بعد اس نے دستانے اور ماسک اتار کر اسے تلف کرنے والی مشین میں ڈال دیا۔ اس نے جو نوٹس بنائے تھے انہیں بھی مشین میں ڈال دیا۔ لائٹر اس نے احتیاط سے رکھ دیا اور پھر سونے کے لیے لیٹ گیا۔

☆☆☆

پیٹس شولینڈر بہت خوش تھا۔ جو ہونا تھا وہ اس کے سامنے ہونے جا رہا تھا۔ اس کے خیال میں نہ تو پاپا کو اور نہ ہی اینگس کو اس کے ارادے کا علم تھا۔ وہ اچانک وہاں آ کر ان دونوں کو سرپرائز دے سکتا تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اینگس کا قصہ اس کے سامنے تمام ہوتا اور وہ اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا۔ تقریب کا آغاز شام چھ بجے ہونا تھا۔ اس لیے پیٹس ساڑھے چھ بجے اپنے گھر سے روانہ ہوا۔ حسبِ معمول اس کے ساتھ اس کے محافظوں کا پورا ٹولا تھا۔ اس کے ساتھ دو ایک جیسی گاڑیاں تھیں۔ ان میں سے ایک میں وہ ہوتا اور دوسری میں اس کے محافظ ہوتے تھے۔ کسی کو پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کس گاڑی میں ہے۔

تقریب پروموٹر کے گھر کے لان میں ہو رہی تھی اور اس کا گھر ساحل کے پاس ایک بہت بڑے قطعے پر تھا۔ گاڑیاں اندر جا کر مہمان کو چھوڑ کر واپس باہر چلی جاتیں۔ پیٹس کی گاڑی نے اسے لان کے سامنے اتارا اور باہر چلی گئی۔ اس کی نظر سب سے پہلے ایک طرف کھڑے پاپا پر گئی۔ اسے دیکھ کر پیٹس مسکرا دیا۔ پھر وہ اپنے میزبان پروموٹر کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ اس سے علیک سلیک کر رہا تھا تو اسی وقت اینگس کی کار آ کر وہاں رکی اور اس سے اتر کر اینگس لان میں آ گیا۔ پروموٹر اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھ گیا۔ پیٹس اسے دیکھتے ہی ہالی ووڈ کی اداکاراؤں کے ایک جھرمٹ کی طرف بڑھ گیا۔ دل کش حسینائیں شروع سے اس کی کمزوری تھیں۔

اینگس نے پیٹس کو دیکھا اور دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اس کے لیے پاپا کو ہائر کر سکتا ہے تو دنیا میں پاپا جیسے پیشہ ور قاتلوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ پروموٹر سے بات کرنے کے دوران میں اس کی نظریں میلسی کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ وہ اسی نوخیز تتلی صفت فنکارہ کے لیے یہاں آیا تھا۔ جب وہ اسے نظر نہیں آئی تو اس نے پروموٹر سے پوچھا۔ "میلسی کہاں ہے؟"

پروموٹر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ وہ جانتا تھا کہ اینگس اس نئی اداکارہ کے چکر میں ہے۔ "میلسی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے مجھے کال کر کے معذرت کر لی ہے۔ وہ آج نہیں آ سکے گی۔"

اینگس کا منہ بن گیا اور وہ بری طرح جھنجلا گیا۔ جس کی خاطر وہ سارے خطرات نظر انداز کر کے یہاں آیا تھا، وہی نہیں آئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ فوراً یہاں سے چلا جائے مگر پھر اس نے خود پر قابو پایا اور لان کی طرف بڑھ گیا۔ لان روشنیوں سے زیادہ ہالی ووڈ کے فلمی ستاروں سے جگمگا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اینگس اپنی جھنجلاہٹ میں خاصا افاقہ محسوس کرنے لگا۔ اسے کئی جان پہچان والی خواتین مل گئی تھیں اور وہ ان میں چہکنے لگا۔ اس دوران میں اس نے کئی بار پیٹس کو دیکھا اور ہر بار اسے اپنی طرف متوجہ پایا۔ کچھ دیر بعد اینگس کو

www.pkdigest.com

الجھن ہونے لگی۔ آخر پینس اس کی طرف ہی کیوں نگران تھا؟ پھر وہ اسے جس طرح دیکھ رہا تھا، یہ انداز بھی اجنبی تھا جیسے اس کے ساتھ کچھ ہونے والا ہو اور پینس چاہتا ہو کہ وہ یہ منظر اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھے۔

اچانک اسے خطرے کا احساس ہوا۔ اسے یہ احساس اس خیال سے ہوا تھا کہ کہیں پاپا اسی تقریب میں اسے نشانہ تو نہیں بنائے گا... لیکن یہ کیسے ممکن تھا؟ اس نے سہم کر چاروں طرف دیکھا۔ پاپا یہاں کیسے آسکتا تھا؟ پھر اسے خیال آیا کہ پاپا کوئی عام پیشہ ور قاتل نہیں بلکہ ایک نہایت چالاک شخص ہے اور وہ یہاں تک رسائی حاصل کرسکتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے اب یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن اسے موت کے اندھے تیر سے خوف آتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ وہاں بے شمار لوگ تھے۔ کئی سیکیورٹی اہلکار بھی تھے۔ اسے ذرا حوصلہ ہوا کہ اتنے مجمعے میں کون اس پر حملہ کرے گا۔ ظاہر ہے پاپا اندھا دھند قتل تو نہیں کرتا، وہ اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتا ہے اس لیے وہ کم سے کم اتنے لوگوں کے درمیان اسے قتل نہیں کرسکتا تھا۔

☆☆☆

پینس مستقل ہنکس کی طرف نگران تھا۔ کبھی کبھی اسے اپنی حماقت کا احساس ہوتا تو وہ ٹھٹکا اور دیکھنے لگتا لیکن کچھ دیر بعد وہ لاشعوری طور پر پھر ہنکس کی طرف دیکھنے لگتا۔ اس کے ذہن میں یہ خوف تھا کہ وہ ہنکس کے مارے جانے کا منظر مس نہ کردے۔ ہنکس جب آیا تو بڑا خوش تھا لیکن کچھ دیر بعد وہ جھنجلایا ہوا نظر آنے لگا۔ پینس کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا موڈ کیوں بدل گیا ہے۔ کیا اس کی وجہ سے ہنکس جھنجلا گیا تھا؟ کیونکہ اس نے کئی بار پینس کی طرف دیکھا تھا اور اسے اپنی طرف نگران بھی دیکھ لیا تھا۔ یہ اچھی بات نہیں تھی۔

پینس نے دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہا۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟ اسے اپنے اعصاب پر ذرا قابو نہیں جو وہ ہنکس کو یوں براہِ راست دیکھ رہا ہے۔ وہ ہنکس سے نظریں چرانے لگا۔ ایک بار اس نے ہنکس کو دیکھا تو وہ اسے خوف زدہ نظر آیا۔ وہ یوں چاروں طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے خطرہ ہو کہ کوئی ابھی کہیں سے آکر اس پر حملہ کردے گا۔ پینس نے سوچا کہ شاید اس کی چھٹی حس نے اسے خطرے کا احساس دلایا ہے یا وہ اس کے بار بار دیکھنے سے چوکنا ہو گیا تھا۔

ہنکس کا ردِعمل دیکھ کر اسے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ وہ وہاں سے چلا نہ جائے۔ پینس یہ سوچ کر بے چین ہو گیا۔ ایک بار اس کے دل میں آئی کہ وہ آگے بڑھ کر ہنکس کو باتوں میں لگا کر اسے روک لے مگر اس نے بروقت خود کو اس حماقت سے روک لیا۔ اس نے خود کو ڈانٹا کہ یہ حماقت کہیں وہ پاپا کا کام بھی نہ بگاڑ دے۔ یہ سوچ کر پینس ... خاموشی سے فاصلے پر چلا گیا۔ اب وہ پاپا کو ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ لیکن پاپا اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ پاپا کے ذہن میں کیا ہے لیکن وہ یقیناً اسی کام کے لیے یہاں آیا تھا جو پینس نے اسے سونپا تھا۔

☆☆☆

پاپا اس وقت ایک نسبتاً تاریک گوشے میں کھڑا ہوا ڈرائی جن اور مرغی کی بھنی یخنی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے اپنا کام کرنے کی کوئی جلدی نہیں تھی کیونکہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مہمان کس طرح آرہے ہیں۔ ان کی گاڑیاں انہیں چھوڑ کے رہائش گاہ کے باہر پارکنگ کی طرف جارہی تھیں اور اگر کسی کو واپس جانا تھا تو پہلے اسے اپنی گاڑی منگوانی پڑتی تھی۔ اس کے لیے اسے سیکیورٹی آفیسر کو کہنا پڑتا اور وہ تمام چیکنگ کے بعد گاڑی کو اندر آنے کی اجازت دیتا اور اس کام میں دس پندرہ منٹ سے کم وقت نہیں لگتا۔ اس لیے ہنکس کے اچانک رخصت ہو جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھر پاپا نے پینس اور ہنکس کی کچھ حرکتیں بھی دیکھیں۔ پینس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے ہنکس پر ہونے والے حملے کا علم ہے اور وہ اسے پہچان بھی گیا ہے۔ کیونکہ وہ بار بار متوقع نظروں سے پاپا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے پاپا ابھی پستول نکال کر ہنکس کو شوٹ کردے گا یا اسے خنجر گھونپ دے گا۔ پاپا کو اس کے انداز پر ہنسی آنے لگی۔ اس تقریب میں ایسی حرکت تو کوئی تھرڈ کلاس قاتل بھی نہ کرے اور پینس اس سے یہ توقع کر رہا تھا۔ اسے غصہ تو آیا لیکن اس معاملے میں وہ کسی درندے کی طرح تھا جس کا غصہ اس کی جبلت پر حاوی نہ ہوتا... وہ اس بات کا قائل تھا کہ اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو اور کبھی غصے میں کوئی کام نہ کرو، یہی وجہ تھی جب اسے غصہ آتا تو وہ پرسکون ہو جاتا۔

وہ خاموشی سے پیتا رہا اور ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ مہمانوں کی آمد جاری تھی اور تقریب رفتہ رفتہ جوبن پر آتی جا رہی تھی۔ پاپا نے سکون کا سانس لیا کیونکہ پروموٹر نے اسے کچھ لوگوں سے متعارف کرانے کے بعد اس کی جان چھوڑ دی تھی اور اب مہمانوں کو ریسیو کر رہا تھا۔ پاپا خود بھی دوسروں سے جان چھڑا کر ایک گوشے میں آگیا۔ اس نے ایک نفیس سا ہوانا سگار سلگالیا جس کی مہک آس پاس پھیل رہی تھی۔ قہقہے گونج رہے تھے اور جام چھلک رہے تھے۔ دوسروں کو یہ منظر

اچھا لگتا ہوگا لیکن پاپا بیزار تھا، وہ سکون والی جگہ خوش رہتا تھا۔ شور شرابا اسے پسند نہیں تھا۔ ایسی کسی جگہ وہ صرف اس صورت میں آسکتا تھا جب اسے کسی کو قتل کرنا ہو۔

☆☆☆

پینس کو اب جھنجلاہٹ ہونے لگی تھی۔ اس نے اس وقت سکون کا سانس لیا جب ہنکس تقریب میں شامل لوگوں کے درمیان پہنچ گیا۔ یعنی اب اس کا جانے کا فوری طور پر کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اسے توقع تھی کہ پاپا کوئی ایکشن لے گا۔ پاپا بالآخر اسے ایک کونے میں نظر آ گیا جہاں وہ پورے انہماک کے ساتھ جام اور بھنی ہوئی یخنی سے انصاف کر رہا تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا جیسے وہ اسی کام کے لیے یہاں آیا ہو۔ پینس کو شبہ ہوا کہ یہی پاپا ہے جسے اس نے ہائر کیا تھا؟ کیا کوئی قاتل اپنا کام کرنے سے پہلے اتنا پرسکون ہو سکتا ہے؟

'یہ کم بخت اپنا کام کیوں نہیں کرتا ہے۔' اس نے سوچا اور ایک بار پھر اس نے احمقانہ انداز میں خیال آرائی کی کہ وہ جا کر پاپا سے کہے، وہ اپنا کام کیوں نہیں کرتا۔ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے سوچا اور اپنا ذہن کہیں اور لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ مگر اب وہ آچکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ پاپا کا کام دیکھے بغیر یہاں سے نہیں جائے گا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے ایک بار پھر سکون سے یخنی چباتے پاپا کی طرف دیکھا۔ اسے دوبارہ غصے آنے لگا۔ یہ کم بخت آخر کچھ کرتا کیوں نہیں ہے؟ اس نے مجھ سے پچیس ملین ڈالرز کس بات کے لیے ہیں؟

''ارے پینس۔'' کسی نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، ایک پرانی اداکارہ اس کی طرف لپکتی ہوئی آرہی تھی جسے اب فلم اور ٹی وی والے نہیں پوچھتے تھے۔ وہ آتے ہی اس سے لپٹنے کے انداز میں گلے ملی۔ ایک زمانہ تھا کہ پینس اس کی خوش رنگ قربت سے محظوظ ہوا کرتا تھا لیکن اب وہ اس سے لپٹی تو پینس کو اس سے گھن آنے لگی۔ وہ پچپن کیس برس کی ایک ایسی عورت تھی جس نے اپنی جوانی کو مالِ مفت کی طرح لٹایا تھا۔ پینس نے دانت پیس کر مسکراتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا۔

''کیسی ہو تم؟''

''ٹھیک ہوں لیکن تم نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔'' اداکارہ نے شکوہ کیا۔ پینس نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ اس سے چمٹ گئی۔ بڑی مشکل سے پینس باتھ روم کے بہانے اس سے پیچھا چھڑا کر نکلا۔ اس دوران میں وہ ا...

اور پاپا کو بھی بھول گیا تھا۔ اداکارہ کو دکھانے کے لیے اسے باتھ روم جانا پڑا۔ وہاں سے آیا تو پاپا کو اسی گوشے میں اسی شغل میں مصروف پا کر اس کا غصے سے بُرا حال ہو گیا۔ البتہ ہنکس کو ایک طرف چند معروف پروڈیوسرز کے ساتھ پا کر اسے تسلی ہوئی۔ اس نے ہنکس کے پاس ہی ایک صوفے پر نشست جمائی اور اسکاچ وسکی سے شغل کرنے لگا۔ دو تین افراد نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن پھر اس کا موڈ دیکھ کر دور ہو گئے۔

''ہیلو۔'' کسی نے پاس سے کہا تو وہ چونک گیا۔

☆☆☆

ہنکس اب پینس کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسے ایک پرانی

آخری خواہش

ڈاکٹر۔ ''نرس کیا تم نے مریضہ کی ناک کے سامنے آئینہ رکھ کر دیکھا تھا کہ اس کی سانس چل رہی ہے یا نہیں؟''

نرس۔ ''جی جناب! جب میں نے ایسا کیا تو مریضہ نے آنکھ کھولی اور آخری ہچکی لیتے ہوئے کہا۔ ''میری ناک پر تھوڑا سا پاؤڈر لگا دو۔''

موسیقی

پہلا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ موسیقی سے پانی کھول اٹھتا ہے؟''

دوسرا۔ ''سچ ہی ہوگا، خون کھولتا ہوا تو ہم نے بھی محسوس کیا ہے۔''

نعمت

ایک شخص۔ ''شادی کے ابتدائی دنوں میں میری بیوی کو گانے کا بہت شوق تھا لیکن بچے کی آمد کے بعد یہ شوق ختم ہو گیا ہے۔''

دوسرا شخص۔ ''سبحان اللہ! واہ، بچے بھی کیا نعمت ہیں۔''

مستقبل

ظفر۔ ''اس گلوب میں، میں تمہارا مستقبل دیکھ سکتا ہوں۔''

اظہر۔ ''لیکن یہ گلوب تو بالکل سادہ ہے۔''

ظفر۔ ''ہاں! ایسا ہی تمہارا مستقبل بھی ہے۔''

مرسلہ: صدف کرن..... ملتان

www.pkdigest.com

اداکارہ چٹ گئی تھی۔ کسی زمانے میں اینگس کے بھی اس سے تعلقات رہے تھے لیکن اب وہ اسے منہ نہیں لگاتا تھا اس لیے وہ بھی اس سے دور رہا کرتی تھی لیکن چیٹس سے اس کے تعلقات اچھے تھے، کم سے کم اینگس کو تو یہی لگا تھا کہ چیٹس اس سے اب تک مروت نبھا رہا تھا۔ وہ اس سے پیچھا چھڑا کر واش روم کی طرف چلا گیا تھا۔ اینگس دل ہی دل میں جلتے ہوئے کچھ لوگوں سے ملنے لگا، ان میں سے کچھ چاہتے تھے کہ وہ ان کی اگلی فلم میں فنانسر بن جائے۔ جبکہ اینگس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ انہیں ٹالتا ہوا چیٹس کو تلاش کرنے لگا۔ وہ اسے ایک صوفے پر بیٹھا نظر آ گیا۔ اینگس نے سوچا کہ وہ بھی اسے ذرا چھیڑے۔ وہ اس کے پاس پہنچا۔

''ہیلو۔''

چیٹس چونکا اور اسے دیکھ کر چیٹس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی، اس نے جام والا ہاتھ لہرایا۔ ''کیا حال ہیں مسٹر اینگس؟''

اینگس نے قریب سے گزرتے ایک ویٹر سے جام لیا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''ابھی تک تو ٹھیک ہوں... تم سناؤ؟''

''ٹھیک ہوں۔'' چیٹس نے اس کے الفاظ اور لہجے پر غور کیا۔ ''شاید تم کچھ پریشان ہو؟''

''میں تو نہیں البتہ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔'' اینگس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''نہیں، میں بھلا کس بات سے پریشان ہوں گا۔'' چیٹس بے پروائی سے بولا۔ ''البتہ میں نے سنا ہے کہ تم نے گھر سے نکلنا بند کر دیا ہے اور اندر بند ہو کر بیٹھ گئے ہو۔ لان پر بھی نہیں نکلتے۔''

''تم نے غلط سنا ہے۔'' اینگس بھنا کر بولا۔ وہ سمجھ گیا کہ چیٹس کی انٹیلی جنس اسے باخبر رکھے ہوئے ہے اور اس کی انٹیلی جنس بھی کام کر رہی تھی ورنہ وہ بے خبری میں مارا جاتا۔ اب اس نے تمام ممکنہ حفاظتی اقدامات کر لیے تھے۔ اس نے چبھتے لہجے میں کہا۔ ''تم اس تقریب میں کیسے آ گئے، تمہارا تو ارادہ نہیں تھا؟''

''تم نے کس سے سنا ہے؟''

''اسی سے جس نے تمہیں بتایا ہے کہ میں گھر میں محصور ہو گیا ہوں۔''

اس وقت ان کے پاس کوئی نہیں تھا اس لیے وہ ذرا کھل کر بات کر رہے تھے۔ ان کے دل کی کدورت ان کے چہروں اور لہجے سے جھلک رہی تھی۔ چیٹس کا خیال تھا کہ یہ آخری موقع ہے کہ وہ اینگس کو کچھ کہہ سکتا ہے اس کے بعد وہ رہے گا ہی نہیں۔ ☆☆☆

پاپا کلیجی کھاتے کھاتے اور جن سے شغل کرتے ہوئے بور ہو چکا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے مسلسل چیٹس اور اینگس کی نگرانی کر رہا تھا۔ آخر وہ اسے ایک جگہ بیٹھے نظر آ گئے اور پاپا نے خالی جام ایک طرف اچھال دیا۔ اس کے حرکت میں آنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے ایک تازہ سگار نکالا اور اسے ہونٹوں میں دبائے چیٹس اور اینگس کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں صوفے پر آس پاس بیٹھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں ڈرنک کے گلاس تھے۔ ان کے پاس پہنچ کے پاپا نے لائٹر نکالا اور اس کا رخ ایک خاص زاویے پر رکھا۔ اس کے بعد وہ لائٹر کا آگ جلانے والا بٹن دبا کے اپنا سگار سلگانے لگا۔ جب تک سگار پوری طرح سلگ نہیں گیا اس نے بٹن دبائے رکھا اور جب تک چیٹس یا اینگس اس کی طرف متوجہ ہوتے، وہ لائٹر جیب میں رکھ چکا تھا۔ چیٹس اسے دیکھ کر چونکا۔ پاپا مسکرایا اور خالص فرانسیسی لہجے میں بولا۔ ''آہا... آج موسم کتنا شاندار ہے۔''

چیٹس ابھی تک اس کی نگرانی کر رہا تھا لیکن جب پاپا یوں اچانک سامنے آیا تو نہ جانے کیوں وہ گڑبڑا گیا۔ اس کے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اینگس چیٹس کا ردعمل دیکھ کر پریشان ہوا۔ پھر پاپا کے فرانسیسی لہجے نے بھی اسے چونکایا تھا۔ پاپا ایک دم اسے یاد آیا کہ پاپا کوئی چیٹ ورنہ فرانسیسی شخص ہے۔ پاپا ان کے ردعمل پر ایک بار پھر شائستہ انداز میں مسکرایا۔

''معاف کیجیے گا میں شاید مخل ہوا ہوں۔ میں ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔'' وہ ذرا سا جھکا اور پھر وہاں سے چل دیا۔

اینگس نے پاپا کے جانے کے بعد مشکوک نظروں سے چیٹس کی طرف دیکھا۔ ''یہ شخص کون ہے؟''

''مجھے کیا معلوم؟'' چیٹس گڑبڑا کر بولا۔

''پھر تم اسے دیکھ کر چونکے کیوں تھے؟''

چیٹس کا ذہن اس بات میں الجھا ہوا تھا کہ پاپا اس طرح ان کے پاس کیوں آیا اور اس نے انہیں متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے وہ اینگس کی بات نہیں سن سکا تھا۔ وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اینگس نے پوچھا۔

چیٹس نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ''ضروری نہیں ہے کہ میں ہر بات تمہیں بتاؤں۔''

یہ کہہ کر وہ پروموٹر کی طرف چل دیا۔ وہ ایک نئی ہیروئن کو لطیفے سنا رہا تھا۔ چیٹس نے پروموٹر کا بازو پکڑا اور ہیروئن سے معذرت کیے بغیر اسے لے گیا۔ وہ پروموٹر کو ایک طرف لے آیا اور اس نے پاپا کی طرف اشارہ کیا جو پھر سے جن اور

کلیجی کے شغل میں لگ گیا تھا۔

''یہ کون ہے؟'' چیٹس نے پروموٹر سے پوچھا۔

''ایک فرنچ آرٹ مووی ڈائریکٹر۔'' پروموٹر اس کے سوال پر حیران ہوا۔

''تمہیں یقین ہے؟''

''ہاں سو فیصد، میں اس کی موویز کے بعض حصے دیکھ چکا ہوں۔''

چیٹس نے بے یقینی سے پاپا کی طرف دیکھا اور سوچا۔ اگر پروموٹر کی بات درست ہے تو اس کے آدمیوں سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اگر یہ پاپا نہیں ہے تو پاپا کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ جب کچھ دیر بعد اس نے پاپا کو دیکھنا چاہا تو وہ اسے نظر نہیں آیا۔ چیٹس نے دیوانوں کی طرح اسے پوری تقریب میں دیکھ ڈالا، وہ کہیں نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے اپنا موبائل فون نکالا اور اپنے اس آدمی سے رابطہ کیا جو پاپا کی نگرانی کر رہا تھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''تقریب سے نکل کر کہیں جا رہا ہے جناب۔'' چیٹس کے آدمی نے جواب دیا۔

''اس کا پوری ہوشیاری سے تعاقب کرو، اگر یہ تمہاری نظروں سے اوجھل ہوا تو تمہاری خیر نہیں ہو گی۔''

''آپ بے فکر رہیں جناب۔'' اس کے آدمی نے کہا۔

چیٹس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اگر وہ پاپا تھا تو اس کا شکار تو زندہ و سلامت اس کے سامنے حسین خواتین سے گپ شپ کر رہا تھا۔ اگر وہ پاپا نہیں تھا تو اس طرح اچانک نکل کر کیوں چلا گیا؟ پھر اسے یاد آیا، کمپیوٹر نے بھی تصدیق کی تھی کہ یہی شخص پاپا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ پاپا کیا کھیل، کھیل رہا ہے۔ کوئی بیس منٹ بعد اس کے آدمی نے اسے کال کی۔

''جناب! یہ شخص ایک پرائیویٹ ائرپورٹ پر آیا ہے اور ابھی اندر گیا ہے۔''

''تم بھی اندر جاؤ۔'' چیٹس آس پاس موجود لوگوں کا خیال کیے بغیر غرایا۔ اس کا آدمی اسے لمحے لمحے کی رپورٹ دیتا اندر جانے لگا۔ اس نے بتایا کہ پاپا نے اندر اپنا پاسپورٹ چیک کرایا ہے اور چھوٹے جیٹ طیاروں کے لیے مخصوص ہینگر کی طرف جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک جیٹ طیارے میں سوار ہوتا نظر آیا جس کے انجن پہلے ہی اسٹارٹ تھے اور اس کے اندر جاتے ہی جیٹ کا دروازہ بند ہوا اور اس نے رن وے پر ٹیکسی شروع کر دی۔ چیٹس کے اندر ایک خوف سا ابھرنے لگا۔ اس شخص کے اس طرح جانے کے بعد کوئی شک باقی نہیں رہا تھا کہ

www.pkdigest.com

پاگل پن

ایک مالدار وکیل کے سینے پر جب ایک ڈاکو نے پستول کی نال رکھی تو وکیل نے اسے پہچانتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا کرتے ہو، شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں وہی وکیل ہوں جس نے عدالت میں تمہیں پاگل ثابت کر کے پھانسی کے پھندے سے بچایا تھا۔'' ڈاکو ہنس کر بولا۔ ''اور کیا اپنے محسن کو لوٹنا اور اسے قتل کرنا پاگل پن نہیں ہے؟''

ضرورت رشتہ

جم نے لندن کے ایک روزنامے میں مختصر سا اشتہار دیا جس کا عنوان تھا۔ ''ایک بیوی کی ضرورت ہے''۔

اگلے تین دن میں اسے چار سو سے زائد خطوط موصول ہوئے۔ سب میں ایک ہی التجا تھی کہ جم ہمیشہ کے لیے اور بلا معاوضہ ان کی بیوی لے لے۔

وہی پاپا تھا لیکن وہ اس طرح کیوں چلا گیا تھا؟ کیا اسے شک تھا کہ چیٹس اس کی جاسوسی کر رہا ہے؟ مارے خوف کے اس کے پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگیں۔ اسے شرائط یاد تھیں جن کے مطابق وہ پاپا کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ پاپا اپنی شخصیت سے پردہ اٹھانے کو بالکل پسند نہیں کرتا ہے۔ ایسا کرنے والے کو وہ بلا معاوضہ قتل کر دیتا ہے۔

☆☆☆

پاپا جس جیٹ طیارے میں بیٹھا تھا، وہ اس کا ذاتی طیارہ تھا اور جب وہ اپنا کام مکمل کر لیتا تھا تو اس میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو جاتا تھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ وہ اس طرح جائے گا اور اسی وجہ سے اس کی نگرانی کرنے والے عام طور سے اس کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔ اسے یقین تھا اس بار بھی ایسا ہی ہوا ہو گا۔ اس کے آدمی اس کے سگنل کے منتظر تھے۔ پرواز کی اجازت پہلے ہی حاصل کی جا چکی تھی اور جیسے ہی وہ طیارے میں سوار ہوا، وہ حرکت میں آ گیا اور جب تک اس نے سیٹ بیلٹ باندھی، طیارہ رن وے پر آ چکا تھا۔ اس سپرسانک جیٹ نے اسے دو گھنٹے میں میامی پہنچا دیا۔ وہاں طیارے نے لینڈ کیا اور مزید ایندھن لیا اور اس کے بعد پھر مزید پرواز کی۔ سمندر پر آنے کے بعد پاپا نے اپنی سیٹ بیلٹ کھول دی اور آرام سے پھیل کر بیٹھ گیا۔ اس طیارے میں دو پائلٹس کے علاوہ ایک ائرہوسٹس بھی تھی لیکن وہ پاپا کے طلب کرنے پر ہی آتی تھی۔ پاپا نے جیب سے لائٹر نکالا اور اسے اسی مخصوص آلے سے چیک کیا۔ اس بار بھی پہلی

روشنی جلی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ محفوظ ہے۔ اس نے اپنا کام بھی کر دیا تھا۔ پاپا جانتا تھا کہ اسے دوبارہ استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ لیکن یہ اس کی کامیابی کے ایک نشان کے طور اس کے سیف روم کا ایک حصہ ضرور بنے گا۔ پاپا نے اس بار اسے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیا کیونکہ وہ خطرناک چیز تھی اور اسے مستقل اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہیں تھا۔

☆☆☆

پیٹس کا غصے سے بُرا حال تھا۔ اینکس نہ صرف اس تقریب سے زندہ سلامت رخصت ہوا تھا بلکہ اس سے اگلے دن بھی زندہ رہا تھا۔ پیٹس مسلسل پاپا کو اس کے ای میل پر میلز کر رہا تھا اور اسے گالیاں دیتے ہوئے اس سے اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کر رہا تھا لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ پیٹس جانتا تھا کہ وہ فرانس میں کہاں رہتا ہے لیکن وہ اس کے خلاف کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔

تیسرے دن غم و غصے سے اس کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی کہ اس کے سیٹلائٹ فون پر پاپا کی کال آئی۔ وہ پاپا کی آواز سنتے ہی اس پر ابل پڑا۔ وہ اسے سناتا رہا اور پھر اس نے مطالبہ کیا۔ ”میری رقم واپس کرو دھوکے باز شخص۔“

”میں نے کام کر دیا ہے اس لیے تم رقم کی واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔“ پاپا نے سکون سے کہا۔ وہ ذرا بھی مشتعل نہیں ہوا تھا۔

اس پر پیٹس نے اسے مزید سنائیں۔ ”تم جھوٹے بھی ہو، اینکس ابھی زندہ ہے۔“

”وہ زندہ ہے لیکن صرف پندرہ سے بیس دن کے لیے... اس کے بعد اسے دنیا کی کوئی طاقت موت سے نہیں بچا سکتی۔“

پیٹس چونکا۔ ”وہ کیسے؟“

”اسے چھوڑو اور اینکس کو بھول جاؤ۔ اس کا نام زندوں کی فہرست سے خارج ہو چکا ہے، تم اپنی فکر کرو۔“ پاپا کا لہجہ سرد ہو گیا۔

پیٹس چونکا۔ ”کیا مطلب... میں اپنی فکر کروں؟“

”کیا تم اپنی طبیعت میں کچھ گرانی محسوس نہیں کر رہے ہو؟“

پیٹس اس بار زیادہ چونکا لیکن اس نے جھوٹ بولا۔ ”نہیں، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔“

پاپا ہنسا۔ ”تم جھوٹے ہو۔ جس شخص کے جسم میں سوڈیم این بی فائیو کی ایک ملی گرام مقدار چلی جائے، تیسرے دن اس کی طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔“

پیٹس دہشت زدہ ہو گیا۔ ”یہ کیا ہوتا ہے؟“

”ہائی ریڈیو ایکٹو کمپاؤنڈ۔“ پاپا نے بتایا۔ ”یعنی انتہائی حد تک تاب کار مادہ... یہ بہت باریک سفوف کی صورت میں ہوتا ہے اور اسے کسی ڈرنک یا پانی میں ڈال دیا جائے تو اس کا پتا بھی نہیں چلتا...... کیونکہ اس سے رنگ، بو اور ذائقہ کچھ نہیں بدلتا...... البتہ یہ جس کے جسم میں جاتا ہے وہ پندرہ سے بیس دن میں مر جاتا ہے۔“

پیٹس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ ”تم نے مجھے یہ تاب کار سوڈیم دیا ہے مگر کیوں اور کیسے؟“

”جب میں نے تمہارے دشمن کی ڈرنک میں یہ شامل کیا تھا تو ساتھ ہی یہ تمہاری ڈرنک میں بھی شامل ہو گیا تھا۔“

پیٹس کو وہ وقت یاد آ گیا جب وہ اور اینکس ساتھ ساتھ بیٹھے تھے اور پاپا ان کے پاس آیا تھا۔ اس کے حلق سے کراہ نکل گئی.... وہ جان گیا کہ پاپا سچ کہہ رہا ہے اب اس کی زندگی بھی اتنی ہی تھی جتنی اس کے دشمن کی۔ وہ دونوں ساتھ ہی مرتے۔

”لیکن کیوں؟“

پاپا نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ”میں دو افراد کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ ایک وہ جس کا مجھے کنٹریکٹ ملا ہو اور دوسرا وہ جو مجھے دھوکا دے کر میرا راز جان جائے۔ تم میرے بارے میں جان گئے ہو اس لیے موت تمہارا مقدر بنی ہے۔“

پیٹس چیخ کر بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو تم بچ جاؤ گے؟“

”پیٹس تم نے مجھے ایک بار دھوکا دیا اور اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب تم نے میرے بارے میں ایک لفظ بھی کسی سے کہا تو مجھے معلوم ہے تمہاری ایک بہت پیاری سی بیٹی ان دنوں یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔ اس صورت میں وہ جلد تم سے آملے گی۔“

پیٹس کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں، میں تمہارے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”گڈ، اسی میں تمہاری بہتری ہے اور ہاں اگر تم اس کال کو ٹیپ کر رہے ہو تو شوق سے اسے اپنے پاس رکھنا، یہ میری اصل آواز نہیں ہے بلکہ ایک مشین میری آواز میں بول رہی ہے، گڈ بائے مسٹر پیٹس!“

پاپا نے فون بند کر دیا۔ اس وقت وہ جزیرہ کیپری کے ساحل پر واقع ایک ہوٹل کے سیٹلائٹ فون کے ذریعے کال کر رہا تھا۔ اگرچہ اسے امید تھی کہ بیٹی کی دھمکی سن کر پیٹس اس کا راز افشا کرنے سے گریز کرے گا لیکن پھر بھی احتیاطاً وہ پیرس سے نکل گیا۔ اب وہ دو ہفتے اس خوب صورت جزیرے میں گزار سکتا تھا۔ اس کے بعد اسے مزید احتیاط کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مذاق

سلیم انور

محبت کبھی کبھی ایسی تکلیف کا باعث بن جاتی ہے ... جو روح کو جھنجوڑ کر رکھ دے ..... ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا جو جذبۂ محبت سے سرشار تھا

قاتل اداؤں کی مالک ایک پیکرِ جمال کی کارفرمائیاں

”جمال! کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟“ اندھیرے کے باوجود میں دیکھ رہا تھا کہ سونیا کی براؤن آنکھیں نہایت توجہ سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ میرے تاثرات کو پرکھنا چاہ رہی تھی۔

میں نے اپنی نظریں پارک کی تراشیدہ گھاس پر جما دیں۔ سونیا کا سر میرے زانو پر تھا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟“

”تمہیں مجھ سے محبت ہے۔“ سونیا نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم یہ بات یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہو؟“

”بس میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ سونیا کے یہ سوالات مجھے بے چین کر رہے تھے۔ میں کوئی شاعر قسم کا بندہ نہیں تھا کہ اس کی محبت میں قصیدے پڑھنا شروع کر دیتا۔ مجھے لفاظی بالکل نہیں آتی تھی۔

”کیا تم میرے لیے جان دو گے؟“

”ہاں، یقینی طور پر۔“

یہ سن کر سونیا مسکرا دی لیکن پھر اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس نے بیزاری سے کہا۔ ”تم ایک پولیس افسر ہو۔ تم تو کسی انجان شخص کے لیے بھی جان دے سکتے ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ فرائض کی ادائیگی میں ایسا ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر ان سب کے مقابلے میں، میں منفرد کیونکر ہوئی؟ مجھ میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“

''بس ہے۔'' میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پیار سے کہا۔ ساتھ ہی مجھے اپنے پولیس ڈپارٹمنٹ کی دیوار پر لگا ہوا پوسٹر یاد آ گیا جس پر لکھا تھا۔ ''کوئی اعتراف مت کرو... ہر بات سے انکار کرو... جوابی الزام عائد کرو۔'' میں نے بھی جوابی چال چلتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ تم کس طرح کہہ سکتی ہو کہ تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟''

یہ سن کر سونیا نے میرے زانو پر سے سر اٹھاتے ہوئے کروٹ بدلی اور گھاس پر چت لیٹ کر آسمان پر ستاروں کو تکنے لگی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

بنا سوچے سمجھے میری زبان سے یہ طنزیہ جملہ نکل گیا۔ ''یہ اتنا آسان نہیں ہے... ہے نا؟''

سونیا نے اپنی نگاہیں میرے چہرے پر جما دیں۔ چاندنی میں اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ وہ نرم لہجے میں بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں کیونکہ یہ میرے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک جھٹکے سے اپنی سیاہ زلفوں کو شانوں پر سے پیچھے ہٹا دیا۔ اس کے سینے کا زیر و بم اس کی جذباتی کیفیت کا مظہر تھا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھ دیا۔ ''عین یہاں... ہر مرتبہ جب بھی میں تم سے جدا ہوتی ہوں... ہر مرتبہ جب بھی میں تمہیں الوداع کہتی ہوں... اور جب بھی میں اپنے ڈیڈی کو دیکھتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ وہ تمہیں کبھی بھی قبول نہیں کریں گے۔ یہ وہ حقیقتیں ہیں کہ جن کی بنا پر کہا جا سکتا ہے مجھے تم سے محبت ہے... اس لیے کہ یہ میرے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میرے دل میں کسک سی اٹھتی ہے۔''

اس کی بات سن کر میں یک دم ہی شرمندہ ہو گیا۔ ''سنو، جانم... میں... میں معافی چاہتا ہوں۔ دیکھو میرا یہ مطلب...''

سونیا نے ہاتھ بڑھا کر اپنی شہادت کی انگلی میرے ہونٹوں پر رکھ دی۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ دیکھو تم نے صحیح تو کہا ہے۔ میں کسی بھی انجان شخص کے لیے جان دے سکتا ہوں۔ یہ کوئی خاص بات تو نہ ہوئی لیکن میں تمہارے لیے ایک کام کر سکتا ہوں۔ وہ کام جو میں کسی اور کے لیے کبھی نہیں کروں گا۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

یہ سن کر سونیا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا؟'' اس کے لہجے سے تجسس عیاں تھا۔

''میں تمہاری خاطر قتل کر سکتا ہوں۔'' میں نے دھماکا کیا۔

یہ سن کر سونیا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ کچھ دیر تک آنکھیں پھاڑے میرے چہرے کو تکتی رہی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''ہاں۔'' میں نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا تم مذاق کر رہے ہو؟''

''نہیں۔ میں واقعی تمہارے لیے کسی کو بھی قتل کر سکتا ہوں۔'' میں نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

یہ سنتے ہی وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے گھاس پر پڑا ہوا اپنا سویٹر اٹھا کر پہنا اور بغیر کچھ کہے تیزی سے پارک کے گیٹ کی جانب چل پڑی۔

''سنو!'' میں نے آواز دی۔ ''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''ہمیں اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔'' سونیا نے پلٹ کر جواب دیا اور دوبارہ اس طرف بڑھ گئی جہاں ہماری کاریں پارک تھیں۔

میں نے گھاس پر بکھری ہوئی چیزیں سمیٹیں اور تیزی سے سونیا کی جانب لپکا اور اسے رکنے کے لیے آوازیں دینے لگا۔ اس سے قبل کہ میں پارکنگ لاٹ تک پہنچتا، سونیا کی کار کا انجن جاگ اٹھا۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔

لیکن میری عجلت کسی کام نہیں آئی۔ میں جب وہاں پہنچا تو سونیا کی سیاہ گاڑی رفتار پکڑ چکی تھی۔ میں اپنی پولیس پٹرول کار کی جانب پلٹ گیا۔ کار کی چابیوں کا گچھا نکالا اور اندھیرے میں دروازے کا کی ہول تلاش کرنے لگا۔ اس عجلت میں میری گن بیلٹ ہاتھ سے پھسل کر زمین پر گر گئی۔ ''لعنت ہو۔'' میں بڑبڑایا۔ بیلٹ اٹھانے کے لیے مجھے جھکنا پڑا۔ جب میں اٹھ کر سیدھا ہوا تو اچانک کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں نہا گیا۔ میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور میں اپنی جگہ جم سا گیا۔

وہ گاڑی مجھ سے کئی فٹ کے فاصلے پر آ کر رک گئی۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر روشنی کے حلقے سے سونیا نمودار ہوئی اور آ کر میرے سینے سے چمٹ گئی۔ وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ ''آئی ایم سوری!''

''تم اچانک اٹھ کر چلی کیوں گئی تھیں؟''

''بات یہ ہے کہ میں... میں... میں خود بھی قتل کا سوچ رہی تھی۔'' سونیا کی گرم سانسیں مجھے اپنی گردن پر محسوس ہو رہی تھیں۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

سونیا مجھ سے علیحدہ ہوئی اور ایک قدم پیچھے ہٹنے کے بعد اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

''سونیا!'' میں نے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا

اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے تم نے کیا کہا ہے؟''

''ہاں۔'' سونیا نے آہستہ سے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں کبھی بھی تمہاری نہیں ہو سکتی۔ میرے ڈیڈی تمہیں کبھی بھی قبول نہیں کریں گے۔ یہ بات مجھے اندر ہی اندر ہلاک کر رہی ہے۔''

''تمہارے ڈیڈی مجھ سے کبھی نہیں ملے پھر تم یہ بات یقین سے کیونکر کہہ سکتی ہو کہ وہ مجھے پسند نہیں کریں گے؟''

''بس میں جانتی ہوں۔''

''تمہاری عمر تئیس برس ہو چکی ہے۔ تم بالغ ہو۔ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں اسے بھاڑ میں ڈالو۔ تم وہاں سے چلی آؤ۔ ہم شادی کر کے علیحدہ رہ لیں گے۔ اگر وہ تمہیں کچھ دینا چاہیں...''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' سونیا نے میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔ پریشانی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''یقیناً آسان ہے۔ پھر تم میری ذمے داری ہو گی۔'' میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''کیا تم میری اس کار کی قسطیں بھر سکو گے؟ اور میرے کریڈٹ کارڈز کے بل؟ میرے کالج کی... ٹیوشن کی فیس؟''

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ''نہیں۔''

''میرے کالج کی تعلیم ختم ہونے میں ابھی تین سال باقی ہیں۔ جب میں گریجویشن کر لوں گی تو پھر مجھے اچھی ملازمت مل جائے گی۔ اس کے بعد ہی میں وہاں سے نکل سکوں گی اور ہم ساتھ رہ سکیں گے۔''

''اور اس وقت تک؟'' میں نے کہا۔

سونیا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''بہتر یہی ہو گا کہ ہم ایک دوسرے سے ملنا چھوڑ دیں۔''

میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ میرے سینے میں اچانک درد سا اٹھنے لگا اور پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ اب میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ سونیا کس درد کی بات کر رہی تھی۔ کس تکلیف کا اظہار کر رہی تھی... اور یہ کہ محبت کرنا تکلیف دہ کیوں ہوتا ہے... واقعی محبت ایک تکلیف دہ جذبہ ہے۔

میں نے جھنجلاہٹ میں اپنی کار کے فینڈر کو ٹھوکر رسید کر دی۔ ''لعنت ہو۔'' میں بڑبڑایا۔ ''اس کا کوئی نہ کوئی اور حل تو ہو گا۔''

''نہیں اور کوئی حل نہیں ہے۔''

میں نے گاڑی سے ٹیک لگا لی۔ میری پشت سونیا کی جانب تھی۔ میری آنکھوں سے ایک آنسو بہتا ہوا میرے غرور کو روندتا چلا گیا۔ میں سونیا سے نظریں ملاتے ہوئے کترا رہا تھا۔ ''اگر میں اس بارے میں تمہارے ڈیڈی سے بات کروں تو؟''

''نہیں، اگر انہیں پتا چل گیا کہ میرا کوئی بوائے فرینڈ ہے تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔'' سونیا نے تیزی سے کہا۔

میں دھیرے دھیرے اس کی جانب گھوم گیا۔ ''میرا خیال ہے تم نے بتایا تھا کہ وہ مجھے اس بنا پر پسند نہیں کریں گے کہ میرا تعلق پولیس سے ہے۔''

''ہاں۔''

''تب وہ تمہیں صرف اس بنا پر کیوں قتل کر دیں گے کہ تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے؟''

اس سوال پر سونیا نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔''

''مجھے آزما کر تو دیکھو۔''

''میں نہیں بتا سکتی۔ وہ واقعی مجھے قتل کر دیں گے اور کوئی بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ وہ بہت طاقتور اور اثر رسوخ والے ہیں۔''

''ٹھیک ہے... ان کا اپنا ذاتی کاروبار ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ یہ چیز انہیں قانون سے بالاتر تو نہیں کرتی۔''

''ان کا ملٹی بلین ڈالرز کا کاروبار ہے جو اس ملک میں

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

[illegible]

حکیم اینڈ سنٹر
* پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک تک پھیلا ہوا ہے۔ اور اس ملک میں یہ بات انہیں قانون سے بالاتر بنا دیتی ہے۔"

میں نے بے بسی سے اپنا چہرہ تھام لیا۔ "کیا تم چاہتی ہو کہ ہم اپنے تعلقات ترک کر دیں؟"

"ہاں... الا یہ کہ..."

"کیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

وہ چپ رہی۔

"بتاؤ۔" میں نے دوبارہ پوچھا۔ "تمہیں میری قسم!"

"میں نے کئی راتیں جاگ کر گزاری ہیں اور انہیں زہر دینے کا خواب دیکھا ہے۔" سونیا نے نہایت سکون سے کہا۔

"تمہاری مراد قتل سے ہے؟"

سونیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن وہ... وہ تمہارے ڈیڈی ہیں۔"

"نہیں، وہ میرے ڈیڈی نہیں ہیں۔" سونیا غصے سے پھٹ پڑی۔ "وہ ایک وحشی درندے ہیں۔" سونیا کی آنکھوں میں وحشت نمایاں تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو گئے پھر وہ زمین پر ڈھیر ہو گئی۔

میں اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کیا ہوا جانم... کیا بات ہے؟" اس کی حالت نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔

اس نے پلٹ کر اپنا چہرہ میرے مقابل کیا اور میری گردن کو دبوچتے ہوئے بولی۔ "وہ میرے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔"

میرے دل کی دھڑکن وہیں تھم گئی۔ میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون برف بن گیا۔ "کیا کہا؟ پھر سے کہنا۔"

سونیا کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ "وہ اس وقت سے مجھ پر زیادتی کر رہے ہیں جب میں چودہ برس کی تھی... ممی کے مرنے کے بعد سے۔"

"تم نے کسی کو بتایا کیوں نہیں؟"

"وہ مجھے مار ڈالتے۔" سونیا جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ "اور پھر کوئی بھی میری بات پر یقین نہیں کرتا۔"

"یقین کرتے... تم بتاتیں تو سہی!"

"نہیں... انہوں نے اس بارے میں پورا اطمینان کر لیا تھا۔ جب میں پندرہ برس کی تھی تو انہوں نے مجھے پابند کر دیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے سونیا اٹھ بیٹھی۔ "اب میری دماغی مریضہ ہونے کی مکمل ہسٹری ان کے پاس ہے۔ میرے حلفیہ بیان کے باوجود دنیا کی کوئی جیوری، کوئی عدالت انہیں مجرم قرار نہیں دے سکتی۔"

"ہم اس معاملے میں کچھ نہ کچھ تو کر سکتے ہیں۔" میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس دو ہی راستے ہیں۔ یہ سب کچھ برداشت کرتی رہوں یا انہیں زہر دے دوں۔"

"تم انہیں زہر نہیں دے سکتیں۔ سب کو پتا چل جائے گا کہ زہر تم ہی نے دیا ہے۔ تمہیں یقینی طور پر جیل جانا پڑ جائے گا اور میں حقیقت میں تم سے پھر کبھی نہیں مل سکوں گا۔"

"ان کے سیکڑوں دشمن ہیں۔ یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔" سونیا نے کہا۔

"ان کے دشمنوں میں سے کتنے ہیں جو اچھی طرح یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں؟"

اس بات پر سونیا نے ایک سرد آہ بھری۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ مجھے یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔"

میرے جبڑوں کے مسلز جلنے لگے اور نفرت کے تیزاب نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

میری نظریں اس لڑکی پر جمی ہوئی تھیں جس سے میں نے پیار کیا تھا۔ پھر تصور میں، میں نے اس کے باپ کو اس کی معصومیت کی دھجیاں اڑاتے دیکھا تو میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے بہ مشکل تمام اپنی اس کیفیت پر قابو پایا اور اٹھ کھڑا ہوا پھر سہارا دے کر سونیا کو بھی کھڑا کر دیا۔

پوری چاندنی میں سونیا کا چہرہ پوری طرح روشن تھا۔ مجھے اس کے چہرے کے خدوخال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں کرب اور اذیت کے آثار کتنی گہرائی تک ہیں۔ اتنے عرصے کے میل جول کے باوجود میں نے کبھی اس کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔

میں نے سونیا کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "جلد ہی تم اپنے اس ڈراؤنے خواب سے بیدار ہو جاؤ گی۔" میرے لہجے میں اتنی درندگی تھی کہ میں خود اپنی آواز سے خوف زدہ ہو گیا۔ "اور تمہارا شیطان جہنم رسید ہوگا۔"

☆☆☆

دو ہفتوں بعد سونیا مجھے اسی پارک میں ملی۔

ہم ایک خالی بنچ پر جا بیٹھے۔ اس نے مجھے ایک کاغذ تھما دیا۔ "یہ مکان کا خاکہ ہے جو میں نے پوری توجہ اور احتیاط سے بنایا ہے۔"

میں نے نقشے کا جائزہ لیا۔ "خاصا ٹھیک ہے... اور الارم وغیرہ؟" میں نے حفاظتی انتظامات کے بارے میں جاننا چاہا۔

سونیا اس بات پر مسکرا دی۔ "اس مغرور شخص کو اپنی ذات پر بڑا گھمنڈ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کوئی بھی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے اس نے نہ تو پہرے دار رکھے ہوئے

ہیں اور نہ ہی برگلر الارم نصب کرائے ہیں۔"

"تم ان کی گالف آئرن اسٹک لائی ہو؟"

سونیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گڈ! وہ اس وقت کہاں ہوں گے؟"

"صوفے پر مدہوش پڑے ہوں گے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ اس رات وہ پوکر کھیلیں گے؟"

"وہ ہر جمعرات کو رات دیر تک پوکر کھیلتے ہیں۔"

میں نے ایک بار پھر کاغذ پر سونیا کے گھر کے نقشے کا جائزہ لیا۔ "وہ گھر کب واپس آتے ہیں؟"

"نصف شب کے وقت۔ بعض اوقات جلدی بھی آ جاتے ہیں۔"

"کیا وہ نشے میں ہوں گے؟"

"یہ بات تو یقینی ہے۔ ایک بار جب وہ مدہوش ہو کر سوتے ہیں تو پھر کوئی طوفان بھی انہیں جگا نہیں سکتا۔"

"اوکے!" میں نے وہ نقشہ تہ کر کے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے رپورٹ درج کرا دی؟"

"ہاں، میری انسپکٹر درانی سے بات ہوئی تھی۔"

"کیا اس نے کسی قسم کے شک کا اظہار کیا تھا؟"

"میرے خیال سے تو نہیں... کیوں؟"

"وہ دراصل اس لیے کہ انسپکٹر درانی کا شمار ہمارے محکمے کے بہترین سراغ رسانوں میں ہوتا ہے۔ تم نے اسے کیا بتایا؟" میں نے تفصیل جاننا چاہی۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ میرا تقرر پولیس کی اسپیشل فورس میں ہوا تھا۔

"میں نے اسے بتایا کہ کالج میں کوئی میرا پیچھا کرتا ہے اور مجھے شک ہے کہ اس نے میرے گھر کا پتا لگا لیا ہے۔"

"اس کے علاوہ اور کچھ؟"

"ہاں، میں نے یہ بھی بتایا کہ دو دن قبل رات کے وقت میں نے ایک عجیب سے شخص کو اپنے ڈرائیو وے میں دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ شخص وہی ہو سکتا ہے جو کالج میں میرا پیچھا کرتا ہے۔"

"تم نے اس کا حلیہ بتایا؟"

"میں نے ایک ایسے شخص کا حلیہ بیان کر دیا جسے کچھ دیر پہلے میں نے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں دیکھا تھا۔"

"پھر انسپکٹر درانی نے کیا کہا؟"

"اس نے سب کچھ لکھ لیا اور کہا کہ وہ باوردی پولیس والوں کی اضافی پیٹرول ڈیوٹی لگا دے گا۔"

میں نے مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔

اس رات میری ڈیوٹی نائٹ شفٹ میں تھی اور سونیا کا گھر میری پیٹرولنگ کی حدود میں آتا تھا۔

"اوکے! اور کچھ تو نہیں پوچھنا؟" سونیا نے کہا۔

"نہیں... سب ٹھیک ہے۔"

"تو آج کی رات؟"

"ہاں، آج کی رات تم تو گھر پر نہیں ہو گی؟"

"نہیں۔"

"رات تم اپنی سہیلی کے یہاں گزارو گی؟"

"ہاں، آج اس کی مہندی ہے۔ سب سہیلیاں رات وہیں گزاریں گی۔ خوب ہلا گلا ہوگا۔ ڈانس پارٹی بھی ہوگی۔ میری وہاں شرکت کے بے شمار گواہ مل جائیں گے۔"

"اوکے!" میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔

پھر ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے سونیا کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔ "اگلی مرتبہ جب تم سے ملاقات ہوگی تو تم اس وحشی درندے کے شکنجے سے آزاد ہو چکی ہوگی۔"

سونیا نے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولی۔ "جانتے ہو، مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔"

"کون سی بات پر؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"جب تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے اس حد تک محبت کرتے ہو کہ میری خاطر کسی کو قتل بھی کر سکتے ہو۔"

"یقیناً کروں گا۔" میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ قتل باجواز ہوگا۔"

☆☆☆

میں نے ڈیش بورڈ پر نصب کلاک پر نگاہ ڈالی۔

رات کا ایک بج رہا تھا۔ میرے ایکشن میں آنے کا یہی وقت تھا۔ میں نے اپنا پولیس ریڈیو اٹھا لیا۔ "ون تھری سکس، ہیڈ کوارٹرز!"

ریڈیو میں کچھ دیر کھڑکھڑاہٹ ہوتی رہی پھر ڈسپیچر کی مانوس آواز ابھری۔ "گو اہیڈ ون تھری سکس!"

"ٹین فور سیون۔ ٹین فور ٹو۔" میں نے کہا تا کہ وہ یہ سمجھے کہ میں گھر پر کھانا کھا رہا ہوں۔

"ٹین فور... ون تھری سکس۔"

میں اپنی پیٹرول کار سے نیچے اتر آیا اور اپنے پولیس ریڈیو کا والیوم کم کر دیا۔ اب میرے پاس ایک گھنٹے کا وقت تھا۔

میں نے مخصوص لبادہ، ٹوپی، دستانے اور نرم جوتے پہن لیے۔ پھر سیٹ کے نیچے سے گالف آئرن اسٹک نکال لی اور ایک گہری سانس لی۔ میرے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔

میں دوڑتا ہوا مبارک ڈائمنڈ کی کوٹھی تک جا پہنچا۔ ایک

بار میں نے اپنی پولیس کار کی جانب نگاہ ڈالی...... وہ کوٹھی کے احاطے سے خاصے فاصلے پر درختوں کی آڑ میں کھڑی تھی اور نظروں سے بڑی حد تک اوجھل تھی۔

کوٹھی کے عقبی دروازے کے پاس پہنچ کر میں رک گیا۔

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔

میں نے آج تک کسی شخص کو قتل نہیں کیا تھا۔

بے شک میں نے قتل کرنے کے امکانات کے بارے میں سوچا ضرور تھا لیکن وہ تصوراتی مناظر ہمیشہ اپنے دفاع کی صورتِ حال کے پیشِ نظر ہوتے تھے... جبکہ یہاں صورتِ حال مختلف تھی۔ یہ ایک سفاکانہ قتل تھا۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اپنے اس فعل کو جو میں کرنے جارہا تھا، تصور کی آنکھ سے دیکھنے لگا۔

میں جتنی بھی کوشش کررہا تھا، اس شخص کو قتل کرنے کا منظر میرے ذہن کے پردے پر نمودار نہیں ہورہا تھا۔

میں نے اپنا سر جھکا لیا اور پلٹ کر عقبی صحن میں واپس چل دیا۔ جب میں تھکے قدموں سے لوٹ رہا تھا تو یہ سوچ رہا تھا کہ سونیا کو کیا بتاؤں گا؟ میں اس سے آنکھیں کس طرح ملا پاؤں گا؟ وہ اس خبر پر کس ردِعمل کا اظہار کرے گی؟

ابھی میں عقبی صحن کے احاطے تک ہی پہنچا تھا کہ اچانک ذہن کے پردے پر سونیا کی عزت تاراج کرنے کا منظر ابھر آیا۔ میرا خون دوبارہ سے جوش مارنے لگا اور میں نے اپنے دانت سختی سے بھینچ لیے اور میں وہیں رک گیا۔ وہ منظر بار بار میری آنکھوں کے سامنے آرہا تھا۔

میں بے ساختہ پلٹا اور دوبارہ کوٹھی کے داخلی دروازے کی جانب چل پڑا۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر میں رک گیا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے مہاگنی کے دروازے کے وسط میں ایک زوردار لات رسید کی تو لکڑی چیخ گئی اور دروازہ کھل گیا۔

میں تیز تیز قدموں سے کوٹھی میں داخل ہوگیا اور اس جانب چل دیا جہاں میری یادداشت کے مطابق لیونگ روم ہونا چاہیے تھا جو سونیا نے نقشے میں بتایا تھا۔ وہاں پہنچنے سے قبل ہی مجھے ٹی وی کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ سونیا کا بنایا ہوا نقشہ بالکل ٹھیک ہے۔

ٹی وی اسکرین کی روشنی میں لیونگ روم کی ہر شے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اسکرین کی جھلملاہٹ سے کمرے میں سائے رقص کررہے تھے اور صوفہ بھی روشنی کی زد میں تھا۔

میں پیچھے سے صوفے کی طرف بڑھا اور گالف آئرن اسٹک جو بدستور میرے ہاتھ میں تھی، اسے میں نے سر سے اوپر ہوا میں بلند کردیا۔ پھر میں صوفے کے کنارے سے گھوما اور وار کرنے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ میرا سانس سینے میں اٹک سا گیا۔

وہ صوفے پر موجود نہیں تھا۔ صوفہ خالی پڑا تھا!

اتنے میں ایک آواز گونجی۔ ''تم کون ہو اور میرے گھر میں کیا کررہے ہو؟''

میں تیزی سے آواز کی سمت گھوم گیا۔

مبارک ڈائمنڈ ایک ہاتھ میں واڈکا کی بوتل اور دوسرے ہاتھ میں ٹی وی ریموٹ تھامے مجھے گھور رہا تھا۔

میں وہیں جم کر رہ گیا۔

میرے سامنے وہ شخص موجود تھا جس نے میری گرل فرینڈ کی معصومیت کو تار تار کیا تھا اور اس وقت وہ اپنی زندگی کے بھرپور وجود کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟ تم کون ہو اور کیا...''

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور گالف آئرن اسٹک کو بیس بال کے بیٹ کے مانند پوری قوت سے گھما دیا۔ وار کرتے وقت میں نے اپنا پورا زور اپنے پیر کی ایڑی پر ڈالتے ہوئے آئرن اسٹک گھمانے میں اپنی طاقت صرف کردی۔

جب آئرن اسٹک کا سرا مبارک ڈائمنڈ کے سر سے ٹکرایا تو ضرب اس شدت کی تھی کہ میرا ہاتھ تک جھنجھنا گیا۔ اس کے سر سے خون بہنا شروع ہوگیا۔ وہ ایک ہی وار میں فرش پر ڈھیر ہوگیا جیسے کسی گولی نے اس کے دماغ کے مرکزی حصے کو نشانہ بنایا ہو۔ واڈکا کی بوتل سرامک کے فرش پر گر کر چکنا چور ہوگئی۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

سب کچھ ٹھیک دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور آئرن اسٹک ایک بار پھر پوری قوت سے اس کے سر پر ماردی اور مارتا چلا گیا۔ وار اتنے شدید تھے کہ اس کا ہینڈل بھی مڑ گیا۔

مبارک ڈائمنڈ کے جسم نے ایک جھرجھری لی اور پھر وہ ساکت ہوگیا۔ میں نے گالف آئرن اسٹک ہاتھ سے نیچے گرادی اور اس کے برابر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے اس کی گردن کی جانب ہاتھ بڑھا کر اس کی نبض ٹٹولی۔ نبض ساکت تھی۔

میں نے تیزی سے اس کا بٹوا اور اس کی جیولری سمیٹی اور باہر کی جانب لپکا۔

میں باہر نکلا تو سرد ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی اور میں صحن میں گر پڑا۔ مجھے ابکائی آرہی تھی۔ میں نے اپنے جبڑے مضبوطی سے بھینچ لیے اور ابکائی روک لی۔ میں جائے واردات پر کوئی ثبوت نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میرا حلق جل رہا تھا۔ میں بمشکل تمام اپنے قدموں پر کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتے انداز میں

روحانی معالج
صدر کراچی
ایس - آر - رائے
ہر کام بذریعہ کلام الٰہی کیا جاتا ہے ہر مقصد میں کامیابی چند یوم میں حاصل کریں مثلاً
من پسند جگہ شادی
گھریلو پریشانی
کاروبار میں بندش
رشتوں میں بندش
انعامی چانس
سوتن سے نجات
شوہر کو راہِ راست پر لانا
بیرون ملک سفر
ہر کام بذریعہ نقش و کلام کیا جاتا ہے
ہم دعویٰ نہیں کام کرتے ہیں
خود بیٹھ کر کام حل کروائیں اور پرسکون زندگی بسر کریں
اپنا لکی نمبر اور برج ستارہ، پتھر، مبارک دن
معلوم کریں صرف ایک فون کال پر
رابطہ 24 گھنٹے
0332-2502301
021-35476149 , 021-32783885
0322-3231669 , 0333-3136430
www.pkdigest.com

دوڑنا شروع کر دیا۔

اپنی پولیس کار کے پاس پہنچ کر میں نے تیزی سے لباس اتارا، دستانے، جوتے اور ٹوپی مبارک ڈائمنڈ کے بٹوے اور جیولری سمیت ایک پلاسٹک بیگ میں ٹھونس دیے۔ پھر گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میری سانسیں ابھی تک تیزی سے چل رہی تھیں اور دل بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

میں نے لمبے لمبے سانس لیے تب جا کر سانس کی آمدورفت درست ہوئی۔ جب دل کی رفتار بھی قدرے کم ہو گئی تو میں نے پلاسٹک کا بیگ کار کی ڈکی میں بند کر دیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک ویرانے میں، میں نے پلاسٹک بیگ اور اس کی اشیا کو ایک گڑھے میں رکھ کر جلا دیا جو میں نے پہلے ہی تلاش کر رکھا تھا۔ پھر تیزی سے اپنے گھر پہنچا اور شاور لینے کے بعد لباس تبدیل کیا اور ڈسپیچر کو فون پر بتایا کہ مجھے تھوڑی سی دیر ہو سکتی ہے۔

"میں تمہاری تاخیر کو سنبھال لوں گا۔" ڈسپیچر نے تفریح لیتے ہوئے کہا۔ "بشرطیکہ میرے لیے میک ڈونلڈ سے برگر لیتے ہوئے آؤ۔"

"تمہیں برگر مل جائے گا۔"

☆☆☆

جب میں اپنی ڈیوٹی پر واپس آیا تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ میں نے وعدے کے مطابق ڈسپیچر کو برگر پہنچایا اور پھر اپنی پٹرولنگ گاڑی میں لوٹ آیا۔

میں بیس منٹ تک اسٹیئرنگ وہیل تھامے بیٹھا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میرا پیٹ گڑبڑ کر رہا تھا اور میری آواز بھی کپکپا رہی تھی۔ میں کافی دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔

پھر میں نے گاڑی پارکنگ لاٹ سے باہر نکالی اور سیدھا مبارک ڈائمنڈ کی کوٹھی کی جانب روانہ ہو گیا۔

میں نے گاڑی اس کی کوٹھی کے سامنے لے جا کر روک دی۔

"ون تھری سکس۔ ہیڈ کوارٹرز۔"

"یس!"

"میں مبارک ڈائمنڈ کی رہائش گاہ کا معمول کا جائزہ لینے جا رہا ہوں۔" میں نے ڈیوٹی افسر کو بتایا۔

"مین فورا!"

میں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ میرے گھٹنے جواب دے رہے تھے۔ کوٹھی کے عقبی دروازے پر پہنچ کر میں نے ایک گہری سانس لی اور پھر اپنا ریڈیو آن کرتے ہوئے بولا۔ "ہیڈ کوارٹرز! مجھے ایک دروازہ کھلا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ نقب زنی کی ممکنہ واردات ہو سکتی ہے۔ میں جائزہ لینے اندر جا رہا ہوں۔ مجھے مدد درکار ہو سکتی ہے۔"

"او کے!"

میں سیدھا لیونگ روم کی جانب چل دیا۔

مبارک ڈائمنڈ اپنے ہی خون میں تربتر فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے بمشکل تمام تھوک نگلتے ہوئے اپنے حلق کو تر کیا۔ وہ یقینی طور پر مر چکا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے ریڈیو آن کر دیا۔ "ہیڈ کوارٹرز! اندر ایک لاش موجود ہے۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے پیرامیڈیکل اسٹاف کو روانہ کر دو۔"

پولیس ریڈیو میں زندگی کی لہر سی دوڑ گئی اور پیغامات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے جھک کر مبارک ڈائمنڈ کی گردن کو چھوا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی انگلیوں کے نشانات وہاں ثبت کیے تھے تاکہ اگر لاش کے اطراف میں میرے ڈی این اے دریافت ہوئے تو میں اس کی وضاحت پیش کر سکوں۔

پھر میں نے ملزم کو تلاش کرنے کے بہانے پوری عمارت کو کھنگال ڈالا اور پولیس ریڈیو پر پیغام دیا کہ عمارت محفوظ ہے۔

اس کے بعد میں نے کوٹھی کے اطراف میں جائے واردات کا مخصوص ٹیپ لپیٹ دیا اور ڈرائیو وے میں رک کر انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

"جب تمہیں اس واردات کا پتا چلا تو اس وقت کیا بجا تھا؟" سراغ رساں درانی نے پوچھا۔

میں خود کو نارمل ظاہر کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ "پونے تین کا عمل ہوگا۔ میں نے ریڈیو پر وقت کا اندراج کرا دیا تھا۔" میں نے اپنی طرف سے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

سراغ رساں درانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ فلیش کرتی ہوئی روشنیوں میں اس کی نیلی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔ "اس علاقے میں اضافی گشت کے بارے میں تمہیں میرے احکامات مل گئے ہوں گے؟" سراغ رساں نے جاننا چاہا۔

"جی ہاں، مجھے احکامات مل گئے تھے۔ میں لگ بھگ ہر ایک گھنٹے بعد یہاں کا گشت لگا رہا تھا۔" میں نے بتایا۔

"اور ہر مرتبہ وقت کا اندراج بھی کراتے رہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کوئی مشتبہ بات دکھائی دی تھی؟"

"نہیں۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ اس دوران میں، میں بے چین تھا جبکہ انسپکٹر درانی اپنی نوٹ بک میں سب کچھ لکھتا جا رہا تھا۔

"عجیب سی بات ہے... ہے نا؟" میں نے تبصرہ کیا۔

"وہ کیا؟"

"اپنے ہی گھر میں اپنی ہی گالف آئرن اسٹک سے ہلاکت۔"

درانی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "وہ اس کی ذاتی اسٹک نہیں تھی!"

"واقعی؟"

"ہاں، اس کے ذاتی گالف آئرن شمار کیے جا چکے ہیں۔ تمام کے تمام اپنی جگہ موجود ہیں۔"

"اوہ! میں نے یہ اندازہ اس لیے لگایا تھا کہ اسے وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔"

انسپکٹر درانی کی نظریں دور تاریکی میں کہیں جمی ہوئی تھیں۔ "وہ حرام زادہ بڑا دیدہ دلیر تھا۔"

"وہ کس طرح؟"

"تم ہر ایک گھنٹے بعد یہاں رک کر جائزہ لیتے رہے ہو۔ اس نے یقیناً تمہاری کار دیکھی ہوگی۔ پھر بھی اس نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا اور اپنا کام کر دکھایا۔" درانی کا لہجہ عجیب سا تھا۔ "کیا تم نے اپنے کھانے کے وقفے کا پیغام ریڈیو پر دے دیا تھا؟"

"میں ہمیشہ پیغام درج کرا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے غور سے درانی کے چہرے کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم کیا سوچ رہے ہو؟"

اسی لمحے انسپکٹر درانی کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ "ہیلو، کامران! کیا معاملہ ہے؟ ہاں، وہ مر چکا ہے۔"

اس دوران میں انسپکٹر درانی وہاں سے پلٹ گیا اور ٹہلتا ہوا دور نکل گیا۔ البتہ یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑ گئے تھے۔ "بظاہر تو یہ ڈکیتی کی واردات لگ رہی ہے لیکن معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ ہمیں اس کی بیٹی کو ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔ وہ پہلے ہی ایک رپورٹ درج کرا چکی ہے..."

درانی کی آواز آہستہ معدوم ہو گئی۔ پھر وہ جائے واردات کا معائنہ کرنے دوبارہ کوٹھی میں چلا گیا اور میں نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔

میں نے لاگ بک میں اس وقت تک کی تمام تفصیل درج کر دی جب تک میرا متبادل پہنچ نہیں گیا۔ وہ ٹھیک چھ بجے آ گیا تھا۔ میں نے لاگ بک اس کے حوالے کر دی۔ "سراغ رساں درانی اب بھی اندر موجود ہے۔ باقی سب جا چکے ہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پلٹ گیا۔

میں اپنی پولیس گاڑی میں سوار ہو کر گھر کی جانب چل دیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح ڈرائیونگ کی۔ نہ ہی یہ یاد ہے کہ گھر پہنچ کر کب لباس تبدیل کیا اور کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

میں اپنے بیڈ پر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ مجھے یہ احساس ہونے میں ایک سیکنڈ لگا کہ میں کہاں پر ہوں۔ میں دوبارہ بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"یہ میں نے کیا کر دیا؟" میرے ذہن میں یہ الفاظ گونجنے لگے... اور پھر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اسی اثنا میں دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا۔

"ڈپٹی جمال!" باہر سے ایک بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "دروازہ کھولو۔ میں سراغ رساں کامران ہوں۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

'یہ کم بخت کیا لینے آیا ہے؟' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

میں نے جلدی سے اپنی جینز چڑھائی۔ 'شاید انہیں میری مدد کی ضرورت پیش آ گئی ہے۔' میں نے سوچا۔

اتنے میں دروازے کے قبضے دوبارہ جھنجھنانے لگے۔

"آ رہا ہوں۔" میں نے ہانک لگائی اور سست قدموں سے دروازے کی جانب چل دیا۔

دروازہ کھولا تو یوں لگا جیسے میرا مثانہ تقریباً خالی ہو گیا ہو۔ نیم دائرے میں سپاہیوں کا ایک ٹولا میرے دروازے کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔

سراغ رساں انسپکٹر کامران نے میری کلائی پکڑی اور ایک جھٹکے سے مجھے گھسیٹ لیا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ جب میں نے سنبھلنے کی کوشش کی تو اس نے اپنے جوتے سے میری پنڈلی پر ایک ٹھوکر رسید کر دی اور میرا بازو مروڑ کر میری پشت پر لے گیا۔ میرا منہ بگڑ گیا اور میں اپنے گھٹنوں کے بل گر پڑا۔

انسپکٹر کامران نے میرا دوسرا بازو جکڑ لیا۔ اس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں اور مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

انسپکٹر درانی نے قدم آگے بڑھایا اور بولا۔ "تمہیں خاموشی اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ تم جو کچھ بھی کہو گے وہ..."

میرا سر چکرانے لگا۔ میں سراسیمہ ہو گیا۔ اس نے مجھے میرے حقوق سے آگاہ کیا اور پولیس کار میں دھکیل دیا۔

میں نے نشستوں کے درمیان کی جالی کے پار عقبی آئینے میں دیکھا۔ آفیسر سہیل آئینے میں سے مجھے گھور رہا تھا۔ "تم کس حد تک چلے گئے تھے اور تم نے یہ کیا کیا ہے، بیٹا؟"

"سر!" میں نے اسے مخاطب کر کے پریشان لہجے میں کہا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"جمال! احمق بننے کی کوشش مت کرو۔ انہوں نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ اب ان کے ساتھ معاملات طے کرنے کی

www.pkdigest.com

کوشش کرنا۔ شاید تمہاری سزا میں چند برسوں کی تخفیف ہو جائے۔"
"سزا؟ سر... میں نے کچھ نہیں کیا۔"
"ان کے پاس تمہاری ویڈیو بطور ثبوت موجود ہے۔"
"یہ پاگل پن ہے۔"
آفیسر سہیل نے افسردگی سے سر ہلایا۔ "لگتا ہے کہ اس شخص نے اپنی کوٹھی کے اندر اور باہر خفیہ کیمرے نصب کرا رکھے تھے۔ میں نے وہ ٹیپ خود دیکھی ہے۔ تم سفید کورآل اور میچنگ کیپ پہنے تمام حرکات وسکنات کرتے ہوئے واضح طور پر دکھائی دے رہے ہو۔ اس لبادے میں بھی تمہیں پہچاننے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔"
حیرت اور صدمے نے میری حالت خراب کر دی۔ میرا سر سختی سے کار کی کھڑکی کے ساتھ جما ہوا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے باہر گزرتی ہوئی گاڑیوں کو تک رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے پردے پر کوئی فلم چل رہی ہو۔
میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ جلد ہی میری آنکھ کھل جائے گی اور خواب اختتام پذیر ہو جائے گا اور اپنے اس خواب پر میں بعد میں خوب ہنسوں گا۔
ہیڈ کوارٹر پہنچ کر آفیسر سہیل نے کار ڈرائیو وے میں روک دی۔ اس نے مجھے کار سے نیچے اترنے میں مدد دی۔ پھر میرا بازو پکڑ کر مجھے سیڑھیاں چڑھانے لگا۔ ہم اوپر لابی میں آ گئے۔
میری نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ اپنے ساتھیوں کی نظریں مجھے اپنے جسم میں تیر کے مانند چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں حیران تھا کہ وہ...
"یہ وہی ہے... اوہ مائی گاڈ! یہ وہی ہے۔"
یہ ایک مانوس آواز تھی جسے سنتے ہی مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میری نگاہیں کمرے کا طواف کرنے لگیں۔
وہ وہاں موجود تھی اور ایک سپاہی اس کی حفاظت کی خاطر اس کے پاس مستعد کھڑا تھا۔
اوہ میرے خدا! وہ سونیا تھی اور ہاتھ اٹھا کر میری جانب اشارہ کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ "یہی وہ شخص ہے جو میرا تعاقب کیا کرتا تھا۔" اس نے چیختے ہوئے کہا۔ "تم حرام زادے!" اس نے مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کی۔ "تم نے میرے باپ کو قتل کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم خود بھی موت کے شکنجے سے بچ نہیں پاؤ گے۔ تم..."

☆☆☆

میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔
میرے ہاتھ شکنجے میں بندھے ہوئے تھے۔ پھر سہیل کا مکروہ چہرہ میری نظروں کے سامنے آ گیا۔

"مجھے کیا ہو گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"تم کسی کتیا کی طرح بے ہوش ہو گئے تھے بیٹا۔" اس نے اپنے مخصوص لہجے میں بتایا۔ "اب قید خانے میں وہ سب تمہارے کھامڑپن سے لطف اندوز ہوں گے۔"
میں نے اپنا بدن سمیٹا اور بیٹھ گیا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے سر؟ کیا یہ کوئی مذاق ہے؟"
"اگر یہ مذاق ہے تو اس کا سب سے زیادہ لطف وہ لڑکی لے رہی ہے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"سونیا؟"
"اوہ... تو تم اسے جانتے ہو؟"
"میرا اس کے ساتھ عشق چل رہا ہے۔"
یہ سن کر آفیسر سہیل نے اپنا سر پیچھے کو جھٹکتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "یہ بات جج کو بتانا۔"
"یہ سچ ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔
"کسی کا تعاقب کرنا اور اس سے عشق لڑانا ایک ہی بات نہیں ہے، بیٹا!" سہیل نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "وہ لڑکی اس وقت بہت غم زدہ ہے لیکن اسے جیسے ہی اس بات کا احساس ہوگا کہ اسے اپنی تمام زندگی کبھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی تو اس کے آنسو اس طرح خشک ہو جائیں گے جیسے صحرا میں پانی جذب ہو جاتا ہے۔"
میں منہ پھاڑے اس کی صورت تکنے لگا۔
"جی ہاں! جناب نے اس کی تقدیر بنا دی ہے۔ وہ بے شمار دولت کی تن تنہا وارث بن چکی ہے اور یہ دولت تم نے اپنے ہاتھوں سے اس کی جھولی میں ڈالی ہے۔"
میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
میرے ذہن میں وہ تمام باتیں بازگشت کرنے لگیں جو سونیا نے مجھ سے کہی تھیں۔ اب سب کچھ صاف صاف میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس نے مجھے بے وقوف بنایا تھا... اپنے مقصد کے حصول کی خاطر!
اس نے مجھ سے جو کچھ بھی کہا تھا، وہ سراسر جھوٹ تھا۔ اس جھوٹ کی خاطر اس نے اپنے باپ کو بھی نہیں بخشا اور اس پر وہ الزام عائد کر دیا جو میرے جنون کی بنیاد بنا تھا۔
اس کی ہر ایک بات جھوٹ اور صرف جھوٹ پر مبنی تھی۔ ماسوائے ایک بات کے...
"محبت تکلیف دہ ہوتی ہے۔" میں نے بلند آواز سے کہا پھر حقارت سے زمین پر تھوکتے ہوئے بولا۔ "لیکن اتنی زیادہ نہیں جتنی کہ بے وفائی!"

ایک بھوت کا مجھے نیند سے بیدار کرنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ ڈیوڈ کے انتقال کے بعد یہ دوسری رات تھی۔ میرا زخم ابھی تازہ تھا اس لیے نیند گہری نہیں آئی تھی۔ اس رات غم سے نڈھال ہو کر لیٹی تھی اور ابھی آنکھ ہی لگی تھی کہ اچانک میں جاگ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ کمرا بہت ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تب ہی میری نظر ایک انسانی ہیولے پر پڑی جو میرے بیڈ کی پائنتی کی طرف کھڑا تھا۔ میں سمجھی کہ یہ ڈیوڈ ہے جو بھوت کی شکل میں واپس آ گیا ہے۔ میں ڈیوڈ کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی، خواہ وہ بھوت کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ڈیوڈ کی طرح چھ فٹ لمبا تھا۔ اس کے بال کالے اور آنکھیں بھوری تھیں۔ وہ خاصا وجیہہ تھا لیکن اس تھیوری کی اہم بات یہ تھی کہ وہ ڈیوڈ جیسا تو تھا لیکن ڈیوڈ نہیں تھا۔
کوئی شخص کتنا ہی خوب صورت اور اسمارٹ کیوں نہ ہو، آدھی رات کے وقت نیند سے بیدار ہونے کے بعد سامنے نظر آئے تو انسان ڈر ہی جاتا ہے اور ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میں نے زور سے چیخ ماری۔ وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے بھوت دیکھا ہے۔ میں بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی اور خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ میرا بڑی شدت سے جی چاہا... کاش ڈیوڈ زندہ ہوتا۔ اس وقت میرے پہلو میں ہوتا... لیکن ڈیوڈ کا بستر خالی تھا اور یہ خالی پن میرے وجود میں اتر گیا۔ میرا سینہ غم سے پھٹنے لگا۔ شوہر کی اچانک موت میرے لیے بڑا نقصان تھی۔
میں نے خود کو تسلی دینے اور بہلانے کی کوشش کی کہ میں نے ڈراؤنا خواب دیکھا تھا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ساری رات ڈیوڈ کے لرزہ خیز قتل کے بارے میں خواب آتے رہے۔ کس طرح اس کا قتل ہوا اور وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا۔ صبح اٹھی تو لگ رہا تھا، برسوں کی بیمار ہوں۔ روئے زمین کی کوئی چیز بھی آج میری طبیعت کو بحال نہیں کر سکتی تھی کیونکہ آج ڈیوڈ کی تدفین کا دن تھا۔ میں نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ میرا چہرہ دُھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید اور شکن آلود تھا جیسے ابھی ڈرائیر سے نکالا گیا ہو۔ میرے بال بکھرے ہوئے اور بے رنگ تھے۔ نیلی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ "تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی، اینا!" میں نے خود کو تسلی دی۔ بیالیس سال کی عمر میں بھی میرا جسم بے ڈھب نہیں

ہلکے پھلکے انداز میں الجھنوں کو سلجھاتی ڈرامائی کہانی

فوزیہ ظہیر

بھوت، پریت اور آسیب کے نام سے ہی جسم میں سنسنی سی پھیل جاتی ہے۔ کچھ لوگ ان پر یقین نہیں رکھتے اور کچھ کا خیال ہے کہ یہ محض انسانی ذہن کی کرشمہ سازیاں ہیں... ایک ایسے ہی بھوت کی کہانی جو قدم قدم پر اپنی موجودگی اور ذہانت کا ثبوت دے رہا تھا

www.pkdigest.com

ہوا تھا اور چہرے پر یہ لکیریں تو غم کی لکیریں تھیں۔ اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کا مجھے اس وقت تک کوئی ڈر اور کوئی احساس نہیں ہوا تھا جب تک کہ "وہ" میرے مقابل نہیں آئی تھی۔

میں حیران تھی کہ کیا "اس" میں اتنی ہمت ہے کہ وہ ڈیوڈ کی تدفین میں شریک ہو، اگر وہ شریک بھی ہوتی تو میں اسے پہچان نہیں سکتی تھی کیونکہ جب ڈیوڈ نے اس سے اپنی وابستگی کا اقبالِ جرم کیا تھا تو اس کا نام نہیں بتایا تھا اور نہ ہی میں نے کبھی پوچھا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا، میرے لیے اس عورت کا نام جاننا اتنا اہم نہیں تھا جس سے ڈیوڈ گزشتہ پندرہ ہفتوں سے بدھ کے روز سینٹ جارج ہوٹل میں ملتا رہا تھا اور انہی پندرہ ہفتوں میں میرے کالج کی پرنسپل نے میری رات کی ڈیوٹی لگائی تھی جہاں میں اکنامکس کی کلاس لیتی تھی۔ میں تو ایمان داری سے اپنی ڈیوٹی نبھا رہی تھی لیکن ڈیوڈ میری غیر موجودگی کا غلط فائدہ اٹھا رہا تھا۔ جب ڈیوڈ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ بہت شرمندہ ہوا اور اپنے "عارضی پاگل پن" کے لیے مجھ سے رو رو کر معافی مانگی۔ آج سے چھ مہینے پہلے ڈیوڈ نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا اور اس کے بعد سے وہ ایک آئیڈیل شوہر بن گیا تھا۔ ڈیوڈ کی اور میری شادی کو بیس سال ہو گئے تھے اور ان بیس سالوں میں، میں نے ڈیوڈ کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ وہ میری عادت بن گیا تھا جسے میں چھوڑ نہیں سکتی تھی... لیکن تقدیر نے اسے چھڑا دیا۔

جس دن اس کا قتل ہوا، اس صبح اس نے مجھ سے کہا تھا۔ "اینا! میں ایک ایسا کام کرنے جا رہا ہوں جس پر تمہیں فخر ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "ڈیوڈ! میں تو ہمیشہ تم پر فخر کرتی ہوں۔"

پھر وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا... کبھی نہ آنے کے لیے۔

اس رات ڈیوڈ حسبِ معمول مجھے کالج سے لینے آیا تھا جہاں میں پڑھاتی تھی۔ میں کار کی طرف آ رہی تھی کہ میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ گولیاں ڈیوڈ کو لگی ہیں۔ جب میں قریب پہنچی تو ڈیوڈ زمین پر ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا، چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور وہ موت کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اتنی خوف زدہ تو میں اپنے کمرے میں بھوت دیکھ کر بھی نہیں ہوئی تھی جتنی میں ڈیوڈ کو مرتے ہوئے دیکھ کر ہوئی۔ کسی نے بھی گولی چلانے والوں کو نہیں دیکھا تھا۔ چند عینی گواہ تھے جنہوں نے ایک نئی شیورلیٹ کار کو تیزی سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے سوا کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ نہ گاڑی کا ماڈل، نہ نمبر پلیٹ، نہ ہی کوئی ڈرائیور کی شناخت کر سکا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ کار میں کتنے لوگ تھے۔

گزرے ہوئے واقعات میرے ذہن کے پردے پر ایک ایک کر کے آتے جا رہے تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا وجود بہت بڑے طوفان کی زد میں ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ سیاہ لباس پہنا جو ڈیوڈ کو بہت پسند تھا۔

تدفین میں کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ شاید ڈیوڈ کی سابقہ محبوبہ بھی آئی ہو۔ میری فیملی کے لوگ، ہمسائے، دوست اور ایمرے اینڈ ویلڈن کے ملازمین جہاں ڈیوڈ وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ مسٹر ونسلو ایمرے کمپنی کا مالک تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا اور غمگین لگ رہا تھا۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کیونکہ صرف چند ہی دنوں میں اس نے بہت سے جنازوں کی تدفین میں شرکت کی تھی۔ پانچ دن پہلے ایمرے اینڈ ویلڈن کا ایسڈ ٹینک پھٹنے سے تین ملازمین جاں بحق ہو گئے تھے۔ ڈیوڈ کو بھی ان اموات کا بہت دکھ تھا۔ پھر پلانٹ منیجر نے خودکشی کر لی جو خود کو ان تین افراد کی موت کا ذمے دار سمجھتا تھا کیونکہ ملازمین کی ٹینک کے متعلق شکایات پر اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ آخر ٹینک پھٹ گیا۔ مسٹر ایمرے اپنی خوب صورت سیکریٹری لوئس کے ساتھ ڈیوڈ کی قبر سے واپس جا رہے تھے۔ لوئس پلانٹ منیجر چانس ڈیوریکس کی بیوی تھی جو اب آنجہانی ہو چکا تھا لیکن لوئس کے چہرے پر کوئی رنج، کوئی ملال نہیں تھا بلکہ وہ کافی ہشاش بشاش تھی حالانکہ اس کے شوہر کو مرے ہوئے ابھی صرف چند دن ہوئے تھے۔

میں ڈیوڈ کی کھلی قبر کے پاس بیٹھی تھی۔ "خدا حافظ ڈیوڈ۔" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اسی وقت مجھے اپنے کندھے پر ایک گرم ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا، یہ وہی بھوت تھا جو رات کو میرے بیڈ کی پائنتی کے پاس کھڑا تھا۔ مجھے اس وقت اسے دیکھ کر شدید غصہ آ گیا۔ میں اس وقت تنہا رہنا چاہتی تھی۔ ڈیوڈ سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت مجھے اپنے قریب کسی کی بھی مداخلت پسند نہیں تھی۔ وہ اس وقت لوگوں کے ہجوم میں شامل تھا۔ میں اس کے آر پار نہیں دیکھ سکتی تھی اور اس کے ہاتھ کا لمس بھی گرم تھا... وہ بھوت کیسے ہو سکتا تھا؟ بہرحال، میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "کیا کوئی انسان ایک لمحہ بھی تنہا سکون سے نہیں گزار سکتا؟" اور اس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی لیکن میرا ہاتھ صرف اپنے کندھے کو چھو کر رہ گیا۔ میں خوف سے لرز گئی۔ اس نے دکھ سے سر ہلایا اور ہاتھ ہٹا لیا۔

"میں بھوتوں پر یقین نہیں رکھتی۔" میں نے ہچکچا کر کہا۔ "کیا تم ڈیوڈ ہو؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ شاید وہ مجھے کچھ مختلف نظر آ رہا ہے لیکن ہے

ڈیوڈ ہی... مگر بھوت نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کیا تم مجھے تھوڑا سا وقت دو گے کہ میں اپنے شوہر کو خدا حافظ کر لوں؟" اس نے آہستہ سے سر جھکایا اور غائب ہو گیا۔ میں کانپ کر رہ گئی۔ جب میں ذرا پُرسکون ہوئی تو میں نے دل ہی دل میں ڈیوڈ کو پکارا۔ "ڈیوڈ! یہ تم کیوں نہیں ہو؟ اگر میں پاگل ہو رہی ہوں اور بھوت دیکھنے لگی ہوں تو پھر یہ تمہارا ہی بھوت کیوں نہیں ہے؟ ڈیوڈ! میرے سامنے آؤ، چاہے کسی بھی شکل میں ہو... میں تمہاری واپسی چاہتی ہوں۔" میں نے انتظار کیا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

"خدا حافظ ڈیوڈ!" میں نے مایوس ہو کر کہا۔ "میں تمہیں بہت یاد کروں گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں تمہارے بغیر زندہ کیسے رہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ میں بہت دن تک اداس رہوں گی۔"

میں ابھی واپسی کا ارادہ کر رہی تھی کہ سامنے سے سراغ رساں روسو کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرے والا انسان تھا... نہ خوب صورت، نہ بدصورت۔ درمیانہ قد، چھوٹے چھوٹے بال... اس کی آنکھیں، اس کی آواز، اس کا چہرہ، کسی چیز سے بھی اس کے دل کی اندرونی کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا تھا لیکن جب اس سے تھوڑی دیر بات کرو تو اس کی ذہانت کا پتا چلتا تھا۔ اس کی شخصیت پُرسکون سمندر جیسی تھی۔

"ہیلو روسو!" جب وہ میرے نزدیک آیا تو میں نے کہا۔

"ہیلو... ڈاکٹر بلیک برن!" اس نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے میں نے مداخلت کی۔ میں صرف یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ آپ ٹھیک ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ میں اب واپس جانا چاہتی ہوں۔"

اس نے اپنا ہاتھ پیش کر کے مجھے حیران کر دیا لیکن میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور خاموشی سے لیموزین کی طرف بڑھ گئی۔ جب ہم گاڑی کے پاس پہنچے تو میں نے اسے گھر چلنے کی دعوت دی لیکن اس نے نرمی سے انکار کر دیا۔

"کیا تم پورا وقت مجھے وہاں بیٹھے دیکھتے رہے تھے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا۔

"جی ہاں میڈم! میں آپ کو دیکھ رہا تھا۔" اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا۔

"کیا تم نے کسی اور کو بھی میرے ساتھ دیکھا؟" میں نے اس سے تصدیق چاہی۔

"نہیں میڈم! میں نے کسی اور کو آپ کے ساتھ نہیں دیکھا۔ لیکن کیوں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ بس میں نے اس لیے پوچھا تھا کہ شاید اس حادثے سے متعلق تمہیں کچھ اور معلومات ہوں۔" میں نے بے ربط سے جملے کہے۔

"نہیں، مجھے افسوس ہے ڈاکٹر بلیک برن لیکن ہم اس کیس پر تیزی سے کام کر رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"اسی لیے تم یہاں نظر آ رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں میڈم!" وہ بولا۔

میں نے اسے خدا حافظ کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میرے ایک طرف میری بہن لیزا تھی اور دوسری طرف میرے والد میرا ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے۔ ہم گھر پہنچے تو وہاں بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ بھوت شاید کچھ گھبرایا ہوا تھا، اسے میں نے لوگوں کے بیچ کھڑے دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں لوگ واپس چلے گئے۔ لیزا کو تقریباً پچاس دفعہ یقین دلانے کے بعد کہ میں ٹھیک ہوں اور تنہا رہنا چاہتی ہوں... واپس بھیجا۔ بھوت بہت بے چینی سے میرے تنہا رہ جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب سب چلے گئے اور میں تنہا رہ گئی تو ہم اندر آ گئے۔

"او کے! اب ہم بات کر سکتے ہیں۔" میں نے اس سے کہا۔ وہ میرے ساتھ لیونگ روم میں آیا اور ہم ایک صوفے پر مخالف سمتوں میں بیٹھ گئے۔

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا صرف کچھ اشارے کیے جو میری سمجھ میں نہیں آئے۔

"کیا تم بول نہیں سکتے؟" میں نے پوچھا۔ اس نے منہ کی طرف اشارہ کر کے نفی میں سر ہلایا۔

"میں تمہیں کاغذ قلم دوں تو تم لکھ سکتے ہو؟" اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"میرا خیال ہے کہ بھوتوں کو ٹھنڈا ہونا چاہیے لیکن آج جب تم نے مجھے چھوا تو تم گرم تھے۔ شاید تمہیں مرے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور چار انگلیاں اٹھائیں۔

"چار دن ہوئے ہیں، ٹھیک ہے۔" میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم میرے ہی پاس کیوں آئے؟" میں نے پوچھا تو وہ آتش دان کی طرف گیا اور ڈیوڈ کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"ڈیوڈ کے سلسلے میں؟" میں نے پوچھا تو اس نے پھر سر ہلایا۔

"تمہارا بہت شکریہ۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟" میں نے بھوت کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا پھر کچھ اشارے کیے جو میں سمجھ نہیں سکی۔ وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔

www.pkdigest.com

تک انہوں نے کسی کو انعام کے نام پر ایک پیسا بھی نہیں دیا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ کے پاس جو کچھ ہوگا، وہ لے کر اطمینان سے نکل جاؤں گا اور پولیس کو اطلاع دے دوں گا۔ پھر اگر پولیس انعام دیتی ہے تو وہ میرا بونس ہوگا۔''

میں نے اچانک ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ ''تم اب بھی سچ نہیں بول رہے ہو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں تین تک گنوں گا، پھر فائر کر دوں گا۔ ایک... دو...''

''بتاتا ہوں صاحب... بتاتا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''مجھ سے ورما صاحب نے کہا تھا کہ ایسے جوڑوں پر نظر رکھوں جن میں لڑکی غیر ملکی ہو۔''

''ورما... تم ورما کے آدمی ہو؟''

''جی صاحب!'' وہ سر جھکا کر بولا۔ ''میں پہلے ممبئی میں تھا پھر ورما صاحب اور ان کے پارٹنر نے مجھے یہاں بلا لیا۔ یہ ہوٹل بھی ورما صاحب کا ہی ہے۔''

''اس ہوٹل میں بھی وہی کچھ ہوتا ہے جو ممبئی میں ہوتا ہے؟'' میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''جی صاحب! یہاں بھی ورما صاحب اور ان کے پارٹنر کا یہی دھندا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ ہماری باتیں کوئی اور بھی سن رہا ہوگا؟'' میں نے فکر مندی سے کہا پھر بھنا کر بولا۔ ''سنتا ہے تو سنے... پہلے میں تمہیں تو ٹھکانے لگا دوں۔''

''اس وقت کوئی بھی نہیں سن رہا ہے صاحب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''کمروں کی باتیں بھی میں ہی سنتا ہوں۔ ورما صاحب نے کہا تھا کہ تم ان کے کمرے میں جا کر اس گیس کا اسپرے کر دینا۔'' اس نے ایک اسپرے مجھے دکھایا۔

''اس سے کیا ہوتا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ گیس ڈیڑھ سے دو منٹ کے اندر اندر انسان کو دو تین گھنٹے کے لیے مفلوج کر دیتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اسپرے کرنے کے بعد آپ کے مال پر بھی ہاتھ صاف کر لوں گا۔''

''یہ لوگ جو سی ڈیز اور ویڈیوز بناتے ہیں، انہیں رکھتے کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو ورما صاحب ہی کو معلوم ہوگا صاحب۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ ''میں صرف اور صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ اب میں تین تک بھی نہیں گنوں گا۔ بتاؤ وہ سی ڈیز اور ویڈیوز کہاں ہوتی ہیں؟''

''ورما... ان کے چار پرنٹس بنواتا ہے۔ ماسٹر پرنٹ وہ اپنے پاس رکھتا ہے۔ دوسرا پرنٹ اس کے پارٹنر کے پاس ہوتا ہے۔ تیسرا پرنٹ وہ ان لوگوں کو بھیج دیتا ہے جنہیں بلیک میل کرنا ہوتا ہے یا جن کی سی ڈیز مارکیٹ میں بیچنا ہوتی ہیں۔''

''اور چوتھا پرنٹ؟'' میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''چوتھا پرنٹ اسی ہوٹل کے سیف میں ہوتا ہے جہاں ویڈیوز بنائی جاتی ہیں۔''

''ورما کے ساتھ اس دھندے میں اور کون کون لوگ شامل ہیں؟''

''اس میں بہت بڑے بڑے لوگ ہیں صاحب! کمشنر پولیس، ہوم سیکریٹری اور کئی ایم ایل ایز بھی اس دھندے میں شامل ہیں۔ اسی لیے ورما پر ابھی تک کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک سال پہلے ایک ٹی وی چینل کے رپورٹر نے یہ سب معلوم کر لیا تھا۔ دوسرے دن اس کی لاش کوڑے کے ایک ڈھیر پر ملی اور اس کے گھر کو آگ لگا دی گئی۔''

''یہاں جتنا بھی میٹریل ہے، وہ سب میرے حوالے کر دو۔'' میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''سیف کا نمبر تو صرف ورما صاحب اور ان کے خاص آدمیوں کو معلوم ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو... نہیں مانو گے۔'' میں نے ریوالور لوڈ کیا اور اس کی کنپٹی پر رکھ کر انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔

''مجھے بھی معلوم ہے سر!'' وہ جلدی سے بولا۔ یا تو وہ بنیادی طور پر بزدل تھا یا پھر ورما نے اسے میری ذات سے اتنا خوف زدہ کر دیا تھا کہ وہ بزدلی کا ثبوت دے رہا تھا۔

''چلو میرے ساتھ۔'' میں نے کہا۔ ''اور کوئی چالاکی دکھائی تو صبح پولیس کو یہاں تمہاری بھی لاش ملے گی۔ میں نے اس سے پہلے اتنا میں قتل کیے ہیں۔'' میں نے اسے مزید خوف زدہ کرنے کو کہا۔

''میں یہاں کا کیمرا تو آف کر دوں۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ کر بیڈ کے پیچھے لگا ہوا چھوٹا سا ایک بٹن دبا دیا۔

پھر وہ ہمیں لے کر ایک کمرے میں پہنچا۔ اس کمرے سے ایک راستہ تہ خانے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ سیف نیچے تہ خانے میں ہے۔

وہ تہ خانے میں اتر گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں تھا اور میرے پیچھے جینی۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ وہ تہ خانہ کیا، خاصا کشادہ کمرا تھا۔ اس میں ایک طرف بڑا سا ایک سیف لگا ہوا تھا۔

''چلو، اب سیف کھولو۔'' میں نے اسے حکم دیا۔

وہ جونہی سیف کی طرف بڑھا، کمرا اچانک تیز روشنی میں نہا گیا۔

میں بوکھلا کر پلٹا تو مجھے تہ خانے کے دروازے پر چار آدمی نظر آئے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''ویلکم مسٹر کامران! آخر تم ہمارے جال میں پھنس ہی گئے۔ ہمیں امید تو نہیں تھی کہ تم اتنی آسانی سے ہمارے قابو میں آ ؤ گے۔ اسی لیے میں نے چندر کو اسپرے دے کر بھیجا تھا کہ وہ اسپرے کر کے تمہیں بے ہوش کر دے لیکن تم ضرورت سے کچھ زیادہ ہی محتاط اور ذہین ہو۔ تم نے اسپرے سے پہلے ہی چندر پر قابو پا لیا۔ ہم تو اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ ہاں، ہوٹل کے ہر اس دروازے پر ہم نے اپنے آدمی بٹھا دیے تھے جہاں سے تمہارے باہر نکلنے کا امکان ہو۔ مگر یہ چندر تو بہت ذہین نکلا۔ اس نے تمہیں سب کچھ سچ سچ بتایا ہے، سوائے اس کے کہ سی ڈیز اور ویڈیوز یہاں ہوتی ہیں۔ اب تم خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ ساتھ یہ حسین لڑکی بھی بے موت ماری جائے اور اس دفعہ کوئی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میرے آدمی تمہیں بلا جھجک گولی مار دیں گے۔ میرا تعلق پولیس سے ہے اور میں اس علاقے کا اے سی پی ہوں۔ یہ چاروں بھی انسپکٹر ہیں۔ چلو، اب دیر مت کرو۔''

جینی نے میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ یہ ہوٹل چھوڑ دو، اب دیکھ لیا اپنی ضد کا انجام!

''چلو، کہاں چلنا ہے؟'' میں نے کہا۔

''پہلے اپنے دونوں ہاتھ دیوار سے لگاؤ اور تلاشی دو۔'' اے سی پی نے کہا۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے ایک آدمی نے اتنی مہارت سے میری تلاشی لی کہ مجھے کچھ بھی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ لوگ واقعی پولیس سے تعلق رکھتے تھے۔

''اب تم بھی اپنی تلاشی دے دو۔'' اے سی پی نے جینی سے کہا۔ ''خوب صورت لڑکیوں کی تلاشی تو میں خود لیتا ہوں۔''

اس نے جینی کو دیوار سے ہاتھ لگانے کو نہیں کہا تھا، یہی اس کی بھول تھی۔ جینی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور پہلے ہی پھینک دیا تھا اور اب دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے کھڑی تھی۔

وہ سب جینی کی تلاشی کا منظر دیکھنے کے لیے کمرے میں آ گئے تھے۔ اے سی پی نے جینی کو دوسری طرف رخ کرنے کو کہا۔ پھر اس نے جینی کی کمر کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ جینی کی دائیں ٹانگ چلی اور اے سی پی کے پیٹ میں لگی۔ وہ درد سے دہرا ہو گیا۔ جینی نے دروازے کے نزدیک کھڑے ہوئے دوسرے آدمی پر دائرے میں گھوم کر زوردار لات ماری اور کھلے ہوئے دروازے سے باہر بھاگ گئی۔

میں نے بھی باہر نکلنے کی کوشش کی مگر وہ سب ایک ساتھ مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ پھر ان میں سے کسی نے میرے سر پر کسی وزنی چیز سے وار کیا۔ آخری آواز میں نے اے سی پی کی سنی۔ وہ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''پکڑو اس سفید کتیا کو... وہ نکل کر جانے نہ پائے۔'' پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

بے ہوشی کا یہ وقفہ نہ جانے کتنا طویل تھا یا پھر مجھے کچھ ہی دیر بعد ہوش آ گیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

مجھے ہوش آیا تو میرا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ میرے پیروں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

گویا پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا تھا۔ میرے کھاتے میں اتنے قتل تھے کہ میں خود کو پاکستانی ایجنٹ ماننے سے انکار کر بھی دیتا، تب بھی پھانسی کا تختہ میرا مقدر تھا۔

میں جس لاک اپ میں تھا، وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہاں بس میلی سی ایک دری تھی اور کونے میں پانی کا مٹکا رکھا تھا۔

میں اسی طرح پڑا رہا۔ پندرہ منٹ یا شاید آدھے گھنٹے بعد وہاں قدموں کی آہٹیں ابھریں۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ مجھے سب سے پہلے ورما کا منحوس چہرہ نظر آیا۔ اس کے سر پر ابھی تک پٹی بندھی تھی۔ شاید جینی نے کچھ زیادہ ہی قوت سے وار کر دیا تھا۔ ورما کے پیچھے وہی اے سی پی تھا جو مجھے گرفتار کر کے لایا تھا۔ اس کے ساتھ دو انسپکٹر تھے۔

ورما نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں بھئی سپرمین! اب بلاؤ اپنی ایجنسی کو کہ وہ تمہاری مدد کرے۔'' پھر وہ اے سی پی سے مخاطب ہوا۔ ''اس کے پیروں میں بیڑیاں اور ہتھکڑیاں کیوں ڈال رکھی ہیں؟ جب تک کوئی قیدی لاک اپ میں

اچھا آدمی

ایک صاحب جو ملک بھر میں بہت جھوٹے مشہور تھے۔ کسی شہر میں آئے تو ان کی شہرت سن کر ایک ستر سالہ بوڑھی عورت اس سے ملنے آئی اور بولی۔ ''بیٹے کیا تم وہی ہو جس سے بڑا جھوٹا اور کوئی نہیں؟''

جھوٹے نے جواب دیا۔ ''محترمہ چھوڑیے اس بات کو۔ میں آپ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا ہوں۔ کمال ہے، یہ عمر اور اس پر یہ حسن، یہ جمال، یہ کشش۔ جواب نہیں آپ کا۔''

وہ خاتون شرما کر بولی۔ ''ہائے اللہ، لوگ کتنے جھوٹے ہیں جو ایک اچھے خاصے آدمی کو جھوٹا کہتے ہیں۔''

www.pkdigest.com

"تم ڈیوڈ کو جانتے ہو، ٹھیک ہے۔" میں نے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم مجھے پریشان کرنا چاہتے ہو؟ کیا میں نے ڈیوڈ کے ساتھ کچھ غلط کیا تھا؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیا تم اپنی کسی غلطی کا اظہار کرنا چاہ رہے ہو؟" میرے سوال کے جواب میں اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بھوت بننے سے پہلے تم ڈیوڈ کو جانتے تھے؟" اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا تم ان ملازمین میں سے ایک تھے جو ایسڈ ٹینک پھٹنے سے مر گئے تھے؟" وہ چونک پڑا لیکن نفی میں سر ہلایا اور چار انگلیاں اٹھائیں۔

"اوہ! ہاں، وہ تو پانچ دن پہلے مرے تھے... تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تم چار دن پہلے مرے تھے؟ لیکن وہ آدمی جو چار دن پہلے مرا تھا، وہ تو پلانٹ منیجر ڈیوریکس تھا۔ کیا تم وہی ہو؟" میں نے پوچھا تو اس نے بہت افسردگی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا تم نے خودکشی کی؟" میں نے پوچھا تو وہ اپنا سر زور زور سے دائیں بائیں ہلاتے ہوئے جوش سے کھڑا ہو گیا جیسے کہنا چاہتا ہو... نہیں، ہرگز نہیں۔

"تو پھر تمہیں کسی نے قتل کیا؟" اس کا جواب ہاں میں تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کس نے؟" اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں پہنی ہوئی شادی کی انگوٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ میں اب اس کی اشاروں کی زبان کافی حد تک سمجھنے لگی تھی لہٰذا میں نے پوچھا۔

"تمہاری بیوی نے تمہیں قتل کیا؟" اس کا جواب ہاں میں تھا۔

تین دن پہلے کی تمام کہانیاں مجھے یاد آنے لگیں لیکن سب دھندلی دھندلی تھیں۔ میں بھاگ کر گئی اور تین دن پہلے کے اخباروں کا پلندا اٹھا لائی۔ پھر وہ اخبار نکالا جس کے پہلے ہی صفحے پر ڈیوریکس کی خودکشی کی کہانی تھی۔ میں نے بہ آوازِ بلند پڑھنا شروع کیا۔ "مسٹر چانس ڈیوریکس... چانس!"

"کیا تمہارا پہلا نام چانس ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پھر پڑھنا شروع کیا۔

"مسٹر چانس ڈیوریکس... ایمرے اینڈ ویلڈن کے پلانٹ منیجر نے کل شام خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی۔ اس کی بیوی لوئس جو خود بھی ایمرے اینڈ ویلڈن کے مالک مسٹر ونسلو ایمرے کی سیکریٹری ہے، کافی دیر سے آفس سے گھر پہنچی تو اپنے شوہر کی لاش دیکھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر منگل کے دن فیکٹری میں ایسڈ ٹینک کے پھٹنے سے تین ملازمین کے موت کا شکار ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ رنجیدہ تھا۔ وہ خود کو ان کی موت کا ذمے دار سمجھتا تھا کیونکہ مسٹر چانس ڈیوریکس کو ٹینک کے متعلق ملازمین کی طرف سے شکایتیں ملتی رہی تھیں لیکن اس سے ٹینک کی مرمت کرانے میں غفلت ہوئی..."

میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور کہا۔ "کاش! ٹینک کی مرمت وقت پر ہو جاتی تو متوقع اموات کو روکا جا سکتا تھا۔ بہرحال، میرا نام ڈاکٹر ایما بلیک برن ہے۔ کیا میں تمہیں چانس کہہ سکتی ہوں؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا تمہاری بیوی لوئس مسٹر ایمرے کی سیکریٹری ہے؟" اس نے پھر سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا۔ "اور تم نے خودکشی نہیں کی بلکہ تمہاری بیوی نے تمہیں قتل کیا ہے؟" اس نے سر ہلا کر ہاں کہا۔

"کیسے؟" اس نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔

"اس نے تمہارے منہ میں پستول رکھ کر فائر کیا؟" میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں لرز کر رہ گئی۔ "یہ کس طرح ممکن ہے؟ میں نے دیکھا ہے تمہاری بیوی کو... وہ اتنی لمبی نہیں ہے۔" میں نے پوچھا۔ اس نے ایک گلاس اٹھایا، اس میں کچھ ڈالا پھر اس میں کوئی چیز ملائی اور اس کو پینے کی ایکٹنگ کی... اس کے بعد آنکھیں بند کر لیں۔

"اس نے تمہاری ڈرنک میں کوئی دوا ڈالی تھی؟ تم بے ہوش ہو گئے پھر اس نے تمہارے منہ میں پستول رکھ کر فائر کر دیا... ٹھیک ہے نا؟" میں نے وضاحت سے بیان کیا... تو اس نے اسے درست قرار دیا۔

"لیکن لیبارٹری کے تجزیے سے خواب آور دوا کی تصدیق نہیں ہوئی۔" اس نے حیرانی اور مایوسی کا اظہار کیا۔ "اور انہوں نے اسے خودکشی کا کیس قرار دے دیا۔" میں نے کہا۔ اس نے پھر اپنا سر ہلایا۔

"کیا تمہیں دفن کیا گیا تھا؟" میں نے تھوڑا ہچکچا کر پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا لیکن وہ بہت رنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"کیا تمہیں وہ جگہ پسند نہیں ہے جہاں تمہیں دفن کیا گیا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور کراس کا نشان بنایا۔

"تم کیتھولک ہو اور تمہیں کیتھولک قبرستان میں دفن نہیں کیا گیا۔ ٹھیک؟" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہی وجہ ہے کہ تم مجھے تنگ کر رہے ہو۔" میں نے عاجز آ کر کہا، اس نے بہت دکھ سے مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے سے مایوسی ظاہر ہونے لگی پھر وہ غائب ہو گیا۔ جیسے ہی وہ گیا، گھر خالی خالی لگنے لگا۔

"واپس آؤ۔" میں نے شرمندگی سے کہا لیکن وہ نہیں آیا۔

"چانس! پلیز واپس آ جاؤ۔ میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔ اس وقت میں بہت مشکل وقت سے گزر رہی ہوں۔ "تنگ کرنے" کے الفاظ میں نے تمہیں ناراض کرنے کے لیے تو استعمال نہیں کیے۔ اگر تم واپس آ جاؤ گے تو میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کروں گی۔" میرے یہ کہنے پر وہ واپس آ گیا۔ میں نے گفتگو کا سلسلہ پھر شروع کیا اور پوچھا۔

"مجھے بتاؤ، ڈیوڈ کا ان معاملات سے کیا تعلق ہے؟" اس نے کچھ لمحے سوچا پھر ڈیوڈ کی تصویر کی طرف اشارہ کیا پھر اس کے سر کی طرف۔

"کیا ڈیوڈ نے بھی تمہارے سر پر گولی چلائی؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔

"ٹھہرو، ٹھہرو... میں سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ڈیوڈ نے مجھے بتایا تھا کہ میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتا جو تمہارے متعلق کہی گئی تھیں اور ڈیوڈ کے پاس تمہارے بے قصور ہونے کا ثبوت بھی تھا۔ کیا یہی تمہارے کہنے کا مطلب ہے؟" اس نے اثبات میں زور زور سے سر ہلایا اور کچھ مطمئن اور پُرسکون نظر آنے لگا۔

اپنے سوالوں، چانس کے اشاروں اور سر کی حرکات سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ڈیوڈ کے پاس ثبوت تھا جس کے مطابق چانس نے بہت پہلے ایسڈ ٹینک کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایمرے نے انکار کر دیا تھا... کیونکہ اس کی مرمت پر بہت زیادہ لاگت آ رہی تھی۔ ڈیوڈ نے چانس کو بتایا بھی تھا کہ اس نے وہ کاغذات کہاں چھپا کر رکھے ہیں جنہیں سامنے لانے سے چانس بے قصور ثابت ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے پوچھا۔

"ڈیوڈ کو اسی لیے قتل کر دیا گیا؟" اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور نظریں جھکا لیں جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے افسوس ہے۔ میں نے کہا۔ "تمہارا کوئی قصور نہیں۔ میں سراغ رساں روسو سے اس سلسلے میں بات کروں گی اور تمام حقیقت سامنے لاؤں گی۔" وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔

میں نے روسو کو فون کیا اور اسے بتایا کہ میرے پاس ڈیوڈ کے کیس سے متعلق اور شاید دوسرے کیس کے متعلق بھی کافی معلومات ہیں اس لیے وہ میرے گھر آ جائے تاکہ بات ہو سکے۔ اس نے فوراً آنے کا کہا۔ جب وہ آیا تو میں نے اسے کافی پیش کی اور پھر ہم اسی کاؤچ پر بیٹھ گئے جس پر کچھ دیر پہلے چانس اور میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیا تم چانس ڈیوریکس کے کیس پر کام کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا تو اس نے فوراً جواب نہیں دیا۔ میں اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ اچانک چانس بھی آ گیا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا پھر فوراً ہی نظریں ہٹا لیں لیکن روسو نے مجھے چونکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے متجسس نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

"ڈاکٹر بلیک برن! تم ٹھیک تو ہو؟ کیا کوئی چیز تمہیں پریشان کر رہی ہے؟"

میں گھبرا گئی اور ہکلا کر جواب دیا۔ "نن... نہیں... کچھ نہیں۔ ہاں، تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟"

"ہاں... میں چانس ڈیوریکس کیس پر کام کر رہا ہوں۔" اس نے تھوڑا ہچکچاتے ہوئے کہا جیسے وہ اس سلسلے میں بات نہیں کرنا چاہتا ہو۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ اس نے خودکشی کی یا اسے قتل کیا گیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

اسے میرا سوال جواب کرنا اچھا نہیں لگا اور وہ بولا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے ڈپارٹمنٹ سے باہر کسی غیر متعلقہ آدمی سے اس سلسلے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔" اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے اگر تم بتانا نہیں چاہتے تو میں بتاتی ہوں کہ چانس ڈیوریکس نے خودکشی نہیں کی تھی۔ ڈیوڈ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے پاس چانس والے کیس سے متعلق اس کی بے گناہی کے ثبوت ہیں۔ چانس ایسڈ ٹینک بدلنا چاہتا تھا لیکن مسٹر ایمرے نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" میں نے اسے بتایا۔

"تمہارے شوہر نے تمہیں جو کچھ بتایا تھا، اگر وہ سچ ہے تو مسٹر ایمرے کٹہرے کے پیچھے ہوں گے۔ یہ بہت سنجیدہ معاملہ ہے اور اس کے لیے ثبوت چاہئیں... اور شاید تمہارا خیال ہے کہ تمہارے شوہر کو خاموش رکھنے کے لیے ہی قتل کر دیا گیا؟" اس نے استفسار کیا۔

"ہاں، یہی سچ ہے۔" میں نے جوش سے کہا۔ "اور ان کاغذات کو تلاش کرنے کے لیے میں تمہاری مدد چاہتی ہوں۔"

"اور تمہارے خیال میں وہ کاغذات کہاں ہونے چاہئیں؟" اس نے دریافت کیا۔

اسی لمحے ایک موٹی سی کتاب شیلف سے گری۔ اس

www.pkdigest.com

کے گرنے سے میں اچھل پڑی۔ روسو نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھی اور کتاب اٹھا لائی۔ اس کا نام MEN TO MATCH MY MOUNTAINS تھا۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ چانس مجھے کیا بتانا چاہ رہا ہے۔ میں نے روسو کو جواب دیا۔

"وہ کاغذات ہمارے پہاڑی کاٹیج میں ہیں۔" اور ڈرتے ڈرتے چانس کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"روسو! چلو... ہم ابھی پہاڑی کاٹیج پر چلیں گے۔" میں نے جوش سے کہا۔

"اوکے!" وہ کھڑا ہو گیا۔

میں اپنے بیڈروم میں آگئی۔ اپنا کوٹ اٹھایا، گاڑی کی چابی اور پرس اٹھایا۔ میں نے روسو کی طرف دیکھا اس نے بہت ہلکے کپڑے پہن رکھے تھے اور پہاڑ پر بہت سردی ہوگی۔ یہ سوچ کر میں نے ڈیوڈ کی الماری کھولی اور ایک گرم کوٹ روسو کے لیے نکال لیا۔ ساتھ ہی میں بڑبڑا رہی تھی۔

"ڈیوڈ! برا نہ ماننا۔ میں تمہارا کوٹ روسو کو دے رہی ہوں۔" اتنے میں چانس نے آکر میرا کندھا ہلایا اور اشارے سے کہا کہ جلدی کرو۔

"میں جلدی تو کر رہی ہوں۔" میں نے الماری کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر بلیک برن! تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟" روسو نے جو نجانے کب سے بیڈروم کے دروازے پر کھڑا تھا، مجھ سے پوچھا۔

میں گھبرا گئی جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو۔ میں نے ہکلا کر جواب دیا۔ "وہ... اوہ... میں تو... اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ تمہارے لیے ڈیوڈ کا ایک کوٹ لیا تھا کیونکہ پہاڑ پر سردی ہوگی۔" میں نے اسے کوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ ڈاکٹر بلیک برن!" اس نے کوٹ لیتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں تمہیں ایبا کہہ سکتا ہوں؟ جب تم مجھے بے تکلفی سے اپنے شوہر کا کوٹ دے سکتی ہو تو میں بھی تمہیں تمہارے نام سے پکار سکتا ہوں... اگر اجازت ہو تو؟"

"کیوں نہیں۔ ڈاکٹر بلیک برن تو صرف میرے کالج تک مخصوص ہے۔ آپ مجھے شوق سے ایبا کہہ سکتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ایبا... کیا تمہیں یقین ہے کہ تم مجھے اس کوٹ میں دیکھ کر غمگین نہیں ہوگی؟" اس نے کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور کہا۔ "اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

تقریباً بیس منٹ تک ہمارا سفر خاموشی کے ساتھ طے ہوا۔ اچانک میں نے چانس کو بیک ویو مرر میں دیکھا۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا مگر اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی میں نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن روسو نے سب دیکھ لیا تھا، وہ بولا۔

"یہ تمہارا شوہر ہے... ہے نا؟ اور جب میں تمہارے بیڈروم میں آیا تھا تب بھی تم اسی سے باتیں کر رہی تھیں اور اس سے پوچھ رہی تھیں کہ کیا تم وہ کوٹ مجھے عارضی طور پر دے سکتی ہو؟"

میرے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"پریشان نہ ہو۔ میں بھی اپنی بیوی سے اس کی موت کے بعد باتیں کرتا تھا۔" اس نے مجھے تسلی دی۔

"مجھے افسوس ہے، مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہاری بیوی مر چکی ہے۔ کیا تمہاری بیوی تمہارے سوالوں کا جواب دیتی تھی؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں، اپنے انداز میں دیتی تھی۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "کیا تم مسز چانس ڈیوریکس کو جانتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں اس سے ڈیوڈ کی تدفین کے دن پہلی دفعہ ملی تھی لیکن غائبانہ طور پر بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"کم سے کم تم دونوں کو ایمرے اینڈ ویلڈن کے ملازمین کی انشورنس پالیسی پروگرام سے فائدہ ہوگا۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"چاہے موت کسی بھی طریقے سے واقع ہوئی ہو... بے شک خودکشی سے بھی؟" میں نے جاننا چاہا۔

"ہاں، خودکشی کی صورت میں بھی۔" اس نے جواب دیا۔ چانس غصے سے مٹھیاں بھینچنے لگا۔

"لیکن وہ خودکشی نہیں تھی۔" میرے منہ سے نکل گیا۔ روسو نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"تمہیں چانس ڈیوریکس میں کیا دلچسپی ہے جو اس کی خیر خواہی کر رہی ہو؟ میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے ایمان داری سے کام نہیں لے رہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو گی۔ میں ایک پولیس والا ہوں اور ہر قسم کے لوگوں کو پہچانتا ہوں۔"

اس کے بدلے ہوئے رویے اور سخت لہجے نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں اسے کیسے بتاتی کہ مجھے یہ معلومات ایک بھوت سے حاصل ہوئی ہیں۔ کوئی پولیس والا اس بات پر یقین کرے گا؟

"تمہارے کہنے کا مطلب کیا ہے؟ تم مجھ سے کس طرح بات کر رہے ہو؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

اس نے ایک آہ بھری اور بولا۔ "مطلب یہ کہ مجھے معلوم ہوا ہے کچھ دن پہلے تمہارے حلیے کی ایک عورت سینٹ جارج ہوٹل میں ہر ہفتے مسٹر ڈیوریکس سے ملتی تھی۔ ہوٹل کے رجسٹر میں بھی مسٹر اینڈ مسز ڈیوریکس کے نام کا اندراج ہے۔ تمہارا مسٹر ڈیوریکس کے ساتھ معاشقہ چل رہا تھا... ایسا ہی تھا نا؟"

میرا غصے اور دکھ سے برا حال ہو گیا۔ میں نے ڈیوڈ کے لوئس کے ساتھ تعلقات کو سب سے چھپایا تھا لیکن یہ الزام میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس لیے اب مجھے سب کچھ روسو کو بتانا پڑا کہ وہ میں اور ڈیوریکس نہیں تھے بلکہ لوئس اور میرا شوہر تھے۔ "چھ مہینے پہلے میرے شوہر نے بتایا تھا کہ اس کا ایک افیئر چل رہا ہے۔ ڈیوڈ اور وہ عورت بدھ کی رات سینٹ جارج ہوٹل میں ملتے تھے۔ میں بدھ کی رات کالج میں ایک کلاس لیتی تھی۔ تم کالج سے پتا کر سکتے ہو۔ چانس ڈیوریکس اور ڈیوڈ قد کاٹھ میں ایک جیسے لگتے تھے اور لوئس کے اور میرے بال بھورے ہیں اور آنکھیں نیلی ہیں۔ انہوں نے ہمارے نام استعمال کیے ہوں گے۔ تم معلومات کرو تو پتا چل جائے گا کہ چانس ڈیوریکس کی بھی بزنس کے سلسلے میں بدھ کی رات کافی مصروفیات ہوتی تھیں اسی لیے اس کی بیوی کی میرے شوہر کے ساتھ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ ہمارا نام استعمال کرتے رہے اور ہمیں شک بھی نہیں ہوا۔"

میری آواز میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میرا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ شرم کے مارے زمین میں سما جاؤں۔ میرے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا لہٰذا میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

روسو گھبرا گیا اور شرمندگی سے اظہار افسوس کرتا رہا۔ اس وقت تک ہم کاٹیج تک پہنچ چکے تھے۔ روسو گاڑی سے نیچے اترا۔ دوسری سائیڈ سے آکر گاڑی کا دروازہ کھولا اور مجھے اترنے میں میری مدد کی اور میرا ہاتھ تھام کر گڑگڑانے لگا۔

"ایبا! مجھے سچ سچ بہت افسوس ہے۔ میں بالکل گدھا ہوں۔ مجھے اس معاملے کی تصدیق کرنی چاہیے تھی۔ میں نے صرف ہوٹل کی کلرک کے بیان پر بھروسا کر لیا۔ میں قصوروار ہوں۔ تم چاہو تو سزا کے طور پر مجھے کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔ پلیز! مجھے معاف کر دو۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔ "آج میں نے پورا دن بہت مشکل میں گزارا ہے اس لیے میں خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ چلو، اب اندر چلتے ہیں اور کاغذات تلاش کرتے ہیں۔" اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس وقت برف تو نہیں پڑ رہی تھی لیکن جمعرات کو پڑنے والی برف ابھی تک موجود تھی۔ کاٹیج کی چھت اور زمین پر برف کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ چانس میرے کندھے پر ہاتھ رکھے میرے ساتھ خاموشی سے چل رہا تھا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ برف پر اس کے قدموں کے نشان نہیں بن رہے تھے لیکن اس کے ہاتھ کی گرمی زندہ انسانوں جیسی تھی۔ اچانک روسو نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

"ٹھہرو... یہاں برف جمعرات کو گری تھی... ٹھیک؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔

"کیا تم نے یہاں کسی اور کو بھی بلایا تھا۔ کوئی مہمان یا کوئی دیکھ بھال کرنے والا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، کسی کو بھی نہیں بلایا۔" میں نے جواب دیا اور اس سمت میں نظر دوڑائی جدھر روسو دیکھ رہا تھا۔ کاٹیج کے باہر دو افراد کے قدموں کے نشان بنے ہوئے تھے۔ جو تازہ تھے۔ لگتا تھا کہ وہ افراد کاٹیج میں داخل ہوئے تھے اور اپنا کام دکھا کر چلے گئے تھے۔ روسو نے مجھے روکا۔

"تم تھوڑی دیر یہیں ٹھہرو... مجھے دروازے کی چابیاں دے دو۔ میں پہلے دیکھتا ہوں کہ اندر کوئی خطرہ تو نہیں۔" میں نے سر ہلایا اور چابیاں اسے دے دیں۔ وہ محتاط انداز میں کاٹیج کی طرف بڑھنے لگا۔ پرانے قدموں کے نشانات کو ضائع کیے بغیر وہ کاٹیج کا تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت مجھے چانس سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم جانتے ہو۔ ہم سے پہلے یہاں کون آیا تھا؟"

"لوئس اور ایمرے۔" اس نے اشارے سے بتایا۔

"کیا انہیں وہ چیز مل گئی جس کی تلاش میں وہ یہاں آئے تھے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔ پھر اچانک ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا، روسو کاٹیج سے واپس آ رہا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ آتے ہی اس نے کہا۔

"کوئی یہاں آیا تھا۔ اس نے کاٹیج کی تلاشی لی اور اچھا

www.pkdigest.com

مطلوبہ چیز حاصل کرنے کے بعد روانہ ہو گیا۔ کاش! ہم ذرا اور جلدی آجاتے تو وہ کامیاب نہ ہوتے لیکن ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ میں شیرف کو فون کر کے بلاتا ہوں۔“

”روسو! میں بھی اندر جا کر ایک نظر ڈالنا چاہتی ہوں۔“ میں نے بے قراری سے کہا۔

”تمہارے اندر جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انہوں نے بہت اچھی طرح تلاشی لی ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ اب وہاں کچھ ملے گا۔“ روسو نے مایوسی سے کہا۔

”ٹھیک ہے لیکن ایک نظر ڈالنے میں کیا حرج ہے؟“ میں نے ضد کی۔

”اچھا تو پھر کوشش کرنا کہ کسی چیز کو چھونا نہیں۔“ اس نے تاکید کی۔

روسو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کاٹیج کا سامان پھیلا ہوا تھا۔ کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ ہر دراز کھول کر باہر ڈال دی گئی تھی۔ تصویروں کو ان کے فریم سے الگ کر دیا گیا تھا۔ تکیے اور گدّوں کو ادھیڑ ڈالا تھا۔ ہر چیز الٹ پلٹ تھی۔

روسو بھی ہمارے پیچھے اندر داخل ہوا اور بولا۔ ”میں جانتا ہوں یہ تلاشی کس نے لی ہے؟ لوئس ڈیوریکس اور وِنسلو ایمرے نے۔“

”تم کیسے جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلی وجہ یہ کہ ان کے علاوہ اور کون اس کاٹیج کی تلاشی کے لیے آسکتا ہے؟ دوسری وجہ یہ کہ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ یہ قدموں کے نشان ایک مرد اور ایک عورت کے ہیں۔ اس کے علاوہ میں تمہیں کوئی سبب نہیں بتا سکتا۔“ وہ تھوڑا اسا رک کر دوبارہ گویا ہوا اور معنی خیز انداز میں بولا۔

”کیا تمہارے شوہر کے بھوت نے تمہیں کوئی ٹِپ نہیں دی؟“

”یہ میرا شوہر نہیں ہے۔“ میں نے کہا اور چانس کی طرف مڑی۔ ”کیا میں اسے بتا دوں کہ تم کون ہو؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیا وہ ابھی یہاں موجود ہے؟“ روسو نے تجسس سے پوچھا۔

”ہاں، وہ یہیں ہے اور وہ چانس ڈیوریکس ہے۔ وہ ڈیوڈ کی تدفین والی رات سے میرے پاس آرہا ہے۔ وہ کیتھولک قبرستان میں دفن ہونا چاہتا ہے۔ چونکہ اس نے خودکشی کی تھی، اس لیے اس کی کمیونٹی والوں نے وہاں تدفین کی اجازت نہیں دی۔“ میں نے تفصیل سے بتایا۔

”لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ اس نے خودکشی نہیں کی؟“ اس نے پوچھا۔

”دنیا والوں کے لیے تو اس نے خودکشی ہی کی ہے لیکن اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی بلکہ لوئس نے اسے قتل کیا ہے۔ وہ بول نہیں سکتا لیکن اس کی اشاروں کی زبان کو سمجھنا اتنا مشکل بھی نہیں۔ اس نے واضح کیا ہے کہ لوئس نے گولی مارنے سے پہلے اس کی ڈرنک میں خواب آور دوا ڈال دی تھی۔ جب وہ سو گیا تو اسے گولی مار دی۔ اس طرح اس قتل کو خودکشی کا رنگ دے دیا گیا۔ اب اس کی روح اس وقت تک بھٹکتی رہے گی جب تک اسے کیتھولک قبرستان میں دفن نہ کر دیا جائے۔ روسو! ہمیں اس سلسلے میں اس کی مدد کرنی چاہیے... ہے نا؟“ روسو نے غور سے میری باتیں سنیں اور پھر سر ہلا کر بولا۔

”پہلے اس معاملے سے نمٹ لیں پھر کچھ کرتے ہیں۔“

میں نے دیکھا کہ چانس ٹہلتا ہوا آتش دان کی طرف گیا ہے۔ روسو نے میری نظروں کا تعاقب کیا اور پوچھا۔

”کیا وہ وہاں ہے؟“

”ہاں، آتش دان میں جو دھاتی پلیٹ ہے اس کے نیچے کچھ دکھانا چاہتا ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔ روسو آتش دان کے پاس گیا اور نیچے بیٹھ کر دھاتی پلیٹ اٹھائی۔ مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی جب اس نے وہاں سے کاغذوں کا ایک بنڈل کھینچا۔ چانس نے میرا کندھا دبایا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں شکر گزاری کے آنسو تھے۔ پھر وہ غائب ہو گیا۔

کاغذات سے ثابت ہو گیا کہ چانس بے قصور تھا۔ کاٹیج میں ایمرے اور لوئس کے فنگر پرنٹس بھی مل گئے۔ ایمرے کو ملازمین کے قتل جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ ایمرے نے بعد میں ڈیوڈ کو قتل کرنے میں لوئس کی مدد کرنے کا بھی اعتراف کیا اور پولیس کو بتایا کہ لوئس نے چانس کو بھی قتل کیا تھا۔

میں نے چانس کو آخری دفعہ دیکھا، جب میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی تدفین کے کاغذات پر دستخط کیے کہ میں اس کی لاش کو کیتھولک قبرستان میں منتقل کرنے کے تمام اخراجات اٹھاؤں گی۔ وہ مجھے اپنی قبر پر ملا اور احسان مندی سے مجھے گلے لگا لیا۔ وہ ابھی تک گرم تھا۔

روسو اور میں نے ایک سال پہلے شادی کر لی ہے۔ ہم فارغ اوقات میں ایک دوسرے کو بھوتوں کی کہانیاں سناتے ہیں۔

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ

وادی محبوب سے نکل کر دربدر ہو جانے والے خاندان کا پُراثر ماجرا

منظر امام

دلدار وادی

دوستی کرنے کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا ... یہ کبھی بھی اور کسی سے بھی ہو سکتی ہے ... ایک حسین و دلفریب وادی کے پُرسکون مسکن میں قیام پذیر دوشیزہ کا احوالِ زیست جو فطرت کی دلدادہ تھی ... پھولوں ... درختوں سے خاص اُنس اور یگانگت رکھتی تھی۔

وہ ایک پیالہ نما وادی تھی۔

اس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے جن کی چوٹیوں پر برف جمی رہتی اور جب ہوائیں ان چوٹیوں سے ہوتی ہوئی وادی میں آتیں تو ان میں انار، شہتوت اور انگوروں کی خوشبوئیں بھی شامل ہوتیں۔

وادی میں چاروں طرف صنوبر اور سرو کے درخت تھے جن کے پتے ہواؤں سے تالیاں بجایا کرتے۔ زمین پر ہر طرف سرسبز گھاس کی چادر بچھی ہوئی تھی۔

پہاڑوں سے بہہ کر آنے والے جھرنے نے ایک چھوٹے سے تالاب کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس تالاب کے آئینے میں پہاڑوں اور درختوں کے عکس جھلملایا کرتے تھے۔

تالاب سے کچھ پرے درختوں کی قطاروں کے ساتھ

چھوٹے چھوٹے مختلف رنگوں کے گھر بنے ہوئے تھے۔ یہ بہت صاف ستھرے گھر تھے جن میں صاف ستھرے لوگ رہا کرتے تھے۔

درختوں کی قطاروں کے پیچھے مکئی اور چاول کی فصلیں لہلہایا کرتیں۔ یہ ولدار وادی کے لوگوں کی فصلیں تھیں۔

یہاں بارش بھی اچھی خاصی ہوتی تھی۔ بارش کی وجہ سے دھان کی فصلیں بہت اچھی ہوا کرتیں۔ ولدار وادی میں بہت پُرسکون اور خاموش مزاج لوگ رہتے تھے۔

ان کے یہاں موجودہ دور کی زندگی کی پیچیدگیاں نہیں تھیں۔ ان کے وسائل اگرچہ کم تھے لیکن مسائل بھی بہت کم تھے۔ ان کے یہاں کوئی سیاسی پارٹی نہیں تھی۔ کاروبار کی منافقتیں نہیں تھیں۔ جاگیردارانہ نظام کا کوئی جبر نہیں تھا۔ بجلی اور فون کے بل نہیں آیا کرتے تھے۔

تالاب کنارے بیٹھ کر پہاڑوں کو دیکھتے رہنا ان کی واحد تفریح تھی۔ یہاں بہار کا موسم اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا کرتا۔ ہر طرف پھول ہی پھول کھل جاتے۔ رنگ برنگے خوب صورت پھول... اور پوری ولدار وادی ان پھولوں سے مہکتی رہتی۔

انہی پُرسکون گھروں میں سے ایک گھر میں فرزین بھی رہتی تھی۔ ایک بہت خوب صورت بچی، جس کی عمر بارہ تیرہ برس تھی۔ وہ اتنی خوب صورت تھی کہ سب اسے ولدار وادی کی شہزادی کہا کرتے تھے۔

شہزادی اپنے ماں باپ کی اکلوتی تھی۔ اس کے ماں باپ اس سے بہت پیار کرتے۔ اس وادی میں اس کے باپ کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔

وہ تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا بھی جانتا تھا اور ولدار وادی کی اکلوتی مسجد میں نماز بھی پڑھایا کرتا۔ اذان بھی وہی دیتا تھا۔

کرم دین ایک سیدھا سادہ صاف گو اور سچا انسان تھا۔ اس کے گھر سے پچھلی طرف ایک بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی تھی جو اونچے نیچے راستوں سے گزرتی ہوئی مسجد تک جایا کرتی۔

وہ پتھروں سے بنی ہوئی ایک مسجد تھی جس کی گھاس پھوس کی چھت کو بانسوں کے سہارے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ چاہے اور کہیں روشنی ہو یا نہ ہو لیکن اس مسجد میں رات کے وقت چراغ ضرور جلائے جاتے۔ یہ چراغ یا تو خود کرم دین جلایا کرتا یا وادی کا کوئی اور آدمی آ کر جلا جاتا۔

کبھی کبھی فرزین بھی باپ کے ساتھ آ کر شوق میں چراغ جلانے کا کام کیا کرتی تھی۔

مسجد سے ذرا ہٹ کر ایک اور پگڈنڈی گھومتی ہوئی تالاب کے پاس آجاتی تھی۔ وہاں ایک ایسا گوشہ تھا جو شاید وادی والوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔

اس گوشے میں فرزین کا ایک دوست ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک پودا تھا... صنوبر کا۔ اسے فرزین نے اپنا دوست بنا رکھا تھا۔ وہ یہاں بیٹھ کر اس سے باتیں کیا کرتی۔

اس نے اس پودے کی بہت خدمت بھی کی تھی۔

وہ پودا خواب میں آکر اس سے باتیں بھی کیا کرتا تھا۔

ایک دن اس پودے نے فرزین سے کہا۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”کس بات کا ڈر؟“ فرزین نے پوچھا۔

”ایسا لگتا ہے جیسے کوئی میرا دشمن ہو گیا ہے۔“ پودے نے کہا۔ ”وہ مجھے مار دینا چاہتا ہے۔ مجھے کاٹ دے گا۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔“ فرزین جلدی سے بولی۔ ”میرے اچھے پودے! تم مت گھبراؤ۔ میں تمہاری حفاظت کروں گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“

دوسری صبح فرزین کو وہ خواب یاد آتا رہا۔ وہ پودا اسے اپنی طرف بلا رہا تھا تاکہ وہ آکر اس کی حفاظت کرے۔ فرزین نے اپنے گھر سے روٹی کے ٹکڑے اٹھائے۔ تھوڑا سا مکھن لیا اور اس گوشے کی طرف روانہ ہو گئی جہاں اس کا دوست پودا رہا کرتا تھا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ دن بھر وہاں بیٹھ کر اس پودے کی حفاظت کرے گی اور کسی کو بھی اس کے قریب نہیں آنے دے گی۔ اس نے کھانے کی پوٹلی کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی چھڑی بھی لے لی تھی۔

اور اس پودے کے پاس کوئی تھا۔

شاید کوئی بچہ جو دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا اور آہستہ آہستہ اس طرح ہل رہا تھا جیسے رو رہا ہو۔

فرزین اس کے پاس پہنچ گئی۔ ”اے... کون ہو تم؟“ فرزین نے اسے آواز دی۔

اس بچے نے چونک کر فرزین کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے تھے۔ وہ بہت خوب صورت سا بچہ تھا۔ شاید فرزین ہی کی عمر کا یا اس سے ایک دو سال بڑا ہوگا۔

اس کی بھی آنکھیں نیلی نیلی تھیں اور بال سنہری تھے۔ رنگ بہت صاف تھا اور ماتھے پر چوٹ کا ایک ہلکا سا نشان بھی تھا جو اس کے چہرے پر بہت اچھا لگ رہا تھا۔

”بتاؤ نا... کون ہو تم؟“ فرزین نے دوبارہ پوچھا۔

”میں دانیال ہوں۔“ بچے نے جواب دیا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”میں ابو کے ساتھ آیا تھا۔“ بچے نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں وہ کہاں ہیں؟“

فرزین سمجھ گئی تھی کہ یہ بچہ اپنے ابو سے بچھڑ کر اس طرف آ گیا ہے۔ پھر بھی اس نے اپنے اطمینان کی خاطر پوچھ لیا۔ ”تم میرے پودے کو کاٹنے کے لیے آئے ہو... ہے نا؟“

”کون سا پودا؟“

”یہ والا۔“ فرزین نے پودے کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم اس کے دشمن بن کر آئے ہو۔ اسے مار دینا چاہتے ہو؟“

”نہیں تو۔“ بچے نے جلدی سے انکار میں اپنی گردن ہلائی۔ ”میں اسے کیوں ماروں گا؟ میں تو اپنے ابو کے ساتھ آیا تھا۔“

”کہاں ہیں تمہارے ابو؟“

”پتا نہیں۔ وہ تو کھو گئے۔“ بچے نے جواب دیا۔

فرزین کو خیال آیا کہ شاید اس بچے نے کچھ کھایا نہ ہو۔ اس لیے اس نے پوچھا۔ ”کچھ کھاؤ گے؟ میرے پاس روٹیاں اور مکھن ہے۔“

بچے نے جس نے اپنا نام دانیال بتایا تھا، فرزین کو دیکھتے ہوئے اپنی گردن ہلا دی۔ فرزین نے اپنی پوٹلی کھول دی۔ دانیال بہت شوق سے سب کھاتا رہا۔

فرزین بہت غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بچہ کہیں اور سے آیا تھا۔ کسی دور دیس سے۔ شاید ان پہاڑوں کی دوسری طرف سے جن کی چوٹیوں پر برف جمی رہتی تھی اور جو چوٹیاں سورج کی روشنی میں شیشے کی طرح جھلملایا کرتیں۔

اس نے بچے سے پوچھا۔ ”تم رہتے کہاں ہو... تمہارا گھر کہاں ہے؟“

”بہت دور۔“ دانیال نے جواب دیا۔ ”ہم بڑی بڑی گاڑیوں پر آئے تھے اور پھر میں کھو گیا۔ نہ جانے وہ لوگ کہاں ہوں گے۔“

فرزین نے سوچا کہ اسے تسلی دی جائے۔ ویسے اس کے دل میں نہ جانے یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ وہ اس بچے کو وہیں اپنے پاس رکھ لے۔

اس کا کوئی دوست بھی تو نہیں تھا۔ صرف یہ پودا تھا لیکن پودا تو صرف خواب میں آکر باتیں کرتا تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اگر یہ اس کے پاس رہ گیا تو یہ اچھی بات نہیں ہو گی۔ اس بے چارے کے ماں باپ کتنے پریشان ہوں گے۔

بچے نے کھانا ختم کر لیا تھا۔ اس نے فرزین سے پوچھا۔ ”تم کہاں رہتی ہو؟“

بچہ

”میں نے ایک نیا آلۂ سماعت خریدا ہے۔“ ایک بہرے نے نیا آلۂ سماعت دوسرے بہرے کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اب میں ٹھیک طور پر تمہاری بات سن سکتا ہوں۔“

”کیا کر سکتا ہوں؟“ دوسرے بہرے نے کچھ نہ سنتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”لو یہ آلہ لگا کر سنو۔“ پہلے بہرے نے آلۂ سماعت دوسرے بہرے کو دے دیا۔ ”اب بتاؤ کہ یہ آلہ کیسا ہے؟“

”اچھا ہے۔“ دوسرے بہرے نے جواب دیا۔ ”بہت اچھا ہے۔“

”بچہ ہے۔“ پہلے بہرے نے غصے سے دوسرے بہرے کی طرف دیکھا۔ ”کس کا بچہ ہے؟“

”وہ اس طرف۔“ فرزین نے اشارہ کیا۔ ”میری امی اور ابو بھی میرے ساتھ رہتے ہیں۔ دونوں بہت اچھے ہیں۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ آؤ... تم میرے ساتھ گھر چلو۔“

وہ جب اس بچے کو لے کر اپنے گھر پہنچی تو اس کے ابو اور امی گھر ہی پر تھے۔ وہ دونوں فرزین کے ساتھ ایک بچے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

”ارے! یہ کون ہے بیٹا؟“ اس کی امی نے پوچھا۔

”امی! یہ ادھر جنگل میں بھٹک رہا تھا۔ اس کے ابو گم ہو گئے ہیں۔“ فرزین نے بتایا۔

”ماشاء اللہ! کتنا پیارا بچہ ہے۔“ کرم دین نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”نہ جانے کس کا بچہ ہوگا... کہاں سے آیا ہوگا؟“ مہر گل نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ ولدار وادی میں جو شکاریوں کی پارٹی آئی ہوئی ہے، یہ بچہ اس پارٹی کا ہے۔“

”چلیں ابو... اس کو لے چلتے ہیں۔“ فرزین نے کہا۔

”بس بیٹا! عصر کی نماز پڑھ کر لے چلوں گا۔“

”میں بھی ساتھ چلوں گی۔“

کرم دین ہنس پڑا۔

لیکن عصر کے بعد بچے کو اس کے پڑاؤ تک لے جانے کی نوبت ہی نہیں آ سکی۔ موسم کے تیور تو صبح ہی سے خراب ہو رہے تھے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ بارش اس طرح پھٹ پڑے گی۔

ان علاقوں کی بارش بھی بہت بھیانک ہوا کرتی تھی۔ پہلے ہلکے ہلکے بادل آسمان پر نمودار ہوتے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ بادل گھنے ہوتے جاتے۔ پہاڑوں کے چاروں

www.pkdigest.com

طرف سے امڈ امڈ کر آتے اور ولدار وادی میں دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا ہو جاتا۔

اس اندھیرے میں رہ رہ کر بجلی چمک اٹھتی اور بادلوں کی خطرناک گونج سنائی دینے لگتی جیسے ہزاروں بم ایک ساتھ پھٹ پڑے ہوں۔ اس کے بعد بارش شروع ہو جاتی اور بارش بھی ایسی کہ ایک تار سا بندھ جاتا۔

ولدار وادی کے لوگ ایسی بارشوں کے عادی تھے۔

اس لیے جب بارش ہوتی تو وہ صرف اتنا کرتے کہ اپنے مویشیوں کو سائبان میں لے آتے۔ اس کے بعد الاؤ روشن کیا جاتا۔ یہ الاؤ عام طور پر مسجد کے دالان میں روشن ہوتا تھا۔

یہ ایک کچا دالان تھا لیکن اس کے اوپر چھت پڑی ہوئی تھی۔ بہت ہی مضبوط قسم کی اس لیے بارش سے محفوظ رہتی۔ الاؤ کے اردگرد کرم دین کچھ لوگوں کو لے کر بیٹھ جاتا اور خدا رسولؐ کی باتیں شروع ہو جاتیں۔ بزرگوں کے قصے بیان کیے جاتے۔

یہ قصے کرم دین نے نہ جانے کہاں سے سن رکھے تھے۔ وہ انہی کو دہراتا رہتا تھا۔ اس دوران قہوے کا دور بھی چلتا رہتا اور جب رات زیادہ ہو جاتی تو سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

اس شام بھی ایسی ہی بارش ہوئی اور دانیال وہیں فرزین کے پاس رہ گیا۔ مہر گل نے اس کے لیے گھی والے پراٹھے اور انڈا بنایا۔

یہ انڈے ان کی اپنی مرغیوں کے تھے۔ دانیال کی گھبراہٹ اور پریشانی ابھی تک ختم نہیں ہو سکی تھی۔ صرف فرزین سے باتیں کر کے وہ کسی حد تک بہل رہا تھا۔

فرزین کے پاس اسے بتانے کے لیے کوئی خاص بات بھی نہیں تھی جبکہ دانیال کے پاس بہت کچھ تھا۔ وہ شہر میں رہتا تھا۔ اس کا ایک خوب صورت گھر تھا جس میں بہت سی چیزیں تھیں جس کا فرزین کو علم نہیں تھا۔

وہ اسکول بھی جایا کرتا۔ اس کی ایک بڑی بہن تھی۔ ماں باپ تھے۔ اس کے باپ کا کوئی بزنس تھا۔ اسے شکار کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ بس وہ اپنے دوستوں کے کہنے پر اس طرف چلا آیا تھا۔ دانیال نے اس کے ساتھ چلنے کی ضد کی تھی۔ اسی لیے وہ دانیال کو بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

اور یہاں آکر نہ جانے کس طرح دانیال ان لوگوں سے بچھڑ گیا تھا اور اس گوشے میں پہنچ گیا تھا جہاں فرزین کا دوست پودا تھا اور جہاں سے فرزین اسے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

دانیال نے اسے بہت سی باتیں بتائیں۔ جواب میں فرزین نے بھی اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ جیسے جب پہاڑوں پر برف گرنے لگتی ہے تو پھر کیسا لگتا ہے اور جب برف صنوبر کے درختوں کے پتوں پر گرتی ہے تو پتے کتنے خوب صورت معلوم ہوتے ہیں۔ زمین ہر طرف سے برف کی سفید چادر اوڑھ لیتی ہے۔

پھر جب بہار کا موسم آتا ہے تو کس طرح کے خوب صورت پھول چاروں طرف اپنے جلوے دکھانے لگتے ہیں۔ پوری ولدار وادی کسی دلہن کی طرح نکھر جاتی ہے۔

اس نے جگنوؤں کے بارے میں بتایا۔ دانیال نے آج تک جگنو نہیں دیکھے تھے۔ شہر میں ایسی چیزوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ پھر اس نے یہ بتایا کہ وہ خود کیا کرتی رہتی ہے۔

دونوں رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔

پھر گہری نیند نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

فرزین کی جب آنکھ کھلی تو مہر گل مویشیوں کے پاس موجود تھی جبکہ دانیال کا کوئی پتا نہیں تھا۔ اس کا باپ کرم دین بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''ماں! وہ کہاں چلا گیا؟'' فرزین نے پوچھا۔

''وہ واپس چلا گیا بیٹی۔'' مہر گل نے بتایا۔

''واپس چلا گیا؟'' فرزین کو یہ سن کر ایک دھچکا سا لگا۔ ''مجھ سے ملے بغیر؟''

''وہ بے چارہ تو تجھے اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا۔'' مہر گل نے بتایا۔ ''لیکن تو ایسی سوئی ہوئی تھی کہ اس کے لاکھ جگانے پر بھی تیری آنکھ نہیں کھلی۔ دوسری طرف تیرے بابا کو بھی جلدی ہو رہی تھی۔ اسے پڑاؤ پہنچ کر بچے کو حوالے کرنے کے بعد کچھ سامان لانے شہر کی طرف بھی جانا تھا۔ اس لیے وہ دونوں چلے گئے۔''

بارش تو اگرچہ رک چکی تھی لیکن فرزین کے سینے میں اٹھنے والا طوفان کہیں زیادہ شدید تھا۔ نہ جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اچانک ہی بالکل خالی ہو گئی ہو۔

''اور ہاں... وہ جاتے جاتے تیرے لیے ایک چیز بھی دے گیا ہے۔'' مہر گل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''وہ کیا ہے ماں؟''

''وہ اندر میرے کمرے کی چارپائی پر رکھا ہے۔'' مہر گل نے بتایا۔ ''جا کر دیکھ لے۔''

وہ ایک لاکٹ تھا۔

چاندی کا بنا ہوا خوب صورت لاکٹ... جو شاید دانیال ہی کا تھا۔ اس لاکٹ میں ایک چھوٹی سی ڈبیا لٹک رہی تھی۔

اس ڈبیا میں ایک تصویر بھی تھی۔ بہت چھوٹی سی۔ اس

لڑکے دانیال کی تصویر... جس کی روشن روشن نیلی آنکھیں شاید فرزین ہی کو دیکھ رہی تھیں۔

فرزین نے وہ لاکٹ اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اب وہ پھر اکیلی ہو گئی تھی۔ وہ لڑکا اس کا دوست بن کر آیا بھی تھا تو بس ذرا سی دیر کے لیے۔ اس نے سوچا کہ بارش کو رکنا نہیں چاہیے تھا۔ یہ ہوتی رہتی... ہوتی رہتی اور وہ لڑکا اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے۔

کرم دین دوپہر تک واپس آ گیا تھا۔ اس نے یہ خبر سنائی کہ اس نے اس بچے کو اس کے باپ تک پہنچا دیا ہے۔ وہ شہر سے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ولدار وادی کے پاس پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

کرم دین نے بتایا کہ اس لڑکے کے باپ نے اسے ہزار روپے بھی دیے ہیں۔ وہ تو انکار کر رہا تھا لیکن اس نے زبردستی کرم دین کی جیب میں ڈال دیے۔

پھر اس وقت فرزین نے سوچا... کاش! اس لڑکے کا باپ بابا کو کبھی نہیں ملتا اور وہ لڑکا اس کے پاس واپس آ جاتا لیکن اب اس کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ لڑکا تو واپس جا چکا تھا۔

وہ دن پھر اداس اداس رہی۔

حالانکہ بارش کے بعد موسم بہت خوب صورت ہو گیا تھا۔ پورا ماحول دھلا دھلا صاف ستھرا اور پہلے سے کہیں زیادہ شاداب نظر آنے لگا تھا۔

ہری ہری گھاس پر چلتی ہوئی سرخ سرخ بیر بہوٹیاں کثیر تعداد میں نکل آئی تھیں۔ بہت سے پرندے بھی اس کے گھر کے سامنے والے گھاس کے ٹکڑے پر اتر آئے تھے۔ ان سب کے باوجود اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب بے کلی سی تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔

اس رات اس نے اپنے دوست پودے کو پھر خواب میں دیکھا۔ وہ دوست پودا بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کی شاخیں زور زور سے اس طرح ہل رہی تھیں جیسے رقص کر رہی ہوں۔ اس کے پتے تالیاں بجا رہے تھے۔

اس پودے نے شاید فرزین کو کوئی کہانی بھی سنائی تھی لیکن فرزین کو دوسری صبح وہ کہانی یاد نہیں رہی تھی۔

وہ اس لڑکے کو بھول نہیں پا رہی تھی۔ وہ اس کے ذہن پر چھا گیا تھا اور اسی شام ایک دوسرا لڑکا وہاں آ گیا۔ وہ شامو تھا۔ اس کی خالہ کا بیٹا۔

وہ لوگ ولدار وادی سے بہت دور کسی قصبے میں رہتے تھے۔ اس کے خالو کی وہاں ایک چھوٹی سی دکان تھی جبکہ شامو

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دار الحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061
0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

یونہی دن بھر آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔

وہ ایک فضول لڑکا تھا۔ فرزین سے دو تین یا چار سال بڑا لیکن اس کی حرکتیں بہت خراب تھیں۔ وہ فرزین کو چھیڑتا رہتا تھا۔ فرزین اسے ناپسند کرتی تھی۔

جبکہ اس کی خالہ اس پر اپنی محبتیں نچھاور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتیں۔

وہ لوگ سال دو سال میں دلدار وادی آجایا کرتے اور آتے وقت اپنے قصبے سے سوغاتیں وغیرہ بھی لے کر آتے... کرم دین کے لیے، مہر گل کے لیے اور فرزین کے لیے۔ اس بار بھی بہت کچھ لے کر آئے تھے۔ کپڑے اور کھانے پینے کی چیزیں لیکن فرزین کو ایسی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی اسے شامو کا آنا اچھا لگتا تھا۔ اس کے لیے تو بس ایک ہی دوست بہت تھا۔

اور وہ تھا اس کا پودا... یا پھر وہ لڑکا جو کچھ دیر کے لیے اس کی زندگی میں بہار کے جھونکے کی طرح شامل ہوا تھا اور جاتے جاتے فرزین کو ایک تحفہ بھی دے گیا تھا۔

کرم دین اور مہر گل نے بہت خوش دلی سے فرزین کی خالہ زرگل اور شامو کا استقبال کیا۔ زرگل، فرزین کو پیار کر رہی تھی جبکہ شامو کی نگاہیں پوری طرح فرزین پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ لوگ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ فرزین کو... بیزاری سی ہونے لگی۔ وہ چپکے سے گھر سے باہر آگئی۔ اس کا رخ اپنے اس گوشے کی طرف تھا جہاں اس کا دوست رہتا تھا۔

وہ پودے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

اس کے پاس اس وقت سنانے کے لیے بہت کچھ تھا۔ اپنی تنہائی... خالہ اور شامو کی باتیں۔ اس نے اپنی باتیں شروع کردیں۔ وہ یہی کیا کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پودا اس کی باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ وہ پھر بھی اس سے باتیں کرتی رہتی تھی۔

پھر اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی خالہ کا بیٹا شامو اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

”میں جانتا تھا کہ تم اسی طرف آئی ہوگی۔“

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”تمہیں ڈھونڈتا ہوا۔“ شامو اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ ”تم سے باتیں کرنی تھیں نا۔“

”لیکن مجھے تو تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔“

”آخر تم مجھ سے اتنا بھاگتی کیوں ہو؟ میں تو تمہارا دوست ہوں۔“

”نہیں، میرا صرف ایک دوست ہے۔“ فرزین نے سختی سے کہا۔

”اور وہ کون ہے؟“ شامو نے غصے سے پوچھا۔

فرزین کا دل چاہا کہ وہ اپنا لاکٹ شامو کو دکھا دے۔ اس لڑکے کی چھوٹی سی تصویر دکھا کر شامو کو بتائے کہ یہی ہے اس کا دوست۔

لیکن کچھ سوچ کر اس نے پودے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ”یہ ہے میرا دوست۔“

شامو زور زور سے ہنس پڑا۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ تمہارا دوست ہے تو میں تمہارے اس دوست کو کاٹ کر پھینک دوں گا۔“

”نہیں۔“ فرزین کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ ”میں تمہارا ہاتھ کاٹ دوں گی۔ زندگی بھر تمہاری صورت بھی نہیں دیکھوں گی۔“

”اچھا بھئی۔“ شامو نے مصالحت والا راستہ اختیار کر لیا۔ ”ناراض مت ہو۔ میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ چلو تتلیاں پکڑتے ہیں۔“

”نہیں، میں تمہارے ساتھ تتلیاں نہیں پکڑوں گی۔“

”وہ کیوں؟“

”تم تتلیوں کے پر نوچ دیتے ہو... بہت گندے ہو تم۔“

شامو سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب تک وہ دلدار وادی میں رہے گا، فرزین سے اس کی دوستی ہو چکی رہے گی لیکن فرزین تو بہت ناراض تھی۔

اس نے فرزین کو منانے کی خاطر کچھ پھول اکٹھے کیے اور فرزین کے پاس رکھ دیے۔ ”یہ لو... یہ سارے پھول تمہارے لیے ہیں۔“

فرزین مسکرا دی۔ اس کی یہ مسکراہٹ شامو کے لیے نہیں بلکہ پھولوں کے لیے تھی۔ وہ پھولوں سے اتنا ہی پیار کرتی تھی۔ شامو اسے مسکراتا دیکھ کر خوش ہوگیا۔ اس نے فرزین کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”چلو، بیر بہوٹیاں جمع کرتے ہیں۔“

فرزین اس کے ساتھ چل دی۔ اس وقت اسے ایسا لگا جیسے اس کا پودا اسے شامو کے ساتھ جانے سے منع کر رہا ہو۔

☆☆☆

پھر پانچ سال گزر گئے۔

اس دوران اس کے علاوہ اور کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی کہ وہ بڑی ہوگئی تھی۔ انتہائی شاداب اور خوب صورت۔ سنہری بال جو کمر تک لہراتے تھے۔ نیلی آنکھوں سے روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوتی۔

دلدار وادی کے لوگ اسے شہزادی کہا کرتے۔ وہ کل بھی ان کے لیے شہزادی کی طرح تھی اور آج بھی شہزادی تھی۔ اس کا وہ پودا بڑا ہوگیا تھا۔ مضبوط اور طاقتور۔ اس نے اس پودے کے تنے پر اپنا نام لکھ دیا تھا... فرزین۔

خواب میں آکر پودے نے اس سے یہی کہا تھا کہ وہ اس کے تنے پر چاقو سے کرید کر اپنا نام لکھ دے۔ فرزین نے خواب ہی میں اس سے کہا تھا کہ اس طرح تو اسے بہت تکلیف ہوگی لیکن پودے نے کہا تھا کہ وہ دوستی کے لیے یہ تکلیف گوارا کر لے گا۔

دوسری صبح فرزین نے اس تنے پر اپنا نام لکھ دیا۔

ان پانچ برسوں کے دوران اس نے اس لڑکے دانیال کے لاکٹ کو ایک بار بھی خود سے الگ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے گلے میں پڑا رہتا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ اب اس کا چہرہ اس کے تصور میں دھندلانے لگا تھا اور جب یہ دھند بہت گہری ہو جاتی تو پھر فرزین اس لاکٹ کی ڈبیا کھول کر اس کی تصویر دیکھ لیتی تھی۔

ان پانچ برسوں میں ایک بار شامو بھی اپنی ماں کے ساتھ دلدار وادی آیا تھا۔ وہ بھی اب خاصا بڑا ہوگیا تھا۔ ہاتھ پاؤں مضبوط ہوگئے تھے اور اس کی آنکھوں کی وہ چمک جو فرزین کو دیکھ کر پیدا ہوتی تھی وہ اور بھی بڑھ گئی تھی۔

یہ پچھلے سال کی گرمیاں تھیں جب فرزین کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔

وہاں گرمیوں کا موسم بے حد خوش گوار ہوا کرتا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ سیر کرنے دلدار وادی کی طرف آجاتے۔ وہ وادی میں اپنے خیمے لگا لیتے اور دن بھر شکار کے لیے چلنے والی گولیوں کی آوازیں گونجا کرتیں۔

کرم دین کو گولیاں چلنے کی آوازیں سخت ناپسند تھیں۔ وہ کہا کرتا۔ ”یہ لوگ آکر ہماری پاکیزہ وادی کے حسن کو غارت کر دیتے ہیں۔ یہاں کا ماحول خراب کر کے چلے جاتے ہیں۔“

لیکن ایک اس کی ناپسندیدگی سے کیا ہوتا ہے۔ دوسروں کے لیے تو باہر سے آنے والے ان کے لیے روزگار لے کر آیا کرتے تھے۔

وادی والے سارا سال اپنے اپنے گھر میں بیٹھ کر جو کچھ بنایا کرتے، وہ ان گرمیوں میں فروخت ہو جاتا۔ رلیاں، رنگین ٹوپیاں، لکڑی کے چھوٹے چھوٹے جانور اور اسی قسم کی اور بہت سی چیزیں۔ ان کے علاوہ ہر گھر میں خاص طرح کے پکوان بھی بنائے جاتے جو آنے والوں کے ہاتھوں فروخت کر دیے جاتے تھے۔

اخبار بین

میرے ایک دوست کو اخبارات پڑھنے کا بہت چسکا تھا جس کے نتیجے میں وہ پاگل ہوگیا ہے اور اس کے ذہن میں عجیب طرح کے خوف اور واہمے جمع ہوگئے ہیں، ایک دن وہ میرے پاس آیا تو بہت گھبرایا ہوا تھا، کہنے لگا۔ ”مجھے کچھ ہوگیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا مطلب؟“ بولا۔ ”کوئی ایک ہو تو بتاؤں میں جب اپنے گھر کی گھنٹی بجاتا ہوں اور اگر اندر سے چند منٹ تک جواب نہ ملے تو میرا ذہن وہ تمام کہانیاں تیار کرنے لگتا ہے جو روزانہ شہ سرخیوں کے ساتھ اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ میں تصوراتی طور پر دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوتا ہوں تو مجھے ٹی وی لاؤنج میں اپنے بچے خون میں لت پت نظر آتے ہیں، ان کی گردنیں تن سے اسی طرح جدا ہوتی ہیں جیسے اخباروں میں چھپی ہوئی تصویروں میں دکھایا گیا ہوتا ہے۔ میں چیختا ہوا گھر سے باہر نکل جاتا ہوں، اہل محلہ مجھے دلاسہ دیتے ہیں پھر اگلے روز کے اخبارات کی سرخیاں مجھے یاد آتی ہیں، جب سات جنازے اکٹھے اٹھے تو کہرام مچ گیا۔ برابر برابر پڑی ہوئی سات لاشوں کی تصویر بھی چھ کالم میں چھپی ہوتی ہے۔ بین کرتی ہوئی عورتوں میں کسی خوش شکل خاتون کو آہ وزاری کرتے دکھایا جاتا ہے۔“

”دو منٹ دروازہ نہ کھلنے پر تمہارا یہ حال ہو جاتا ہے، تم پاگل تو نہیں ہوگئے؟“

ایک دن کرم دین کے ساتھ ایک مونچھوں والا آدمی آیا... وہ مضبوط جسامت والا لمبا چوڑا آدمی تھا جس کے دونوں پہلو... سے پستول لٹک رہے تھے۔

کرم دین اس سے کچھ دبا دبا اور خوف زدہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس آدمی کے ساتھ گھر کے باہر کھڑا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ اسی دوران فرزین گھر سے باہر نکل آئی۔

فرزین کو دیکھ کر اس آدمی کی جیسے سانسیں رک گئیں۔ اس نے کرم دین سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”میری بیٹی۔“ کرم دین نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔ پھر خواہ مخواہ فرزین کو ڈانٹنے لگا۔ ”تم کیوں باہر آگئی ہو... جاؤ اندر... اپنی ماں کو دیکھو۔“

فرزین بوکھلا کر اندر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد کرم دین بھی آگیا۔ اس نے بتایا کہ وہ بڑے صاحب کا خاص آدمی تھا۔ اسے بڑے صاحب کے لیے بھینسیں خریدنی تھیں۔ کرم دین کے پاس وہ انہی کا سودا کرنے آیا تھا۔

کرم دین نے اس کے ہاتھ اپنی تین بھینسیں بیچ دیں

www.pkdigest.com

اور وہ ان کے اچھے پیسے دے گیا۔ پھر ایک دن ایک اور اجنبی کرم دین کے دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑے صاحب کا منیجر تھا۔ اس نے کرم دین سے کہا۔ "کرم دین! تمہیں بڑے صاحب نے بلایا ہے۔"

"مجھے!" کرم دین حیران رہ گیا۔ "مجھ غریب کو کیوں بلایا ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔ کل پہنچ جانا بڑے صاحب کے پاس۔"

وہ آدمی تو اتنا کہہ کر چلا گیا لیکن سب پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ بڑے صاحب نے کرم دین کو کیوں بلایا تھا؟

"بڑے صاحب بہت پیسے والے آدمی ہیں۔" کرم دین نے مہر گل اور فرزین کو بتایا۔ "ان کی بہت سی زمینیں ہیں۔"

"یہ زمینیں تو اللہ میاں کی ہیں بابا۔" فرزین نے کہا۔ "بڑے صاحب کی کس طرح ہو گئیں؟"

"ہوتی ہیں بیٹا! کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے لیکن یہ تم ابھی نہیں سمجھو گی۔" کرم دین نے کہا۔

"میں تو یہ کہتی ہوں کہ آپ کو جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔" مہر گل نے کہا۔

"نہیں مہرے! بڑے صاحب نے بلایا ہے تو جانا ہی پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کوئی ہمارے فائدے کی بات ہو۔"

"جاؤ، جا کر دیکھ لو۔ خدا خیر کرے۔"

کرم دین دوسرے دن دس بجے کے قریب نکل گیا۔ فرزین اس کے جانے کے بعد کہانیوں کی ایک کتاب لے کر اپنے اسی پودے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

کرم دین نے اسے لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا۔ وہ فرزین کے لیے قصبے سے کتابیں بھی لے کر آیا تھا۔ اس کا پودا اب اچھے خاصے پیڑ کی صورت اختیار کر چکا تھا جس کے تنے پر فرزین نے چاقو کی نوک سے اپنا نام لکھ رکھا تھا۔

کرم دین کی واپسی شام کو ہوئی۔

وہ بہت خاموش تھا جیسے اپنے دل پر کوئی بوجھ لے کر آیا ہو۔ مہر گل اور فرزین اسے گھیر کر بیٹھ گئیں۔ "کیا ہوا بابا؟" فرزین نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بیٹا! تو خود اپنی ہی دشمن ہو گئی ہے۔" کرم دین نے کہا۔

"کیا مطلب؟" مہر گل نے چونک کر پوچھا۔

"اب کیا بتاؤں؟ اس کی اچھی صورت شکل نے بڑے صاحب کو دیوانہ کر دیا ہے۔" کرم دین بہت تلخ ہو کر بولا۔ "حالانکہ اس نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی لیکن پاگل ہوا جا رہا ہے۔ وہ اس دن جو آدمی آیا تھا، اس نے فرزین کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے جا کر بڑے صاحب سے اس کی تعریف کر دی۔"

"تو وہ بڑے صاحب چاہتے کیا ہیں؟" مہر گل نے پوچھا۔

"فرزین سے شادی۔"

فرزین اس سے زیادہ کچھ نہیں سن سکی۔ وہ آنسوؤں کے درمیان اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے اس لاکٹ کو اپنے گلے سے اتار کر اپنی مٹھی میں بھینچ لیا جس میں اس لڑکے کی تصویر تھی۔ وہ اسے ابھی تک بھول نہیں پائی تھی۔ حالانکہ اس کی یادیں بہت مدھم ہو چکی تھیں پھر بھی یادیں تو تھیں۔

شام ہو گئی۔ وہ اسی طرح اپنے بستر پر لیٹی رہی۔ وہ بڑے صاحب سے کیسے شادی کر سکتی تھی؟ وہ تو عمر میں بھی بہت بڑے تھے۔ تقریباً اس کے ابو کے برابر... اور شادی کرنے کا سوچ رہے تھے۔

اس کے باپ نے سچ کہا تھا کہ فرزین کی اچھی صورت شکل خود اس کے لیے دشمن بن گئی تھی۔

لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا؟

رات کے وقت اس کی ماں مہر گل اس کے پاس آ گئی۔ وہ بھی بہت تھکی ہوئی اور اداس دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے فرزین کے خوب صورت بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنی شروع کر دی۔ "نہیں بیٹا! ان [illegible] ہوتے ہیں۔ تیرے دشمن نہیں ہیں۔ بڑے صاحب سے تیری شادی بھی نہیں کریں گے۔ صاف منع کر دیں گے انہیں۔"

"لیکن ماں! میں نے سنا ہے کہ وہ بڑا ظالم انسان ہے۔ وہ بابا کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔"

"یہ تو ہے... لیکن ہم نے یہ سوچا ہے کہ ہم ولدار وادی چھوڑ کر شہر چلے جائیں گے۔"

"نہیں ماں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" فرزین تڑپ اٹھی۔ "ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔ یہ ہمارا گھر ہے، ہماری جنت ہے۔ یہاں میرے دوست ہیں۔ ہم ان کو کیسے چھوڑ دیں؟"

"خود ہمارے دل بھی خون کے آنسو رو رہے ہیں بیٹا۔" مہر گل نے کہا۔ "لیکن اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ یہاں رہتے ہیں تو بڑے صاحب کی تلوار سر پر رہتی ہے۔ یہاں سے چلے گئے تو سکون مل جائے گا... اور ویسے بھی کسی نہ کسی سے تیری شادی تو ہونی ہے نا پھر تو ولدار وادی چھوڑنی ہی ہو گی۔"

"میں نہیں چھوڑوں گی۔"

"نہیں بیٹا! یہ تیری عزت اور زندگی کا معاملہ ہے۔" مہر گل نے کہا۔

"لیکن ہم جائیں گے کہاں؟" فرزین نے پوچھا۔ "شہر میں ہماری جان پہچان تو کسی سے نہیں ہے۔"

"ہے بیٹا۔" مہر گل نے بتایا۔ "تیرے بابا کا ایک دوست وہاں کی بڑی مسجد میں نماز پڑھاتا ہے۔ ہم اس کے پاس چلے جائیں گے۔ میں بھی اس کو جانتی ہوں، وہ بہت اچھا آدمی ہے۔"

"تو پھر میرے دوست کا کیا ہو گا؟" فرزین نے پوچھا۔

"بیٹا! اللہ اس کی حفاظت کرے گا۔" مہر گل نے بتایا۔ وہ یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ فرزین کا دوست کون ہے۔

☆☆☆

یہ بہت بڑا شہر تھا۔

فرزین نے اب تک صرف اس کا نام سن رکھا تھا... کراچی۔ وہ یہاں آ کر دنگ رہ گئی۔ یہ اس کے لیے بالکل نئی دنیا تھی۔

اس نے اتنی گاڑیاں، ایسی عمارتیں، ایسی سڑکیں زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اتنے لوگ بھی ایک ساتھ کبھی نظر نہیں آئے تھے۔

اس کے باپ کرم دین نے اپنی زمین اور اپنا گھر سستے داموں اس طرح بیچ دیا تھا کہ کسی کو خبر بھی نہیں ہونے دی تھی۔ ولدار وادی والوں نے بھی اس معاملے میں پوری طرح ان کا ساتھ دیا تھا۔ یہ آفت ان کی شہزادی پر آئی تھی۔ وہ شہزادی کی محبت میں تو ویسے بھی سرشار تھے۔ اس لیے انہوں نے پوری طرح کرم دین کا ساتھ دیا۔

ولدار وادی سے رخصت ہوتے ہوئے فرزین کا سینہ چھلنی ہوا جا رہا تھا۔ وہ برف پوش پہاڑوں، صنوبر کے درختوں، رنگ برنگے پھولوں، پرندوں اور سب سے بڑھ کر اپنے درخت دوست کو چھوڑ کر کسی انجانی دنیا کی طرف جا رہی تھی۔

اس کے لیے سب کچھ جیسے برباد ہو چکا تھا۔

شہر کو دیکھ کر اسے خوشی نہیں بلکہ حیرت ہوئی۔ یہاں اس کے لیے جو کچھ بھی تھا، وہ انوکھا اور پریشان کر دینے والا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی تاثر نہیں تھا۔

اس کے باپ کے دوست کا نام نادر علی تھا۔ وہ جس مسجد میں نماز پڑھایا کرتا، وہ ایک بڑے محلے کی مسجد تھی۔ مسجد کے صحن کے باہر گیٹ کے ساتھ دو کوٹھریاں تھیں جن میں اس کا خاندان رہا کرتا۔ اس کا ایک بیٹا تھا اور بیوی ساتھ رہتی تھی۔

اسٹیشن اتر کر کرم دین نے اسے فون کر دیا تھا۔ نادر علی یہ سن کر بہت خوش ہوا تھا کہ اس کا دوست کرم دین شہر پہنچ چکا ہے اور اسٹیشن کے باہر اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے میں اسے لینے پہنچ جائے گا۔

فرزین نے اگرچہ اپنے جسم پر ایک چادر لپیٹ رکھی تھی، اس کے باوجود اس کے جسم کے دل کش خطوط دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچے جا رہے تھے۔

لوگ آتے جاتے اسے گھور کر دیکھتے اور وہ ایک طرف ہٹ جاتی۔ اسے بہت گھبراہٹ اور شرم محسوس ہو رہی تھی۔ ولدار وادی میں تو اس کے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

وہاں کے لوگ یا تو اس کا احترام کرتے تھے یا اس سے پیار کرتے تھے۔ اس نے ایسی بے باک نگاہوں کا سامنا کبھی نہیں کیا تھا۔

کچھ دیر بعد کرم دین کا دوست نادر علی بھی وہاں پہنچ گیا۔ دونوں دوست ایک دوسرے کے ساتھ بہت گرم جوشی سے ملے۔

نادر علی نے بہت پیار سے فرزین کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پھر اس نے ایک ٹیکسی کی۔ ان کا مختصر سا سامان ٹیکسی میں رکھا گیا اور یہ قافلہ روانہ ہو گیا۔

فرزین کے لیے اردگرد کے مناظر بہت حیرت انگیز تھے۔ یہاں کے لوگ شاید ولدار وادی کے لوگوں سے بہت مختلف تھے۔ ہر شخص جیسے بہت جلدی میں تھا۔ بھاگنا چاہتا

گتھا

ایک دن ایک بیٹے کو اپنے باپ کی جوانی کی تصویر مل گئی۔ وہ دوڑتا ہوا اپنی ماں کے پاس آیا اور پوچھا۔ "امی یہ کون ہیں؟"

ماں فخریہ انداز میں بولی۔ "یہ تمہارے ابو ہیں۔"

بیٹا حیرانی سے بولا۔ "اگر یہ میرے ابو ہیں تو وہ عینک والا گنجا کون ہے جو اتنی مدت سے ہمارے گھر میں رہ رہا ہے۔"

اہم اعلان

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے۔ قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہو گی۔

تھا۔ ایک دوڑ لگی ہوئی تھی۔ گاڑیاں بھاگ رہی تھیں۔ انسان بھاگ رہے تھے۔ سڑکیں اور عمارتیں بھاگ رہی تھیں۔

بالآخر نادر علی کا محلّہ آہی گیا۔

نادر علی نے کرایہ دے کر ٹیکسی کو رخصت کیا اور وہ سب اندر آگئے۔ نادر علی کی بیوی زلیخا ایک سیدھی سادی عورت تھی جس نے ایک بیٹے کو جنم دینے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا ہوگا۔

وہ بھی مہر گل اور کرم دین کو جانتی تھی۔ فرزین کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ''مہر گل!'' اس نے مہر گل کو مخاطب کیا۔ ''تمہاری بیٹی تو بہت پیاری ہے۔''

''ہاں جی۔'' مہر گل نے ایک گہری سانس لی۔ ''بس قسمت اچھی ہو جائے۔''

اسی دوران نادر علی اور زلیخا کا بیٹا فیاض بھی کہیں باہر سے آچکا تھا۔ وہ جوان لڑکا تھا... بائیس تیئیس برس کا۔ وہ کسی طرح بھی کسی مولوی کا بیٹا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اس کی مونچھیں گھنی گھنی تھیں اور آنکھوں میں سرخی بھی تھی۔

فرزین کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہوگئی جو فرزین کے لیے بہت جانی پہچانی تھی۔ اسے وہ دن یاد آیا جب نواب صاحب کا آدمی کرم دین سے باتیں کر رہا تھا اور فرزین کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ اس وقت فرزین کو دیکھ کر اس آدمی کی آنکھوں میں کچھ ایسی ہی چمک آئی تھی۔

پھر جب اسے یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ ابھی کچھ دنوں تک اسی گھر میں رہیں گے تو اس کی آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی۔ ''فکر مت کرو چاچا۔'' اس نے کہا۔ ''میں تم لوگوں کا پورا خیال رکھوں گا۔ یہاں کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔''

اس رات عشا کی نماز کرم دین نے اسی مسجد میں ادا کی۔

ایک کمرا ان تینوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

اس رات فرزین نے خواب میں اپنے دوست درخت کو دیکھا جو بہت اداس ہو کر شکوہ کر رہا تھا۔ ''آخر تم نے مجھے چھوڑ دیا نا... تم ہی تو میری ایک دوست تھیں۔ تمہیں معلوم ہے میں نے کس کس طرح تمہارے اس نام کی حفاظت کی ہے جو تم نے میرے سینے پر لکھا تھا۔ میں نے زبردست آندھیوں اور بارشوں میں بھی اپنے آپ کو گرنے نہیں دیا۔ صرف اس لیے کہ میں تمہارے نام کو گرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا اور تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔''

پھر فرزین نے اس سے کہا۔ ''میرے اچھے دوست! تمہیں تو معلوم ہے کہ دلدار وادی کو ہم لوگوں نے کیوں چھوڑا۔ مجھ پر ایک بڑی آفت نازل ہونے والی تھی۔ اس آفت کی وجہ سے ہمیں بھاگنا پڑا۔ ورنہ تم جیسے اچھے دوست کو کون چھوڑ سکتا ہے۔''

دوسری صبح فرزین بہت اداس تھی۔ اس نے جب مہر گل کو اپنا یہ خواب سنایا تو وہ بھی اداس ہوگئی۔

نادر علی مسجد کے مدرسے میں بچوں کو پڑھایا بھی کرتا تھا۔ وہ دس بجے کے قریب گھر سے مدرسے چلا جاتا پھر اس کی واپسی ظہر کے بعد ہوا کرتی۔

فیاض بھی عام طور پر دس گیارہ بجے گھر سے نکل جاتا تھا۔ نادر علی یا زلیخا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اگر کبھی سوال بھی کیا جاتا تو الٹا سیدھا جواب دے دیتا۔

لیکن اس دن وہ کہیں نہیں گیا بلکہ اس نے مہر گل سے کہا۔ ''چلو چاچی! تم دونوں کو شہر کی سیر کرا دوں۔''

مہر گل اور فرزین کا دل نہیں چاہ رہا تھا اس کے ساتھ جانے کے لیے لیکن جب زلیخا نے بھی زور دیا تو دونوں تیار ہوگئیں۔

فیاض نے دن بھر کے لیے ایک ٹیکسی پکڑ لی تھی۔ وہ دن بھر انہیں سیر کراتا رہا۔ فرزین کو سمندر دیکھ کر بہت وحشت بھی ہوئی اور بہت اچھا بھی لگا۔

پھر فیاض ان دونوں کو ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں لے آیا۔ وہ ان دونوں، خاص طور پر فرزین پر بہت مہربان ہوا جا رہا تھا۔

شام کو پانچ بجے تک یہ لوگ سیر سے واپس آچکے تھے۔ فرزین بہت تھک چکی تھی۔ سیر کے دوران فیاض نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ سوائے ہوں ہاں کے اور کچھ نہیں بولی۔

رات کھانے کے دوران کرم دین نے نادر علی سے کہا۔ ''بھائی نادر علی! میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ گرچہ تمہارا دل بہت بڑا ہے لیکن یہ مکان بہت چھوٹا ہے۔ ہم تم لوگوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ اس لیے کرائے کا کوئی مکان مل جائے تو ہم چلے جائیں گے۔''

''ارے نہیں چاچا! ایسی بھی کیا بات ہے۔'' فیاض جلدی سے بول پڑا۔ ''تم لوگ یہیں رہو۔''

''نہیں بیٹا..... یہ ممکن نہیں ہے۔'' کرم دین نے کہا۔

پھر یہ فیصلہ ہوا کہ ان لوگوں کے لیے اسی محلے میں کوئی مکان تلاش کیا جائے۔ فیاض نے اس کام کا بیڑا اٹھا لیا اور ایک ہفتے کے اندر اس نے ایک مکان تلاش بھی کر لیا جو اس مسجد کے پاس ہی تھا۔ کرم دین، مہر گل اور فرزین کے ساتھ

اس مکان میں منتقل ہو گیا۔

☆☆☆

صرف دو برسوں کے بعد صورتِ حال مختلف ہو گئی۔

فرزین کی زندگی بدل کر رہ گئی۔ اس کا یہ بدلاؤ فیاض کی وجہ سے ہوا تھا جواب اس کے تلوے چاٹا کرتا اور فرزین اسے ٹھوکر مارتی رہتی تھی۔

بات وہاں سے شروع ہوئی تھی جب ایک شام فیاض اس کے گھر آیا۔ اس وقت مہر گل اور کرم دین دونوں باہر گئے ہوئے تھے۔

فیاض نے فرزین کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ ''فرزین! میں تم سے شادی کر کے تمہارے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

فرزین کو اندازہ ہو گیا کہ اس نے فیاض کی آنکھوں کی جس چمک کا مطلب سمجھا تھا، وہ غلط مطلب نہیں تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اپنے لاکٹ پر رکھ لیا۔ وہی لاکٹ جواب سے برسوں پہلے اس کا پہلا پہلا دوست دانیال اسے دے گیا تھا۔ اس طرح وہ محسوس کرتی جیسے اس لاکٹ سے توانائی کا اخراج ہو رہا ہو اور وہ توانائی اس کے پورے وجود پر چھا کر اسے حوصلہ مند بنا دیتی۔

''جواب دے فرزین!'' فیاض نے کہا۔ ''میں تیرے پیار میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔''

''نہیں فیاض بھائی۔'' فرزین نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی۔ ''تم بہت اچھے ہو۔ میں تمہیں اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''کیوں نہیں کر سکتیں... کیا بُرائی ہے مجھ میں؟''

''کوئی بُرائی نہیں ہے۔'' فرزین نے کہا۔ ''لیکن میں مجبور ہوں۔''

''آخر ایسی کیا مجبوری ہے؟''

''میں یہ نہیں بتا سکتی۔''

''لگتا ہے کسی کے ساتھ پھنس چکی ہے تُو۔'' فیاض نے اپنا آپ ظاہر کر دیا۔

فرزین نے ایسی بات پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ کسی نے بھی ایسے انداز میں اس سے بات نہیں کی ہو گی۔ شرم اور غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسی وقت فیاض نے اس کا ہاتھ بھی تھام لیا۔

فرزین کے لیے اب برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ فیاض کے گال پر رسید کر دیا۔ تھپڑ کھا کر فیاض تلملا گیا... پھر اس نے لپک کر فرزین کے بال تھام کر جھٹکے دینے شروع کر دیے۔ ''حرامزادی! بڑا غرور ہے اپنی صورت پر۔ سارا غرور خاک میں ملا دوں گا۔ تو نہیں جانتی میں کتنا بُرا آدمی ہوں۔ تُو نے جو تھپڑ مارا ہے، وہ میں سود کے ساتھ تجھے لوٹا دوں گا... سمجھی۔''

اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ کرم دین اور مہر گل واپس آ چکے تھے۔ فیاض نے فرزین کو دھمکی دی۔ ''دیکھ! اگر تُو نے کسی کو کچھ بتایا نا تو یہ تیرے لیے بہت بُرا ہو گا۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے خود ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور ان دونوں کو سلام کرتا ہوا باہر نکلتا چلا گیا۔

فرزین دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ کرم دین اور مہر گل اس کی حالت دیکھ کر دھک سے رہ گئے۔

''کیا ہوا بیٹا! بتا کیا بات ہوئی... کیا کہا اس نے؟''

فرزین نے روتے ہوئے کرم دین اور مہر گل کو بتا دیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ فیاض نے کیسی کیسی باتیں کی ہیں۔

''یاخدا! جس کا باپ اتنا فرشتہ، اس کا بیٹا ایسا ہو سکتا ہے۔''

''میں ابھی نادر علی کو جا کر بتاتا ہوں۔'' کرم دین نے کہا۔ ''فیاض نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔''

''نہیں بابا! وہ کمینہ آدمی ہے۔'' فرزین نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''نہ جانے کیا کر بیٹھے۔''

''تو پھر کیا کریں؟ کیا اس انتظار میں رہیں کہ وہ کچھ اور کر گزرے؟'' کرم دین نے کہا۔

''کیوں نہ ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔''

''اتنی مشکلوں سے تو دکان چلنی شروع ہوئی ہے۔'' کرم دین نے کہا۔ ''اب ہم کہاں کہاں بھٹکتے پھریں گے؟''

ان دو برسوں کے دوران کرم دین نے پرچون کی ایک دکان کھول لی تھی۔ وہ دکان اب چلنے لگی تھی جبکہ فرزین کو پڑھانے کے لیے ایک استانی آیا کرتی۔

فرزین پرائیویٹ طور پر میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ گھر کے حالات سیٹ ہونے لگے تھے کہ اب یہ ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔

''تو پھر جیسا تم چاہو۔'' مہر گل خاموش ہو گئی۔

''تم دیکھ لینا، نادر علی اس کم بخت کے ہوش ٹھکانے لگا دے گا۔ وہ بہت اصول پسند انسان ہے۔''

لیکن اس اصول پسند انسان نے اپنے بیٹے کے لیے ایسا الزام سنتے ہی سے انکار کر دیا۔ ''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' اس نے کہا۔ ''ہمارے فیاض میں لاکھ دوسری بُرائیاں ہوں لیکن وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔''

''میرے بھائی! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں یا میری بیٹی

جھوٹ بول رہے ہیں؟''

''تمہارے لیے تو نہیں کہوں گا کیونکہ تم میرے دوست ہو لیکن تمہاری بیٹی فرزین کو شہر کی ہوا لگ چکی ہے۔ اسے اتنا معصوم مت سمجھنا۔''

کرم دین دل گرفتہ ہو کر واپس لوٹ آیا۔ اسے نادر علی سے ایسے جواب اور ایسے رویے کی توقع نہیں تھی۔

مہر گل اور فرزین دونوں ہی یہ سن کر دنگ رہ گئیں کہ نادر علی نے ایسی بات کہہ دی تھی۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم لوگوں کو اب یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔'' کرم دین نے کہا۔

''نہیں بابا! اب ہم کہیں نہیں جائیں گے۔'' فرزین ایک جھٹکے سے بولی۔ ''یہ کیا بات ہوئی کہ میری وجہ سے پورے ملک میں بھاگتے رہو۔ دلدار وادی سے بھاگے صرف میری وجہ سے اور اب یہاں سے بھاگنا ہے صرف میری وجہ سے... نہیں بابا! اب ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ ہمیں یہیں رہ کر خود اپنے آپ کو مضبوط بنانا ہو گا۔ اتنا مضبوط کہ کوئی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔''

''اور یہ مضبوطی ہم میں کہاں سے آئے گی؟''

''آ جائے گی بابا... آ جائے گی۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ میں اپنی حفاظت خود کر لوں گی۔ یہ فیاض جیسے لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

کرم دین بہت حیرت سے اپنی اس بیٹی کو دیکھ رہا تھا جسے شاید کچھ بولنا ہی نہیں آتا تھا لیکن اب وہ ایسی باتیں کر رہی تھی جیسے اس نے دنیا بھر کا تجربہ حاصل کر لیا ہو۔

اس کے بعد کرم دین اور نادر علی کی دوستی تقریباً ختم ہو گئی۔ کرم دین نماز کے لیے اب دوسری مسجد جانے لگا تھا۔ اس کے نزدیک نادر علی ایک منافق انسان تھا اور منافق کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔

فیاض بھی بہت دنوں تک دکھائی نہیں دیا۔ اس نے کرم دین کے گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک بار پھر ان کی زندگی میں سکون سا ہونے لگا تھا کہ اچانک ایک دن فرزین کو راستے سے اٹھا لیا گیا۔

وہ اپنی استانی کے گھر سے آ رہی تھی کہ راستے میں ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رکی۔ اس میں سے دو آدمی پستول لیے ہوئے اترے اور اس سے پہلے کہ فرزین کچھ سمجھ سکتی، اسے زبردستی گاڑی میں بٹھا لیا گیا۔

فرزین خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''کک... کون ہو تم لوگ؟'' اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

ماہنامہ پاکیزہ

اپریل 2010ء
سالگرہ نمبر
کی رعنائیاں

زندگی ایک ہیرے کے مانند ہے جسے انسان خود تراش کر خوبصورت بناتا ہے **انجم انصار** کے کچھ ایسے کرداروں کی تلاش و جستجو کی کتھا

عالیہ بخاری اور **قیصرہ حیات** کے سلسلے وار ناول

مایوس دلوں کو روشنی بخشتے لفظوں کی مصنفہ **اقبال بانو** کی خصوصی تحریر بطور خاص سالگرہ نمبر کے لیے

انجم انصار کی پندرھویں کتاب ''ایک سے بڑھ کر ایک'' کی تقریب پذیرائی کی خصوصی رپورٹ

سالگرہ اور خوشیوں کے دھنک رنگ لیے **شائستہ زرین** کا دلچسپ سروے

یاسر نواز اور **ندا یاسر** کی برجستہ اور شگفتہ باتیں

افسانے

شمیم فضل خالق، عالیہ حرا، عاصمہ آغا، سعدیہ رئیس، شیریں حیدر، نوشین ناز اختر، سکینہ فرخ اور **نیلم احمد بشیر** کی پُراثر تحریریں

آپ کی پسند کے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

ہوتا ہے، ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ غیر قانونی ہے۔ ہم کوئی غیر قانونی کام تو کرتے نہیں ہیں۔''

''سر! یہ پھر فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔'' اے سی پی نے کہا۔

''یہ کوئی جن یا بھوت نہیں ہے کہ دھواں بن کر ان سلاخوں سے نکل جائے گا۔ اسے کھول دو۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں پریس کانفرنس کرنے والا ہوں۔ اخبار والے اسے اس حال میں دیکھیں گے تو طرح طرح کے سوالات اٹھائیں گے۔''

اے سی پی نے ایک انسپکٹر کو اشارہ کیا۔ اس نے حوالات کا تالا کھولا پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ اس دوران میں بقیہ پولیس والوں نے اپنے ریوالور نکال کر مجھ پر تان لیے جیسے انہیں خدشہ ہو کہ میں ہاتھ پیر کھلتے ہی اڑ جاؤں گا۔

انسپکٹر نے میری ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھولیں اور بولا۔ ''اس کے سر سے خون بہہ رہا ہے۔''

''اس کی مرہم پٹی کر دو۔'' اے سی پی نے کہا۔ فوراً ہی اس نے ایک کانسٹیبل کو آواز دے کر فرسٹ ایڈ باکس منگوایا اور میرے زخم کی صفائی کرنے لگا۔

میں چاہتا تو اس وقت بھی بھاگنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن اس وقت فرار ہونا خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔ وہ لوگ مجھے بے دریغ گولی مار دیتے۔

انسپکٹر نے میری گردن سے خون صاف کیا۔ میرے زخم کی اچھی طرح صفائی کی پھر میرے زخم پر پٹی باندھ کر باہر نکل گیا۔

''گڈ بوائے!'' ورما نے کہا۔ ''اگر تم یونہی ہمارے ساتھ تعاون کرتے رہے تو فائدے میں رہو گے۔'' پھر وہ اے سی پی سے بولا۔ ''مجھے خطرہ اس امریکن لڑکی سے ہے۔ وہ اپنے سفارت خانے کے ذریعے ہماری سرکار پر دباؤ ڈلوا سکتی ہے۔ یہ ثابت کر سکتی ہے کہ کامران کا پاکستانی ایجنسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ کینی کچھ بھی کر سکتی ہے۔ وہ نکل کیسے گئی؟ کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ وہ بھی مارشل آرٹ کی ماہر ہے۔ دو کانسٹیبلوں کو اسی نے ہلاک کیا ہے۔ میرا یہ حال بھی اسی نے کیا ہے۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''اب تم آرام کرو۔ صبح ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ سب وہاں سے چلے گئے۔

میرے ہاتھ پیر کھل چکے تھے اس لیے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر امی اور پاپا کو معلوم ہوگیا تو ان کے دل پر کیا گزرے گی؟ تیمور کس کرب سے گزر رہا ہوگا؟ سب سے بڑھ کر مجھے خالہ نسیمہ، انکل اور سعید بھائی کی فکر تھی۔ وہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟ کیا واقعی وہ لوگ مجھے پاکستانی ایجنٹ سمجھ رہے ہوں گے؟ ان کی تو عزت داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی۔

ہلکی سی آہٹ ہوئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ ایک پولیس انسپکٹر لاک اپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے نزدیک بلایا۔ میں پہلے تو سمجھا نہیں کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ جب اس نے دوسری مرتبہ اشارہ کیا تو میں اٹھ کر حوالات کے دروازے کے پاس آگیا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میرا نام مراد خان ہے سر! میں آر کے صاحب کا آدمی ہوں۔ میں آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا اور آپ کو یہاں سے نکال لوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ کچھ پیسے رکھ لیں۔ قدم قدم پر آپ کو ان کی ضرورت پڑے گی۔''

میں نے وہ نوٹ لے لیے۔ وہ ''کچھ پیسے'' بیس ہزار روپے تھے۔ میں نے خاموشی سے وہ پیسے رکھ لیے مجھے پولیس اور حوالات کا تجربہ تو نہیں تھا لیکن جانتا ضرور تھا کہ یہاں قدم قدم پر پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

مجھے اس بات سے بہت تقویت پہنچی تھی کہ جینی نے آر کے کو میرے بارے میں آگاہ کر دیا تھا اور خوشی اس بات کی ہوئی تھی کہ آر کے جیسے معروف آدمی نے نہ صرف مجھے پہچان لیا تھا بلکہ وہ عملی طور پر بھی میدان میں آگیا تھا۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا لیکن مجھے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سر کا درد البتہ اب نہ ہونے کے برابر تھا۔ پھر میرے ذہن میں مختلف لوگوں کے چہرے آتے رہے... امی، پاپا، فرحت، تیمور، نوشین، آنٹی نسیمہ، انکل، سعید بھائی، جینی اور آر کے۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کھردرے فرش پر لیٹنے سے میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ مجھے اٹھانے والا ایک مکروہ صورت سپاہی تھا۔ ان کے جسموں پر خاکی وردی دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں اس وردی کی توہین محسوس ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ یہ یونیفارم ہماری فوج کی ہے اور ہماری فوج اس وقت دنیا کی بہترین فوجوں میں سے ایک ہے۔

''کچھ ناشتا پانی کرتا ہے؟'' سپاہی نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

''ناشتے میں یہاں کیا ملے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''او بھائی! یہ بڑے لوگوں والا کوئی فائیو اسٹار ہوٹل نہیں ہے۔ سامنے منباری کا ہوٹل ہے۔ وہاں سے چائے، بسکٹ، مسکہ بن مل جائے گا۔''

''تو پھر ایسا کرو کہ مجھے دو کپ گرم گرم چائے اور مسکہ بن لا دو۔ سر درد کی دو گولیاں بھی لیتے آنا۔'' میں نے اس کی نظر بچا کر سو کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

''کوئی پان، بیڑی، سگریٹ؟'' کانسٹیبل نے پوچھا۔

''بس اور کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور باقی پیسے تم رکھ لینا۔ ہاں اگر مل سکے تو مجھے انگریزی کا کوئی اخبار بھی لا دینا۔''

میں جانتا تھا کہ وہاں زیادہ تر ہندی ہی کے اخبارات ملتے تھے یا پھر انگریزی کے۔

سپاہی کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ اس نے کہا۔ ''صاحب! دوپہر کے کھانے کے وقت بھی مجھے بلا لینا۔ میرا نام گوبند رام ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم ہی آجانا۔ ابھی تو مجھے یہ چیزیں لا دو۔''

سپاہی تھوڑی دیر میں وہ چیزیں لے آیا۔ میں نے سب سے پہلے پیٹ کی آگ بجھائی پھر اخبار کھول لیا۔

اخبار کی شہ سرخی دیکھتے ہی میری کھوپڑی ناچ کر رہ گئی۔ ممبئی کے تاج ہوٹل کو کچھ لوگوں نے وہاں مقیم لوگوں سمیت یرغمال بنا لیا تھا اور پورے بھارت میں ایک سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ بھارتی حکومت اس کارروائی کو بھی پاکستان کے سر منڈھنے کی کوشش کرے گی۔

میں نے خبر تفصیل سے پڑھی۔ خبر کے مطابق ہوٹل کو یرغمال بنانے والے دہشت گردوں کی تعداد دس بارہ کے درمیان تھی۔ انہوں نے ہوٹل کو بم سے اڑانے کی دھمکی دی تھی۔ انڈیا کی سی آئی ڈی، پولیس اور ان کی خاص کمانڈو فورس بلیک کیٹس حرکت میں آگئی تھیں۔

اخبار پڑھنے کے بعد میں نے اسے تہ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

دوپہر کو گوبند رام پھر آگیا۔ میرا کھانا کھانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن محض گوبند رام کی خاطر میں نے پھر سو روپے نکالے اور اس سے مسکہ بن اور چائے کے دو کپ لانے کو کہا اور کہا کہ باقی پیسے وہ رکھ لے۔ وہ جانے لگا تو میں نے اخبار اسے دے دیا۔ میرے پاس اخبار کا ہونا بھی مناسب نہیں تھا۔

دو بجے کے قریب گوبند رام پھر آیا اور بولا۔ ''صاحب! پولیس کے کوئی بہت بڑے افسر آرہے ہیں۔ وہ آپ سے تفتیش کریں گے۔'' یہ اطلاع دے کر وہ چلا گیا۔

پورے تھانے میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ ایک ایک کونے کی صفائی ہو رہی تھی۔ وہ منظر دیکھ کر مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے ملک کے پولیس تھانے یاد آگئے۔

ایک گھنٹے بعد اے سی پی چار انسپکٹرز کے ساتھ آگیا۔ ان میں سے ایک انسپکٹر کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں تھیں۔ وہ انسپکٹر حوالات کا دروازہ کھول کر اندر آیا اور مجھے ایک مرتبہ پھر جکڑ دیا گیا۔

پھر مجھے بندوقوں اور پستولوں کی زد میں ایک ہال نما کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ میں پیر پھیلا کر بہ مشکل تمام ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ بعد وہاں دہلی کا پولیس کمشنر اور سادہ لباس میں دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک انتہائی باوقار اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ دوسرے کے چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی۔ حیرت تو مجھے بھارتی فوج کے ایک بریگیڈیئر کو وہاں دیکھ کر ہوئی۔

سب سے پہلا سوال اسی نے کیا۔ ''مسٹر کامران! آپ انڈیا میں پاکستانی ایجنسی کے لیے کب سے کام کر رہے ہیں؟'' اس کا لہجہ مہذب لیکن سرد تھا۔

''سر! میں بے شمار مرتبہ بتا چکا ہوں کہ میں پاکستانی ایجنسی کے لیے کام نہیں کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

ایک باوقار افسر نے کہا۔ ''میں ایس یو کرشنا ہوں، ڈائریکٹر آف امیگریشن... کیا آپ اپنا پاسپورٹ دکھانا پسند کریں گے؟''

''میرا سامان اور پاسپورٹ چوری ہو چکا ہے مسٹر کرشنا! اس وقت تک میں نے اس پر امیگریشن کی اسٹیمپ بھی نہیں لگوائی تھی۔''

ان سب نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، پھر پولیس کمشنر نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کا بیان ہے کہ آپ شریف آدمی ہیں اور یہ سب کچھ صرف ایک حادثہ ہے؟ آپ نے جتنے قتل کیے ہیں، وہ بھی حادثاتی ہیں؟ آپ نے یہاں مختلف ٹھکانے بدلے، وہ بھی اتفاقیہ ہیں اور آپ سنہا آرکیڈ کی جس بلڈنگ میں تین آدمیوں کا قتل کر کے بھاگے تھے، وہ بھی اتفاقیہ تھا؟''

''میں نے کہا نا کہ مجھے اس صورت حال میں پھنسایا گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

www.pkdigest.com

''خاموش ہو جا۔'' ان میں سے ایک شخص غرایا۔ ''ورنہ میں گولی مار دوں گا۔''

فرزین کو ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے پھیلتے جا رہے ہوں۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ بہت بھیانک تھا۔

نہ جانے یہ کون لوگ تھے؟ اسے کہاں لے جا رہے تھے؟ کیوں لے جا رہے تھے؟ اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو اس کے ساتھ ایسا سلوک ہو رہا تھا؟

بہت دیر کے بعد گاڑی ایک بڑے سے احاطے میں داخل ہو گئی جس کی دیواریں بہت بلند تھیں اور لوہے کا ایک بڑا سا گیٹ تھا جو اس گاڑی کو دیکھ کر کھول دیا گیا۔

''چل... نیچے اتر۔''

فرزین نیچے آ گئی۔ وہ دونوں گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے رہے۔ ''یار! چیز تو بہت زبردست ہے۔'' ایک نے تبصرہ کیا۔

''استاد کی پسند ہے پیارے۔''

''آ... اندر آ۔'' ایک نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن فرزین نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا لیا۔

اسے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

وہ ایک سجا سجایا کمرا تھا۔ صوفے، میز، ایک طرف ایک ٹی وی، ایک الماری اور بھی کئی چیزیں تھیں... اور ایک صوفے پر فیاض بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

فرزین کو اس کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ فیاض کی حیثیت ان لوگوں میں ممتاز معلوم ہوتی تھی۔ فرزین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے ایک طرف تھوک دیا۔ ''اوہ!'' فیاض نے اپنے دانت پیسے۔ ''تیری اکڑ کا ابھی تک وہی حال ہے۔''

''میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ ایسی کمینی حرکت سوائے تیرے اور کون کر سکتا ہے۔''

''تو نے میرا کمینہ پن ابھی دیکھا ہی کہاں ہے۔'' فیاض نے کہا پھر اس نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ''تم لوگ باہر جاؤ اور ہوشیار رہنا... یہ چڑیا کہیں اڑ نہ جائے۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا استاد۔'' ان میں سے ایک مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس کے سارے پر کاٹ کر رکھ دوں گا۔''

ان لوگوں کے جانے کے بعد فیاض، فرزین سے مخاطب ہوا۔ ''میں نے تو بڑی شدت سے چاہا تھا کہ تجھ سے شادی کر کے تجھے عزت کی زندگی دوں گا لیکن تیرے نصیب میں عزت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔''

''جس کے پاس خود ہی عزت نہ ہو، وہ دوسروں کو کیا عزت دے گا۔''

''اوہو! بہت زبان چلنے لگی ہے... خیر، اب تُو دیکھ لینا کہ میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔''

فرزین نے غیرارادی طور پر اس لاکٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''چھ دنوں کے بعد جب تجھے یہاں سے چھوڑوں گا تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔''

فرزین نے پھر اپنی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا محسوس کیا۔ کیا وہ ان لوگوں کا مقابلہ کر سکے گی؟ نہیں... وہ تو ایک کمزور، بے بس پرندے کی طرح ہے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ نہ جانے اس کے ماں باپ کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔ وہ اتنی دیر تک کبھی گھر سے باہر نہیں رہی تھی۔ کرم دین بے چارہ تو اس کو دیکھنے کے لیے استانی کے گھر تک چلا گیا ہوگا اور جب اسے پتا چلا ہوگا کہ فرزین تو بہت دیر ہوئی جا چکی ہے تو پھر اس کا کیا حال ہو رہا ہوگا؟

فیاض آہستہ آہستہ اپنی مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

فرزین نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ وہ دیوار کے ساتھ جا لگی۔ فیاض آگے بڑھ رہا تھا اور جیسے ہی وہ فرزین کے قریب آیا، فرزین نے فیاض کی دونوں رانوں کے درمیان ایک ٹھوکر رسید کر دی۔

فیاض اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا اسی لیے وہ فرزین کی طرف سے بے پروا سا ہو گیا تھا۔ فرزین کی ٹھوکر نے اسے بلبلا کر رکھ دیا۔

وہ تڑپ کر فرش پر گر پڑا۔ اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ فرزین اس کے اوپر سے پھلانگتی ہوئی کھلے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئی۔

فیاض نے صرف اسے خوف زدہ کرنے کے لیے اپنے آدمیوں سے کہا ہوگا کہ وہ پہرا دیتے رہیں جبکہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ فرزین گیٹ سے باہر نکلتی چلی گئی۔

اس وقت شام ہو چکی تھی۔ یہ ایک ویران علاقہ تھا۔ اکا دکا مکانات ایک دوسرے سے فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں آ گئی ہے۔

اسے فیاض کا بھی خوف تھا۔ وہ اپنے اوسان بحال ہونے کے بعد اس کے تعاقب میں دوڑ لگا دیتا یا پھر فون کر کے اپنے آدمیوں کو بلا لیتا اور اس بار فرزین کے لیے واقعی بہت دشواری ہو جاتی۔

اس نے ایک طرف تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔

وہ خوف زدہ ہرنی کی طرح پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی جا رہی تھی۔ وہ کچھ ہی دور چلی ہوگی کہ ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رک گئی۔

فرزین کی جان نکل گئی لیکن کار چلانے والے کو دیکھ کر اسے سکون سا محسوس ہوا۔ وہ ایک عورت تھی... خاصی خوش شکل۔ اس کے جسم کا لباس بھی بہت ماڈرن قسم کا تھا۔ ''کہاں جا رہی ہو لڑکی؟'' اس عورت نے پوچھا۔

''جی، کہیں نہیں۔''

''بہت گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ آؤ، بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں پہنچا دیتی ہوں۔''

فرزین کی گھبراہٹ ختم نہیں ہوئی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی جا رہی تھی۔ ''اوہو... شاید بہت پریشان ہو۔'' اس عورت نے کہا۔ ''چلو بیٹھ جاؤ... گھبراؤ نہیں، شاباش۔''

فرزین گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس عورت نے ایک بھرپور نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ ''ماشاء اللہ! کیا خوب صورت چہرہ ہے۔ لگتا ہے تمہارا حسن تمہارے لیے مصیبت بن گیا ہے؟''

''جی... جی ہاں۔'' فرزین نے اعتراف میں اپنا سر ہلا دیا۔

''یہ لوگ اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ مکار، ظالم، خیر... اب بتاؤ کہاں رہتی ہو؟''

فرزین نے اپنے علاقے کا نام بتایا۔ ''نصیر آباد۔''

''اوکے! چلو پہنچا دیتی ہوں۔''

راستے میں اس عورت نے کہا۔ ''بہتر یہی ہے کہ تم مجھے اپنا دوست سمجھ کر اپنے بارے میں بتا دو۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے کسی کام آ جاؤں۔''

فرزین نے اسے فیاض کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس عورت پر بھروسا کر لے۔

''تم کہیں اس فیاض کی بات تو نہیں کر رہی ہو جو شاید کسی مسجد کے امام کا بیٹا ہے۔'' اس عورت نے دریافت کیا۔

''جی ہاں، وہی۔'' فرزین حیران رہ گئی۔ ''کیا آپ اسے جانتی ہیں؟''

''بہت اچھی طرح۔ وہ ایک کمینہ انسان ہے۔ اچھا ہوا جو تم نے اس کے بارے میں بتا دیا۔ اب ہمیں پہلے اس کا بندوبست کرنا پڑے گا ورنہ وہ تمہیں پریشان کرتا رہے گا۔ اگر تم مجھ پر بھروسا کرنے لگی ہو تو کچھ دیر کے لیے تمہیں میرے

اسرائیل کے علاوہ

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک

جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں

رابطہ: ثمر عباس

(فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

ساتھ چلنا ہوگا۔''

''جی... مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔'' فرزین نے کہا۔ ''لیکن میں پہلے گھر جانا چاہتی ہوں۔ گھر والے میری وجہ سے بہت پریشان ہو رہے ہوں گے۔''

''ضرور۔'' اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ ''میرا نام شہلا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''باقی باتیں بعد میں معلوم ہوں گی۔''

کچھ دیر میں فرزین اپنے گھر میں تھی۔

کرم دین اور مہر گل بہت پریشان تھے۔ کرم دین نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھان کر واپس آیا تھا۔ نہ جانے کیسے کیسے اندیشوں نے انہیں گھیر رکھا تھا۔

وہ دونوں فرزین کے ساتھ شہلا کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ فرزین نے شہلا کی ہدایت کے مطابق اپنے ماں باپ کو اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس نے شہلا کے بارے میں کہا کہ وہ استانی کی جاننے والی ہے۔

''معاف کیجیے گا... میری وجہ سے آپ لوگوں کو پریشانی ہوگئی۔'' شہلا نے کہا۔ ''یہ استانی کے گھر سے نکل رہی تھی کہ مجھے مل گئی۔ مجھے بازار سے کچھ چیزیں خریدنی تھیں اسی لیے میں فرزین کو اپنے ساتھ لے گئی تھی اور اب پھر لے جا رہی ہوں کیونکہ میری شاپنگ ادھوری رہ گئی ہے۔''

شہلا کی طرف سے کرم دین اور مہر گل کو اطمینان ہوگیا تھا۔ اس لیے انہوں نے فرزین کو جانے کی اجازت دے دی۔ باہر نکل کر شہلا نے فرزین سے کہا۔ ''اگر تم پر جو کچھ گزری ہے، وہ تمہارے والدین کو معلوم ہو جاتا تو بے چارے پریشان ہو جاتے۔ اور جہاں تک فیاض کا سوال ہے وہ تو خیر آج کے بعد تمہارے راستے میں آنے کی ہمت ہی نہیں کرے گا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

''تم اس کی فکر چھوڑو... اپنے بارے میں بتاؤ۔ کہاں سے آئی ہو؟ پہلے کہاں رہتی تھیں؟''

بہت دنوں کے بعد فرزین نے ولدار وادی کی کہانی چھیڑی تھی۔ وہاں کے پہاڑ، درخت، پھولوں، پرندوں، شرارت کرتی گلہریوں کی کہانی۔ پھر اپنے دوست پودے کی کہانی جواب شاید تناور درخت بن چکا ہوگا۔ پھر اس لڑکے کی کہانی جو نہ جانے کہاں سے بھٹکتا ہوا اس طرف جا نکلا تھا اور جس کا دیا ہوا لاکٹ ابھی تک اس کے پاس محفوظ تھا۔ پھر بڑے صاحب کا جبر۔ ان لوگوں کا ولدار وادی چھوڑ کر شہر آ جانا۔ یہاں نادر علی اور فیاض وغیرہ۔

غرضیکہ اس نے اپنی پوری زندگی کھول کر اس کے سامنے رکھ دی۔ کچھ بھی نہیں چھپایا۔

اس کی داستان سن کر شہلا نے اسے پیار سے بھینچ لیا۔ ''میری جان! تم تو جنت میں رہتی تھیں۔ شہزادی تھیں وہاں کی۔ کتنی معصوم اور خوب صورت زندگی گزاری ہے تم نے... اور اب اس جہنم میں چلی آئی ہو۔''

گاڑی ایک بڑے سے گیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔

اس احاطے میں فرزین کو کئی مسلح محافظ دکھائی دیے جو شہلا کو دیکھ کر الرٹ ہوگئے۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' شہلا نے کہا۔

شہلا اسے اپنے ساتھ ایک بہت بڑے ڈرائنگ روم میں لے آئی جہاں ایک جہازی سائز کے صوفے پر ایک جہازی سائز کا آدمی بیٹھا تھا۔ وہ اتنا موٹا تھا کہ شاید اپنی مرضی سے اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا ہو۔

''آؤ میری گڑیا... آؤ۔'' اس نے شہلا کو دیکھ کر اپنے موٹے موٹے بازو پھیلا دیے۔

شہلا اس سے لپٹ گئی۔ پھر اس نے الگ ہو کر فرزین کی طرف اشارہ کیا۔ ''بابا! یہ میری دوست ہے... میری بہن اور میری سب کچھ ہے۔''

''خوش آمدید... خوش آمدید!''

''بابا! میری اس جان کو ایک آدمی سے شکایت ہوگئی ہے۔''

''کون ہے وہ؟'' موٹا شخص غصے سے بولا۔ ''پورے شہر میں اسے گاڑی سے باندھ کر دوڑاتا رہوں گا۔ بتاؤ کون ہے؟''

''فیاض علی۔'' شہلا نے بتایا۔ ''وہ امام صاحب کا بیٹا۔''

''اوہ... وہ...'' موٹا شخص غصے سے پھنکارا۔ پھر اپنے برابر رکھے ہوئے انٹرکام کو اٹھا کر دہاڑا۔ ''دس منٹ کے اندر اندر فیاض علی کو حاضر کرو۔''

ریسیور رکھ کر اس نے فرزین کی طرف دیکھا۔ ''وہ آ رہا ہوگا۔ اس کا حشر تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا... اور یہ سب بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا بدتمیزی کی ہے۔ بس اتنا بہت ہے کہ تمہیں اس سے شکایت ہوگئی ہے۔''

دس منٹ سے شاید زیادہ نہیں گزرا ہوگا کہ فیاض علی کانپتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوا اور فرزین کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ

گھر بیٹھے ایک سالہ سکل ڈویلپمنٹ ڈپلومہ

بذریعہ خط و کتابت (عمر اور تعلیم کی کوئی قید نہیں)

انگلش لینگویج	بیوٹی پارلر اینڈ بیوٹیشن	ڈرافٹس مین سول	فوٹو گرافی	فرسٹ ایڈ میڈیکل	جرنلزم	الیکٹریشن	لائبریرین
ریڈیو ٹی وی ٹیکنیشن	نیوز رپورٹنگ	پبلک ریلیشن آفیسر	ڈرافٹس مین مکینیکل	سکول ٹیچنگ	لیڈی ٹیلرنگ	یوگا	
موبائل ریپیئرنگ	ڈرائنگ ماسٹر	انٹیریئر ڈیزائننگ / فائن آرٹس	کوکنگ اینڈ بیکنگ	بوتیک اینڈ فیشن ڈیزائننگ	امپورٹ ایکسپورٹ		
ریفریجریشن اینڈ ایئر کنڈیشننگ	کمپیوٹر کورس	کمپیوٹر ہارڈ ویئر	آٹو کیڈ الیکٹریکل	آٹو کیڈ سول	کارپینٹر	موٹر سائیکل ٹیکنیشن	
حکمت طب نبوی	سول سرویئر کوانٹٹی سرویئر	فزیوتھراپی	پلمبر	ہومیو ڈاکٹر	ہوم اکنامکس	مارکیٹنگ	پولٹری فارمنگ	چلڈرن کیئر
میجک کرنا سیکھیے	عربی بول چال سیکھیے	سائنس اور زراعت	ویلڈنگ	فٹر	باغبانی (پھل اور سبزیاں)	ہائی جین اینڈ پبلک ہیلتھ	

ایڈمیشن فیس -/1000 روپے ماہانہ فیس -/350 روپے۔ مدت ایک سال (چھ چھ ماہ کے دو سمسٹر) نام پتہ اور کورس کا نام SMS کرنے کیلئے فون 0345-7917181 یا ڈاک سے بذریعہ ڈاک موصول ہو جائے گا۔ طلبہ کو جو ڈپلومہ سرٹیفکیٹ جاری کیا جائے گا گورنمنٹ سے منظور شدہ ہوگا۔ نوٹ: (1) وہی طلبہ SMS کریں جو فیس ادا کر کے کورس منگوانا چاہتے ہیں۔ (2) فاسٹ ٹریک کے ذریعے طلبہ ایک سال کورس کم مدت میں بھی مکمل کر سکتے ہیں

گھر بیٹھے داخلے DAE اسسٹنٹ میڈیکل ڈپلومہ / انجینئرنگ ڈپلومہ

میٹرک سائنس و آرٹس کے بعد بذریعہ خط و کتابت ڈپلومہ ان ہومیو پیتھک، حکمت، نرسنگ، ڈسپنسر، ایکسرے ٹیکنیشن، الٹرا ساؤنڈ ٹیکنیشن، ڈینٹل ٹیکنیشن، فزیو تھراپی، ویٹرنری اسسٹنٹ (جانوروں کا علاج)، لیبارٹری ٹیکنیشن، اسسٹنٹ (چار سالہ حکمت کورس، ہومیو پیتھک کورس)، الیکٹریکل، الیکٹرونکس، سول، مکینیکل، ٹیکنالوجی، آرکیٹیکچر، کیمیکل، ٹیکسٹائل، ڈیزائننگ، کمپیوٹر، بائیو میڈیکل انجینئرنگ، سول سرویئر، کوانٹٹی سرویئر (3 سالہ ڈی اے ای اور دو سالہ بی ٹیک) سمسٹر رجسٹریشن فیس -/2000 روپے ماہانہ فیس -/500 روپے کل مدت ایک سال (چھ چھ ماہ کے دو سمسٹر) نام پتہ اور کورس کا نام SMS کرنے کیلئے موبائل نمبر 0305-6482061 نوٹ صرف وہی طلبہ و طالبات SMS کریں جو فیس ادا کر کے کورس منگوانا چاہتے ہیں۔ پراسپکٹس اور داخلہ فارم ڈاک کے ذریعے آپ کے گھر موصول ہو جائے گا۔ ڈپلومہ گورنمنٹ سے منظور شدہ ہوگا۔ رزلٹ کا انتظار کرنے والے طلبہ بھی داخلہ کے اہل ہیں

گھر بیٹھے داخلے ایگزیکٹو ایم بی اے (ایگزیکٹو مینیجر ان بزنس ایڈمنسٹریشن)

سپیشلائزیشن ان: مارکیٹنگ، فنانس، HRM، بینکنگ مینجمنٹ، ہاسپٹل مینجمنٹ، میڈیکل سٹور مینجمنٹ، ایڈمنسٹریشن، کنسٹرکشن مینجمنٹ، ٹیکسٹائل مینجمنٹ، اسٹاک مینجمنٹ، انگریزی مینجمنٹ، الیکٹریکل، سول، مکینیکل، کیمیکل، ایگریکلچر مینجمنٹ۔

ایسے طلبا و طالبات جن کی تعلیمی قابلیت بی اے، بی ایس سی، بی کام، بی سی ایس، ایم بی بی ایس، ڈی اے ای اور بی ایس سی انجینئرنگ ہے اور وہ گھر بیٹھے مندرجہ بالا کورس بذریعہ خط و کتابت کرنا چاہتے ہیں وہ اپنا نام، کورس کا نام، والد کا نام اور مکمل ایڈریس لکھ کر موبائل نمبر 0306-4829917 پر SMS کریں یا فون کریں۔ پراسپکٹس اور داخلہ فارم آپ کے گھر موصول ہو جائے گا۔ کورس گورنمنٹ سے منظور شدہ ہوگا۔ رزلٹ کا انتظار کرنے والے طلبہ بھی داخلہ کے اہل ہیں۔ کورس گھر بیٹھے اسائنمنٹ کے ذریعے ہوگا اور امتحان بھی گھر بیٹھے ہی ہوں گے۔ سمسٹر رجسٹریشن فیس -/2000 روپے ماہانہ فیس -/1000 روپے

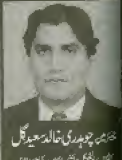

چیئرمین چوہدری خالد سعید گل

نیشنل انسٹیٹیوٹ آف مینجمنٹ سائنسز NIMS ستیانہ روڈ بالمقابل آئیڈیل سوئٹس اینڈ بیکرز نزد APTECH بٹالہ کالونی فیصل آباد۔

فرزین یہاں پہنچ جائے گی۔

"تمہارا مجرم حاضر ہے۔" موٹے شخص نے کہا۔ "اب تم جو سزا چاہو، دے سکتی ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ اس سے صرف یہ کہہ دیں کہ یہ اب میرے راستے میں نہ آئے۔"

"نہیں، سزا ضروری ہے۔" شہلا نے کہا پھر اس نے فرزین کی طرف دیکھا۔ "فرزین! اپنی سینڈلیں اتارو۔"

"کیا؟" فرزین حیران رہ گئی۔

"ایسے کتوں کو تلوے چاٹنے کی عادت ہوتی ہے۔ یہ تمہارے تلوے چاٹے گا۔"

فرزین بوکھلائی ہوئی تھی۔ شہلا کا یہ حکم اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ شہلا نے خود آگے بڑھ کر اس کی سینڈل اتار دی اور اس کے اشارے پر فیاض نے کسی کتے ہی کی طرح اپنی زبان سے اس کے تلوے چاٹنے شروع کر دیے۔

فرزین کے پورے بدن کو سنسنی، شرم، ہیجان، کراہت کے ملے جلے اثرات نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسے ہنسی بھی آرہی تھی اور وہ فیاض کی حالت دیکھ کر سکتے میں رہ گئی تھی کہ جس شخص نے اسے اغوا کر کے برباد کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اس کی اس وقت کیا حالت ہو رہی تھی۔

موٹا شخص ہنسنے لگا۔

اس کا قہقہہ بلند ہوا اور اس کا تھل تھل کرتا ہوا جسم پورے صوفے پر اس طرح ہل رہا تھا جیسے کمرے میں زلزلہ آگیا ہو۔ اس کو ہنستا دیکھ کر اس کے ارد گرد کھڑے ہوئے اس کے محافظ بھی ہنس رہے تھے۔ شہلا بھی ہنس رہی تھی اور فیاض فرزین کا تلوا چاٹے جا رہا تھا... کسی سعادت مند کتے کی طرح!

اس کی ساری بدمعاشی ہوا ہو گئی۔

"بس، ہٹ جاؤ۔" شہلا نے حکم دیا۔

فیاض ایک جانب سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ شرمندگی سے اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور اس میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اپنی گردن اٹھا سکے۔

"اور سن..." اس بار موٹے شخص نے اسے آواز دی۔ "اب تجھے ہفتے میں ایک بار اس لڑکی کے تلوے چاٹنے ہوں گے۔"

فرزین نے کہنا چاہا کہ بس اب بہت ہو گیا لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی۔ شہلا نے ایک ملحقہ دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ باتھ روم ہے۔ جا کر اپنے تلوے دھو لو۔ ایک ناپاک انسان نے انہیں گندا کر دیا ہے۔"

فرزین واش روم میں چلی گئی۔

اسے اب طاقت کے کرشمے کا احساس ہو گیا تھا۔ شہلا کتنی طاقتور عورت تھی۔ وہ موٹا جو اپنی جگہ سے شاید حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا، وہ کتنا بھیانک اور کتنا خطرناک تھا کہ فیاض جیسا آدمی بھی اس کے سامنے کتے جیسا ہو کر رہ گیا تھا۔

فرزین کو شہلا نے اس کے گھر کے دروازے پر اتارتے ہوئے اس سے کہا۔ "میری جان! فیاض سے تو تمہیں نجات مل چکی ہے لیکن اس شہر میں ہر قدم پر ایک فیاض تمہارے لیے کھڑا ہوا ہے۔ ہم کب تک تمہاری حفاظت کرتے رہیں گے؟ اس لیے اپنی حفاظت خود کرنا سیکھو۔ طاقت حاصل کرو میری طرح۔ تم خطرناک حد تک حسین ہو۔ اپنے حسن کو اپنا ہتھیار بنا کر ہر اس شخص کو مار ڈالو جو تمہارے راستے میں آنے کی کوشش کرے۔ ان کتوں سے اپنے تلوے چٹواؤ پھر کوئی بڑے صاحب اور کوئی فیاض تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" فرزین نے ایک گہری سانس لی۔ "میں خود کو طاقتور بناؤں گی۔"

"یہ میرا کارڈ رکھ لو۔" شہلا نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اور جب بھی میری ضرورت ہو، مجھے آواز دے لینا۔"

☆☆☆

فرزین نے بھی اب طاقت حاصل کر لی تھی۔

شہلا سے ملاقات کے دو مہینوں کے اندر اندر اس نے زندگی کے بے شمار تجربات حاصل کر لیے تھے۔ شہلا نے ہر قدم پر اس کی راہنمائی کی۔

اس نے فرزین کو سکھایا کہ اپنے آپ کو بچاتے ہوئے مردوں کو اور خاص طور پر طاقتور مردوں کو کس طرح بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔

اس نے فرزین کو اپنے حلقوں میں متعارف کروا دیا جن کی مدد سے اس نے کاروبار کر لیا تھا۔ یہ ایک بوتیک تھا اور صرف بوتیک ہی نہیں بلکہ جدید فیشن کے ہر پہلو پر اس کی دسترس تھی۔ اس بوتیک کی زیر نگرانی برائڈل شوز، فیشن شوز ہوا کرتے اور ان تمام شوز کا مقصد یہ تھا کہ ایسی لڑکیاں تیار کی جائیں جو مردوں کی محتاج بن کر نہ رہ سکیں۔

یہ لڑکیاں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو رہی تھیں۔

فرزین نے ایک فوٹوگرافر ہائر کر لیا تھا۔ یہ ایک منجھا آدمی تھا جس کا ہنر یہ تھا کہ عام صورت شکل کو بھی اس انداز سے ایکسپوز کرتا کہ وہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی دکھائی دیتی۔

ان تصویروں کا باقاعدہ البم تیار کیا جاتا اور وہ البم شہلا اس سے لے جایا کرتی۔ فرزین اکثر اس سے پوچھا کرتی۔ "شہلا! تم لڑکیوں کی تصویروں کا کیا کرتی ہو؟"

وہ ہنس دیتی۔ "میری جان! تم صرف آم کھاؤ، پیڑ مت گنا کرو۔"

شہلا پر اسے اتنا بھروسا تھا کہ اس نے پیڑ گننے چھوڑ دیے تھے۔ زندگی اچانک ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ ایسی زندگی کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

وہ موٹا شخص اس پر بہت مہربان تھا۔

فرزین اس کے بدلتے روپ کو دیکھ کر حیران اور خوف زدہ رہ جاتی۔ شہلا اور فرزین کے لیے تو وہ بے پناہ نرم تھا لیکن اپنے دشمنوں کو معاف کرنے کا عادی نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کے قتل کا حکم اس نے فرزین کے سامنے دیا تھا۔

فرزین کے پاس اب کافی پیسے آگئے تھے۔

دلدار وادی میں پھولوں کے درمیان رہنے والی ایک شہزادی اب مکمل طور پر بدل چکی تھی۔ وہ پختہ اور ہو گئی تھی۔ فیاض کو اس نے معاف کر دیا تھا کیونکہ ویسے بھی وہ اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

اس نے شہر کے پوش علاقے میں ایک گھر خرید لیا تھا۔ کرم دین کو اس کی رفتار اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ اس سے کہا کرتا۔ "بیٹی! تم آخر کن راستوں پر چل نکلی ہو؟"

"بابا! تم فکر مت کرو۔ میں کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ میری رگوں میں تمہارا خون ہے اور میری روح میں دلدار وادی کی خوشبو بھری ہوئی ہے۔ اسی لیے میں بھٹکوں گی نہیں۔ میں نے صرف طاقت حاصل کی ہے کیونکہ ہمیں کئی بار اپنے کمزور ہونے کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔"

موٹے شخص کے بارے میں اس نے جان لیا تھا کہ اس کا نام احتشام ہے اور وہ انڈرورلڈ کا ایک خطرناک آدمی ہے۔ شہلا کو اس نے اپنی بیٹی بنا رکھا تھا اور شہلا ہی کے حوالے سے اس کی مہربانیاں فرزین پر بھی تھیں۔

ایک شام شہلا نے فون کیا۔ "فرزین! تمہیں بابا نے بلایا ہے۔"

وہ احتشام کو بابا کہا کرتی تھی۔

"خیریت تو ہے نا؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں بھی اسی طرف جا رہی ہوں۔ تم بھی پہنچ جاؤ۔"

فرزین کچھ دیر کے بعد احتشام کے سامنے تھی۔ شہلا بھی وہاں موجود تھی۔ اس کمرے میں ان تینوں کے علاوہ اور

ہر شمارہ خاص شمارہ

ماہنامہ سرگزشت

نیا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے

شمارہ اپریل 2010ء کی جھلکیاں

دشتِ مجنوں

ایک بڑے ادیب کی دلچسپ سوانح حیات

شہر مولتان

ملتان پر ایسی تحریر جو بار بار پڑھی جائے گی

چتوڑ کا چاند

ایک رانی کی قربانی کا دلچسپ احوال

میرا گھر

ایک دکھی عورت کی سچ بیانی جو آپ کو بھی غمزدہ کرے گی

اس کے علاوہ

انصاف، انا کا اسیر، بچہ میرا دوست، آئیڈ، اندھی گولی، میری مظلوم ماں، زہر کی پڑیا اور بلائے ناگہانی جیسی سچ بیانیاں، انڈر ٹیکر جیسے معروف ریسلر کا زندگی نامہ اور بھی بہت سی تحریریں جو آپ کے ذوقِ مطالعہ کی تسکین کا باعث بنیں گی

آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے حاصل کریں

کوئی نہیں تھا۔

احتشام خلافِ معمول بہت خاموش تھا۔ وہ بار بار فرزین کی طرف اس طرح دیکھتا جیسے اس سے کچھ کہنا چاہتا ہو مگر کچھ کہہ نہ پاتا۔ بالآخر شہلا نے اس سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے بابا! آج آپ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔''

''نہیں۔'' وہ غرایا۔ ''پریشانیاں ہم جیسوں کے لیے نہیں ہوتیں۔ میں تو اس لڑکی سے ایک کام لینے کا سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں کر بھی پائے گی یا نہیں۔''

''آپ حکم دیں بابا!'' فرزین نے کہا۔ ''آپ پہلی بار کسی کام کے لیے کہہ رہے ہیں۔''

''تمہیں ایک آدمی کو اپنے قابو میں کرنا ہے۔ حسن نام ہے اس کا۔ وہ ایک خفیہ ایجنسی کا سربراہ ہے۔ اس ایجنسی کا کام ملک سے ہم جیسے انڈر ورلڈ والوں کا سراغ لگا کر ان کی فائل تیار کر کے آرمی حکام کے حوالے کرنا ہے۔ پھر آرمی حکام کی جب مرضی ہو یا ان کی پلاننگ ہو تو وہ ہمارے خلاف ایکشن کر سکتے ہیں۔''

''فرزین کو کس طرح اس آدمی کو کنٹرول کرنا ہے بابا؟''

''وہ ایک ایسا آدمی ہے جو آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔ بہت ہی سخت مزاج اور اصول پسند ہے۔ وہ کبھی اسکینڈل کی زد میں نہیں آیا۔ کوئی لڑکی اس کو اپنے جال میں نہیں الجھا سکی ہے حالانکہ اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ نوجوان ہے لیکن اس نے اپنی آرمی ٹریننگ کے دوران ایسے کارنامے کیے ہیں کہ اس کی بنیاد پر اس کو اس اہم اور خفیہ محکمے کا سربراہ مقرر کر دیا گیا ہے۔''

''انٹرسٹنگ۔'' شہلا نے ہونٹ سکیڑے۔ ''پھر تو آپ یہ کیس میرے حوالے کر دیں بابا۔''

''نہیں، تم اسے قابو میں نہیں کر سکو گی۔ ہاں، فرزین کے لیے امکانات ہیں۔''

''وہ کس طرح بابا؟''

''اس کی شخصیت کے دو متضاد پہلو ہیں۔ حسن ایک طرف تو سخت گیر اور اصول پسند انسان ہے، دوسری طرف حُسن پرست بھی ہے۔ حُسن پرست سے یہ مت سمجھنا کہ وہ لڑکیوں یا عورتوں وغیرہ کا شوق رکھتا ہے بلکہ وہ مصور ہے۔ لینڈ اسکیپ میں مہارت رکھتا ہے۔ فارغ اوقات میں اس کا یہی مشغلہ ہے... مصوری۔ وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ مصوری کا سامان اٹھائے خوب صورت مقامات کی طرف جا کر مصوری کرتا رہتا ہے۔ بس اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ یہ کام فرزین ہی کر سکتی ہے۔''

''میں سمجھی نہیں، مجھ سے یہ کام کس طرح ہو گا؟'' فرزین نے پوچھا۔

''تم نے بتایا تھا کہ تم دلدار وادی میں رہتی تھیں۔'' احتشام نے کہا۔

''جی بابا! میں وہیں پیدا ہوئی۔ وہاں کے ایک ایک درخت، ایک ایک پودے سے واقف ہوں۔''

''تم کسی طرح اس سے مل کر اس میں یہ شوق پیدا کر دو کہ وہ دلدار وادی تک چلا جائے۔ میرا مطلب ہے اپنی مصوری کرنے۔ وہاں ہم ایسے حالات پیدا کر دیں گے کہ وہ کئی ہفتوں تک وہاں سے نکل نہیں سکے گا اور اس دوران تم اسے اپنے حُسن کے جال میں پھانس لینا۔ معاف کرنا۔ میں اس قسم کے الفاظ استعمال کر رہا ہوں لیکن مقصد یہی ہے۔''

''فرض کریں، اس نے فرزین سے دوستی کر لی... اس کے بعد کیا ہو گا؟''

''فرزین اس سے باتوں کے درمیان اس کے محکمے کے راز اگلوا لے گی۔'' احتشام نے کہا۔ ''اس کے پاس ایک ایسی ڈیوائس ہو گی جو ان دونوں کی باتیں ہم تک پہنچا دے گی اور ہم اس کی مدد سے اپنا کام کر گزریں گے۔''

''بابا! اتنا جھنجٹ مول لینے کی کیا ضرورت ہے!'' شہلا نے کہا۔ ''سیدھے سیدھے اس بندے ہی کو راستے سے ہٹا دیں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ محکمہ تو اپنی جگہ کام کرتا رہے گا۔ میں پورے محکمے پر وار کرنا چاہتا ہوں۔'' موٹے نے بتایا۔ ''وہ اگر منظر سے ہٹ بھی گیا تو اس کی جگہ کوئی اور آ جائے گا۔''

''اس لیے آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس کے محکمے کے سارے راز معلوم ہو جائیں؟''

''ہاں اور یہ کام فرزین ہی کر سکتی ہے کیونکہ ایک طرف تو خود اس کا اپنا حُسن اور دوسری طرف دلدار وادی کے تذکرے حسن کو کھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔''

''مجھے منظور ہے بابا۔'' فرزین نے کہا۔ ''میں اس پروجیکٹ پر کام کر سکتی ہوں۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' احتشام مسکرا دیا۔ ''لیکن یہ بہت ہی ٹاپ سیکرٹ قسم کا مشن ہے۔''

''جی ہاں، اس کا اندازہ ہے مجھے۔''

''لیکن وہ بندہ ملے گا کہاں بابا؟'' شہلا نے پوچھا۔

''مڈنائٹ کلب میں... اور آج ہی ملے گا کیونکہ کل

سے وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر کالام وغیرہ کی طرف نکل جائے گا۔''

''ایک بات بتائیں بابا! کیا فرزین یہ کام شہر میں اس کے قریب رہ کر نہیں کر سکتی ہے؟''

''نہیں، یہ بھی ایک انسانی پہلو ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں فرزین سے دوستی کر لے لیکن یہاں کا ماحول اسے جکڑے رکھے گا جبکہ کہیں اور جا کر وہ بے تکلفی اور رومانس کے موڈ میں ہو گا اور اس وقت وہ... وہ سب کچھ بتانا شروع کر دے گا جو فرزین اپنی ہوشیاری سے اس سے اگلوانا چاہے گی۔''

''سمجھ گئی بابا۔'' فرزین نے کہا۔ ''میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

''تم آج شہلا کے ساتھ مڈنائٹ کلب چلی جانا۔''

فرزین نے کلب جانے سے پہلے ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا تھا۔ سرخ رنگ کے لباس نے اسے اور بھی دل فریب بنا دیا تھا۔

''واہ! تم تو پیر بہوٹی معلوم ہو رہی ہو۔'' شہلا نے اس کی تعریف کی۔ ''وہ بے چارہ تو شاید پاگل ہو جائے گا۔''

''جانتی ہو، میں تمہیں کیوں خوش دکھائی دے رہی ہوں؟'' فرزین نے پوچھا۔

''میں جانتی ہوں۔ تم نے برسوں کے بعد دلدار وادی کی باتیں سنی ہیں۔ تمہیں وہاں جانے کا موقع مل رہا ہے۔ تم وہاں اپنے پودوں، درختوں اور پھولوں سے ملو گی... وہاں کے پرندوں سے باتیں کرو گی۔ شاید اس لیے تمہاری روح تک میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی ہے۔''

''ہاں شہلا! بالکل یہی بات ہے۔ دلدار وادی میرے بچپن کے خوابوں کی سرزمین ہے۔ میں نے وہاں بہت حسین دن گزارے ہیں۔ بہت یادیں وابستہ ہیں۔ اب ان یادوں کو تازہ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔''

''گڈ لک! مجھے امید ہے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گی۔'' شہلا نے کہا۔ ''آؤ اب چلتے ہیں۔ تمہارا شکار پہنچ گیا ہو گا۔''

مڈنائٹ کلب میں بہت گہما گہمی تھی۔ پورا کلب رنگوں اور خوشبوؤں سے بھرا ہوا تھا۔ نہ جانے کتنی خوب صورت لڑکیاں تھیں لیکن فرزین کے سامنے سارے چراغ گل ہو گئے تھے۔ وہ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اب تم اپنے شکار کو سنبھالو۔'' شہلا نے کہا۔ ''میں تم

مایوسی گناہ ہے

پیرزادہ وسیم جعفری کا اعلان

ہم چھین لیں گے آپ کی ہر پریشانی اللہ کے کرم سے

وہ کام جو بڑے سے بڑا عامل و جادوگر نہ کر سکے وہ میرے بزرگوں کی دعا سے ہو جاتا ہے مثلاً شوہر کے دل سے شک و نفرت کی آگ ہو، سنگدل محبوب نے نیند حرام کر دی ہو تجارت میں دن بدن نقصان ہوتا ہو، رشتوں میں بندش، عزیزوں سے لڑائی جھگڑا، عزت و وقار میں کمی یا دشمن حاوی ہو، بیٹی کی سسرال میں عزت نہیں، امیگریشن کے مسائل، لاٹری نمبر غرضیکہ ہر مشکل کیسی ہی کیوں نہ ہو اپنی آخری امید سمجھ کر رابطہ کریں

پیرزادہ وسیم جعفری
گجرات پاکستان
0300-7462777
0333-8217808

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پھلبہری

سفید داغ قابل علاج مرض ہے

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر

اجمل زیدی

ہربل

کے ذریعے پاکستان کا مستقل پروگرام

ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

G-8/1

(051) 2254505 - 2255007

0300-8566188

2261836

9-جنوری تا 30-جنوری

9-جولائی تا 30-جولائی

9-دسمبر تا 30-دسمبر

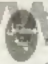

پشاور

ہوٹل امین

کم فروری تا 11 فروری

کم جون تا 11 جون

کم اکتوبر تا 11-اکتوبر

قیام

فون (091) 2218215-9

موبائل 0300-8566188

لاہور

ہوٹل عامر

14-فروری تا 27 فروری

14-جون تا 27 جون

14-اکتوبر تا 27-اکتوبر

قیام

فون (042) 7115015-19

موبائل 0300-8566188

ملتان

ہوٹل سٹی سینٹر

28 مارچ تا 6-اپریل

28 جولائی تا 6-اگست

28 نومبر تا 7 دسمبر

قیام

فون (061) 4518061-62

4582803 (0300-8566188)

کراچی

فیروز ہیلتھ سینٹر

13-مارچ تا 27 مارچ

13-جولائی تا 27 جولائی

13-نومبر تا 27 نومبر

قیام

آفس 706، 7 فلور

K.F.C

فون 021-7012068-9

موبائل 0300-8566188

www.leucodermatologist.com

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

سے الگ ہو رہی ہوں۔''

''لیکن وہ ہے کہاں؟''

''وہ سامنے کرانے کی جھاڑیوں کے پاس... جس نے بلیو سوٹ پہن رکھا ہے۔'' شہلا نے بتایا۔

فرزین نے اسے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ نہ جانے اس کے سینے میں کیا ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ ایک ایسی ہلچل تھی جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ایسا لگا جیسے وہ اسے بہت قریب... بہت قریب سے جانتی ہو۔

وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ وہ اس وقت اکیلا ہی کھڑا تھا۔ فرزین اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بھی چونک کر فرزین کی طرف دیکھا اور جیسے سکتے میں رہ گیا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ ''تم... تم شاید فرزین ہو نا؟''

''ہاں اور تم... تم...''

''میں دانیال ہوں... دانیال حسن۔'' دانیال نے بتایا۔

فرزین لہراتی ہوئی اس کے سامنے گر گئی۔

☆☆☆

نہ جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا۔ وہ کسی خوب صورت کمرے کے آرام دہ صوفے پر لیٹی ہوئی تھی اور دانیال اس کے پاس دوسرے صوفے پر بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فرزین نے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ دانیال نے کہا۔ ''نہیں نہیں... لیٹی رہو۔ تم ابھی کمزوری محسوس کر رہی ہو گی۔''

''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' فرزین اٹھ بیٹھی۔

دونوں ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ ''دانیال! میں نے تو تمہیں اس لیے پہچان لیا تھا کہ تمہارا جو چہرہ بچپن میں تھا، وہی آج بھی ہے... اور میں تمہارے دیے ہوئے لاکٹ میں تمہاری تصویر دیکھتی رہتی ہوں اس لیے پہلی نظر میں تمہیں پہچان گئی لیکن تم... تم نے تو کمال کر دیا۔''

''فرزین! تم کیا سمجھتی ہو، میں نے تمہیں بھلا دیا ہو گا... نہیں۔ تم تو میری زندگی کے لیے پیار کا پہلا جھونکا تھیں اور اس پہلے جھونکے کی فرحت بھلائی نہیں جاتی۔ میں نے تمہیں ہر پل یاد رکھا ہے۔ تمہارا نام بھی اور تمہارا چہرہ بھی۔''

''پھر بھی اس طرح پہچان لینا تو بہت بڑی بات ہے نا۔''

''کچھ بھی نہیں ہے... ٹھہرو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے تمہیں کس طرح یاد رکھا۔''

دانیال اٹھ کر ایک کمرے میں چلا گیا۔ فرزین اس اتفاق پر سوچتی ہی رہ گئی۔ کتنے حیرت انگیز طور پر دانیال سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' دانیال کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔''

فرزین کو اس ڈیوائس کا خیال آیا جو احتشام نے اس کے حوالے کی تھی۔ وہ ڈیوائس فرزین کے بُندوں میں لگی ہوئی تھی۔ وہ بُندے اب اس کے کانوں میں نہیں تھے۔

''تم شاید اپنے بُندے تلاش کر رہی ہو؟'' دانیال ہنستے ہوئے بولا۔

''ہاں۔''

''وہ میں نے ایک طرف رکھ دیے ہیں۔'' دانیال نے بتایا۔ ''اس میں بہت ہی جدید قسم کی ڈیوائس لگی ہوئی ہے اور مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی تمہیں میرے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''بے وقوف بھیجنے والے نے یہ ضرور بتا دیا ہو گا کہ میرا تعلق کس محکمے سے ہے۔ ایسی چیزیں تو ہماری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہیں۔''

''او خدا! تیرا شکر ہے۔'' فرزین نے بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''ورنہ میں زندگی بھر اپنے آپ سے شرمندہ ہوتی رہتی۔''

''اب آؤ میرے ساتھ۔'' دانیال نے کہا۔

[illegible]

انتہائی خوب صورت لینڈ اسکیپ بنائے گئے تھے اور ہر طرف صرف ایک ہی انسانی چہرہ تھا... اور وہ چہرہ خود فرزین کا تھا۔

''یہ... یہ میری تصویریں...'' وہ سکتے میں رہ گئی۔ ''یہ تم نے کس طرح بنا لیں؟''

''بہت آسانی سے۔ میں تصور کی آنکھوں سے تمہیں دیکھتا رہتا تھا۔ سوچتا تھا کہ اب تم اتنی بڑی ہو گئی ہو تو اب تمہارا چہرہ ایسا ہو گیا ہو گا۔ اب جوان ہو کر ایسی ہو گئی ہو گی۔ بس اپنے تصور کی طاقت سے اب تک تمہاری تصویریں بناتا رہا ہوں۔''

''دانیال... تم...'' فرزین کی آواز کانپنے لگی۔ ''تم... تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو؟''

''تم خود دیکھ لو لیکن تم لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے؟'' دانیال نے پوچھا۔ ''میں تمہاری تلاش میں کئی بار ولدار وادی جا چکا ہوں لیکن یہی معلوم ہوا کہ تم لوگ کہیں جا چکے ہو۔ پھر میں ہر سال ایسی ہی برف پوش پہاڑیوں اور وادیوں کے درمیان تمہاری تلاش میں گھومتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم نیچر سے محبت کرتی ہو اس لیے شہر میں نہیں رہ سکتیں۔ تم کہیں آس پاس ہو اور اسی تلاش کے درمیان میں نے پہاڑوں اور

وادیوں کی پینٹنگ شروع کردی۔ یہ چہرہ تو میں نے صرف ایک بنایا ہے... اور وہ ہے تمہارا۔ باقی فطرت کے مناظر کی تصویریں بناتا رہا ہوں کیونکہ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا جیسے تم اچانک صنوبر کے کسی درخت کے پیچھے سے نکل کر میرے سامنے آجاؤ گی... اور آج تم آگئیں لیکن تم لوگوں کے ساتھ کیا ہوا تھا... وہ جگہ کیوں چھوڑ دی؟"

فرزین نے اسے تفصیل کے ساتھ اپنی ساری کہانی سناتے ہوئے کہا۔ "اور اس طرح میں تمہارے پاس آگئی۔"

"میرے خدا! یہ تو عجیب اتفاق ہے۔" دانیال نے کہا۔ "اتفاق سے میں جن لوگوں کے خلاف کام کررہا ہوں، وہ وہی لوگ ہیں... تمہارے ہمدرد!"

"میرے ہمدرد نہ کہو۔ میں اتفاقاً ان کے پاس پہنچ گئی ہوں۔ احتشام ایک خطرناک آدمی ہے لیکن میرے ساتھ اس کا رویہ بہت اچھا رہا ہے۔"

"اب یہاں آکر میں گڑبڑا گیا ہوں۔" دانیال نے کہا۔ "تم ہمارے دشمن کی طرف سے میرے پاس آئی ہو، اب سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں؟"

"تم اپنا فرض پورا کرو دانیال۔" فرزین نے مشورہ دیا۔ "تم ان کے خلاف جو کچھ کررہے ہو، ضرور کرتے رہو۔"

"تم ایک بات بتاؤ، میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں۔ تمہارے جواب پر ہماری آئندہ پلاننگ اور زندگی کا انحصار ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ ایک طرف تو وہ لوگ تمہارے ہمدرد ہیں۔ انہوں نے تمہیں بہت پیار دیا ہے۔ بہت محبت کی ہے تم سے۔ سہارا دیا ہے تمہیں... اور دوسری طرف وہ قوم اور وطن کے دشمن ہیں۔ اب بتاؤ، تم ایسی صورت میں کیا کرو گی؟ کس کا ساتھ دو گی... ان لوگوں کا یا قوم اور وطن کا؟"

"یہ کوئی پوچھنے کی بات نہیں ہے دانیال! مجھے اپنی قوم اور وطن ہی کا ساتھ دینا ہوگا۔"

"شاباش! بس اب تم وہی کرو جو ان لوگوں نے تم سے کہا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"انہیں یقین دلا دو کہ تم مجھے قابو کرنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔" دانیال نے کہا۔ "تم اپنے پھندے مضبوط کرلو۔ پھر ہم ایسی باتیں کریں گے جو ان کے پلان کے مطابق ہوں گی۔ تم مجھے اکساؤ گی کہ میں دلدار وادی تک ضرور جاؤں... اور جب ہم وہاں پہنچ جائیں گے تو پھر وہی ہوگا جس کی پلاننگ میرے ذہن میں ہوگی۔ تمہیں ملک کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا۔"

"میں تیار ہوں دانیال۔" فرزین نے کہا۔ "اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میں دس بار سوچتی لیکن تمہارے سامنے مجھے سوچنا ہی نہیں ہے... جو ہوگا اس کا سامنا کرلوں گی۔"

☆☆☆

وہ ایک بار پھر دلدار وادی میں تھی۔

نہ جانے کتنے برسوں کے بعد اس کا یہاں آنا ہوا تھا۔

یہاں کی وادیاں اسی طرح تھیں۔ جھیل اسی طرح خوب صورت تھی۔ پھولوں کے وہی رنگ تھے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ البتہ کچھ لوگ بدل گئے تھے۔

کچھ پرانے لوگ مر چکے تھے۔ ان کی جگہ ان کی اولادوں نے لے لی تھی۔ حکومت نے یہاں ایک ریسٹ ہاؤس بنوا دیا تھا۔ دانیال اور فرزین اسی ریسٹ ہاؤس میں آکر رکے تھے۔

شہلا اور احتشام، فرزین کی پروگریس سے بہت خوش تھے جس نے دانیال حسن جیسے سخت دل اور اصول پسند نوجوان کو اپنے قابو میں کرلیا تھا۔

فرزین اور دانیال کی پلاننگ یہ تھی کہ دانیال آہستہ آہستہ اپنی باتوں میں اپنے محکمے کا راز ظاہر کرتا جائے گا لیکن یہ راز وہ نہیں ہوگا جس کی ضرورت احتشام کو تھی... بلکہ یہ ایک چال ہوگا اور جب وہ اس چال میں پھنس کر اپنا ایکشن شروع کریں گے تو اس وقت بہت آسانی سے ان کو گرفتار کرلیا جائے گا۔

دانیال کو ریسٹ ہاؤس میں چھوڑ کر وہ اپنے پرانے لوگوں سے ملنے چلی گئی۔ وہ سب اسے دیکھ کر بہت حیران اور خوش ہوئے۔

دلدار وادی کی شہزادی ایک عرصے کے بعد واپس آئی تھی۔ گاؤں کے لوگوں نے اس کے گرد ایک ہجوم سا لگا رکھا تھا۔

وہ بہت دیر تک ان کے درمیان رہی۔

پھر ان سے اجازت لے کر ریسٹ ہاؤس کی طرف واپس آگئی اور اچانک... درختوں کے عقب سے کچھ لوگ نکل کر اس کے ساتھ ہولیے۔

فرزین انہیں دیکھ کر چونک اٹھی۔ "بس، سیدھی چلتی رہو۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"کون ہو تم لوگ؟" فرزین نے پوچھا۔

"گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارے ساتھی ہیں۔" دوسرے نے کہا۔ "تم ریسٹ ہاؤس کی طرف جارہی ہونا؟ ہم بھی اسی طرف جارہے ہیں۔ باس ریسٹ ہاؤس میں تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

فرزین کانپ کررہ گئی۔

یہ سب کچھ بہت غیر متوقع تھا۔ باس ریسٹ ہاؤس تک کیوں پہنچ گیا تھا اور خود دانیال کہاں ہوگا؟ وہ تو اسے ریسٹ ہاؤس میں چھوڑ کر آئی تھی۔

باس ریسٹ ہاؤس کے لاؤنج میں تھا... اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ۔ اسی طرح پورے صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا۔ فرزین نے سب سے پہلے باس کو دیکھا۔ پھر دانیال کو دیکھا جو ایک طرف دیوار کے ساتھ اپنا کاندھا دبائے بیٹھا تھا۔ اس کے کاندھے سے نکلنے والے خون نے اس کی قمیص سرخ کردی تھی۔ فرزین بے تحاشا اس کی طرف لپکی۔

"رک جاؤ لڑکی!" باس نے گونج دار آواز میں کہا۔

فرزین نے رک کر احتشام کی طرف دیکھا۔ وہ غصے بھری نگاہوں سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "کیا تم نے ہمیں بے وقوف سمجھ رکھا تھا کہ ہم تمہیں اس طرح چھوڑ دیں گے؟ جب تم پہلی بار اس آدمی سے ملیں اور خوشی سے بے ہوش ہوکر گر پڑیں تو اسی وقت ہمیں شبہ ہوگیا تھا کہ تم اس شخص کو جانتی ہو۔ ہم نے تمہارے بارے میں چھان بین کی۔ پھر شہلا سے پتا چلا کہ تمہارے پاس ایک لاکٹ ہے جس میں تمہارے بچپن کے اس محبوب کی تصویر ہے۔ ہم نے مزید چھان بین کی تو معلوم ہوگیا کہ یہی وہ دانیال حسن ہے جو بچپن میں تم سے ملا تھا اور تم یہ کہانی شہلا کو سنا چکی ہو۔"

"ہاں، یہی ہے میرا محبوب۔" فرزین پھر اٹھی۔

"مجھے افسوس ہے بیٹا!" احتشام کا لہجہ نرم ہوگیا۔ "افسوس ہے کہ یہ دانیال حسن تمہارا محبوب ہے۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میں اسے معاف کردیتا لیکن یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ ہمارا تعلق جس دنیا سے ہے، وہاں جذبات اور محبتوں وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہم صرف اپنی بقا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہم نے تم دونوں کی موت کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"دیکھو احتشام!" دانیال نے اسے مخاطب کیا۔ "تم یہ کہہ چکے ہو کہ تم فرزین سے پیار کرتے ہو کیونکہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے پھر اس پورے معاملے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس لیے تم اسے جانے دو۔ معاف کردو اس کو۔ تمہاری دشمنی مجھ سے ہے، میرے محکمے سے ہے۔ فرزین کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"افسوس... یہ بھی نہیں ہوسکتا۔" احتشام نے دھیرے سے کہا۔ "شاید تم نہیں جانتے کہ ہمارے لیے رشتے ختم ہوکر رہ جاتے ہیں۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی ایک بیٹی کو گولی ماری ہے۔ خود اپنی بیٹی کو... کیونکہ وہ بھی ہمارا راز فاش کرنے جارہی تھی اور اب دوسری بیٹی کا خون کرتا ہوگا۔ ہاں، میں نے شہلا کی طرح فرزین کو بھی اپنی بیٹی سمجھا۔ اسی لیے میں نے اس سے پیار کیا لیکن میری پہلی اور آخری محبت میری تنظیم ہے۔ میں مجبور ہوں۔"

احتشام نے اپنی گردن جھکالی۔ فرزین نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"بابا! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ ہمیں معاف کردیں اور دانیال اپنے محکمے سے استعفا دے دے۔ ہم سب کچھ بھول کر کہیں اور چلے جائیں... کسی اور ملک میں جاکر رہنے لگیں۔"

"نہیں بیٹا! اب یہ نہیں ہوسکتا۔" احتشام نے کہا۔ "اب واپسی نہیں ہوسکتی۔"

فرزین اس دوران دانیال کے پاس آچکی تھی۔ دانیال نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ احتشام نے پھر فرزین کو مخاطب کیا۔ "ہاں، اگر تمہاری کوئی خواہش ہو تو ضرور بتادو۔ اگر کہو تو تمہارے ماں باپ کو اتنے پیسے دے دیے جائیں کہ انہیں زندگی بھر کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"نہیں۔" فرزین نے انکار میں اپنی گردن ہلادی۔ "میرے بابا کو یہ سب اچھا نہیں لگے گا۔ ہاں، ان تک یہ پیغام ضرور بھجوا دینا کہ ان کی بیٹی اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ ہے... وہ سمجھ جائیں گے۔"

"کون سے دوست؟"

"ایک تو یہ دانیال اور دوسرا ایک درخت۔ صنوبر کا خوب صورت درخت جس کے تنے پر میں نے چاقو سے اپنا نام لکھا تھا۔ اگر تم ہمیں مارنے کا فیصلہ کرہی چکے ہو تو ہم دونوں کو اسی درخت کے سائے میں دفن کروا دینا۔"

احتشام کی آنکھوں میں کچھ اور آنسو بھر آئے۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

☆☆☆

دلدار وادی میں صنوبر کے اونچے اونچے درختوں کے درمیان ایک گوشہ ہے جس کے ایک درخت پر فرزین کا نام کھدا ہوا ہے۔

اس درخت کے قریب دو قبریں بنی ہوئی ہیں... کچی قبریں۔ ان قبروں کے آس پاس پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں سے خوب صورت پرندے آکر ان قبروں کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں اور جب ہوائیں زور زور سے چلتی ہیں تو اس درخت سے کچھ پتے ٹوٹ کر ان دونوں قبروں پر بکھر جاتے ہیں۔

www.pkdigest.com

غیرت، دہشت، ظلم، دوستی اور دشمنی کے معاشرے میں جنم لینے والی داستان

دشمن دوست

دوسرا رنگ

کاشف زبیر

ہر عورت کی زندگی میں صنف مخالف کے اجارہ دار معاشرے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ایسی ہی ستم در ستم رسیدہ دوشیزہ کی داستان جسے مرد کے آگے سر تسلیم خم کرکے ہر ستم کو چپ چاپ سہہ لینے کا ترکہ وراثت میں ملا تھا باپ کی شفقت سے محروم بیٹی... حالات کی ترشی کا ذائقہ بدلنے کے لیے جب اس نے من میں چھپے فنکار کو ابھارنا چاہا تو مرد کی روایتی غیرت کا حریف سامنے آکھڑا ہوا۔ وقت کے ستم کا یہ دریا عبور ہوا تو مشکلات کا ایک نیا سمندر اس کے سامنے موجود تھا۔

تقدیر کے منہ زور بہاؤ سے نبرد آزما ایک دوشیزہ کی زندگی کے تغیرات

اکبر خان بہت غصے میں تھا۔ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی مینا کو بلالیا۔ اس کا نام مینا گل تھا اور اس کے نقوش اپنی بنگالی ماں سے ملتے تھے۔ اکبر خان پشاور کا رہنے والا تھا لیکن اس نے شادی ایک بنگالی عورت سے کی تھی۔

''مینا!'' اکبر خان نے کڑک کر کہا۔ ''ادھر آ۔''

''ہاں بابا۔'' باورچی خانے میں آٹا گوندھتی مینا بولی۔ ''ابھی آئی۔''

''ابھی نہیں... فوراً آ۔'' اکبر خان نے حکم دیا۔ مینا باپ کا لہجہ پہچانتی تھی اس لیے ایسے ہی آٹا لگے ہاتھوں کے ساتھ چلی آئی۔ وہ تقریباً انیس برس کی نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے باپ کا سرخ چہرہ دیکھا تو ڈر گئی۔

''بابا! کیا بات ہے؟''

''تو گل محمد کی بیٹی کی شادی میں ناچی تھی؟'' اکبر خان نے سنگین لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بابا۔'' مینا اور ڈر گئی۔ ''لیکن وہاں صرف لڑکیاں تھیں۔''

''بکواس نہ کر... اگر وہاں صرف لڑکیاں تھیں تو دوسروں کے پاس موبائل میں تیری تصویریں کہاں سے آگئیں؟'' اکبر خان دہاڑا۔ ''بول... کیا تو نہیں ناچی تھی؟''

''ہاں بابا۔'' اس نے پھر اقرار کیا۔

''کیوں؟'' اکبر خان گرجا۔ ''کیا میں نے تجھے منع نہیں کیا تھا؟ یہ ناچ گانا سب حرام ہے۔''

''کیا تھا بابا۔'' مینا بمشکل بولی۔

اکبر خان نے اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ ''پھر تو نے یہ حرکت کیسے کی... تیری جرأت کیسے ہوئی؟''

مینا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اکبر خان اس پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اسے بے دریغ مارنے لگا۔ مینا خاموشی سے پٹنے لگی لیکن پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ چیخنے لگی۔

اکبر خان کا تعلق پشاور کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں سے تھا۔ وہ اپنے باپ کی سات اولادوں میں سب سے چھوٹا تھا اور شاید اسی لیے بگڑ گیا تھا۔ اس کے چار بڑے بھائی پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے تھے لیکن اکبر خان نے پانچویں کے بعد اسکول کی شکل نہیں دیکھی [illegible] نے تنگ آکر اسے ایک مدرسے میں داخل کروا دیا جہاں اس [illegible] نے چار سال تک مار کھا کھا کر بڑی مشکل سے ناظرہ ختم کیا۔ اس کے بعد اس نے مدرسے جانے سے بھی انکار کر دیا۔ سارا دن آوارہ گردی کرتا اور دوسروں سے لڑائی جھگڑے کرتا رہتا۔ گھر والے اس سے تنگ آگئے تھے۔

سترہ سال کی عمر میں اپنے ایک رشتے دار کے ساتھ اس نے کراچی کا رخ کیا۔ اس کا رشتے دار کراچی میں بازاروں میں دو نمبر الیکٹرانک کا سامان بیچتا تھا۔ اس نے اکبر کو بازاروں میں چائے فروخت کرنے پر لگا دیا اور جب اکبر خان کے پاس کچھ رقم آئی تو وہ کپڑے کا اسٹال لگانے لگا۔ وہ پشاور اور نوشہرہ سے اسمگل شدہ کپڑا لاکر ان بازاروں فروخت کرتا۔ اس میں کمائی بہت اچھی تھی۔ تین سال میں اس نے اتنا کمالیا کہ شادی کا سوچنے لگا۔ اس نے سپر ہائی وے کے ساتھ ایک کچی بستی میں چھوٹا سا مکان بنا لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ خاندان میں اس کی شادی ممکن نہیں۔ اس کا باپ اس کے لیے کسی کی لڑکی مانگے گا ہی نہیں۔ اس لیے اسے شادی کے لیے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

اکبر خان کے ایک جاننے والے نے کہیں سے ایک بنگالی لڑکی خرید کر اس سے شادی کر لی تھی۔ اکبر خان نے اس سے معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ اندرون سندھ میں ایک جگہ سے اس نے یہ لڑکی خریدی تھی اور وہیں ایک قاضی نے اس کا نکاح پڑھایا تھا۔ اکبر خان نے پوچھا۔

''کیا لڑکی راضی تھی؟''

واقف کار نے قہقہہ لگایا۔ ''کیسے راضی نہ ہوتا... ہم نے پیسا کس لیے دیا ہے؟''

اکبر خان کو بھی یہ راستہ اچھا لگا۔ اس کے پاس خاصا روپیا تھا۔ اس نے واقف کار کے توسط سے بات آگے بڑھائی اور اس کے ساتھ ہی اس جگہ جا پہنچا جہاں بردہ فروشی کا کاروبار سرکار کی ناک کے عین نیچے جاری ہے۔ یہ انسانوں کی منڈی ہے۔ یہاں صنف نازک کو جانوروں کی طرح بیچا اور خریدا جاتا ہے۔ جی ہاں، اگر کسی کا دل خریدی ہوئی عورت سے بھر گیا ہو تو وہ اسے پھر یہاں لاکر فروخت کر سکتا ہے۔ پورے ملک بلکہ افغانستان تک سے خریدار یہاں آتے ہیں کیونکہ اس جنگ زدہ ملک میں ڈالرز کی اتنی بہتات ہوگئی ہے کہ افغانوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کہاں خرچ کریں۔ یہ سب اس ملک میں ان تمام انسانی حقوق کی نام نہاد این جی اوز کے ہوتے ہوئے ہو رہا ہے جن کے نزدیک حقوقِ نسواں صرف ایک پردے نے سلب کر رکھے ہیں۔

اکبر خان نے ایک کم عمر لڑکی کا انتخاب کیا اور وہ اسے صرف تیس ہزار میں مل گئی۔ لڑکی کے نین نقش اچھے تھے لیکن

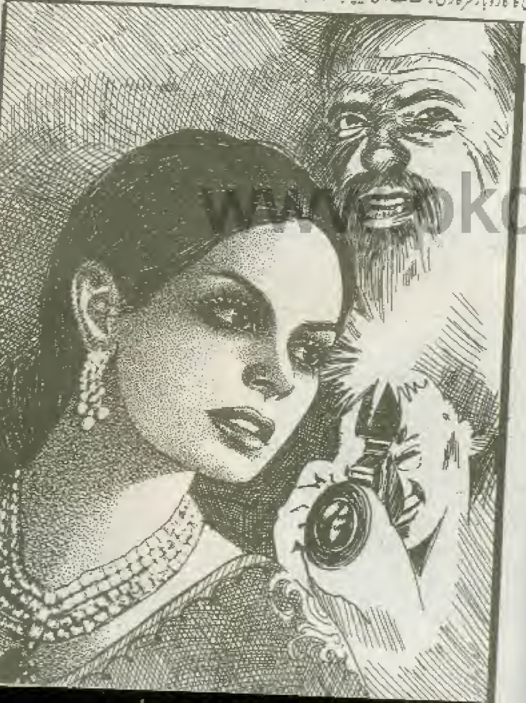

www.pkdigest.com

اس میں ایک نقص تھا، اس کے پاؤں میں لنگ تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس منڈی میں نقص والا انسان بھی فروخت ہو جاتا ہے اور اس کی قربانی میں اس نقص سے کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک وسیع گاؤں نما جگہ پر ہر گھر میں ایسی ہی عورتیں اور لڑکیاں بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ سرحد پار ہزاروں میل دور سے آتی ہیں اور یہاں بک جاتی ہیں۔

اکبر خان نے آج سے بیس سال پہلے جس لڑکی کو خریدا تھا، اس کا نام امینہ تھا۔ اس کا نکاح اسی وقت اکبر خان سے پڑھا دیا گیا اور وہ اسے لے کر کراچی آ گیا۔ امینہ ایک ڈری سہمی لڑکی تھی جس کی عزت اس طویل سفر میں بے شمار بار تار تار ہوئی تھی۔ ہر جگہ ہوس کے پجاریوں نے اسے دل بھر کر لوٹا تھا۔ اکبر خان کو بھی اس بات کا علم تھا لیکن اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اسے ایک بیوی کی ضرورت تھی اور وہ اسے مل گئی تھی۔ امینہ کو صرف بنگالی زبان آتی تھی۔ جب اس نے ایک سال بعد مینا کو جنم دیا، تب بھی اسے معمولی سی اردو آتی تھی۔ اکبر خان نے خود اسے پشتو سکھانے کی کوشش نہیں کی، وہ اس سے اردو میں بات کرتا تھا۔ اس نے اس شادی کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا۔ اپنے گھر والوں کو بھی نہیں بتایا۔

لیکن اتفاق سے ایک دن اس کا بھائی پشاور سے اس کے گھر آیا تو اسے پتا چلا کہ اکبر خان نے شادی کر لی ہے اور اس کی ایک بچی بھی ہے۔ وہ بھائی کے اس طرح چھپ چھپا کر شادی کرنے سے خوش نہیں تھا۔ اس نے اکبر خان سے کہا۔ ”تو نے شادی کی ہے یا گناہ جو اسے چھپایا؟ ہمیں کیوں نہیں بتایا؟“

”تم لوگوں نے مجھ سے تعلق ہی کہاں رکھا تھا۔“ اکبر خان نے بے رخی سے کہا۔ ”جو میں اپنی شادی کی اطلاع تمہیں دیتا۔“

”کیوں، ہر سال ادھر کا چکر نہیں لگتا ہے، گھر نہیں آتا ہے؟“ بڑے بھائی نے طنز کیا۔ ”شادی کا بتاتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔“

اکبر خان جھنجلا گیا۔ ”یہ میری زندگی ہے، میری مرضی... میں شادی کروں اور نہ بتاؤں۔“

بھائی ناراض ہو کر چلا گیا اور اس نے اکبر خان سے کہہ دیا کہ اب اس سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ جب اس کے باپ کو پتا چلا تو اس کی طرف سے بھی اکبر خان کے لیے یہی پیغام آیا۔ اکبر خان کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ خود کون سا اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کا باپ ایک معمولی سا زمیندار تھا۔ اس کی وراثت چھ سات حصوں میں بٹ کر نہ ہونے کے برابر رہ جاتی اس لیے اکبر خان کو دولت کی کشش بھی نہیں تھی۔ اسے تو اپنی ماں کی پروا بھی نہیں تھی جو اس کے لیے روتی تھی۔

اکبر خان جب کسی کام سے شہر سے باہر جاتا تو اتنے دن کا راشن وغیرہ کا انتظام کر کے گھر کو باہر سے تالا لگا جاتا۔ اسے ایک بچی کی ماں بن جانے والی امینہ پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور نہ ہی امینہ کو کسی کے گھر جانے کی اجازت تھی۔ جب دوسرے بچے کی ولادت قریب تھی تب بھی اکبر خان اسے گھر میں بند کر کے خود پشاور چلا گیا جہاں سے اسے مال لانا تھا۔ اسے آنے میں تاخیر ہو گئی اور ادھر امینہ کو تکلیف شروع ہو گئی۔ وہ بے چاری اکیلی گھر میں تڑپتی رہی۔ اس کی چیخیں سن کر اہلِ محلہ تڑپ اٹھے لیکن اکبر خان سے سب ہی ڈرتے تھے۔ امینہ نے اسی حالت میں نہ جانے کیسے بچے کو جنم دیا اور کیسے اسے اور خود کو سنبھالا۔ جب اکبر خان آیا تو محلے کے لوگوں نے اسے لعن طعن کی۔ اس کی لوگوں سے منہ ماری ہوئی اور اس نے گھر آتے ہی پہلے سے بے حال امینہ کو مارا پیٹا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ اس کی حالت کیسی ہے۔ اسے غصہ تھا کہ محلے کے لوگوں نے اس کی بیوی کی آواز کیوں سنی۔

امینہ نے اس بار لڑکے کو جنم دیا تھا۔ اس کی حالت اس کے بعد خراب ہی رہنے لگی تھی۔ وہ اس بیماری کے عالم میں بھی گھر کے کام کرتی رہی اور بچوں کو سنبھالتی رہی۔ اکبر خان کو بچوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ اسے بیٹیاں پسند نہیں تھیں اس لیے اس نے کبھی مینا کو گود میں نہیں لیا اور نہ پیار کیا تھا مگر ساتھ ہی اسے بیٹے سے بھی کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ جب محلے والوں نے اس سے جھگڑا کیا تو اس نے ایک ہفتے بعد ہی یہاں سے مکان بیچ دیا۔ اس بار اس نے ایک باقاعدہ آبادی میں مکان لیا۔ اگرچہ یہ بھی غریبوں کا علاقہ تھا لیکن لیز تھا۔ مکان بھی بہتر تھا اور اس میں گیس اور پانی کی سہولت بھی تھی۔ اس سے امینہ کو ذرا آسانی ہو گئی۔

ان دنوں اکبر خان کے پاس خاصا پیسا آ گیا تھا۔ اس نے ایک پرانی گاڑی لے لی۔ حالانکہ وہ پہلے کی طرح باقاعدگی سے بازار نہیں لگا رہا تھا۔ امینہ کو عام سی باتوں کی سمجھ نہیں تھی، ان باتوں کی سمجھ کیسے آتی؟ اکبر خان جب پشاور یا کہیں سے مال لاتا تو پہلے اسے گھر ہی لاتا۔ یہاں اس کے تھان بنا کر پھر اپنے مال میں شامل کر لیتا۔ اس کے ساتھ بازار لگانے والے دکان داروں کا گروپ اپنا مال ایک ہی

جگہ رکھتا تھا۔ وہ مال وہیں سے اٹھا کر روز بازار لے جاتے اور رات کو لا کر اسی جگہ رکھ دیا کرتے۔ اس طرح وقت اور محنت کی بچت ہوتی تھی۔

پہلے وہ امینہ کو بھی اس کام میں شامل کر لیا کرتا تھا لیکن پھر اس نے یہ کام الگ کمرے میں اور دروازہ اندر سے بند کر کے کرنا شروع کر دیا۔ امینہ نے کبھی تجسس نہیں کیا۔ وہ نہایت سیدھی سادی عورت تھی اور اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ ایک بار اکبر خان کمرا بند کر کے لائے ہوئے مال کے ساتھ مصروف تھا کہ باہر اس کا کوئی ملنے والا آیا۔ وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اس سے ملنے چلا گیا۔ مینا دروازہ کھلا دیکھ کر اندر چلی گئی۔ اکبر خان نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کوئی بچہ بھی اس کمرے میں نہ جائے، اس کا مال خراب ہو جائے گا۔ امینہ کو کچھ دیر تک پتا نہیں چلا پھر وہ کسی کام سے اس طرف آئی تو اس نے کھلے دروازے سے اندر مینا کو کسی چیز سے کھیلتے دیکھا۔ وہ جلدی سے اندر گئی تو اس نے مینا کے پاس چوکور اور چکنی سی شفاف پلاسٹک کی تھیلیاں دیکھیں جن میں کوئی سفید پاؤڈر نما چیز بھری ہوئی تھی۔ یہ تھیلیاں کپڑے کی تہ سے زیادہ موٹی نہیں تھیں۔ مینا نے ایسی دو تھیلیاں اٹھا رکھی تھیں۔

”مینا! یہ کیا کر رہی ہے... رکھ دے۔“ امینہ نے اس سے تھیلیاں چھین کر رکھ دیں۔ ”تیرا باپ دیکھ لے گا تو مارے گا۔“

وہ اسے لے جانے لگی کہ اکبر خان واپس آ گیا۔ اس نے دیکھ لیا کہ تھیلیاں سامنے پڑی ہیں۔ اس نے امینہ کے بال پکڑ لیے۔ ”کیوں آئی اس کمرے میں جب تجھے منع کیا ہے؟“

”میں... نہیں آئی۔“ وہ کراہی۔ ”مینا آئی ہے۔“

یہ سن کر اکبر خان نے معصوم مینا کو تھپڑ مارا۔ ”کیسے آئی تو اس کمرے میں؟“

وہ ڈر کر ماں سے لپٹ کر رونے لگی... اور لیکن اکبر خان کو ان دونوں پر ذرا بھی ترس نہیں آیا۔ اس نے بے دردی سے ان دونوں کو مارا۔ اس نے امینہ کو دھمکی دی۔ ”اب اگر تو یا تیری بچی اس کمرے کی طرف آئے تو مار کر اسی جگہ دفن کر دوں گا۔“

امینہ کو نہیں معلوم تھا کہ پلاسٹک کی چپٹی تھیلیوں میں کیا ہے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اکبر خان کو اصل غصہ کس چیز پر ہے۔ ان کے اس کمرے میں آنے پر یا اس سفید چیز والی تھیلیوں کو چھیڑنے پر؟ ویسے بھی وہ اکبر خان کے اس ظالمانہ سلوک کی عادی تھی۔ وہ آئے دن کسی نہ کسی بہانے اسے مارتا پیٹتا رہتا۔ بچوں سے بھی اس کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ مینا تین سال کی ہونے والی تھی۔ وہ اکثر باپ سے مار کھاتی تھی اور دو سال کا امیر بھی باپ کی سختی کا نشانہ بنتا تھا۔ اکبر خان کا وجود ان کے لیے تحفظ سے زیادہ دہشت کی علامت تھا۔ وہ جب گھر میں ہوتا تو سب ہی سہمے ہوئے رہتے۔

اسی سال امینہ پھر امید سے ہو گئی۔ اس بار اس کی طبیعت بھی زیادہ خراب تھی۔ مینا بے چاری چھوٹی ہونے کے باوجود ماں کا خیال رکھتی تھی۔ جب امینہ بے حال ہو کر بستر پر پڑ جاتی تو وہ امیر کے کھانے پینے کا خیال بھی رکھتی تھی۔ چھوٹی سی عمر میں اسے بہت سمجھ آ گئی تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس کی ماں کی زندگی بہت مشکل ہے اور اس کا باپ ان کے لیے کچھ نہیں کرتا... سوائے ان کو جانوروں کی طرح چارا ڈال دینے کے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، امینہ کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ آخری دنوں میں اکبر خان کہیں سے ایک دائی کو لے آیا۔ اس نے امینہ کی حالت دیکھ کر کہا۔

”یہ میرے بس کی بات نہیں ہے، اسے کسی اسپتال لے جاؤ۔“

”ہمارا عورت اسپتال نہیں جاتا۔“ اکبر خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کا پہلا بچہ بھی گھر پر ہی ہوا تھا۔“

”وہ نارمل ہوگا... پر اس بار معاملہ بگڑ گیا ہے۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔ ورنہ یہ مر جائے گی۔“

”مر جائے تو مر جائے۔“ اکبر خان بے پروائی سے بولا۔ ”اگر تم اس کا ادھر کچھ کر سکتا ہے تو ٹھیک ہے۔“

دائی نے دیکھا کہ اکبر خان کسی صورت نہیں مان رہا ہے اور وہ امینہ کو اسپتال بھی نہیں لے جائے گا تو اس نے مجبوراً ہامی بھر لی لیکن ساتھ ہی بولی۔ ”یہ بتا دوں کہ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو میری ذمے داری نہیں ہوگی میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا ہے کہ بات میرے بس سے باہر ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اکبر خان بولا۔ ”تم کرو، باقی اللہ مالک ہے۔“

یوں اس نے ساری ذمے داری اللہ پر ڈال دی۔ دائی نے کوشش کی لیکن کیس واقعی بہت خراب تھا اور امینہ نے بچے کی پیدائش کے فوراً بعد دم توڑ دیا۔ دائی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ اب یہ شخص اسے نہیں بخشے گا لیکن اس نے اپنی بیوی کے مرنے کی خبر بنا کسی تاثر کے سنی اور فوراً اس کے کفن دفن کی تیاری میں لگ گیا۔ امینہ کے مرنے کے تین گھنٹے کے اندر اس نے اسے قبر میں بھی اتار دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ

www.pkdigest.com

دروازہ کھلا رہ گیا اور اکبر خان وقت سے پہلے گھر آ گیا۔ اس نے دستک دی اور پھر دروازہ کھلا دیکھ کر اندر آ گیا۔ مینا کو دنیا سے بے خبر ناچتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ کسی باز کی طرح جھپٹا اور مینا کو اس کی چوٹی سے پکڑ کر بے دریغ مارنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک تو اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ اچانک ہی اس کی سرمستی اذیت میں کیسے بدل گئی۔ پھر جب اس نے اپنے باپ کو دیکھا تو سہم گئی۔

”حرامزادی۔“ اکبر خان نے غرا کر کہا۔ ”تو نے یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔“

”بابا... میں...“ اس نے کہنا چاہا لیکن اکبر خان کے بھاری ہاتھ نے اس کا منہ بند کر دیا۔ وہ اسے اتنی بے دردی سے پیٹ رہا تھا کہ شازمین شور سن کر باہر آ گئی۔ اکبر خان کو دیکھ کر وہ بھی بوکھلا گئی اور جب اکبر خان نے مینا پر بھڑاس نکال کر اس کی طرف رخ کیا تو وہ صاف مکر گئی کہ اسے نہیں پتا کہ مینا ناچ رہی تھی۔

”تجھے واقعی نہیں پتا...“ اکبر خان نے یقین نہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ”یہ سب تیرا قصور ہے۔“

”قسم لے لو اکبر خان۔“ شازمین نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بالکل نہیں معلوم۔“

اکبر خان نے اسے تو کچھ نہیں کہا لیکن اسی وقت سی ڈی پلیئر نکال کر اپنی الماری میں رکھ دیا۔ شازمین نے سکون کا سانس لیا کیونکہ اس نے ٹی وی کو نہیں چھیڑا تھا۔ مینا کو اتنی مار پڑی تھی کہ وہ دو دن تک بستر پر پڑی رہی تھی۔ ویسے بھی وہ کمزور سی لڑکی تھی۔ اکبر خان نے اسے دھمکی دی۔ ”اب میں نے سن بھی لیا کہ تو ناچی ہے تو میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گا۔“

اس واقعے کے بعد مینا شازمین سے کچھ کھنچ سی گئی۔ یہ شازمین ہی تھی جس نے اسے اتنا حوصلہ دیا تھا اور جب اکبر خان کے سامنے بات آئی تو وہ کتنی صفائی سے مکر گئی تھی۔ بعد میں شازمین نے اسے منانے کی کوشش کی تو اس نے اس سے کہہ دیا۔ ”باجی! اب تم نے یا کسی نے مجھے ناچنے کو بھی کہا تو میں نہیں ناچوں گی۔“

”پاگل... تجھے خیال رکھنا چاہیے تھا۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا اور تو اندر ناچ رہی تھی۔ دروازہ بند کر کے ناچتی تو اکبر خان کو کبھی پتا نہیں چلتا۔“

لیکن مینا کے دل میں ایسا خوف بیٹھا کہ اس نے پھر ناچنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ جب بھی وہ کوئی گانا سنتی یا ٹی وی پر رقص کا کوئی پروگرام دیکھتی تو بے اختیار اس کا دل بھی رقص کرنے کو چاہتا۔ اس موقع پر اسے باپ کی مار یاد آ جاتی تو وہ سہم جاتی۔ جب اس نے شازمین کی فرمائش پر بھی ناچنے سے انکار کیا تو اس نے اس کا داخلہ اپنے کمرے میں بند کر دیا۔ ٹی وی وہیں تھا اور مینا اب ٹی وی دیکھنے سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ اس کے دل میں خیال آتا کہ وہ شازمین کی بات مان لے... اور شاید وہ مان بھی جاتی اگر شازمین اسے صرف اپنے سامنے رقص کرنے کو کہتی لیکن وہ چاہتی تھی کہ مینا گھر آنے والی عورتوں کے سامنے اور ان کے گھر میں ہونے والی تقریبات میں بھی رقص کرے۔ مینا یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اسے ڈر تھا کہ یہ بات اکبر خان کے علم میں آ گئی تو شاید وہ اسے قتل ہی کر دے۔

”باجی! میں تمہارے سامنے ناچ سکتی ہوں، پر سب کے سامنے نہیں۔“ اس نے انکار کر دیا۔

”ٹھیک ہے پھر میرے کمرے میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شازمین نے اسے صاف منع کر دیا۔

مینا نے آج تک کسی اسکول نہیں دیکھا تھا بلکہ شازمین کے آنے سے پہلے اسے گھر سے باہر نکلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اس نے جو سیکھا تھا، وہ ٹی وی سے سیکھا تھا۔ اسے بولنے اور چلنے پھرنے کا سلیقہ آ گیا۔ اس کی زبان خاصی حد تک درست ہو گئی تھی۔ اکبر خان کو اس کی پروا نہیں تھی۔ تیرہ سال کی عمر میں اس نے مینا پر کھانا بنانے کی ذمے داری عائد کر دی۔ شازمین نے کبھی یہ ذمے داری نہیں نبھائی تھی اور وہ کھانا بھی بہت خراب بناتی تھی۔ اس کے مقابلے میں مینا نے بہت جلد کئی اچھے کھانے بنانے سیکھ لیے۔ اس لیے اکبر خان... جو پہلے باہر کھانا کھاتا تھا اب وہ گھر میں ہی کھانے لگا۔

شادی کے کئی سال تک شازمین کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی لیکن پھر وہ امید سے ہو گئی۔ اب مینا کے ذمے اس کے بھی بہت سارے کام لگ گئے تھے۔ وہ گھر کے ساتھ ساتھ باہر کے کام بھی نمٹانے لگی۔ جیسے بازار سے سودا وغیرہ لے کر آنا۔ پھر محلے میں لینے دینے کے لیے بھی وہی آنے جانے لگی۔ اکبر خان نے جو اجازت شازمین کو دی تھی، وہی اسے بھی دے دی۔ یوں مینا باہر کی دنیا سے روشناس ہونے لگی۔

شازمین کا بیٹا ہوا تھا اور اکبر خان اس بار بہت خوش تھا۔ مینا کو حیرت ہوئی کہ جس شخص نے اپنے دو بیٹوں کو پلٹ کر نہیں پوچھا، وہ اس بیٹے کے ہونے پر اتنا خوش ہو رہا تھا۔ مینا کو غصہ آنے لگا... بیٹے کی ولادت کے بعد شازمین کی قدر میں اضافہ ہو گیا تھا اور اکبر خان اس کا اس طرح خیال رکھنے لگا تھا کہ مینا نے کبھی اسے اپنی ماں کا خیال رکھتے نہیں

دیکھا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ شازمین کے سامنے بچھا جاتا اور شازمین نے اس کا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے اکبر خان سے کہا کہ وہ مینا کو مکان کے اوپری حصے میں ایک کمرا بنوا دے۔ وہ وہیں رہا کرے اور نیچے صرف کام کرنے کے لیے آیا کرے۔ اکبر خان کو خوب صورت بیوی کی خوشنودی مطلوب تھی اور بیٹی کی اس کے نزدیک ملازمہ سے زیادہ حیثیت نہیں تھی۔ اس نے فوراً شازمین کی بات مان لی۔ اس نے اوپر ایک کمرا بنوایا اور مینا کو اس میں منتقل کر دیا۔ اس نے احتجاج کیا کہ اسے اس طرح کیوں اوپر بھیجا جا رہا ہے لیکن اکبر خان نے اس کی ایک نہیں سنی۔ اسے بالکل پروا نہیں تھی کہ جوان ہوتی بیٹی اوپر تنہا کس طرح رہے گی۔

اوپر منتقل ہونے کے بعد کئی راتوں تک اسے خوف کی وجہ سے نیند نہیں آئی۔ دن میں جب کمرے کے اوپر لگی ٹین کی شیٹیں تپنے لگتیں، تب بھی اسے نیچے آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہاں، کام کے لیے شازمین اسے گھڑی گھڑی آوازیں دیتی رہتی۔ پہلے تو مینا سمجھی کہ شازمین نے صرف اس وجہ سے اسے الگ کیا ہے کہ اس نے ناچنے سے انکار کیا تھا لیکن ایک بار وہ دوپہر میں کسی ضرورت سے نیچے آئی تو اس نے شازمین کے کمرے کا دروازہ بند دیکھا۔ اس نے توجہ نہیں دی کیونکہ وہ اکثر دروازہ بند کر کے سو جاتی تھی یا ٹی وی دیکھتی رہتی تھی۔ لیکن جب مینا دروازے کے پاس سے گزرنے لگی تو اسے اندر کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ اس نے دبی زبان میں کچھ کہا تھا۔ الفاظ مینا کی سمجھ میں نہیں آئے تھے لیکن آواز مردانہ ہی تھی۔ وہ سُن سی ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا باپ دو دن کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا ہے، اس کے اندر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر مینا نے تالے کے سوراخ سے اندر جھانکا تو اسے سامنے بستر پر ایک مرد لیٹا نظر آیا۔ اس نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ شازمین نظر نہیں آ رہی تھی لیکن یہی بہت تھا کہ اس کے بستر پر ایک غیر نیم عریاں مرد تھا۔ مینا چودہ سال کی عمر میں ٹی وی کے ذریعے مرد اور عورت کے تعلقات کے بارے میں سب جان چکی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شازمین کیا کھیل کھیل رہی ہے۔ وہ تیزی سے اوپر آئی اور دیر تک اپنے دھڑکتے دل پر قابو پاتی رہی۔ اسے حیرت تھی کہ شازمین کو اس کے باپ سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ اگر وہ اسے بے وفائی کرتے پکڑ لیتا تو بلاشبہ اسے قتل کر دیتا۔ مینا کو غصہ بھی آیا کہ شازمین نہ جانے کب سے اس کے باپ کو دھوکا دے رہی۔ اس نے سوچا کہ وہ یہ بات کسی طرح باپ تک پہنچا دے گی... لیکن کس طرح؟

اسے یہ ڈر بھی تھا کہ اس کے باپ نے اگر اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تو نتیجے میں اسے باپ کے ساتھ شازمین کی دشمنی کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ اس نے اوپر سے نگرانی کی اور اس شخص کو کچھ دیر بعد گھر سے نکل کر جاتے دیکھ لیا۔ وہ محلے کا ہی تھا۔ اس کا نام ناظر خان تھا اور وہ خوب صورت آدمی تھا۔ شاید اسی وجہ سے شازمین نے اس سے تعلقات قائم کیے تھے اور پوری دیدہ دلیری سے اسے دن دہاڑے گھر میں بلا لیتی تھی۔ لازمی بات تھی کہ یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ شاید اس سے کھل کر ملاقات کے لیے ہی شازمین نے مینا کو اوپر بھیج دیا تھا اور بلاضرورت اس کے نیچے آنے پر پابندی لگا دی تھی۔

اس دن کے بعد سے مینا شازمین کی جاسوسی کرنے لگی اور اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ناظر خان نہ صرف دن میں بلکہ جب اکبر خان شہر سے باہر گیا ہوتا تو رات میں بھی آ جاتا اور پوری پوری رات شازمین کے کمرے میں رہتا۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا تھا اور اسے اتنی سمجھ نہیں تھی کہ اس کی ماں اس اجنبی مرد کے ساتھ تنہائی میں کیا کرتی ہے۔ جب اکبر خان گھر آتا تو شازمین اس کے ساتھ اتنے محبوبانہ انداز میں پیش آتی کہ وہ خوش ہو جاتا اور مینا کی بات سنتا تو ایک طرف وہ مینا کو دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ نیچے آتی تو اسے جھڑک کر اوپر جانے کو کہہ دیتا۔ اس کا رویہ دیکھ کر مینا کو یقین آ گیا کہ اگر اس نے باپ کو شازمین کی بے وفائی کے بارے میں بتایا تو وہ شازمین کو تو کچھ نہیں کہے گا لیکن اسے ضرور قتل کر دے گا۔ اس لیے اس نے فی الحال زبان بند رکھنے کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی سوچ لیا کہ وہ شازمین کو رنگے ہاتھوں پکڑوائے گی ضرور۔

وقت گزرتا رہا اور شازمین ایک بار پھر امید سے ہو گئی۔ مینا کو پتا چلا تو اس نے سوچا کہ یہ بچہ اس کے باپ کا نہیں ہے کیونکہ گزشتہ چند مہینے میں اسے گھر میں ٹکنے کا موقع کم ہی ملتا تھا اور وہ زیادہ تر شہر سے باہر رہا کرتا تھا۔ اس نے اب کپڑے کا کام چھوڑ دیا تھا بلکہ بظاہر کوئی کام نہیں کرتا تھا کیونکہ جب وہ کراچی میں ہوتا تو تمام وقت گھر پر رہتا اور کسی کام سے ہی باہر جاتا تھا۔ کام نہ کرنے کے باوجود اس کے پاس رقم کی ریل پیل تھی۔ مینا نے خود دیکھا تھا کہ وہ شازمین کو ہزاروں کے حساب سے رقم دیتا اور گھر میں ہر چیز لاتا تھا۔ اس نے شازمین کو زیور اور کپڑوں سے لاد دیا تھا۔ وہ اس کی ہر فرمائش پوری کرتا۔ اپنے بیٹے کے لیے ڈھیر ساری چیزیں لاتا تھا... جب وہ ایسا کرتا تو مینا کو اس پر ترس آنے لگتا کہ وہ نہ جانے کس کی اولاد کو اپنا سمجھ کر اس پر روپیا لٹا رہا ہے اور جو

www.pkdigest.com

’’یہاں آپ کس سے ملنے آئے تھے؟‘‘ امیگریشن آفیسر نے پوچھا۔ ’’کیا یہاں آپ کا کوئی شناسا یا رشتے دار ہے؟‘‘

’’میں اپنی فرینڈ جینیفر کے ساتھ انڈیا گھومنے آیا تھا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہاں میں کسی کو نہیں جانتا، نہ یہاں میرا کوئی رشتے دار ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تاج ہوٹل پر جن لوگوں نے قبضہ کیا ہے، کیا وہ آپ کے رابطے میں ہیں؟‘‘

’’میں نہیں جانتا کہ آپ کس قبضے کی بات کر رہے ہیں؟‘‘ میں نے کہا۔

’’ہوٹل میں آپ کے کتنے آدمی ہیں؟‘‘ پولیس کمشنر نے پوچھا۔

’’مجھے علم نہیں ہے کہ تاج ہوٹل پر کس نے قبضہ کیا ہے۔ یہ کب کا واقعہ ہے؟‘‘

’’یہ کل کا واقعہ ہے۔‘‘ پولیس کمشنر نے کہا۔

’’میں کل سے آپ کی قید میں ہوں۔ میرا سیل فون آپ کے پاس ہے... میرا کسی سے بھی رابطہ نہیں ہے۔ پھر میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ وہاں کیا ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے؟‘‘

’’آپ پاکستان آرمی کے کس یونٹ میں ہیں اور آج کل آپ کا یونٹ وہاں کے کس شہر میں ہے؟‘‘ بریگیڈیئر نے پوچھا۔ ’’اپنا عہدہ بتایئے تاکہ آپ کو اس کے مطابق سہولتیں فراہم کی جا سکیں۔‘‘

’’میں کتنی دفعہ کہوں کہ پاکستانی ایجنسی سے میرا کوئی بھی تعلق نہیں ہے... پھر میرا کوئی عہدہ کیسے ہو سکتا ہے؟‘‘

’’پاسپورٹ پر آپ کا ایڈریس ہے، کیا وہ اصلی ہے؟‘‘ پولیس کمشنر نے پوچھا۔

’’جی ہاں، میں ایک قانون پسند شہری ہوں۔‘‘

’’آپ یہاں کس مشن پر آئے تھے؟‘‘ بریگیڈیئر نے پوچھا۔

’’صرف گھومنے۔‘‘

بریگیڈیئر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک شخص تیزی سے لیپ ٹاپ پر ہماری گفتگو ٹائپ کر رہا تھا۔ ممکن ہے، وہ گفتگو ریکارڈ بھی ہوئی ہو۔

ان افراد کے جانے کے بعد پولیس والوں نے مجھے پھر حوالات میں بند کر دیا۔

اب اس میں ایک اور شخص کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خاصا لمبا تڑنگا آدمی تھا اور اپنے حلیے ہی سے سکہ بند بدمعاش لگ رہا تھا۔ اس کا سر گنجا اور جسم کسرتی تھا۔

مجھے حوالات میں بند کیا گیا تو اس نے حقارت سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ’’ادھر آ کے میرے پیر دبا۔‘‘

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

’’میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔‘‘ وہ اٹھ کر میرے سامنے آ گیا۔ ’’تو کس جرم میں جیل آیا ہے؟ سالے... زنخوں کی طرح جیبیں کاٹتے ہو، عورتوں سے پرس چھین کر بھاگتے ہو اور جیل آ کر ہم جیسے ’’مردوں‘‘ کی بدنامی کراتے ہو۔‘‘

’’میں نے جیب نہیں کاٹی بلکہ لوگوں کے گلے کاٹے ہیں۔‘‘ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ’’میں نے انتالیس قتل کیے ہیں۔‘‘

وہ یوں قہقہہ لگا کر ہنسا جیسے میں نے اسے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ’’تو نے قتل کیے ہیں... تو نے انتالیس قتل کیے ہیں؟‘‘ پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ’’تو نے انتالیس قتل کیے ہوں یا سو... تجھے میرے پاؤں تو دبانا ہی پڑیں گے۔ تو نے شاید رگھو کا نام نہیں سنا ہے۔ یہاں تو پولیس والے بھی میرے پیر دباتے ہیں۔‘‘

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اچانک میری پسلیوں پر اس کی لات پڑی۔ میں تلملا کر رہ گیا۔ ’’چل، میرے پاؤں دبا۔ یہ رگھو کا حکم ہے... رگھو جو کبھی کسی پر رحم نہیں کرتا... اگر تو نے میرا کہا نہ مانا تو... میرے کھاتے میں ایک اور قتل کا اضافہ ہو۔ پھانسی تو مجھے ایک ہی دفعہ ہو گی لیکن تو اپنی جان سے جائے گا۔‘‘

یہ سن کر رگھو کا چہرہ غصے سے مزید سیاہ ہو گیا۔ وہ اٹھ کر میرے سامنے آیا اور اچانک اس نے میری گردن پکڑنے کی کوشش کی۔ میں تھوڑا سا ترچھا ہوا اور اس کی کلائی جوڑ کے پاس سے پکڑ لی۔ ’’میں آخری دفعہ کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے الجھنے کی کوشش مت کر۔ دنگا فساد کر کے .... اور قتل کر کے جیل آنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ بدنام تو مردوں کو تم کرتے ہو۔‘‘ میں نے اس کا جملہ اسی پر اچھال دیا۔

اس نے بائیں ہاتھ سے میری گردن پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی وہ کلائی بھی جوڑ کے پاس سے تھام لی۔ اس نے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ اس میں بلاشبہ کسی بیل کی سی قوت تھی لیکن میری گرفت ایسی تھی کہ وہ کامیاب نہیں ہوا۔

’’زیادہ زور لگاؤ گے تو تمہاری دونوں کلائیاں جوڑوں کے پاس سے نکل جائیں گی پھر زندگی بھر کے لیے دونوں ہاتھوں سے معذور ہو جاؤ گے اور بھیک بھی نہیں مانگ

سکو گے۔‘‘

اس نے طیش میں آ کر اپنے کدو جیسے سر سے میرے چہرے پر پوری قوت سے وار کیا لیکن میں نے اس سے پہلے ہی گھٹنے سے اس کی ناف پر وار کر دیا تھا۔ وہ بلبلا کر دہرا ہوا تو میں نے اس کی کلائی پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ چٹ کی آواز آئی اور اس کی بائیں کلائی کا جوڑ نکل گیا۔ وہ آدمی جی دار تھا اس لیے اپنے حلق سے نکلنے والی چیخ کو حلق ہی میں گھونٹ لیا۔ اس کا بایاں بازو بے جان ہو کر اس کے پہلو میں جھول رہا تھا۔ میں نے لات مار کے اسے ایک طرف پھینک دیا۔

وہ فرش پر پڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ’’تو واقعی مرد ہے اور جی دار آدمی ہے... ورنہ آج تک کسی نے رگھو پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔‘‘

’’ہاں، اب تمہیں پیر دبوانے کی ضرورت ہے... کہو تو تمہارے پیر دبا دوں؟‘‘ میں نے کہا۔

’’مجھے طعنہ مت دے۔ یہ بتا، کیا اب میں ہمیشہ کے لیے ٹنڈا ہو گیا یا اس کا کوئی علاج بھی ہے؟‘‘

’’اس کا علاج تو میں ابھی کر دوں گا لیکن تمہیں بہت زیادہ تکلیف ہو گی۔ اگر تکلیف برداشت کر سکتے ہو تو میں اس کا علاج کرنے کو تیار ہوں۔‘‘

’’رگھو تکلیف سے نہیں گھبراتا۔ میں نے اپنے جسم پر گولیاں بھی کھائی ہیں اور چاقو کے گہرے گہرے گھاؤ بھی سہے ہیں۔ تو تکلیف کی پروا مت کر۔‘‘

میں نے اس سے سیدھا بیٹھنے کو کہا اور اس کا بایاں بازو کہنی کے پاس سے پکڑ لیا۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ اگر تمہارے پاس رومال یا کوئی اور کپڑا ہو تو اسے دانتوں میں پکڑ لو۔

اس نے جیب سے میلا سا ایک رومال نکال کر دانتوں کے بیچ میں دبا لیا۔ میں نے اس کا جوڑ دیکھا۔ اس کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسائیں، دوسرے ہاتھ سے اس کی کہنی پکڑی اور پوری قوت سے جھٹکا دے کر اس کا جوڑ بٹھا دیا۔ میں نے یہ طریقہ امریکا میں ایک کورین بوڑھے سے سیکھا تھا۔

رگھو تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ پرسکون ہو گیا۔ اس نے ایک نظر اپنے ہاتھ پر ڈالی پھر مٹھی بند کرنے کی کوشش کی۔ ہاتھ اوپر اٹھایا اور بولا۔ ’’تم نے تو کمال ہی کر دیا۔‘‘

’’ابھی تمہیں کچھ دن تکلیف رہے گی۔ اس ہاتھ سے کوئی کام مت کرنا۔ کوئی بھی وزن مت اٹھانا۔ ایک ہفتے میں

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہو سکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہو گی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دار الحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

www.pkdigest.com

اس کی اصل اولاد ہے، اسے پوچھتا بھی نہیں ہے۔ مینا کے لیے سال میں عید بقر عید پر جوڑا بنتا تھا اور اس کی کوئی چیز اسی وقت آتی تھی جب پرانی چیز استعمال کر کر کے گھس جاتی یا پھر ٹوٹ جاتی۔ اسے سارے گھر کے کام کرنے کے بعد بھی بچا کھچا کھانے کو ملتا تھا۔ اس کی حالت گھر کی نوکرانی جیسی تھی اور شاید اکبر خان اسے اس سے زیادہ اہمیت بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔

شاز مین کی دیدہ دلیری بڑھتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا کہ ناظر خان ساری رات وہاں گزارنے کے بعد دن میں بھی سوتا رہتا۔ مینا کا دل چاہتا کہ شاز مین سے پوچھے کہ وہ کیا کھیل کھیل رہی ہے لیکن اسے اس عورت سے ڈر لگنے لگا تھا جو اپنے شوہر سے نہیں ڈرتی تھی... وہ کسی اور کی کیا پروا کرتی۔ لیکن معاملہ رفتہ رفتہ اس کی برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک دن جب اکبر خان رات گئے باہر سے آیا اور مینا اس کے لیے دروازہ کھولنے گئی تو اسے خیال آیا کہ آج باپ سے بات کر لے۔ اس نے اکبر خان سے کہا۔

"بابا! مجھے تجھ سے بات کرنی ہے۔"

اکبر خان نے اسے گھورا۔ "کیا بات کرنی ہے؟"

"ادھر نہیں بابا... اوپر آ۔" مینا میں اتنی جرأت آ گئی تھی کہ وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اوپر لے آئی۔ اپنے کمرے میں لانے کے بعد اس نے اکبر خان سے کہا۔ "بابا! میں جو بتاؤں اس پر غصہ مت کرنا، بھلے میری بات غلط لگے تو مجھے جان سے مار دینا۔"

اکبر خان نے اسے غور سے دیکھا۔ "تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

مینا ڈر گئی لیکن پھر اس نے ہمت کر کے بتا دیا۔ "بابا! جب تو گھر سے باہر جاتا ہے تو محلے کا ایک آدمی ناظر خان گھر میں آتا ہے۔"

اکبر خان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے غرا کر کہا۔ "تو جانتی ہے تو کیا کہہ رہی ہے؟"

"ہاں بابا! جانتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "وہ رات کو بھی آتا ہے اور دن میں بھی۔"

اکبر خان کے تاثرات سے لگ رہا تھا جیسے وہ بڑی مشکل سے خود کو روکے ہوئے ہے، ورنہ وہ شاید مینا کا گلا دبا دیتا۔ "تیرا مطلب ہے کہ وہ شاز مین سے ملنے آتا ہے؟"

"ہاں بابا!" مینا نے مزید ہمت کی۔ "وہ باجی کے کمرے میں رہتا ہے اور دروازہ بند ہوتا ہے۔ جب وہ آتا ہے تو باجی مجھے نیچے آنے سے منع کر دیتی ہے۔"

"تو کب سے جانتی ہے؟"

"چار مہینے ہو گئے۔"

اکبر خان نے اس کی گردن پکڑ لی۔ "اور تو مجھے اب بتا رہی ہے؟"

"بابا! مجھے ڈر لگتا تھا۔" اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"تم اسے کچھ نہیں کہو گے... اور مجھے مار دو گے۔"

اس کی بات سن کر اکبر خان کی گرفت نرم پڑ گئی اور اس نے مینا کو چھوڑ دیا۔ وہ کچھ دیر اسے سفاک نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "اگر یہ بات غلط نکلی تو میں تیرے ٹکڑے کر کے کہیں دبا دوں گا۔"

مینا جانتی تھی کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ اس نے اپنی جان پر کھیل کر یہ کام کیا تھا۔ اگر شاز مین کو بھنک پڑ جاتی اور وہ اپنے عاشق کو آنے سے منع کر دیتی تو اکبر خان ثبوت نہ ملنے پر سچ مچ اسے مار دیتا۔ اس نے مزید جرأت کر کے کہا۔ "اگر تم جاننا چاہتے ہو تو شہر سے باہر جانے کا کہہ کر دیکھو تم کو خود پتا چل جائے گا۔"

اکبر خان نے کچھ نہیں کہا اور نیچے چلا گیا۔ شام کو جب مینا نے ان کے سامنے کھانا لگایا تو اکبر ہنس ہنس کر شاز مین سے بات کر رہا تھا۔ مینا کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کا باپ پھر بیوی کی باتوں میں آ گیا تھا اور اگر وہ اسے یہ بتا دیتا کہ مینا نے اس کی اصلیت کھول دی ہے تو وہ اس کی دشمن بن جاتی اور اسے نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اکبر خان دو دن گھر میں رہا پھر وہ ایک ہفتے کے لیے پشاور جانے کی تیاری کرنے لگا۔ شاز مین بہ ظاہر تو اسے روک رہی تھی لیکن اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی کہ اسے اپنے محبوب کے ساتھ پورے ایک ہفتے کھل چھرے اڑانے کا موقع ملے گا۔ اتفاق سے ان کا گھر ایسی جگہ تھا کہ آس پاس کا کوئی مکان ان کے سامنے نہیں تھا اس لیے کسی کو ناظر خان کی آمد کا پتا نہیں چلتا تھا اور اگر معلوم بھی ہو جاتا تو کوئی ان کے پھڈے میں نہیں پڑتا۔ اکبر خان کی آتش مزاجی سے سب واقف تھے۔ ناظر خان بھی ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور مقامی سطح پر منشیات اور اسلحہ فروخت کرتا تھا۔ اس لیے علاقے کے لوگ اس سے دور ہی رہا کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ کسی نے اس بات کو اکبر خان تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ محلے کی عورتیں ڈھکے چھپے انداز میں اس معاشقے کا ذکر کرتی تھیں اور انہوں نے کئی بار مینا کو جتایا تھا کہ وہ اس بارے میں سب جانتی ہیں لیکن مینا سن کر انجان بن جاتی۔

مینا کو شبہ تھا کہ اس کا باپ نہیں آئے گا۔ اس نے شاید سمجھ لیا تھا کہ مینا جھوٹ کہہ رہی ہے اور جب وہ اگلی بار آئے

گا تو اس کی شامت آ جائے گی۔ لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا تھا۔ اکبر خان کو بیوی پر شک ہو گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ جس دن اسے... آنا تھا، اس روز اچانک محلے میں شور اٹھا اور معلوم ہوا کہ کسی نے ناظر خان کو قتل کر دیا ہے۔ شاز مین کے کان میں بھنک پڑی تو وہ بے قرار ہو گئی۔ اس نے مینا سے کہا۔ "ذرا معلوم کر... یہ لوگ کیا بکواس کر رہے ہیں؟"

"بکواس نہیں کر رہے ہیں... کسی نے اس ہیروئن اور چرس بیچنے والے ناظر کو قتل کر دیا ہے۔" مینا نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "لیکن تم کو اس سے کیا؟"

"بک بک نہ کر... میں جو کہہ رہی ہوں، وہ معلوم کر کے آ۔" شاز مین لرزتی آواز میں چلائی۔

مینا منہ بنا کر باہر نکل گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ ناظر خان اپنے گھر میں سو رہا تھا کہ کوئی اسے قتل کر کے چلا گیا۔ مینا واپس آئی تو شاز مین بری طرح رو رہی تھی۔ مینا نے اس سے پوچھا۔ "تم کیوں رو رہی ہو... بابا تو زندہ ہے ابھی؟"

شاز مین نے اسے گھورا اور کوئی جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مینا سمجھ گئی تھی کہ یہ کام کس کا تھا۔ اسی رات اکبر خان آ گیا۔ اس نے بہ ظاہر کوئی ردعمل نہیں دکھایا لیکن اس کے انداز میں ایک خاموش سفاکی محسوس کی جا سکتی تھی۔ اس نے شاز مین کے کمرے میں جانے یا اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شاز مین بھی سہم گئی تھی۔ اگلے روز اس نے شاز مین سے کہا۔ "تیار ہو جا۔"

"کیوں؟" اس نے ڈر کر کہا۔

"بکواس نہ کر... جو کہا ہے وہ کر۔" اکبر خان گرجا۔

شاز مین نے تیاری کی اور اکبر خان اسے لے کر چلا گیا۔ اس نے مینا سے کہا۔ "میں تین دن بعد آؤں گا۔ گھر کا خیال رکھنا۔"

"تین دن بعد۔" وہ سہم گئی۔ "میں اکیلی رہوں گی؟"

"ہاں، تجھے کوئی کھا نہیں جائے گا۔" اکبر خان غرایا۔

"اب اوپر نہیں نیچے سونا۔"

ان کے جانے کے بعد مینا نے اکبر خان کی بات پر غور کیا۔ اس نے صرف اپنے آنے کا کہا تھا اور شاز مین یا بچے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ان کو کہاں لے گیا تھا؟ مینا کو لگا کہ وہ شاز مین اور بچے کو بھی کہیں لے جا کر قتل کر دے گا۔ ان تین دنوں میں وہ اس بارے میں سوچ سوچ کر ہولتی رہی تھی۔ اکبر خان تین دن بعد آ گیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ مینا نے اس سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بابا! شاز مین باجی اور شازیب کہاں ہیں؟"

اکبر خان نے اسے گھورا۔ "وہ اب یہاں نہیں آئیں گے۔ ان کو بھول جا۔"

"بابا! شازیب کا کیا قصور...؟"

"چپ کر۔" اکبر خان چلایا۔ "نام مت لے اس حرام کے پلے کا... اسے بھی اس کی ماں کے ساتھ دفن کر آیا ہوں۔"

مینا نے یہ بات سن کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اگرچہ اسے پہلے ہی خیال تھا کہ اس کا باپ ان لوگوں کے قتل کے لیے گیا ہے لیکن پھر بھی اس کے منہ سے سن کر مینا رونے والی ہو گئی۔ شاز مین کا رویہ اس کے ساتھ برا ہی سہی لیکن اتنے دنوں کا ساتھ بھی تو تھا۔ وہ جلدی سے اکبر خان کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے باپ کو یہ بات پسند نہیں آئے گی کہ وہ شاز مین یا اس کے بیٹے کے لیے رو رہی ہو۔

محلے کی عورتوں کو تجسس تو ہوا کہ شاز مین کہاں گئی۔ مینا نے اکبر خان کے حکم کے مطابق ان سے کہہ دیا کہ بابا نے شاز مین کو طلاق دے کر اسے بچے سمیت اس کے گھر بھیج دیا ہے۔ یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اکبر خان نے اسے بچے سمیت قتل کر دیا ہے۔ اس کے بعد اکبر خان نے شہر سے باہر جانا کم کر دیا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اسے مینا کا خیال تھا بلکہ اسے مینا پر اعتبار ہی نہیں تھا۔ اسے شبہ تھا کہ مینا بھی کسی سے دوستی نہ کر لے۔ اس کا اندازہ مینا کو یوں ہوا کہ اکبر خان نے کئی بار اسے ڈھکے چھپے الفاظ میں دھمکایا تھا کہ اگر اس نے مینا کے بارے میں ایسی کوئی بات سن لی تو وہ اسے زندہ ہی زمین میں دفن کر دے گا۔ اس نے مینا سے کہا۔

"یاد رکھ... مجھے اپنی غیرت سے زیادہ کچھ پیارا نہیں ہے۔"

اکبر خان کپڑے کا کام چھوڑ چکا تھا۔ اس کے بعد بھی اس نے کوئی کام نہیں کیا لیکن اس کے خرچے جاری رہے۔ اگرچہ وہ کنجوس آدمی تھا اور بنا اپنے مطلب کے ایک روپیا خرچ نہیں کرتا تھا لیکن پھر بھی مینا کو اندازہ ہو جاتا کہ اس کے پاس بڑی رقم ہے۔ شاز مین کے بعد اس نے شادی کی کوشش نہیں کی تھی۔ مینا کے حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی، سوائے اس کے کہ اسے پہلے کی نسبت کم کام کرنا پڑتا تھا۔ اکثر وقت وہ فارغ رہتی۔ اکبر خان اس پر سختی کرتا تھا لیکن اسے باہر اور محلے میں جانے کی اجازت دے رکھی تھی۔

ایک بار محلے میں شادی تھی چونکہ لڑکی کی شادی تھی اس لیے مینا بھی اس میں شریک تھی۔ مہندی والے دن جب تقریب جاری تھی، کسی عورت نے مینا سے فرمائش کر دی۔

’’مینا! آج ناچ کر دکھا... کتنے دن ہو گئے تیرا ناچ دیکھے۔‘‘

اس نے انکار کیا۔ ’’نا... بابا کو پتا چل گیا تو ہڈیاں توڑ دے گا۔‘‘

’’نخرے نہ کر... اب تیرا بابا اتنا بھی خوفناک نہیں ہے۔‘‘

مینا بے چاری ان عورتوں کو کیا بتاتی کہ اس کا بابا کتنا خوفناک ہے۔ پھر عورتوں کے اصرار نے اسے مجبور کر دیا۔ اسے رقص کیے بہت زمانہ گزر گیا تھا پھر بھی اس نے ایک نئے گانے پر اپنی طرف سے اتنا اچھا رقص کیا کہ سب حیران رہ گئے کیونکہ سب کو پتا تھا کہ اب مینا کے گھر ٹی وی یا سی ڈی پلیئر نہیں تھا۔ سب نے اس کی بے انتہا تعریف کی۔ وہ خوش ہو گئی۔ اپنی تعریف تو سب کو خوش کرتی ہے اور وہ تو پہلے ہی ترسی ہوئی تھی۔ یہاں صرف عورتیں تھیں اس لیے اسے امید تھی کہ اس کے باپ تک یہ اطلاع نہیں پہنچے گی۔ ورنہ وہ اس پر پابندی لگا دے گا۔ کئی دن تک وہ ڈری رہی لیکن جب اکبر خان نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

اکبر خان کے خاندان میں عام طور سے لڑکیوں کی شادی سولہ سترہ برس کی عمر میں کر دی جاتی تھی اور بعض کی تو جوان ہوتے ہی کر دی جاتی تھی... لیکن مینا انیس برس کی ہونے کو آئی تھی اور اکبر خان نے اس کی شادی کے بارے میں منہ سے بھاپ بھی نہیں نکالی تھی۔ حالانکہ مینا تو سترہ برس کی عمر میں امید لگا کر بیٹھ گئی تھی کہ اس کا باپ کہیں اس کا بیاہ کر دے گا اور وہ اس جہنم سے نجات حاصل کر لے گی۔ لیکن اکبر خان نے ایک بار بھی اس کی شادی کا ارادہ ظاہر نہیں کیا اور رفتہ رفتہ مینا کی یہ خوش فہمی بھی دم توڑ گئی کہ وہ شاید اس بارے میں سوچ رہا ہے۔

ایسا لگ رہا تھا کہ اکبر خان اس کی شادی کا خیال ہی دل میں نہیں لایا تھا کیونکہ اسے مفت کی ایک خادمہ ملی ہوئی تھی جو اس کا گھر سنبھالتی تھی، اس کے لیے کھانا بناتی تھی اور دوسرے سارے کام کرتی تھی۔ وہ مینا کی شادی کر دیتا تو اس کا گھر کون دیکھتا؟ اس لیے فی الحال اس کی شادی نہیں کر رہا تھا۔

شادی کی اس تقریب کے بعد مینا کا رقص محلے میں ہونے والی ہر شادی میں لازمی ہو گیا۔ شروع شروع میں وہ باپ کے خوف سے ذرا جھجکی لیکن بعد میں وہ بے خوف ہو گئی۔ اس نے دوسرے گھروں میں ٹی وی پر دیکھ کر نئے رقص سیکھ لیے۔ جب باپ گھر پر نہیں ہوتا تو وہ اس کی مشق کرتی۔ پھر اسے گھر میں ایک جگہ پڑا واک مین مل گیا۔ وہ دوسری عورتوں سے کیسٹ لا کر اپنا میوزک کا شوق پورا کر لیتی۔

لیکن ایک دن اکبر خان کو پتا چل گیا کہ وہ شادی کی تقریبوں میں ناچتی ہے۔ اس نے مینا سے پوچھا تو وہ مکر گئی۔ اکبر خان کو یقین تھا کہ مینا رقص کرتی ہے۔ مگر ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے کچھ کہہ نہیں سکا۔ البتہ اس نے مینا کو دھمکی ضرور دی تھی۔ مینا کو اس کے رویے سے ضد ہو گئی تھی۔ اس نے سوچ لیا کہ اس کا باپ جو چاہے کرتا پھرے، وہ یہ شوق ضرور پورا کرے گی۔ اکبر خان نے اسے تعلیم نہیں دلائی تھی۔ اسے کبھی کوئی تفریح نہیں دی تھی۔ وہ بس اسے جانوروں کی طرح پال رہا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھا رہا تھا اور اسے چارہ پانی ڈال دیتا تھا... بلکہ اس سے اچھا سلوک تو لوگ اپنے جانوروں سے کرتے ہیں۔

پھر ایک بار اکبر خان کو شاید پتا چل گیا اور اس نے مینا کو بہت مارا اور اس کے باہر جانے پر پابندی لگا دی۔ مگر چند دن بعد پابندی اٹھا لی کیونکہ گھر کا سودا لانا اس کے لیے مشکل کام تھا اس لیے اس نے بادلِ ناخواستہ مینا کو باہر جانے کی اجازت دے دی لیکن آئندہ رقص کرنے کی صورت میں اسے برے انجام کی دھمکی دی تھی۔ جب اکبر خان نے محلے کے لڑکوں کے موبائل پر رقص کرتی مینا کی تصویریں دیکھیں تو اس کا خون کھول اٹھا تھا۔

☆☆☆

شیبا علی ایک معروف فیشن ڈیزائنر تھی اور ساتھ ہی وہ عورتوں کے حقوق کے لیے ایک این جی او بھی چلا رہی تھی۔ ملک میں جب کہیں کسی عورت یا لڑکی پر کوئی ظلم ہوتا تو شیبا علی کی این جی او ’’تسا‘‘ کے زیرِ اہتمام پریس کلب کے سامنے ایک مظاہرہ کیا جاتا۔ اگلے دن اخبارات میں اس کی خبر اور تصویریں آ جاتیں۔ کسی ٹی وی چینل پر سلائڈ چل جاتی اور ایک دو سیکنڈ کی ویڈیو بھی آ جاتی۔ اس سے شیبا علی کو بیرونِ ملک سے اپنی این جی او کے لیے فنڈز کے حصول میں آسانی رہتی پھر اسے بیرونِ ملک اپنے کام کی نمائش میں بھی بہت سہولیات مل جاتیں۔

شیبا بہت اعلیٰ درجے کی فیشن ڈیزائنر نہیں تھی بلکہ اس کا زیادہ تر کام دوسروں سے لیا ہوا ہوتا تھا۔ اس کا اصل کام مغربی ملبوسات کو مقامی رنگ دینا تھا۔ شیبا نے بہت چھوٹے پیمانے سے کام کا آغاز کیا تھا اور ترقی کرتے کرتے اس مقام تک آ پہنچی تھی۔ اب اس کے پاس پرانی سبزی منڈی کے علاقے میں دو سو چالیس گز پر بنا بنگلا تھا اور نئے ماڈل کی بیش قیمت گاڑی بھی۔ لیکن یہ اس کی منزل نہیں تھی۔ وہ تو اس سے کہیں آگے جانا چاہتی تھی۔

شیبا اکیلی تھی۔ اس کی ایک ہی بہن تھی اور دبئی کے ایک شیخ سے شادی کر کے دبئی میں ہی رہ رہی تھی۔ اس نے شیبا سے بھی کہا تھا کہ یہ سب چکر چھوڑ کر کسی شیخ کی دوسری، تیسری یا چوتھی بیوی بن جائے اور مزے سے رہے۔ لیکن شیبا کو سونے کے پنجروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو آزاد فضاؤں میں اپنی مرضی سے اڑنا چاہتی تھی۔ بنگلے میں اس کے ساتھ ایک کل وقتی ملازمہ رہتی تھی۔ اس کا شوہر چوکیدار تھا۔ اس نے دونوں کو بنگلے میں ہی ایک کمرا دے رکھا تھا۔ ملازمہ دوسرے گھریلو کاموں کے ساتھ ساتھ کھانا بھی بناتی تھی۔ لیکن شیبا عام طور سے بس صبح کا ناشتا کرتی تھی۔ اس کے بعد وہ دوپہر اور رات کا کھانا باہر ہی کھاتی تھی۔ اس نے کیریئر کے آغاز میں ایک بار شادی کی غلطی کی تھی لیکن جلد اس نے شوہر سے چھٹکارا پا لیا اور تب سے آزاد تھی۔ وقت گزاری کے لیے دوستی کر لیتی تھی لیکن اسے روگ نہیں بناتی تھی۔ اگر کوئی اس کے سر پر سوار ہونے کی کوشش کرتا تو وہ اسے خیرباد کہنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس عمر میں بھی جوان اور تروتازہ نظر آتی تھی۔

اس صبح بھی وہ ناشتا کرتے ہوئے ٹی وی پر نیوز دیکھ رہی تھی کہ ایک لڑکی کے بارے میں خبر آنے لگی۔ اسے اس کے باپ نے مار کر شدید زخمی کر دیا تھا اور محلے والے مداخلت نہ کرتے اور لڑکی کو نہ بچاتے تو شاید وہ اسے مار ہی دیتا۔ ظالم باپ نے اسے بید سے اتنا مارا تھا کہ کئی جگہ سے اس کی کھال ادھڑ گئی تھی۔ شیبا نے جلدی سے چائے کا گھونٹ لیا۔

’’میرے خدا! کس قدر ظالم باپ ہے۔‘‘

ٹی وی پر لڑکی کو زخمی حالت میں اسپتال کے بیڈ پر دکھایا جا رہا تھا۔ شیبا کی ملازمہ بشریٰ نے کہا۔ ’’دیکھو بی بی! بے چاری کا کیا حال کر دیا ہے۔ آپ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاؤ نا۔‘‘

شیبا ابھی خبر دیکھ رہی تھی۔ نیوز کاسٹر نے بتایا کہ پولیس لڑکی کے سفاک باپ کو گرفتار کرنے سے گریز کر رہی ہے جبکہ لڑکی کا کہنا ہے کہ اسے اپنے باپ سے جان کا خطرہ ہے۔ اگر پولیس یا اسپتال والوں نے اسے باپ کے حوالے کر دیا تو وہ اسے قتل کر دے گا۔ لڑکی کا نام مینا گل ولد اکبر خان تھا۔ اس کا باپ ایک قبائلی تھا۔ لڑکی کی عمر انیس برس تھی اور وہ دیکھنے میں خاصی دل کش لگ رہی تھی۔ شیبا نے موبائل اٹھایا اور ایک جاننے والے رپورٹر سے رابطہ کیا۔

’’جنید! میں شیبا بات کر رہی ہوں۔‘‘

’’شیبا جی! کیسی ہیں آپ؟‘‘ جنید خوش دلی سے بولا۔

’’ابھی نیوز لگا کر دیکھو۔ ایک لڑکی مینا کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ باپ نے اسے تشدد کر کے زخمی کر دیا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں شام تک مکمل انفارمیشن چاہیے۔‘‘

’’مل جائے گی۔‘‘ جنید بولا۔

’’میں بارہ بجے اس لڑکی کو دیکھنے اسپتال جاؤں گی۔ وہاں پر تین چار میڈیا والے موجود ہوں اور اگر کوئی چینل اس کی کوریج کرے تو زیادہ اچھا ہوگا۔ تمہارے لیے بھی۔‘‘

آخری جملے نے کام کیا۔ جنید بولا۔ ’’آپ فکر مت کریں، وہاں سب ہوں گے۔‘‘

’’ممکن ہے میں ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس بھی کروں۔‘‘

’’وہ تو لازمی بات ہے۔‘‘ جنید ہنسا۔ ’’اس کے بغیر فائدہ۔ میں سارے بندوبست کر دوں گا۔‘‘

’’اوکے! میں گیارہ بجے کال کر کے کنفرم کر لوں گی۔‘‘

’’اس کی ضرورت نہیں ہے... جیسے ہی انتظامات مکمل ہو جائیں گے، میں خود آپ کو کال کر دوں گا۔‘‘

شیبا ناشتا کر کے اپنے بوتیک کی طرف روانہ ہو گئی۔ آج وہاں کچھ نئے ڈیزائن ڈسپلے کیے جا رہے تھے۔ اسے بوتیک کے عملے کو اس بارے میں کچھ ہدایات دینا تھیں۔ اس کا بوتیک کلفٹن کے ایک مہنگے ترین شاپنگ سینٹر میں تھا۔ اس شاپنگ سینٹر کا پورا ایک فلور اس کے پاس تھا۔ شیبا کے بوتیک میں کوئی لباس دس ہزار روپے سے کم کا نہیں تھا۔ اس لیے صرف بڑے گھرانوں کی عورتیں ہی یہاں آتی تھیں۔ بوتیک پر اپنا کام نمٹا کر اس نے اپنے فوٹوگرافر جوجی کو کال کی۔

’’تم یہاں آ جاؤ۔‘‘ اس نے اسپتال کے بارے میں بتایا۔

’’اسپتال میں میرا کیا کام؟‘‘ اس نے اعتراض کیا۔

’’میں نرسوں اور ڈاکٹروں کا یونیفارم ڈیزائن کر رہی ہوں۔‘‘ شیبا نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟‘‘

’’نہیں اگر آپ یہ کام کر رہی ہیں تو میں اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہوں۔‘‘ جوجی نے برا مان کر کہا۔ جوجی کا سر بالوں سے خالی تھا اس کے اندر عقل کی کمی بھی تھی لیکن اپنے کام کا ماہر تھا۔ شیبا نے اپنی پروفیشنل زندگی میں اتنا ماہر فوٹوگرافر نہیں دیکھا تھا۔ وہ تصویر میں جان ڈال دیتا تھا۔

’’کب آؤں؟‘‘

’’ساڑھے گیارہ بجے پہنچ جانا۔ میں اسپتال کی پارکنگ میں ملوں گی۔‘‘ شیبا نے اسے حکم دیا۔

☆☆☆

www.pkdigest.com

مینا کو ہوش آیا تو وہ اس اسپتال میں تھی اور پولیس اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اکبر خان نے اسے بہت بے دردی سے مارا تھا۔ جب تکلیف اس کی برداشت سے باہر ہوگئی تو اس نے چیخنا شروع کر دیا تھا اور اسی طرح چیختے ہوئے وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ ایک لمحے کو تو سفید دیواریں دیکھ کر اسے لگا کہ وہ مر چکی ہے۔ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر پاس موجود نرس نے ڈاکٹر کو بتایا۔ ڈاکٹر نے خانہ پری کے انداز میں اس سے چند سوالات کیے اور پھر پولیس انسپکٹر کو بلا لیا۔ اس نے مینا سے بیان لیا۔ مینا نے بتا دیا کہ اس کے ساتھ یہ بہیمانہ سلوک اس کے باپ نے کیا ہے اور اگر اسے اکبر خان سے نہیں بچایا گیا تو وہ اسے مار بھی سکتا ہے۔

اس رات تک کئی لوگ اس کے پاس آئے۔ ان میں ایک ٹی وی چینل کی ٹیم بھی تھی جسے کسی طرح اس کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ انہوں نے اس سے سوالات کیے اور اس کی مووی بنا کر لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اکبر خان نے اس سے ملنے کی کوشش کی لیکن اس کی صورت دیکھتے ہی مینا خوف سے چلانے لگی اور اسپتال کے عملے نے اکبر خان کو وہاں سے نکال دیا۔ یہ کوئی نجی اسپتال تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ کون اسے وہاں داخل کرا گیا تھا۔ یہاں اگرچہ اس کی کوئی خاص دیکھ بھال نہیں تھی۔ اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی اور اسے دوائیں بھی دی جا رہی تھیں۔ یہ تین بیڈ والا کمرا تھا اور یہاں وہ اکیلی ہی تھی۔ بس یہ سہولت تھی کہ ایک بٹن دبانے پر کوئی نرس آ جاتی تھی۔

صبح کے وقت کئی اور لوگ بھی آئے اور اس سے اظہارِ ہمدردی کرتے رہے۔ پھر دن میں ایک عورت اندر آئی۔ اس کے پیچھے کئی کیمرے والے تھے۔ اس نے آتے ہی جھک کر اسے پیار اور اس طرح اس کا حال دریافت کیا کہ مینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ ادھیڑ عمر عورت تھی لیکن خوب گوری چٹی اور اسمارٹ سی تھی۔ اس کے بال براؤن تھے اور اس نے خوب صورت لباس پہن رکھا تھا۔

"میرا نام شیبا علی ہے۔" اس نے مینا سے کہا۔ "تم بالکل فکر مت کرو۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔"

اس کے بعد شیبا نے کیمروں کے سامنے ایک دھواں دھار تقریر کی اور اس معاشرے میں عورت کی پسماندگی کا روایتی رونا رویا جس میں بس رونا ہی رونا ہوتا ہے۔ مینا نے ایک طرف ایک گنجے اور عینک لگائے شخص کو دیکھا۔ اس نے مفلر لپیٹ رکھا تھا اور مینا کی تصویریں لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دلچسپی کے تاثرات تھے۔ مینا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ پھر شیبا نے اسے ٹی وی کیمرے کی طرف دیکھ کر اپنے باپ کے مظالم بیان کرنے کو کہا۔ وہ اٹک اٹک کر بتانے لگی کہ اکبر خان نے اس کے ساتھ کتنا بے رحمانہ سلوک کیا تھا۔ کچھ زخم کے نشانات اس کے بازو پر بھی تھے۔ شیبا نے چادر ہٹا کر وہ کیمرے کے سامنے کیے۔ مینا کو شرم آنے لگی۔ اس نے جلدی سے چادر سامنے کر دی۔

"اپنے زخم دکھاؤ۔" شیبا نے سرگوشی کی۔ "یہی تو موقع ہے دنیا کو بتانے کا کہ تمہارے باپ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔"

"نہیں، مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ اسے اتنے سارے مردوں کی موجودگی سے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی پوری طرح ان کے سامنے تھی اور وہ پوری تفصیل سے اس کا معائنہ کر رہے تھے۔ اس نے چادر اس طرح کر لی کہ جسمانی خدوخال چھپ جائیں۔ شیبا نے اس کی الجھن محسوس کر لی تھی۔ اس نے سب سے باہر جانے کو کہا۔ سارے مرد چلے گئے، سوائے اس گنجے کے... لیکن وہ واحد مرد تھا جس کی نظروں سے مینا کو الجھن نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ایک طرف ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"اب تم کیا کرو گی؟" شیبا نے اس سے سوال کیا۔

"مجھے نہیں پتا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا تمہارے پاس کوئی اور ٹھکانا ہے... کوئی اور رشتے دار جس کے گھر تم پناہ لے سکو؟"

"نہیں، میرا ایسا کوئی نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں صرف اپنے باپ کو جانتی ہوں۔"

"تمہاری عمر اکیس برس ہے؟"

"ہاں، میں اکیس کی ہو چکی ہوں۔"

"تب تم قانونی لحاظ سے بالغ ہو۔" شیبا نے اسے بتایا۔ "میں تمہاری طرف سے عدالت میں درخواست دوں گی کہ تم بالغ ہو اور اپنی مرضی سے میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔ کیا تمہیں منظور ہے؟"

"آپ کے ساتھ...؟" مینا نے تذبذب سے کہا۔

"ہاں... میں ایک مشہور شخصیت ہوں اور میرا کام ان بے سہارا لڑکیوں اور عورتوں کی مدد کرنا بھی ہے۔ میری ایک این جی او ہے، تم نہیں سمجھو گی۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" مینا نے اعتماد سے کہا۔ "میں ٹی وی دیکھتی رہی ہوں۔"

"گڈ... کیا تم نے کچھ پڑھا ہے؟"

www.pkdigest.com

''نہیں، مجھے پڑھنا لکھنا نہیں آتا۔''

شیبا نے حیرت سے دیکھا۔ ''سچ... لہجے سے تو تم پڑھی لکھی لگتی ہو۔''

''بس میں نے یہ سب ٹی وی دیکھ کر سیکھا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

شیبا جانتی تھی کہ ٹی وی تو سب دیکھتے تھے لیکن اس سے سیکھتے سب نہیں ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ذہین لڑکی ہے۔ شیبا نے اس سے پھر پوچھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''جی... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے آج شام کو میرا وکیل تم سے مل کر معاملات طے کر لے گا۔'' شیبا بولی۔ ''ابھی اور بھی لوگ تم سے ملنے آئیں گے لیکن تم کسی کی باتوں میں مت آنا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

شیبا اسپتال کے منتظم سے ملی اور اس سے مینا کے علاج اور اس کے اخراجات کے بارے میں پوچھا۔ اسے پتا چلا کہ کوئی نامعلوم شخص مینا کو یہاں داخل کرا گیا تھا اور اخراجات کے لیے تو اسپتال والے بھی فکر مند تھے۔ شیبا نے اس سے کہا۔ ''آپ بے فکر رہیں... اس کا بل میں ادا کروں گی۔ ویسے یہ کب تک ڈسچارج ہو جائے گی؟''

''کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے، معمولی زخم ہیں۔ آپ چاہیں تو ابھی ڈسچارج کرا سکتی ہیں۔''

''ابھی نہیں... اسے کل صبح تک یہیں رکھیں اور اب میری اجازت کے بغیر کوئی اس سے نہیں ملے گا۔'' شیبا بولی۔ ''اسے کسی پرائیویٹ روم میں شفٹ کریں اور اس کی پوری دیکھ بھال کریں۔''

شیبا نے اسپتال میں دس ہزار روپے جمع کرا دیے تھے۔ اس کے بعد اسپتال کی انتظامیہ کیسے اس کی بات نہ مانتی۔ مینا کو ایک پرائیویٹ کمرے میں منتقل کر دیا گیا اور ایک نرس مستقل اس کے پاس تھی۔ شام کو شیبا کا وکیل آیا اور اس نے مینا کے سائن لے لیے۔ اگرچہ اسے لکھنا نہیں آتا تھا لیکن وکیل نے تھوڑی سی مشق کرا کے اس کا سائن لے لیا۔ اس کا شناختی کارڈ بھی نہیں تھا۔ مینا حیران تھی کہ اس عورت کو اس میں کیا نظر آ گیا جو وہ اس کی اتنی مدد کر رہی ہے۔ مینا ایک محدود جگہ رہی تھی لیکن اس کے پاس عقل تھی اور اسے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ عورت اس سے بعد میں کوئی فائدہ حاصل کرے گی اور ابھی اس کی مدد کی ہے مگر مینا کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اکبر خان کسی زخمی جانور کی طرح بے تاب اور غصے میں تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مینا کو قتل کر دے۔ اگر وہ اس کے ہاتھ آ جاتی تو وہ یہی کرتا۔ جب وہ مینا پر تشدد کر رہا تھا تو محلے کی عورتیں آ گئیں۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جب اس نے عورتوں کو برا بھلا کہا تو ان کے مرد آ گئے اور اکبر خان ان سے الجھ گیا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب عورتیں بے ہوش مینا کو لے گئیں اور انہوں نے کسی طریقے سے اسے اسپتال میں داخل کرا دیا۔ اکبر خان نے بہ مشکل اسپتال کا پتا چلایا لیکن جب وہ وہاں پہنچا تو مینا نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اکبر خان نے شور کیا۔ اسپتال انتظامیہ نے گارڈز کی مدد سے اسے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد اسے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسپتال والوں کی طرف سے ایک ہی جواب تھا کہ اس کی بیٹی اس سے ملنا نہیں چاہتی۔ ایک گارڈ نے اسے بتایا کہ اب وہ اس طرف آیا تو شاید اسے بیٹی پر تشدد کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

پھر مینا نے پولیس کو اس کے خلاف بیان دیا تو حالات اس کے لیے اور خراب ہو گئے۔ اس کے ایک پولیس میں واقف کار نے..... مشورہ دیا کہ وہ چھپ جائے ورنہ اوپر سے دباؤ آنے کی صورت میں پولیس اسے گرفتار کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس کے بعد سے اکبر خان گھر میں نہیں تھا بلکہ ایک اور جگہ تھا۔ یہ سپر ہائی وے کے ساتھ ایک کچی آبادی میں اس کا ٹھکانا تھا لیکن اس نے اسے صرف ہنگامی حالات کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے کام ایسے تھے کہ کبھی بھی اسے چھپنے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ یہ ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان تھا۔ اس وقت وہ یہاں کسی زخمی درندے کی طرح ٹہل رہا تھا اور مینا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے دانت پیس کر کہا۔

''تو ایک بار میرے ہاتھ آ جائے تو تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔''

اکبر خان ہمیشہ سے اکھڑ مزاج تھا اور اسے سوائے اپنی ذات اور انا کے کسی سے پیار نہیں تھا۔ اول تو اسے اپنے مطلب کے لیے کسی تاویل کی ضرورت نہیں تھی اور اگر ضرورت پڑتی تو وہ لینے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ مینا کو واپس حاصل کرنا اور اسے اپنے ہاتھ سے مارنا اس کی انا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح یہ کام کرے۔ پھر اسے عزیز خان کا خیال آیا۔ عزیز خان علاقہ غیر کا رہنے والا تھا اور اس نے دو سال پہلے اکبر خان سے رابطہ کیا تھا۔ اصل میں

اکبر خان اسے بہت پہلے سے جانتا تھا لیکن خاصے عرصے سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ دوبارہ ملے تو اکبر خان حیران رہ گیا۔

''عزیز خان ایسا اتنی لمبی داڑھی؟''

عزیز خان ایک آزاد خیال اور مذہب سے دور رہنے والا شخص تھا۔ شراب اور عورت اس کی زندگی کا محور تھے اور اس کی زمین پر پوست کاشت ہوتی تھی۔ اس نے خود ہیروئن بنانے کی لیب قائم کی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ جرائم پیشہ افراد کو پناہ دینے اور تاوان کے لیے اغوا کیے جانے والے افراد کو اپنے پاس رکھنے کے لیے بھی مشہور تھا۔

''آج کل یہی حلیہ چل رہا ہے۔'' عزیز خان ہنسا۔

''تو کیا وہ سب چھوڑ دیا؟''

عزیز خان زور سے ہنسا۔ ''اپنے دھندے کون چھوڑتا ہے؟ میں نے کہا نا، آج کل یہی حلیہ چل رہا ہے۔ پہلے سے زیادہ مزے سے کام کر رہا ہوں۔'' اس نے آنکھ ماری۔ ''میں تو کہتا ہوں تم بھی ایسا ہی کر لو۔''

عزیز خان کے کلین شیو چہرے پر لمبی داڑھی آ گئی تھی اور اس نے سر پر پگڑی بھی باندھ رکھی تھی۔ عزیز خان کی زمین پر اب بھی پوست کاشت ہوتی تھی۔ اسے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ جو کام پہلے وہ چھپ کر کر رہا تھا اب کھلے عام کرنے لگا تھا۔ عزیز خان نے خود اس سے رابطہ کیا تھا۔

''تمہیں کوئی کام ہے؟'' اکبر خان نے پوچھا۔

''ہاں، اب دھندے کا ٹائم آ گیا ہے۔ ایک پارٹی کچھ اسلحہ بھیجنا چاہتی ہے۔''

''کدھر... کراچی؟'' اکبر خان محتاط ہو گیا۔ ''بات یہ ہے یارا کہ میں اسلحے کے چکر میں نہیں پڑتا۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میں تمہیں اسلحہ لے جانے کو کہہ بھی نہیں رہا ہوں۔ مجھے وہاں کچھ ٹھکانے چاہئیں۔ جدھر پولیس کا گزر کم ہوتا ہو۔''

''میں دیکھتا ہوں۔'' اکبر خان نے جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس معاملے میں نہ پڑے تو بہتر ہے کیونکہ اس طرح وہ ایجنسیوں کی نظر میں آ جاتا اور آج کل حالات اس لحاظ سے ٹھیک نہیں تھے لیکن وہ عزیز خان کو صاف انکار کر بھی نہیں سکتا تھا۔ عزیز خان اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور شاید اس نے اکبر خان کی سوچ بھانپ لی تھی۔ اس نے کہا۔

''تو شاید ہچکچا رہا ہے۔ اکبر خان! اس کام میں پیسا بہت ہے۔'' عزیز خان کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ''باہر سے ڈالرز آ رہا ہے۔''

''یارا! یہ سیاسی چکر ہے اور میں سیاست کا آدمی نہیں ہوں۔''

''سیاست کا چکر نہیں ہے اور تیرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بس دو تین ٹھکانے تلاش کرنے ہیں اور میرے آدمیوں کے حوالے کرنے ہیں۔ وہ کراچی میں رہتے ہیں، ان کو اتنا نہیں پتا۔''

''ٹھکانے کس لحاظ سے چاہئیں، خریدنے ہیں یا کرائے پر؟''

''کرائے کا چکر نہیں پالنا... سیدھا سیدھا دام لگاؤ اور خرید لو۔ پیسے کا فکر نہیں ہے۔'' عزیز خان بولا۔ ''پر خیال رہے کہ کوئی تحریری کام نہیں کرنا۔ بس پیسا پھینکو۔''

اکبر خان نے ان لوگوں کو شہر کی مختلف کچی اور غیر قانونی آبادیوں میں مکانات دلوا دیے۔ اس نے چالاکی کی اور خود سامنے آئے بغیر سودا کیا اور قبضہ لے کر مکان عزیز خان کے آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ اس نے جو قیمت بتائی، وہ عزیز خان نے بلا چون و چرا کیے ادا کر دی۔ اکبر خان کو اندازہ ہوا کہ اس کے پاس کہیں سے کالا دھن آ رہا تھا۔ ورنہ وہ بھی اکبر خان کی طرح ایک ایک روپے پر جان دینے والا شخص تھا۔ اپنا مال وہ کسی طرح اتنی فراخ دلی سے نہیں لٹا سکتا تھا۔ اکبر خان نے اس سے دگنی سے بھی زیادہ قیمت وصول کی تھی اور اتنا کما لیا تھا کہ کئی سال گھر بیٹھ کر کھاتا تب بھی ختم نہ ہوتا۔

اس کے بعد وہ عزیز خان کے لیے کام کرنے لگا۔ اس کا شروع سے ارادہ تھا کہ جب ایک خاص رقم جمع ہو جائے گی تو وہ اپنے علاقے میں جا کر..... زمین خریدے گا اور شادی کر کے ٹھاٹ سے زندگی گزارے گا۔ اس کے دونوں بیٹے جو مدرسے میں داخل تھے، اب خاصے بڑے ہو چکے تھے اور اپنا کورس مکمل کرنے والے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ ان کو ساتھ رکھے گا۔ ایک مہینا پہلے وہ پشاور گیا تھا اور اس نے شہر سے باہر نہر کے ساتھ کوئی تیس ایکڑ زمین لے لی تھی۔ حالات کی خرابی کی وجہ سے زمین کی قیمت بہت گر گئی تھی اور اسے سستے داموں مل گئی تھی۔ آئے دن کے بم دھماکوں میں زمین اور کاروبار کی کس کو سوجھتی لیکن اکبر خان ان فکروں سے بے نیاز تھا۔ آج کل زمین سستی ہو رہی تھی لیکن زمین کی پیداوار کی قیمت بڑھتی جا رہی تھی۔ اکبر خان نے تو یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہ اس زمین پر گندم، مکئی اور سورج مکھی کاشت کرے گا۔ یہ ساری ہموار زمین تھی ورنہ اس علاقے میں تمباکو کی فصل سب سے اچھی اگتی ہے۔ اس کے دام بھی اچھے لگتے ہیں۔ بعد میں اس کا ارادہ تمباکو کے لیے زمین لینے کا تھا۔

www.pkdigest.com

لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہو گیا۔ اکبر خان نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ جب اپنی شادی کرے گا تو مینا کی بھی کہیں شادی کروا دے گا۔ اب تو اس کے بارے میں فیصلہ ہی کچھ اور کر لیا تھا۔ اس نے عزیز خان کے مقامی نمائندے بدر شیر سے رابطہ کیا۔ ''میں اکبر خان بول رہا ہوں۔''

''بولو اکبر خان۔'' بدر شیر نے کہا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

''تو آ جاؤ۔''

☆☆☆

مینا، شیبا کا گھر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے کبھی اتنا شان دار اور صاف ستھرا مکان نہیں دیکھا تھا۔ اس کے لیے تو یہ پریوں کے محل جیسا تھا۔ اسے شیبا نے ایک چھوٹا سا لیکن بہترین انداز میں سجا کمرا دے دیا۔

''جب تک تمہارا کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا، تم یہاں رہو۔''

''میڈم! آپ مجھے کوئی کام دلا دیں، میں اپنا گزارہ کر لوں گی۔ بے شک مجھے کہیں گھر میں کام پر رکھوا دیں، مجھے سب آتا ہے۔''

''تم فکر مت کرو، میں نے تمہارے لیے اس سے بھی اچھا سوچا ہے، ذرا عدالت سے تمہاری خود مختاری کا فیصلہ تو ہو جائے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ نہ تو تمہارا پیدائش کا سرٹیفکیٹ ہے اور نہ شناختی کارڈ۔ اس لیے مشکل ہوگی۔ بہر حال، میں یہ کام کروا لوں گی۔ اس کے بعد تمہارے لیے میں نے کچھ سوچا ہے۔''

مینا خوش ہو گئی کہ اتنی بڑی عورت اس کی بہتری کے لیے کچھ سوچ رہی ہے۔ ''شکریہ میڈم۔''

''لیکن جیسا میں کہوں ویسا ہی کرنا ہوگا۔''

''جو آپ کہیں گی، میں ویسا ہی کروں گی۔'' مینا نے اسے یقین دلایا۔

''گڈ! کل سے ایک لڑکی آئے گی۔ وہ تم سے جیسا کہے گی، تم نے ویسا ہی کرنا ہے۔''

یہ لڑکی موبل تھی۔ وہ ایک معمولی سی ماڈل تھی اور آج کل شیبا علی کے پاس کام کر رہی تھی۔ شیبا نے اس کے ذمے لگایا تھا کہ وہ مینا کو چلنے پھرنے اور بولنے کی تربیت دے۔ مینا کے پاس اور کوئی کام نہیں تھا اس لیے وہ دل جمعی سے سیکھنے لگی۔ ایک ہفتے میں اس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ موبل نے اس کا لہجہ اور الفاظ کی ادائیگی کا تلفظ بھی بہت بہتر کر دیا تھا۔ چلنے کے انداز میں تو مینا نے تبدیلی کر لی تھی لیکن اس چیز سے اسے الجھن ہوتی تھی کہ وہ جسم کے مخصوص حصوں کو ایک خاص انداز میں حرکت دے کر چلے۔

''میں اس طرح کیوں چلوں؟'' اس نے موبل سے کہا۔

''یہ میڈم کا حکم ہے۔'' موبل کے پاس اس کے ہر اعتراض کا یہی جواب ہوتا تھا۔

مینا الجھن زدہ ہونے کے باوجود سیکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہی تھی۔ موبل اس پر محنت تو کر رہی تھی لیکن ساتھ ہی مینا محسوس کرتی تھی جیسے وہ اسے ناپسند کرتی ہے۔ مینا سے بات کرتے ہوئے اس کا لہجہ کھردرا ہو جاتا تھا اور وہ اس سے ایک فاصلے پر رہا کرتی تھی۔ ایک دن مینا نے شیبا علی سے اس کی شکایت کی تو وہ مسکرائی۔ ''وہ تم سے جلتی ہے۔''

''مجھ سے جلتی ہے۔'' مینا نے حیرت سے کہا۔ ''مگر کیوں؟''

''کیونکہ جو تمہارے پاس ہے، وہ اس کے پاس ہوتا تو وہ اس ملک کی ٹاپ ماڈل ہوتی۔''

مینا کو معلوم تھا کہ ماڈل کون ہوتی ہیں۔ اس نے حیرت سے کہا ''مجھ میں ایسی کیا بات ہے؟''

شیبا نے اسے شانے سے پکڑ کر ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے کے سامنے کیا۔ ''خود دیکھ لو۔''

www.pkdigest.com

اتنے دنوں میں مینا میں خاصی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ شیبا نے اس کو فٹنگ کے سوٹ لا کر دیے تھے۔ اس کے بال ایک ہیئر ڈریسر سے بنوائے تھے۔ کچھ فیشل اور میک اپ کی پیکٹس سے گزارا تھا۔ اس کے چہرے پر دل کشی اور ایک چمک سی آ گئی تھی لیکن وہ پھر بھی نہیں سمجھی۔

''میں نہیں سمجھی۔''

''پاگل... دیکھو خود کو... خوب صورت جسامت اور جلد کی یہ شائننگ جس کے پاس ہو، اسے ٹاپ ماڈل بننے سے کون روک سکتا ہے۔'' شیبا نے کہا۔

''میں... ماڈل۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔ ''نہیں... نہیں، میں یہ کام نہیں کر سکتی... ورنہ بابا مجھے تلاش کر کے مار دے گا۔''

''وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ تو خود پولیس سے چھپتا پھر رہا ہے۔''

''پولیس سے... پر بابا نے کیا کیا ہے؟''

''اس نے تم پر تشدد کیا ہے اور یہ پولیس کیس ہے۔ وہ پکڑا گیا تو عدالت اسے کم سے کم دو سال کے لیے جیل بھیج دے گی۔''

اگرچہ مینا نہیں چاہتی تھی کہ اکبر خان جیل جائے لیکن اسے یہ سن کر اطمینان محسوس ہوا کہ اب اکبر خان اس کے پیچھے نہیں آ سکتا۔ ممکن ہے وہ کراچی سے ہی چلا گیا ہو۔ اتنا اندازہ تو اسے بھی تھا کہ اس کا باپ کوئی غیر قانونی کام کرتا ہے اور ایسے لوگ ہمیشہ پولیس سے دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ شیبا اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

''بولو، کیا کہتی ہو... ماڈلنگ کرو گی؟''

''میں ماڈلنگ کر سکتی ہوں؟'' اس نے ہچکچا کر پوچھا۔

شیبا ہنس دی۔ ''میری جان! یہ جو ماڈلنگ کر رہی ہیں، کیا یہ آسمان سے اتری ہیں؟ تم ان سے کہیں بہتر ہو۔''

''پھر بھی مجھے تو کچھ نہیں آتا۔''

''تو میں ہوں نا سکھانے کے لیے۔'' شیبا بولی۔ ''بس تم ہاں کر دو... باقی میرا کام ہے۔''

مینا سوچنے لگی۔ اسے اپنے باپ سے ڈر لگتا تھا مگر اب وہ بھی نہیں تھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ ''کروں گی۔''

''شاباش! تم دیکھنا کچھ ہی عرصے میں تم کتنا اوپر جاؤ گی۔''

شیبا کی توجہ اس طرف جوجی نے دلائی تھی۔ جب اس نے مینا کی اسپتال میں لی گئی تصویریں نکالیں تو اس نے خاص طور سے شیبا کو لا کر دکھائیں۔ ''میڈم! اس لڑکی میں ماڈل بننے کی خصوصیت ہے۔ اس کی جسامت، چہرہ اور جلد مثالی ہے۔''

شیبا نے تصویریں دیکھیں تو وہ بھی جوجی کی بات کی قائل ہو گئی۔ مینا کا چہرہ بھی پُرکشش تھا جس سے عام طور سے ماڈل عاری ہوتی ہیں۔ ان کے پاس بس جسم ہی ہوتا ہے اور وہ بھی بنایا ہوا۔ مینا کا جسم تو جیسے قدرتی طور پر ایک ماڈل کے لیے بنا تھا۔ جسمانی نزاکت کے باوجود وہ موزوں بدن کی مالک تھی۔ شیبا نے محسوس کیا کہ اس کی چال میں بھی کشش ہے۔ اگرچہ اسے ابھی تربیت کی ضرورت تھی۔ اس نے مینا سے کہا۔

''تمہیں ڈانس آتا ہے؟''

''ہاں تھوڑا بہت آتا ہے۔'' مینا بولی۔

''اچھا... کر کے دکھاؤ۔'' شیبا نے فرمائش کی تو ایک لمحے کو وہ کانپ گئی۔ یہاں تک وہ اسی وجہ سے تو پہنچی تھی۔ نہ وہ شادی میں رقص کرتی اور نہ ہی اکبر خان اسے اتنی بے دردی سے مارتا۔ یہاں آئے ہوئے اسے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور اب اسے اپنا گھر یاد آنے لگا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ کاش اس کا باپ اسے معاف کر دے تو وہ اس کے ساتھ چلی جائے لیکن ساتھ ہی وہ جانتی تھی اکبر خان کبھی اسے معاف نہیں کرے گا۔ وہ جب بھی اس کے ہاتھ آئے گی، وہ اس کے قتل سے کم کسی چیز پر راضی نہیں ہوگا۔ اس کی واپسی کا دروازہ بند ہو چکا تھا، اب اسے آگے ہی بڑھنا تھا۔ شیبا نے سی ڈی پلیئر چلا دیا اور مینا ایک جانے پہچانے گانے پر رقص کرنے لگی۔ شیبا اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''میرے خدا! تم تو بنی بنائی ڈانسر ہو۔ تم نے اس گانے پر بالکل ویسا ہی ڈانس کیا ہے جیسا اس فلم کی ہیروئن نے کیا تھا۔''

شیبا اس کی تعریف کر رہی تھی اور وہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس کے باپ کو علم ہو گیا کہ وہ ماڈل بن گئی ہے تو اکبر خان اسے مارنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

☆☆☆

اکبر خان بدر کے سامنے تھا۔ بدر صورت سے عیار اور سفاک نظر آنے والا شخص تھا اور وہ سچ مچ بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے اکبر خان سے پوچھا۔ ''تمہیں کس معاملے میں مدد کی ضرورت ہے؟''

اکبر خان نے اسے مینا کے بارے میں بتایا۔ ''وہ نہ جانے کہاں ہے۔ اسپتال والے بھی نہیں بتاتے اور میرے پیچھے پولیس ہے۔''

''پولیس کا تو خیر ہے لیکن لڑکی کا غائب ہونا ٹھیک نہیں ہے۔'' بدر نے تشویش سے کہا۔ ''وہ ہماری برادری کی لڑکی ہے۔ خیر، اس کا پتا چل جائے گا... اور اچھا ہوا تم بھی آ گیا۔''

اکبر خان خوش ہو گیا۔ ''کوئی کام ہے؟''

''ہاں، کچھ دن بعد ایک مکان چاہیے۔ کم سے کم دس افراد کے لیے ہو۔''

''مل جائے گا۔'' اکبر خان نے کہا۔

''لیکن اس بار تمہارا کام صرف مکان تلاش کرنا نہیں ہوگا بلکہ اس میں آنے والوں کا تمام انتظام بھی تم کو کرنا ہوگا۔''

''تم پولیس سے میری جان چھڑا دو تو میں یہ بھی کر لوں گا۔'' اکبر خان نے جلدی سے کہا۔ جب سے اس نے سارے دھندے چھوڑ کر زمیندار بننے کا فیصلہ کیا تھا، اسے پولیس سے خوف آنے لگا تھا... بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اسے گرفتاری سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک بار پولیس کے ہاتھ آ گیا تو بہت سارے معاملات کھل جائیں گے اور پولیس نے اس سے اس کا ماضی اگلوا لیا تو اس کا نیک نام بننے کا منصوبہ ٹھپ ہو جائے گا۔ ایک بار تو اس کے دل میں آیا تھا کہ مینا پر لعنت بھیج کر چلا جائے مگر پھر اس کی انا نے گوارا نہیں کیا کہ مینا آزادی سے جو چاہے کرتی پھرے۔ اس

کے لیے موت کا سوچتے ہوئے اکبر خان کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اس کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ اس کے خیال میں مینا نے اتنے دن تک گھر سے باہر رہ کر خود کو واجب القتل ثابت کر دیا تھا۔

☆☆☆

مینا نے ملبوسات دیکھے اور بولی۔ ''یہ میں پہنوں گی؟''

''ہاں تو کیا میں پہنوں گی؟'' شیبا نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ اس نے دو لباس مینا کے سامنے رکھے تھے۔ اس میں ایک باریک کپڑے کی بنی قمیص تھی۔ اس کے نیچے پہننے کے لیے مختصر سی شمیز تھی۔ یہ شلوار سوٹ تھا اور دوسرا لباس ساڑی تھی جس کے ہمراہ بہت مختصر سا بلاؤز تھا۔ سیاہ شیفون کی ساڑی کے ساتھ سفید بلاؤز تھا اور بہت نمایاں نظر آتا تھا۔ مینا نے انکار کیا۔

''میں یہ لباس نہیں پہن سکتی۔''

شیبا نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیوں... ماڈلز اسی قسم کے لباس پہنتی ہیں اور ماڈلنگ کرتی ہیں۔ کیا تم نے کسی کو شٹل کاک برقع پہن کر ماڈلنگ کرتے دیکھا ہے؟''

مینا نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ شیبا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ماڈلنگ میں ایسے ہی لباس پہنے جاتے ہیں۔ اس نے کہا۔ ''وہ... میں نے... کبھی ایسے کپڑے نہیں پہنے۔''

''تو اب پہنو میری جان۔'' شیبا نے کہا۔ ''آج ان ڈریسز میں تمہارا فوٹو سیشن ہے۔''

مینا مزید پریشان ہو گئی۔ ''میری تصویریں بھی بنیں گی؟''

''ہاں نا جان! تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ ماڈلنگ میں یہ سب ہی تو ہوتا ہے... اور یہ آغاز ہے۔ تمہیں یہ ڈریس پہن کر بہت سارے لوگوں کے سامنے چلنا بھی ہوگا۔''

مینا یہ سب جانتی تھی۔ اس نے ماڈلنگ کی ہامی بھری تھی، تب بھی اسے پتا تھا کہ اسے یہ سب کرنا بھی پڑے گا۔ مگر جب عمل کا وقت آیا تو وہ ہچکچانے لگی۔ اسے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا تھا اور ساتھ ہی اسے معلوم تھا کہ اسے یہ سب قبول کرنا ہی ہے۔ اس نے بادلِ ناخواستہ کپڑے اٹھائے تو شیبا خوش ہو گئی۔ اس نے مینا کا رخسار چوم لیا۔ ''گڈ گرل... اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ جوجی آنے والا ہے۔ فوٹو سیشن وہی کرے گا۔''

مینا نے کمرے میں جا کر شلوار سوٹ پہنا۔ یہ اس کے متناسب جسم پر یوں فٹ ہو گیا کہ اس کے جسم کا ایک ایک حصہ نمایاں ہو گیا۔ اسے خود سے ہی شرم آنے لگی۔ وہ باہر نہیں نکلی تو شیبا خود اندر آ گئی اور اسے دیکھ کر خوش ہو گئی۔ ''کیا غضب کی لگ رہی ہو۔ آؤ، میں تمہارا میک اپ کروں اور تمہیں جیولری پہناؤں۔''

شیبا نے اسے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بٹھا کر اس کا لباس کی مناسبت سے میک اپ کیا اور اسے مصنوعی جیولری پہنائی۔ اس نے تیار ہو کر خود کو آئینے میں دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کے بال سادہ اور میک اپ بھی ہلکا تھا، اس کے باوجود وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ باریک قمیص تلے شمیز صاف محسوس ہو رہی تھی۔ قمیص پر نفیس سی کڑھائی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ شیبا نے اسے موتیوں کا بنا جیولری سیٹ پہنایا تھا۔ وہ بہت اچھی لگ رہی تھی مگر اسے یہ سوچ کر گھبراہٹ ہونے لگی کہ اس لباس میں وہ ایک مرد کے سامنے جائے گی جو اس کی تصویریں بھی لے گا۔

شیبا اسے اپنے بنگلے کے اس کمرے میں لائی جو اس نے فوٹو سیشن کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ جوجی ابھی نہیں آیا تھا۔ وہ اسے سمجھانے لگی کہ اس نے کس طرح کے پوز دینے ہیں۔ یہ پوز بھی اس کے لیے کسی آزمائش سے کم نہیں تھے لیکن اسے تصویریں ہوائی ہی تھیں۔ جوجی آ گیا۔ اس نے مینا کو دیکھ کر دانت نکالے اور شیبا سے بولا۔

''میں نے کیا کہا تھا میڈم... یہ مینا بنائی ماڈل ہے۔''

''اپنا کام شروع کرو۔'' شیبا نے مینا کا موڈ دیکھ کر اسے جھڑک دیا۔ اسے ڈر تھا کہ مینا انکار نہ کر دے لیکن خیریت رہی کہ مینا نے کام سے انکار نہیں کیا بلکہ اس نے بہت اچھی طرح فوٹو سیشن کرایا۔ جوجی خوش تھا۔ اس نے جاتے ہوئے شیبا سے کہا۔ ''آپ دیکھنا، بہت اچھا رزلٹ ہوگا۔''

مینا نے شلوار سوٹ تو پہن لیا تھا لیکن ساڑی پہنتے ہوئے اسے بہت مشکل ہوئی تھی۔ اس نے پہلے کبھی ساڑی نہیں پہنی تھی اور اوپر سے مختصر سا بلاؤز پہن کر تو اسے لگا جیسے اس نے کچھ پہنا ہی نہ ہو۔ شیبا نے اس کی مدد کی۔ ''تمہیں ساڑی پہن کر ماڈلنگ کرنا ہوگی۔'' شیبا نے اس سے کہا۔

''نہیں، سب کے سامنے میں یہ کام نہیں کر سکوں گی۔'' مینا نے گھبرا کر انکار کیا۔

''تم فکر مت کرو... جیسے تم نے یہ سب سیکھ لیا ہے، اسی طرح ساڑی پہن کر چلنا بھی سیکھ لوگی۔ ویسے تمہارا جسم جیسے بنا ہی ساڑی کے لیے ہے۔'' شیبا نے اس کا معائنہ کیا تو وہ شرما گئی۔ سو اب اسے مختلف ملبوسات پہننے کی تربیت دی جانے لگی۔ یہ کام اس کے لیے کسی قدر مشکل ثابت ہوا تھا لیکن ایک ہفتے میں وہ ساڑی سمیت کئی طرح کے لباس خود سے

پہننا سیکھ گئی۔ ساڑی کے علاوہ اسے پینٹ شرٹ، اسکرٹ بلاؤز اور دوسرے مشرقی پہناوے بھی پہنائے گئے۔ اب تک اس نے شلوار سوٹ کے سوا کوئی لباس نہیں دیکھا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اتنے ملبوسات ہوتے ہیں اور پھر ہر لباس کی بھی کئی کئی اقسام تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ عادی ہوتی چلی گئی۔ شیبا اس کی کارکردگی سے خوش تھی۔

اس دوران میں عدالت کی طرف سے اسے خودمختاری کا سرٹیفکیٹ مل گیا اور ساتھ ہی اس کا شناختی کارڈ بھی بن کر آ گیا تھا۔ اگر شیبا کی مدد اور اثر رسوخ نہ ہوتا تو یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ شیبا نے سرٹیفکیٹ اور شناختی کارڈ اسے تھما کر کہا۔ ''اب تم اپنے باپ کی محتاج نہیں رہی ہو۔''

اس نے ان چیزوں کو دیکھا اور سوچا کہ اگر اس کے باپ نے اس کو پالیا تو کیا یہ چیزیں اسے بچا سکیں گی؟ اس نے شیبا کی طرف دیکھا۔ ''میرا باپ مجھے قتل کر دے گا۔''

''تم فکر مت کرو... اب وہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' شیبا نے اسے تسلی دی۔ ''میں نے بتایا تھا کہ وہ خود پولیس سے چھپتا پھر رہا ہے۔ میں نے اوپر سے دباؤ ڈلوایا تو پولیس نے اس کے گھر پر چھاپا مارا تھا۔''

''نہیں، آپ اس کے خلاف کچھ مت کریں۔'' مینا نے التجا کی۔

''اس نے تم پر تشدد کیا ہے، اسے سزا تو ملنی چاہیے۔''

مینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کچھ بھی سہی، وہ میرا باپ ہے۔ اب آپ اس کے خلاف کچھ بھی مت کیجیے گا۔''

شیبا حیرت سے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے شانے اچکائے۔ ''جیسی تمہاری مرضی۔''

''شکریہ میڈم!'' مینا بولی۔

''چھوڑو اسے... یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ بوتیک چلوگی؟''

مینا کو معلوم تھا کہ شیبا این جی او کے ساتھ ایک بوتیک بھی چلاتی ہے اور وہ فیشن ڈیزائنر بھی ہے۔ مینا نے سر ہلایا۔ ''چلوں گی۔''

''آج میں تمہیں دکھاؤں گی کہ میں کیا کرتی ہوں اور آنے والے دنوں میں تمہیں بھی شاید یہی کام کرنا پڑے۔ اکثر ٹاپ ماڈلز اپنا برانڈ نکال لیتی ہیں اور پھر اپنے بوتیک کھول لیتی ہیں۔''

شیبا اسے اپنے بوتیک میں لائی۔ مینا وہاں کی چمک دمک اور وہاں موجود ملبوسات دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پھر ایلیٹ کلاس کی جو خواتین شاپنگ کرنے آئی تھیں، مینا ان کی شاہ خرچی دیکھ کر مزید دنگ رہ گئی۔ لاکھ سے اوپر کے ملبوسات لینا ان کے لیے عام سی بات تھی۔ شیبا نے اسے یہ بتا کر اور حیران کر دیا کہ یہ ملبوسات وہ عام استعمال کے لیے لیتی ہیں۔ خاص تقریبات کے سوٹ تو اسٹارٹ ہی لاکھ سے ہوتے۔ بوتیک کا ایک حصہ عروسی ملبوسات کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں ایسے لباس بھی تھے جن کی مالیت دس لاکھ سے اوپر تھی۔ مینا کو لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ سب اسی شہر میں تھا جہاں مینا جیسی لڑکیوں کو سال میں دو تین سو والے جوڑے بھی مشکل سے ملتے تھے۔ اس کے تاثرات سب سے الگ تھے۔ اس لیے سب ہی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر شیبا سے کہا۔

''میں واپس جاؤں گی۔''

شیبا اس کا مسئلہ سمجھ گئی۔ اس نے کہا۔ ''تم پریشان مت ہو، کچھ دن میں عادی ہو جاؤ گی۔ ابھی تم میرے دفتر میں چل کر بیٹھو۔''

شیبا اسے دفتر میں چھوڑ گئی۔ وہاں میز پر شیبا کے کام پر مبنی میگزین تھے اور ان میں اس کے تیار کیے ہوئے ملبوسات کی تصویریں تھیں۔ ان میں سے بعض لباس تو نہایت مختصر تھے۔ مینا کو حیرت ہوئی کہ انہیں کون پہنتا ہوگا؟ ساتھ ہی اسے یہ سوچ کر گھبراہٹ ہونے لگی کہ کیا اسے بھی اس قسم کے ملبوسات پہن کر ماڈلنگ کرنا پڑے گی؟ اس نے تصویروں کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا کہ وہ اس قسم کے کپڑے تو کسی صورت نہیں پہنے گی۔ ابھی وہ تصویریں دیکھ رہی تھی کہ شیبا آ گئی۔

''کیسے لگے میرے ڈیزائنز؟'' شیبا نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اچھے ہیں۔'' اس نے ہچکچا کر کہا۔ ''لیکن ایسے کپڑے کون پہنتا ہے؟'' اس نے مختصر ملبوسات کی طرف اشارہ کیا۔

شیبا ہنسی۔ ''میری جان! سب سے زیادہ مانگ انہی کی تو ہے۔''

مینا حیران ہوئی۔ ''عورتیں یہ کپڑے پہن کر سب کے سامنے آ جاتی ہیں؟''

''تو اور کس لیے لیتی ہیں۔ ویسے بھی یہ بہت مہنگے سوٹ ہیں۔ بہرحال، چھوڑو اس بات کو... میں تمہیں اس لیے بھی یہاں لائی ہوں کہ کچھ نئے ڈیزائن میں نے تمہارے لیے سلیکٹ کر لیے ہیں۔ آنے والے گرما میں انہیں لانچ کرنا ہے۔ تمہارا ٹیپ لیا جائے گا۔''

مینا نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا میں انہیں پہن کر

www.pkdigest.com

ماڈلنگ کروں گی؟''

''آف کورس... میرے حساب سے تم آنے والے دو مہینوں میں اس قابل ہو جاؤ گی کہ کسی بھی ایجنسی میں حصہ لے سکو۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''تم فکر مت کرو... تمہیں اتنی ریہرسل کرا دیں گے کہ تمہیں بالکل ڈر نہیں لگے گا۔'' شیبا نے اسے تسلی دی۔

مینا وضاحت نہیں کر سکی کہ اسے اس کام سے نہیں بلکہ کسی اور چیز سے ڈر لگ رہا ہے۔ وہ اس کے ذہن میں واضح نہیں تھی۔ شیبا اسے ناپ کے لیے بوتیک کے مخصوص کمرے میں لے گئی اور اسے ماسٹر کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

اکبر خان نے کار اس کچے مکان کے سامنے روکی۔ اندر سے ڈیک پر بلند آواز سے گانا باہر تک سنائی دے رہا تھا۔ اس نے ہارن دیا اور پچھلی نشست سے سامان کے تھیلے اتارنے لگا۔ ابھی دو ہفتے پہلے اس نے ان لوگوں کو یہ مکان خرید کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں سارا سامان اور کھانا پینا مہیا کرنا بھی اس کی ذمے داری تھی۔ یہ کل چھ افراد تھے اور ان کا تعلق علاقہ غیر سے تھا۔ کم سے کم اکبر خان کو یہی بتایا گیا تھا۔ وہ سب پشتو بولتے تھے اور انہوں نے روایتی طرز کے لباس پہن رکھے تھے۔ اس کے باوجود اکبر خان کو ان کے انداز میں کوئی بات الگ سے محسوس ہوتی تھی۔

دستک کے جواب میں ان میں سے ایک نے دروازہ کھولا اور پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''اکبر خان... کیسا ہے تم؟''

''ٹھیک ہوں... راستہ دو، مجھے ابھی اور سامان لانا ہے۔'' اس نے کسی قدر بدمزگی سے کہا۔ اسے اس قسم کے کام بہت ناگوار گزرتے تھے۔ اس نے اندر لے جا کر کارٹن ایک کمرے میں رکھ دیا۔ وہاں زمین پر بچھے قالین پر دو افراد دراز تھے اور شراب پی رہے تھے۔ شراب غیر ملکی تھی۔ اکبر خان نے للچائی نظروں سے بوتل کی طرف دیکھا تو ان میں سے ایک نے جام لہرایا۔

''دوست! تم بھی آ جاؤ۔''

''ابھی باقی سامان لے کر آتا ہوں۔'' اکبر خان کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ جلدی سے باہر کی طرف لپکا۔ اس نے کار سے باقی سامان نکالا اور دروازہ بند کر کے اندر آنے لگا۔ جلدی میں وہ دروازہ کھولنے والے سے ٹکرایا۔ وہ راستے میں کھڑا تھا۔ ایک تھیلا پھسل کر اس کے پاؤں پر گرا تو اس نے بے ساختہ کہا۔ ''ڈیم اٹ۔''

اکبر خان نے معذرت کی۔ ''معاف کرنا یارا... غلطی سے ہو گیا۔''

وہ اندر آیا۔ اس نے سامان رکھا اور اپنے لیے ایک گلاس میں شراب نکالنے لگا۔ اس کا ارادہ تو پورا گلاس بھرنے کا تھا لیکن اسے پیش کش کرنے والے نے بوتل چھین لی۔

''بس کرو... کیا ہمارے حصے کی بھی پی جاؤ گے؟''

مجبوراً اکبر خان کو آدھے گلاس پر اکتفا کرنا پڑا۔ یہ خاصی تیز شراب تھی اور ان لوگوں کے پاس اس کے پورے پورے کارٹن تھے۔ اکبر خان خود سامان لایا تھا۔ دو ڈبے جو مضبوط لکڑی کے تھے، اس قدر بھاری تھے جیسے ان میں لوہا بھرا ہو لیکن انہوں نے اکبر خان کو ان کے لیے مزدور کرنے سے منع کر دیا تھا اور اس کے ساتھ خود اٹھا کر لائے تھے۔ اس نے گلاس ختم کیا تھا کہ بدر کی کال آ گئی۔

''سامان پہنچا دیا؟''

''ہاں ابھی پہنچایا ہے۔'' اکبر خان نے اسے رپورٹ دی۔ ''میں ابھی یہیں ہوں۔''

''میرے پاس آؤ... تمہاری لڑکی کا سراغ مل گیا ہے۔''

یہ سنتے ہی اکبر خان سب بھول گیا۔ اس نے شراب کا گلاس پٹخا اور بولا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ جلدی سے باہر نکلا۔ اس کے پاس چھوٹی ماڈل کی کرولا تھی اور اس کا انجن اچھا تھا۔ اس نے گاڑی دوڑا دی اور بیس منٹ میں کوئی پون گھنٹے کا فاصلہ طے کر لیا۔ بدر اپنے ڈیرے پر اس کا منتظر تھا۔ اس نے ایک اخبار اکبر خان کے سامنے ڈال دیا۔ ''یہی ہے نا تمہاری بیٹی؟''

اکبر خان نے تصویریں دیکھیں تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مینا نے ان تصویروں میں جدید طرز کے ملبوسات پہن رکھے تھے جن میں اس کا جسم بہت نمایاں تھا۔ اسے زیادہ پڑھنا نہیں آتا تھا لیکن یہ تصویریں سب بتانے کے لیے کافی تھیں۔ اس نے بدر کی طرف دیکھا۔

''یہ اب میری بیٹی نہیں، میری دشمن ہے۔ یہ کہاں ہے؟''

''ایک مقامی عورت شیبا کے پاس ہے۔ اس کا کلفٹن میں کپڑوں کا دکان ہے اور وہ ایک این جی او بھی چلاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مینا کو اسپتال سے یہی لے گیا تھا۔''

بدر کی نظریں مینا کی تصویروں پر مرکوز تھیں اور وہ اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اکبر خان اپنی سوچوں میں گم تھا اس لیے وہ محسوس نہیں کر سکا۔ بدر نے بتایا۔ ''آج رات ایک... ٹی وی پر یہ کسی پروگرام میں آئے گا۔''

اکبر خان نے بدر کو دیکھا۔ ''میں اسے ہر قیمت پر واپس لاؤں گا اور اپنے ہاتھ سے ماروں گا۔''

''کیسے...؟ تم تو خود پولیس سے چھپتا پھر رہا ہے۔'' بدر بولا۔

''تم نے میری مدد کرنے کو کہا تھا؟''

''ہاں لیکن پہلے ہمارا کام کرے گا تو ہم مدد کرے گا۔''

''میں نے کب منع کیا ہے... تم کام بولو، ہم کرے گا۔''

''کام بھی بتائے گا۔'' بدر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''پر پہلے تمہارا بیٹی کو ادھر سے نکالے گا۔''

اکبر خان پُرجوش ہو گیا۔ مینا اس سے دور تھی اور ان تصویروں کے علاوہ وہ نہ جانے کیا کیا کرتی پھر رہی تھی۔ یہ سب اس کی برداشت سے باہر تھا اور وہ جلد از جلد اسے اپنے قبضے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی نیک نامی زندگی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مینا ہے۔ جب تک وہ مینا کا خاتمہ نہیں کرے گا، کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ وہ خوش تھا کہ بدر اس سے کام لینے سے پہلے مینا کو واپس لانے کی بات کر رہا تھا۔

''یہ عورت رہتی کہاں ہے؟''

''تم فکر مت کرو... میرے آدمی پہلے ہی اس کا پتا چلا رہے ہیں۔ آج یا کل تک پتا چل جائے گا۔ اس کے بعد ہم سوچے گا کہ اسے کس طرح نکالنا ہے۔'' بدر نے جواب دیا۔

اکبر خان اسی کچی آبادی کے کمرے میں چھپ کر رہ رہا تھا۔ وہاں اسے کوئی نہیں جانتا تھا اور وہ نزدیک ہی ایک ہوٹل سے تینوں وقت کا کھانا کھا لیتا تھا۔ بلا ضرورت کہیں باہر جانے سے گریز کرتا تھا۔ اس نے اپنا حلیہ بدلنے کے لیے شلوار قمیص کا انداز بدل لیا تھا۔ اب وہ ڈھیلی سی شلوار قمیص کے بجائے جدید انداز کی کسی قدر فٹ شلوار قمیص پہن رہا تھا۔ اس نے اپنے مختصر بال بڑھا لیے تھے اور داڑھی کو رنگنا چھوڑ دیا تھا۔ پہلے وہ داڑھی کو سیاہ خضاب سے رنگتا تھا اور اب ایک مہینے سے خضاب نہ کرنے سے اس کی داڑھی میں سفید بال نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے پر جھریوں سے زیادہ شکنیں نمایاں تھیں اور ایک کرخت سا تاثر اس پر ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے وجود میں بغض اور کینہ بھرا ہوا ہو۔ پہلے وہ سر پر گول ٹوپی پہنتا تھا، اب اس نے ٹوپی پہننا چھوڑ دی تھی۔ اگرچہ پولیس اسے اتنی شدومد سے تلاش نہیں کر رہی تھی۔ مگر اپنی طرف سے وہ ساری احتیاطیں کر رہا تھا۔

اکبر خان کو عزیز اور اس کے ساتھی مشکوک لگتے تھے۔ اگرچہ اس نے ابھی تک ان کو کچھ کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن اسے احساس تھا کہ وہ کوئی بہت خطرناک کام کرتے ہیں کیونکہ اس نے ان کو کوئی عام کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ منشیات کی اسمگلنگ کرتے تھے اور نہ ہی اسلحہ لاتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو اکبر خان کو ضرور علم ہوتا کیونکہ اس سے پہلے عزیز خان اس کے توسط سے بھی کام کرتا رہا تھا۔ پچھلے دو سال سے عزیز خان بس اس سے پورے شہر میں ٹھکانے تلاش کروا رہا تھا اور وہاں آ کر اس کے آدمی رہ رہے تھے۔ یہ آدمی بھی اکبر خان کو مشکوک لگتے تھے... یعنی جو ظاہر کرتے تھے، ویسے تھے نہیں۔

لیکن اکبر خان کو ان سب باتوں سے سروکار نہیں تھا۔ اسے تو بس پیسے سے مطلب تھا اور وہ اسے مل رہا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ مینا کا قصہ پاک کرتے ہی وہ یہاں سے نکل جائے گا۔ بدر سے اس کا کوئی معاہدہ نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے مستقل کام کرے گا۔ وہ اسے نہیں روک سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ مزے سے رہتا۔ اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ اس کے ملک اور شہر کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ اسے صرف ذاتی عیش و آرام سے غرض تھی۔ وہ اسی کے لیے جی رہا تھا۔

☆☆☆

عزیز خان کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ اس کا قبیلہ اپنی زمین پر منشیات کاشت کرتا تھا۔ افغان جنگ کے دوران ان کی سرگرمیوں سے آنکھیں بند کر لی گئی تھیں اور اس کے نتیجے میں ملک بھر میں منشیات کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ عزیز خان نے اس بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے تھے اور جب امن کے عالمی ٹھیکے داروں کا اس خطے سے مفاد باقی نہیں رہا تو انہوں نے آنکھیں بدل لیں اور مقامی حکومتوں پر منشیات کی روک تھام کے لیے دباؤ ڈالنے لگے۔ اس کے نتیجے میں عزیز خان اور اس جیسے معمولی لوگوں کی کم بختی آ گئی۔ اگرچہ وہ منشیات کاشت کر رہا تھا لیکن پہلے کی طرح کھلم کھلا والا معاملہ نہیں تھا۔

پھر سختی بہت بڑھ گئی اور پڑوسی ملک سے آنے والی منشیات بھی بند ہو گئی تو عزیز خان کے لیے گزارہ کرنا بھی مشکل ہو گیا۔ وہ اور اس جیسے دوسرے دعا کرنے لگے کہ خطے میں پھر کوئی جنگ چھڑے تو ان کا کاروبار چمک اٹھے۔ ان کی دعا میں رنگ لائیں اور نائن الیون کے بعد امریکا یہاں آن موجود ہوا۔ حسب توقع لوگوں کا کاروبار پہلے سے بھی زیادہ چمک اٹھا کیونکہ اس بار امریکا کے جلو میں آنے والے ڈالرز کی بہتات تھی۔ روسی فوجی منشیات کے عوض اپنا سامان اور

www.pkdigest.com

اسلحہ بیچتے تھے لیکن امریکی فوجیوں کے پاس نقد ڈالرز تھے اب صرف ڈالرز نہیں آرہے تھے بلکہ افغانستان سے بند ہو جانے والی منشیات کی ترسیل بھی دوبارہ ۔۔۔ شروع ہو گئی تھی۔

ایک دن عزیز خان کے پاس ایک شخص آیا۔ اس کا حلیہ مزاحمت کاروں جیسا تھا لیکن اس کی پیش کش نرالی تھی۔ اس نے عزیز خان سے کہا۔

''اگر تم ہامی بھرو تو میں تمہاری ملاقات پڑوسی ملک کی ایک اہم شخصیت سے کرا سکتا ہوں۔''

''اس کا فائدہ؟'' عزیز خان نے سوال کیا۔

''فائدہ ہی فائدہ ہو گا۔'' وہ شخص ہنسا۔ ''نقصان صرف دوسروں کا ہو گا۔ ادھر سے نقد ڈالرز ملے گا... بڑا والا نوٹ... دنیا کے جس حصے میں کہے گا بینک اکاؤنٹ کھل جائے گا۔ پیسا ادھر جائے گا۔''

''عزیز خان کا بینک یہ ہے۔'' عزیز خان نے ہتھیلی آگے کی۔ ''اس بینک میں پیسا آئے گا تو کیوں نہیں جائے گا؟''

آنے والے نے ایک گڈی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ یہ سو سو ڈالرز والی نوٹوں کی گڈی تھی۔ یعنی اس میں دس ہزار ڈالرز تھے لیکن عزیز خان متاثر نہیں ہوا۔ اس نے گڈی اس شخص کے سامنے رکھ دی۔ ''اتنا تو ہم ایک کھیپ سے کما لیتا ہے۔''

''عزیز خان! یہ آغاز ہے اور تم کھیپ بھیجتا ہے تو اس میں خطرہ بھی ہوتا ہے۔ ان کے لیے کام کرے گا تو خطرہ نہیں ہو گا۔''

اس آدمی نے عزیز خان کو مزید دس ہزار ڈالرز دے کر راضی کر لیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد وہ پڑوسی ملک کے دارالحکومت کابل میں تھا اور وہاں اس کی ملاقات ایک اہم شخص سے ہوئی۔ اس نے عزیز خان سے دو ٹوک بات کی۔ ''تم جو مانگو گے تم کو ملے گا لیکن ہمیں تمہارا پورا تعاون چاہیے۔''

عزیز نے بے پروائی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''نوٹ پھینکو گے تو سب ملے گا۔''

''نوٹ ملیں گے۔'' اس شخص نے کہا۔ ''لیکن اتنا یاد رکھنا کہ ہمارے لیے کام کرتے ہوئے کوئی اور خیال ذہن میں نہ آئے۔''

''کس قسم کا خیال؟'' عزیز نے اسے دیکھا۔

''یہی حب الوطنی اور عقیدے جیسے آؤٹ آف ڈیٹ خیالات۔''

عزیز مسکرایا۔ ''اگر میرے ذہن میں ایسے خیالات ہوتے تو میں یہاں اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہوتا؟''

وہ شخص سرد لہجے میں بولا۔ ''ہم نے تمہارے بارے میں مکمل تحقیق کی ہے لیکن پھر بھی تمہیں خبردار کرنا ضروری ہے۔ تم پیسے کے لیے کام کرتے ہو اور پیسا ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

عزیز طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''یہ مت کہو... پیسا تمہارے لیے مسئلہ ہے۔ ہاں تمہارے آقاؤں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ورنہ جو بندہ آج تمہارا صدر ہے، وہ بھی ایک وقت کے کھانے کے لیے میرے ملک میں ہوٹلوں کے باہر پھرتا تھا۔''

اس شخص نے عزیز کی بات نظر انداز کر دی اور بولا۔ ''تمہیں ہدایات اسی شخص سے ملیں گی جو تمہیں یہاں تک لایا ہے۔''

''اور پیسا؟''

''پیسا بھی وہی شخص دے گا۔''

''ٹھیک ہے... جب تک تم پیسا دے گا، ہم تمہارے ساتھ ہے۔''

عزیز خان ان لوگوں کے لیے کام کرنے لگا۔ اس کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس کا مال بنا کسی چیکنگ کے افغانستان کے راستے وسط ایشیا کی طرف جانے لگا جہاں یورپ اور امریکا کے لیے نئے روٹ کھل گئے تھے۔ شروع میں عزیز خان نے اشیا کی ترسیل کا کام کیا لیکن جلد وہ اس سے براہ راست کام لینے لگے۔ عزیز کو دولت مل رہی تھی اور اسے مزید کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔ اسے رقم کام کی نوعیت کے لحاظ سے ملتی تھی۔ ایک بار اسے ایک بارود سے لدی گاڑی ملک کے دارالحکومت میں پہنچانے کا کام سونپا گیا۔ اس کے عوض اسے ایک لاکھ ڈالرز ادا کیے گئے۔ اس نے یہ کام کر دیا۔ اس سے اگلے دن ہی ایک بڑے ہوٹل پر حملہ ہوا اور بے شمار افراد مارے گئے۔ اس حملے میں وہی گاڑی استعمال ہوئی تھی جو عزیز خان نے وہاں پہنچائی تھی۔

اس کے بعد بھی اس نے ملک کے دوسرے حصوں میں کامیابی سے اسلحہ اور بارود پہنچایا۔ اس کے کئی آدمی پکڑے گئے یا مارے گئے لیکن وہ محفوظ رہا۔ اوپر سے شروع کر کے وہ رفتہ رفتہ ملک کے نچلے حصے کی طرف جا رہے تھے۔ پھر عزیز خان کو حکم ملا کہ ملک کے سب سے بڑے شہر میں ٹھکانے بنانے شروع کیے جائیں۔ اس نے اس مقصد کے لیے اکبر خان اور اس جیسے چند دوسرے افراد کو استعمال کیا۔ ان میں

www.pkdigest.com

اکبر خان سب سے کارآمد ثابت ہوا۔ اس نے عزیز کے لیے سرگرمی سے کام کیا۔ اس کی مدد سے عزیز خان نے اپنے آقاؤں کے درجنوں ایجنٹس شہر میں پہنچا دیے تھے۔ اس کے علاوہ بڑی مقدار میں اسلحہ اور گولہ بارود بھی پہنچایا تھا۔ اب نشانہ ملک کی معاشی شہ رگ تھی۔

عزیز خان کی دولت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اس نے اتنا کما لیا تھا کہ اس کی سات پشتیں بھی بیٹھ کر کھاتیں تو ختم نہ ہوتا لیکن اس کی ہوس کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس لیے جب اسے شمالی علاقوں میں بعض کام سونپے گئے تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ اس نے گھوم پھر کر اپنے مطلب کے افراد تلاش کرنا شروع کر دیے۔ وہ ان کو بھرتی کرتا اور پھر تربیت کے لیے پڑوسی ملک بھیج دیتا۔ جب یہ افراد وہاں سے آتے تو انہیں ان کے علاقے میں واپس روانہ کر دیتا۔

یہ ایجنٹس اپنے علاقوں میں اس طرح کام کرتے کہ مشکوک افراد پر نظر رکھتے اور کسی جگہ انہیں مشکوک افراد نظر آتے تو وہ اس کی اطلاع اوپر دیتے۔ عزیز خان نہیں جانتا تھا کہ وہ کس طرح سے کام کرتے تھے کیونکہ اس کا کام انہیں بھیجنا ہوتا تھا مگر اسے شک تھا کہ یہ مقامی افراد ڈرون حملوں سے پہلے جاسوسی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا ناواقف رہنا ہی بہتر ہے کیونکہ اس کام میں خطرات بہت تھے۔ سپر پاور کے باغی سفاکی میں اس سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ آئے دن مختلف جنگ زدہ علاقوں سے لوگوں کی سربریدہ لاشیں ملتی تھیں۔ ان میں کئی افراد وہ تھے جن کو عزیز نے تربیت کے لیے بھیجا تھا۔ اس لیے وہ بہت ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتا تھا اور براہِ راست کسی معاملے میں ملوث ہوئے بغیر اپنا کام نکلوا تا تھا۔

عزیز خان سرحد پر ایک ایسے علاقے میں رہتا تھا جہاں سے اسے دونوں ملکوں میں آنے جانے میں آسانی رہتی۔ اس نے اپنی حفاظت کے لیے محافظوں کی ایک فوج پال رکھی تھی۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ اگر کسی نے اسے مارنے کا فیصلہ کر لیا تو یہ فوج اس کے کام نہیں آئے گی لیکن دل کی تسلی کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اسے اس چکر سے نکل جانا چاہیے کیونکہ اسے اپنے آس پاس خطرے کے سائے منڈلاتے محسوس ہو رہے تھے۔ پھر خطرہ ذرا کھل کر سامنے آ گیا۔ اس کی افغانستان کے راستے وسط ایشیا جانے والی دو کھیپیں منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے غائب ہو گئیں۔ دونوں کھیپیں افغانستان میں غائب ہوئی تھیں اور جن علاقوں میں یہ کام ہوا تھا، وہاں مزاحمت کاروں کا زور تھا...... بظاہر یہ کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن عزیز خان جیسے لوگ تو پتّا کھڑکنے سے بھی چونک جاتے ہیں۔ اس نے فوری طور پر شہر کا رخ کیا۔ حالانکہ اسے وہیں رکنے کو کہا گیا تھا لیکن اس نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے رابطہ کار کو بتایا۔

”میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔“

”تمہاری حفاظت ہماری ذمّے داری ہے۔“ رابطہ کار نے کہا۔

”تمہاری ذمّے داری؟“ عزیز اس کی بات پر ہنسا۔ ”تم لوگ اپنی حفاظت نہیں کر پا رہے۔“

”یہ درست ہے۔“ رابطہ کار نے جواب دیا۔ ”لیکن مسئلہ بچنے کا نہیں، مرنے کا ہے۔“

عزیز چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”دیکھو... تمہیں اب تک لاکھوں ڈالرز دیے جا چکے ہیں اور یہ رقم اس لیے نہیں دی ہے کہ تم موت کے خوف سے بھاگ جاؤ۔“

”مجھے تمہارا کام کرنا ہے، وہ میں یہاں بھی کر سکتا ہوں۔“ عزیز نے عیاری سے کہا۔

”نہیں... تمہیں ہمارا کام وہاں کرنا ہوگا جہاں ہم چاہیں گے۔“ رابطہ کار نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اب تم فیصلہ کر لو تمہیں ہمارے لیے کام کرنا ہے یا نہیں؟“

عزیز خان پھنس گیا تھا۔ اگر وہ انکار کرتا تو یہ لوگ اسے زندہ نہ چھوڑتے اور اگر ان کے لیے کام کرتا تو دوسری طرف کے لوگ اسے نہ بخشتے۔ اس کی منشیات کی کھیپیں ان لوگوں نے ہی غائب کی تھیں ورنہ کوئی اور یہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک پیغام بھی تھا کہ انہوں نے اس کے بارے میں جان لیا ہے۔ عزیز خان کسی صورت واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ خودکش بمبار کو دنیا کی جدید ترین ٹیکنالوجی بھی نہیں روک سکتی تھی، اس کی تو کوئی اوقات ہی نہیں تھی۔ اس نے رابطہ کار سے کہا۔

”میری جان کو وہاں خطرہ ہے۔ تمہارے دشمن جان گئے ہیں کہ میں تمہاری مدد کر رہا ہوں تو کیا وہ مجھے بخش دیں گے؟“

رابطہ کار نے اسے غور سے دیکھا۔ ”کیا تمہیں دھمکی ملی ہے؟“

عزیز خان نے سر ہلایا۔ ”براہِ راست نہیں لیکن افغانستان میں میرا بھیجا ہوا کچھ سامان غائب ہوا ہے۔“

”یہ بات تمہیں پہلے بتانی چاہیے تھی۔“ رابطہ کار

www.pkdigest.com

بولا۔ ”اب ہم اگلی شپ منٹ کے ساتھ ٹریپ لگائیں گے۔“

”تاکہ ان لوگوں کو یقین ہو جائے؟“ عزیز خان تلخی سے بولا۔ ”اب میں نے یہ کام چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”لیکن ایک شپ منٹ تو لازمی جائے گی۔“ رابطہ کار مسکرایا۔ ”اور یہ ہماری طرف سے ہوگی۔“

”تم لوگوں نے یہ کام کرنا ہے تو کر لو۔“ عزیز نے کہا۔

”کام تمہارے توسط سے ہوگا اور اس کے بعد تمہارے لیے ہمارے پاس بہتر پلان ہے۔“ رابطہ کار نے کہا۔

”وہ کیا؟“ عزیز چونکا۔

”پھر تمہیں کراچی جانا ہوگا۔“

☆☆☆

شمال مغربی افغانستان میں ٹوٹی ہوئی سڑک پر ایک ٹرک سفر کر رہا تھا۔ ٹرک میں سامنے دو افراد تھے اور اس کا پچھلا حصہ ترپال سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ عام سا ٹرک تھا۔ اچانک ہی ایک جگہ ٹرک کا ٹائر برسٹ ہوا اور وہ رک گیا۔ اندر موجود دونوں افراد باہر آئے اور اگلا پنکچر ہو جانے والا ٹائر بدلنے لگے۔ جیسے ہی انہوں نے یہ کام مکمل کیا، تاریکی سے نکل کر کچھ افراد نے انہیں گھیر لیا۔ انہوں نے مزاحمت کی کوشش کی تو گھیرنے والوں نے لمحوں میں انہیں چھلنی کر دیا۔ ان کی لاشیں سڑک پر ایک طرف ڈالیں اور ٹرک لے کر روانہ ہو گئے۔ ٹرک کے اوپر اڑتے ایک جاسوس طیارے نے یہ ساری کارروائی مرکزی کمانڈ اینڈ کنٹرول سینٹر میں دکھائی۔ سینٹر کا سربراہ کرنل رینک کا شخص تھا۔ وہ مسکرایا۔ مچھلی نے چارا نگل لیا تھا۔ جاسوس طیارہ اب بھی ٹرک کے اوپر محوِ پرواز تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ٹرک ایک عمارت کے احاطے میں داخل ہو گیا۔

اسفند نوریہ ایک افغان وار لارڈ تھا۔ اس نے طالبان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے اور اپنے جرائم پر معافی مانگ کر بچ گیا تھا لیکن امریکیوں کے آتے ہی اس نے کینچلی بدلی اور ان کا ساتھ دینے لگا۔ اس نے چن چن کر علاقے سے حریت پسندوں کا خاتمہ کرنے میں امریکیوں کا ساتھ دیا اور اس کے صلے میں وہ اس علاقے میں اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد ہو گیا۔ اس نے اپنے قلعہ نما مکان میں دنیا کی ہر نعمت جمع کر رکھی تھی۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس کے آدمی آس پاس سے اس کی پسند کی ہر لڑکی کو اٹھا لاتے تھے۔ جو مزاحمت کرتا، اسے اڑا دیا کرتے۔ اس وقت بھی اس کی خواب گاہ میں ایک ایسی ہی لڑکی تھی۔ سولہ سترہ سال کی لڑکی بے پناہ حسین تھی اور یہی چیز اس کے لیے مصیبت بن گئی۔ اسفند نوریہ مے نوشی کرتے ہوئے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ لڑکی خوف زدہ تھی اور جب اسفند اٹھ کر اس کی طرف بڑھا تو وہ اور بھی خوف زدہ ہو گئی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس کے پاس آتا، باہر سے کسی نے اسفند کو پکارا۔

”کیا ہے؟“ اسفند جھنجلا کر بولا۔

”سامان آ گیا ہے؟“ باہر موجود فرد نے کہا۔

اسفند نے لڑکی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کچھ دیر انتظار کر... میں ابھی آتا ہوں۔“

اسفند باہر آیا تو قلعے کے احاطے میں ٹرک کھڑا تھا۔ اس کے آدمی حریت پسندوں کے حلیے میں کارروائی کرتے تھے اور لوٹ مار اور قتل و غارت گری کر کے آ جاتے تھے۔ جس سڑک سے ٹرک لوٹا گیا تھا، وہ اس کے قلعے کے پاس تھی اور یہاں سے گزرنے والی کوئی گاڑی محفوظ نہیں تھی۔ اس کے آدمی ٹرک میں رکھا سامان کھول کر دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہی انہوں نے ایک پیٹی کھولی، پورا ٹرک ایک دھماکے سے اڑ گیا اور احاطے میں موجود کوئی فرد زندہ نہیں بچا۔ اسفند قلعے کی بالکونی سے دیکھ رہا تھا اس لیے وہ بچ گیا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے دہاڑ کر کہا۔

اسی لمحے قلعے کے اوپر موجود ڈرون طیاروں نے میزائل فائر کیے جو لہراتے ہوئے قلعے کے اندر گھس گئے۔ اسفند نے ایک روشنی کی لہر آتے دیکھی اور دوسرے ہی لمحے اس کا وجود متعدد حصوں میں بٹ گیا۔ چار میزائلوں نے چند لمحوں میں عمارت کا بڑا حصہ کھنڈر میں بدل دیا۔ اندر کمرے میں موجود لڑکی دھماکوں کے نتیجے میں ایک طرف نمودار ہونے والے خلا سے باہر نکلی اور تاریکی میں غائب ہو گئی۔

کمانڈ سینٹر میں موجود کرنل نے تملے میں عجلت کی تھی۔ اس کا ایک آپریٹر جاسوس طیارے سے حاصل کی ہوئی قلعہ نما عمارت کی تصویر کو ڈیٹا سے میچ کر رہا تھا۔ کمپیوٹر نے میچنگ مکمل کی تو نتیجہ سامنے آ گیا۔ آپریٹر نے پکار کر کہا۔ ”سر! ہم سے غلطی ہوئی ہے یہ عمارت تو ہمارے آدمی اسفند نوریہ کی ہے۔“

”میرے خدا!“ کرنل کے منہ سے نکلا لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ فرینڈلی فائرنگ کی اصطلاح امریکیوں نے ایسے ہی موقع کے لیے ایجاد کی تھی لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اس فائرنگ کا شکار ہمیشہ امریکا کے دوست ہی ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی امریکی فرینڈلی فائرنگ کا شکار نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

اکبر خان ہوٹل میں ناشتا کر رہا تھا اور سامنے ٹی وی پر ایک انگلش مووی چینل آ رہا تھا۔ یہ جنگ و جدل سے بھرپور فلم

تھی اس لیے اکبر خان بھی شوق سے دیکھ رہا تھا ورنہ اس کی زبان تو اچھے خاصے پڑھے لکھوں کی بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اچانک ایک کردار نے کہا۔ ”ڈیم اٹ۔“

اکبر خان چونک گیا۔ اسے لگا جیسے اس نے یہ جملہ پہلے بھی کہیں سن رکھا ہے۔ لیکن اسے فوری طور پر یاد نہیں آیا۔ وہ ناشتا مکمل کر کے پانی پی رہا تھا کہ اسے یاد آ گیا۔ اس روز اس شخص نے یہ جملہ بالکل اسی انداز میں کہا تھا جو بظاہر مکمل قبائلی بنا ہوا تھا۔ تو کیا وہ امریکی تھا؟ اس نے بالکل اسی انداز میں یہ الفاظ کہے تھے۔ اکبر خان کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سر جھٹکا۔ اس کی بلا سے وہ امریکی ہوں یا کچھ اور... اسے تو کام کا معاوضہ مل رہا تھا، اسے اور کیا چاہیے تھا؟ گھر آ کر اس نے بدر سے رابطہ کیا۔

”اس عورت کے ٹھکانے کا پتا چلا جس کے پاس مینا ہے؟“

”ہاں، معلوم ہو گیا ہے۔“ بدر نے جواب دیا۔ ”تم میرے پاس آ جاؤ۔“

”میں ابھی آتا ہوں۔“ اکبر خان نے اپنا جوش دباتے ہوئے کہا۔

وہ بدر کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ بدر بھی ایک کچی آبادی میں رہتا تھا جو لینڈ مافیا نے سرکاری زمین پر قبضہ کر کے بنائی تھی۔ یہاں زیادہ تر جرائم پیشہ افراد بسے تھے۔ بدر اس کا منتظر تھا۔ اکبر خان نے بے تابی سے مینا کے بارے میں پوچھا۔

”صبر یار!“ بدر نے اس سے کہا۔ ”وہ بھی آ جائے گی۔ لیکن اس کے بدلے تمہیں ہمارا کام کرنا ہوگا۔“

”بولو، مجھے کیا کرنا ہے؟“

بدر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”اس میں خطرہ ہے۔“

”کیسا خطرہ؟“ اکبر خان چونک گیا۔

”ایک جگہ حملہ کرنا ہے۔“

اکبر خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔“

”آدمی کسی قسم کا بھی نہیں ہوتا۔“ بدر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”پر وہ کسی کام کا ارادہ کر لے تو اسے کر سکتا ہے۔“

”میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔“ اکبر خان نے پھر انکار کیا۔

”لیکن تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔ ہم نے تمہیں اتنا معاوضہ صرف مکانات تلاش کرنے کے لیے نہیں دیا تھا۔ یہ کام تو کوئی معمولی سا پراپرٹی والا بھی کر سکتا تھا۔“

اکبر خان کے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی۔ بدر کا لہجہ کہہ رہا تھا کہ وہ پوری طرح سنجیدہ ہے۔ اس نے ہڑبڑا کر کہا۔ ”یار! مجھ سے اس کا بات نہیں ہوا تھا۔“

”تو اب کرتا ہے۔“ بدر کا لہجہ مزید سرد ہو گیا۔ ”تم کو ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔“

”میں تم سے مدد نہیں لے رہا۔“ اکبر خان جلدی سے بولا۔

”جب تم نے مدد کا کہا تھا، تب یہ بات طے ہو گیا تھا کہ تم ہمارا مدد کرے گا اور ہم تمہارا مدد کرے گا۔ ہم نے اپنا کام تقریباً کر دیا ہے۔ تمہارا ابجی کل یہاں ہوگا اور تم کو ہمارا مدد کرنا ہے۔“

اچھے خاصے سرد موسم میں بھی اکبر خان پسینے میں بھیگ گیا۔ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ ”اگر ہم انکار کرے تو؟“

”اکبر خان! ہمیں معلوم ہے کہ تم نے اپنی بیوی شاز مین اور اس کے بچے کو مار کر کہاں دفن کیا ہے اور جب پولیس تمہیں گرفتار کرے گی تو تم ناظر خان کے قتل کی کہانی خود سنا دو گے۔“

اکبر خان کو لگا جیسے اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے... مجھے منظور ہے... لیکن تمہیں یہ سب کیسے...“

”ہم جس سے کام لیتے ہیں، اس کے بارے میں سب جانتے ہیں۔ اب بولو، کیا کہتے ہو؟“

اکبر خان جانتا تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکتا۔ بدر اسے بھڑکتی آگ میں چھلانگ لگانے کو کہتا، تب بھی وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ایک آخری کوشش کی۔ ”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے لیکن پہلے مینا کو میرے حوالے کرو۔“

”یہ کون سا مشکل کام ہے؟ وہ کل ہی آ جائے گی۔“ بدر مسکرایا۔

☆☆☆

مینا بھرپور ریہرسل کر رہی تھی۔ شیبا اسے اس طرح تیار کر رہی تھی جیسے اس نے کسی عالمی فیشن شو میں شریک ہونا ہے۔ وہ دن بھر میں سات سے دس گھنٹے تیاری کرتی تھی۔ اسے جسمانی طور پر مزید موزوں بنانے کے لیے شیبا اسے ایکسر سائز بھی کراتی تھی۔ وہ مختلف طرح کے لباس پہن کر مختلف انداز میں چلنے کی مشق کرتی تھی اور اس نے بہت تیزی سے ان تمام طریقوں پر عبور حاصل کر لیا تھا جو ایک ماڈل کا خاصہ ہوتے ہیں۔ یہ سب کرتے ہوئے مینا کے اندر ایک کھٹکا سا رہتا کہ ابھی کہیں سے خطرہ نکل کر سامنے آ جائے گا اور خطرہ ظاہر ہے اکبر خان تھا۔ مینا کو اپنے پہلے فیشن شو میں کل

چار لباس پہن کر واک کرنا تھی۔ اسے ہجوم سے روشناس کرانے کے لیے شیبا نے اسے سب کے سامنے واک کرائی تھی اور مینا اب پُرامید تھی کہ وہ جھجکے بغیر یہ کام کر لے گی۔

ایک بڑے سانحے کے بعد شہر کی فضا بڑی مشکل سے معمول کی طرف آ رہی تھی۔ ایک معروف کاروباری علاقے میں لگنے والی آگ نے لاکھوں نہیں تو ہزاروں خاندانوں کو معاشی لحاظ سے تباہ کر دیا تھا جنھوں نے بیس تیس برس میں جا کر اپنا کاروبار جمایا تھا۔ وہ چشم زدن میں فٹ پاتھ پر آ گئے تھے۔ ایسے بھی تھے جو دوسروں کو کھلاتے تھے اور اب خود کھانے کے لیے بھی محتاج ہو گئے تھے۔ جو ایک ہاتھ سے ہزاروں لاکھوں خیرات کرتے تھے اور دوسرے ہاتھ کو پتا نہیں چلتا تھا، اب ان کو اپنے لیے ہاتھ پھیلانا پڑ رہے تھے۔ ایسے بھی تھے جو کروڑوں کا منافع کماتے تھے اور ان کا انکم ٹیکس ریٹرن بھی فائل نہیں ہوا۔ اب وہ کس منہ سے اپنے نقصان کی بات کرتے؟

شیبا نے سوچا تھا کہ اینگزی بیشن ذرا آگے کر دے لیکن سب طے ہو چکا تھا۔ اس موقع پر اینگزی بیشن منسوخ ہوتی تو اسے اسپانسر شپ سمیت سارے معاملات پھر سے طے کرنا پڑتے۔ جو فرم اسپانسر کر رہی تھی۔ اس کا ایم ڈی طاہر گردیزی شیبا کا پرانا واقف کار تھا۔ کسی زمانے میں ان میں بہت قریبی تعلقات تھے لیکن پھر دونوں کا دل بھر گیا تو انھوں نے اپنی اپنی راہ لی تھی۔ البتہ معمول کے تعلقات برقرار تھے۔ جب شیبا نے طاہر کو مینا کی تصویریں دکھائیں تو وہ دلچسپی کا ہو گیا۔ اس نے شیبا سے کہا۔

”کیا ہیرا تلاش کیا ہے تم نے؟“

”ہمارا کام ہی ہیرے تلاش کر کے انھیں تراشنا ہے۔“ شیبا مسکرائی۔ ”میں اسے نیو انٹری دوں گی۔ تم دیکھنا یہ دھماکا کر دے گی۔ گاڈ گفٹ ماڈل ہے۔“

”دوسری لائن پر کب لاؤ گی؟“ طاہر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”اس طرف بھی جلد آ جائے گی۔“ شیبا مسکرائی۔ ”لیکن ابھی خام ہے اس لیے میں صرف ایک طرف لگا رہی ہوں۔ اسے شہرت اور کامیابی کا مزہ چکھنے دو پھر خود بھاگے گی۔“

”نیچے سے آئی ہے؟“

”ہاں، نچلے طبقے کی ہے۔ باپ کوئی مولوی ٹائپ کی چیز ہے، اس سے بہت ڈرتی ہے۔ اگر اس کے ہاتھ آ گئی تو وہ اسے قتل کر دے گا۔“

طاہر چونکا۔ ”یہ وہی لڑکی تو نہیں ہے جس پر اس کے باپ نے تشدد کیا تھا؟“

”تم نے ٹھیک پہچانا۔“

”اس کا باپ تو خان ہے۔“

شیبا مسکرائی۔ ”تو کیا خان فیملیز سے لڑکیاں اس شعبے میں نہیں آتیں؟ آج کل سب چل رہا ہے۔“

”دیکھ لو... کہیں یہ معاملہ گلے نہ پڑ جائے۔ جو اس شعبے میں آتی ہیں، ان کا بیک گراؤنڈ بیک ورڈ نہیں ہوتا ہے۔“

”تم فکر مت کرو۔ اس کا باپ کچھ نہیں کرے گا۔“

”اگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ یہ پہلے میرے پاس آئے گی تو میں اس اینگزی بیشن کو اسپانسر کرنے کو تیار ہوں۔“

شیبا ہنسی۔ ”شرط مت لگاؤ۔ یہ اسپانسر شپ میری نہیں تمہاری ضرورت ہے۔“

”اوکے! میں شرط واپس لیتا ہوں۔“ طاہر نے جلدی سے کہا۔ ”پرانی دوستی کے ناتے؟“

شیبا نے سر ہلایا۔ ”ہاں، اب سوچوں گی لیکن یاد رکھنا کیش میں کوئی کمپرومائز نہیں ہوگا۔“

”وہ تو ظاہر... کی بات ہے۔ میں تو یہ چاہ رہا تھا کہ اس ہیرے کی چمک سب سے پہلے میرے بیڈ روم کو روشن کرے۔“

”تمھارا ... دن ہے۔ وہ پہلے تمہارے پاس ہی آئے گی۔“

”تھینک یو۔“ طاہر گردیزی نے خوش ہو کر کہا اور پھر وہ اسپانسر شپ کے معاملات طے کرنے لگے۔ شیبا نے اینگزی بیشن کا نام اسپرنگ ورائٹی رکھا تھا۔ اس نے مینا کے نام کی پبلسٹی شروع کر دی۔ مختلف میگزینز اور اخبارات میں اس کی تصویریں چھپنا شروع ہو گئیں اور ایک ٹی وی پروگرام میں اس کے کچھ کلپس بھی دکھائے گئے۔

اینگزی بیشن سے دو دن پہلے شیبا، مینا کے ساتھ بوتیک سے واپس آ رہی تھی۔ تمام ملبوسات فائنل ہو گئے تھے اور مینا نے فل ڈریس ریہرسل بھی کر لی تھی۔ شیبا نے اس سے کہا۔ ”اب تم دو دن مکمل آرام کرو تا کہ اینگزی بیشن والے دن تر و تازہ نظر آؤ۔“

خود مینا بھی دل بھر کر آرام کرنے کے لیے ترس گئی تھی۔ ان دنوں وہ صبح سات بجے اٹھ جاتی تھی اور پھر اسے رات گیارہ بجے سے پہلے آرام نصیب نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت بھی رات کے بارہ بج رہے تھے اور اس کا تھکن سے برا حال تھا۔ اس لیے دو دن کے آرام کا سن کر وہ خوش ہو گئی۔ شیبا

www.pkdigest.com

بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ سالے پولیس والے بہت... ہوتے ہیں۔" اس نے پولیس والوں کو ایک ناقابلِ اشاعت گالی دی۔ "انہی لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تجھے ماروں پیٹوں، پریشان کروں اور رات بھر سونے نہ دوں۔ وہ شکایت کرے گا تو اتنا ہم اس کو ماریں گے۔ ان کی..." اس نے ایک اور گالی دی۔

رات کو انسپکٹر مراد خان آیا اور مجھے بتایا کہ یہ لوگ مجھے کسی لمبے چکر میں پھنسانے کی فکر میں ہیں۔ اس لیے ابھی تک میرا پاسپورٹ انہوں نے میڈیا کو نہیں دکھایا تھا۔ اس نے کہا۔ "بھائی نے کہا ہے کہ کسی بھی قسم کی کوئی تکلیف ہو تو بتا دیں۔ میرے علاوہ بھی ان کے کچھ بڑے افسر یہاں موجود ہیں۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "یہ رگھو یہاں کب آیا؟ اس نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا؟ یہ تو پولیس والوں کا خاص آدمی ہے۔ اسے کسی بڑے سیاست داں کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔"

"میں نے اس کے کس بل نکال دیے ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میری طرف سے بھائی کا شکریہ ادا کرنا اور کہنا کہ وہ اس لڑکی کا خیال رکھیں جس نے انہیں فون پر میرے بارے میں اطلاع دی تھی۔"

"وہ لڑکی اس وقت بھائی کے ایک فلیٹ پر ہے۔ بھائی جانتے ہیں کہ وہ ہماری بھابی ہے۔" مراد خان مسکرایا۔ "کل کی میٹنگ میں یہ لوگ آپ کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ اب میں کل آؤں گا۔ ہاں، اگر پیسوں کی ضرورت ہے تو بتا دیں۔"

"نہیں، میرے پاس تو ابھی وہی پیسے ختم نہیں ہوئے۔"

☆☆☆

پھر کئی دن یونہی گزر گئے۔ میں اس دوران میں پابندی سے اخبار پڑھ رہا تھا۔ ممبئی حملے میں پولیس نے کسی اجمل قصاب نامی شخص کو گرفتار کر لیا تھا۔ اب وہ اس کے بارے میں تحقیقات کر رہے تھے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ لوگ مجھے بھی کسی بڑے کیس میں ملوث کرنے والے ہیں۔ ان کی خاموشی سے تو مجھے یہی اندازہ ہو رہا تھا۔

اس دن مراد خان آیا تو بہت پریشان تھا۔ اس نے بتایا۔ "آپ کے کوئی دوست تیمور پاکستان سے آئے ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بھائی نے بہت مشکل سے انہیں روکا ہے۔ اگر انہوں نے آپ سے ملاقات کر لی تو پولیس انہیں بھی آپ کے ساتھ ملوث کر لے گی۔ آپ ان کے نام ایک خط لکھ دیں کہ کچھ دن صبر کر لیں۔ بھائی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے آنے سے بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"تم مجھے ٹیلی فون کرا سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ٹیلی فون!" وہ چند لمحے تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "ہاں، میں کل کسی وقت موبائل فون لے آؤں گا ورنہ میرا خیال ہے کہ موبائل تو اس رگھو کے پاس بھی ہوگا۔"

"ہاں، میں اس سے پتا کروں گا۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے رگھو سے پوچھا۔ "یار رگھو! یہاں تمہارا اتنا اثر رسوخ ہے۔ پولیس والے تمہارے پاؤں دباتے ہیں۔ تم میرا چھوٹا سا ایک کام کرا دو۔"

"مجھے طعنے مت دو کامران بابو!" رگھو نے برا مان کر کہا۔ "کام بولو... اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور کراؤں گا۔"

"مجھے ایک سیل فون چاہیے۔" میں نے کہا۔ "میرا مطلب ہے موبائل فون۔"

رگھو ہنسنے لگا اور بولا۔ "بس اتنا سا کام... یہ تو حوالات ہے کامران بابو! میں نے تو دلی کی تہاڑ جیل میں موبائل رکھا ہوا تھا۔ میں آج ہی تمہیں موبائل فون منگوا دیتا ہوں بلکہ یہ کام ابھی کر دیتا ہوں۔" اس نے کہا اور سلاخوں کے پاس جا کر بولا۔ "ہری رام!"

فوراً ہی ایک مدقوق سا سپاہی وہاں آ گیا۔

"ابھی جا اور موبائل فون لے کر آ۔" اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے۔

"پیسے میرے پاس ہیں رگھو بھائی!" میں نے کہا۔

"ضرور ہوں گے۔" رگھو نے کہا۔ "انہیں سنبھال کر رکھو... کہیں اور کام آ جائیں گے۔"

رگھو نے ہری رام کو کئی نوٹ دیے اور بولا۔ "موبائل اچھی کوالٹی کا ہو، ڈبا پیک ہو اور ساتھ ہی ایک سم بھی لانا۔ باقی پیسے تو رکھ لینا... جا جلدی سے لے کر آ جا۔"

ہری رام فوراً ہی وہاں سے چلا گیا۔

ایک گھنٹے بعد میرے پاس بہترین قسم کا سیل فون موجود تھا۔ میں نے اسے سائلنٹ پر لگا دیا۔

شام کو مراد خان آیا تو میں نے اس سے کہا۔ "میں نے موبائل فون تو منگوا لیا ہے لیکن میرے پاس کسی کا نمبر نہیں ہے۔ تم مجھے آر کے، جینی اور تیمور کا نمبر لا دو۔"

"ان کے نمبر میں پہلے ہی لے آیا ہوں۔" مراد خان نے کہا۔ "میں تو موبائل بھی لایا تھا لیکن آپ نے تو مجھ سے بھی پہلے موبائل کا بندوبست کر لیا۔" اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا جس پر ان لوگوں کے سیل نمبر لکھے تھے۔

میں نے وہ نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کیے اور اس پرچے کی گولی بنا کر چبا لی۔

پھر میں نے سب سے پہلے تیمور کو کال کی۔ بیل بجنے لگی۔ تیمور نے کال ریسیو کر لی۔ وہ بھی نمبر دیکھ کر حیران ہوا ہوگا کہ انڈیا کے نمبر سے مجھے کون کال کر رہا ہے؟

"ہیلو!" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تیمور! میں..."

"تو کیسا ہے کامی!" تیمور نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ "ٹھیک تو ہے؟ ان لوگوں نے تجھ پر زیادہ تشدد تو نہیں کیا؟"

"ابھی تک تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہاں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ بھول کر بھی ایسی غلطی مت کرنا ورنہ تو بھی ان کی نظروں میں آ جائے گا۔ تیرا باہر رہنا بہت ضروری ہے تیمور! تو باہر رہ کر میری بھی مدد کر سکتا ہے اور جینی کو بھی تسلی دے سکتا ہے۔ پھر میرے بعد تو ہی تو امی اور پاپا کا سہارا بنے گا۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کر۔"

"تجھے کچھ نہیں ہوگا کامی!" تیمور نے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور اگر خدانخواستہ تجھے کچھ ہوا تو میں ان لوگوں کو بتا دوں گا کہ دہشت گردی کیا ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے ابھی صرف دہشت گردی کا نام سنا ہے، دیکھی نہیں ہے۔ میں ان کے ایک ایک لیڈر کو چن چن کر گولی ماروں گا۔ ان کے دفتر اور بلڈنگز اڑا دوں گا۔"

"اتنا جذباتی مت ہو تیمور!" میں نے ہنس کر کہا۔ "مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ بس تو جینی کا خیال رکھنا اور کبھی کبھار خالہ نسیمہ کے گھر چکر لگا لینا۔ وہ لوگ بھی بہت پریشان ہوں گے۔ خاص طور پر نوشین کو تسلی کی ضرورت ہے۔ بس اب میں ٹیلی فون بند کر رہا ہوں کیونکہ ایک پولیس انسپکٹر ادھر آ رہا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے جان بوجھ کر اس سے جھوٹ بولا تھا ورنہ وہ مجھ سے اسی طرح کی جذباتی باتیں کرتا رہتا۔

پھر میں نے جینی کا نمبر ملایا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ "ہیلو!" اس کی مترنم آواز سنائی دی۔

"کیسی ہو جینیفر؟" میں نے کہا۔ میں اکثر اسے چھیڑنے کے لیے اس کا پورا نام لیتا تھا۔

"کامی تم! تم کیسے ہو اور کہاں سے بول رہے ہو؟ کیا ان لوگوں کی قید سے فرار ہو گئے ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں... ابھی تک انہی کی قید میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

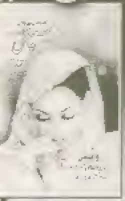

ماہِ اپریل کی ایک دلکش جھلک

دو کوڑی کی عورت
عورت کبھی محبت کی معراج تو کبھی نفرت کی انتہا...
انوار صدیقی کے قلم سے آخری صفحات کی زینت

اشوک موریا
چندر گپت کا تسلسل نگر... نئے چہرے نئے انداز... مہاتما گوتم بدھ سے متعلق مختلف انکشافات... آگہی کے در وا کرتے ابتدائی صفحات پر نواب صاحب کا سحر انگیز انداز

حضرت یعقوبؑ
اللہ کے برگزیدہ پیغمبر کبھی کسی آزمائش سے نہیں گھبرائے...
گیارہ ستاروں اور ایک چاند سے متعلق عبرت اثر واقعات۔
حضرت یعقوبؑ کے صبر و استقامت کی داستان۔

واپسی
سنسنی خیز حالات و واقعات سے مرصع ایک اور ہوش ربا طویل داستان... محی الدین نواب کے قلم کا جادو اور چونکا دینے والا نیا روپ

کتّے کی دُم
جو بارہ برس بعد بھی سیدھی نہ ہو سکی...
ملک صفدر حیات کی کوششوں کا احوال

اور کے علاوہ: انا ڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

مزید: کاشف زبیر... مریم کے خان...
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی، منظر امام، سلیم انور کی دلچسپ تحریریں

بھی انگیزی بیشن کے خیال میں گم تھی۔ اسے اندازہ نہیں ہوا کہ ایک لینڈ کروزر گاڑی ان کے پیچھے آرہی ہے۔ جیسے ہی وہ اپنی گلی میں داخل ہونے لگی، یہ گاڑی تیزی سے اس کی کار کے سامنے آکر رکی۔ شیبا نے بہ مشکل اپنی کار کو تصادم سے بچایا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی، لینڈ کروزر سے دو تنومند افراد اترے اور انہوں نے شیبا اور مینا کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ ان میں سے ایک بولا۔

"شور مت کرنا... نیچے اتر آؤ۔"

شیبا اور مینا لرزتے بدن کے ساتھ نیچے اتر آئیں۔ دوسرے آدمی نے مینا کا بازو پکڑا اور اسے لینڈ کروزر کی طرف لے جانے لگا۔ مینا کو لگ رہا تھا کہ وہ ابھی بے ہوش ہو جائے گی۔ اس کے اندر موجود خطرے کا موہوم سا احساس اچانک ہی حقیقت بن کر سامنے آگیا تھا۔ اسے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ لوگ اس کے باپ کے بھیجے ہوئے تھے۔ اور خوف نے اسے شل کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بنا کسی مزاحمت کے لینڈ کروزر میں پہنچا دی گئی۔ اس دوران میں پہلا والا بدستور شیبا پر گن تانے کھڑا رہا۔ جیسے ہی مینا والی طرف کا دروازہ بند ہوا، اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"ہمارا پیچھا مت کرنا ورنہ ماری جاؤ گی۔"

شیبا میں پیچھا کرنے کی تو کیا ہلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ اس کے سامنے لینڈ کروزر گھوم کر واپس چلی گئی اور وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکی۔ پھر اسے ہوش آیا تو وہ جلدی سے کار میں بیٹھی اور پولیس اسٹیشن کا رخ کیا۔ اسے پولیس میں رپورٹ کرنا تھی۔ اس کی کال کے جواب میں مقامی ڈی ایس پی خود چلا آیا۔ شیبا نے مینا کے اغوا کی رپورٹ لکھوائی۔ ڈی ایس پی نے اسے یقین دلایا کہ پولیس لڑکی کو بازیاب کرانے کی پوری کوشش کرے گی۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ یہ اس کے باپ کا کام ہے۔" شیبا نے کہا۔ "اگر پولیس نے دیر کی تو وہ جنونی اسے قتل بھی کر سکتا ہے۔"

"پولیس پوری کوشش کرے گی۔" ڈی ایس پی نے پھر روایتی جملہ کہا۔ "ویسے اکبر خان تو خود مفرور ہے۔"

"مفرور ہے یا پولیس نے اسے اب تک گرفتار کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے؟" شیبا تلخی سے بولی۔ اسے ڈی ایس پی کے انداز میں کوئی عجلت نظر نہیں آرہی تھی اور وہ یوں سکون سے بیٹھا تھا جیسے ایک لڑکی نہیں کوئی بکری اٹھالی گئی ہو۔ اس نے نہ تو لینڈ کروزر کی تلاش کے بارے میں کوئی حکم دیا تھا اور نہ ہی شیبا سے اغوا کاروں کے بارے میں زیادہ سوالات کیے تھے۔ اس کا رویہ سراسر خانہ پُری والا تھا۔ اس کے جانے کے بعد شیبا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ یہ بات سامنے آتی تو اس کی انگیزی بیشن پر کتنا برا اثر پڑتا اور یہ اثر پڑنا ہی تھا۔ اسے مینا کے حصے کے ملبوسات کے لیے اب کسی اور ماڈل کو تیار کرنا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اب مینا اسے واپس نہیں ملے گی۔ شاید کسی کو بھی نہ ملے اور کوئی نامعلوم قبر اس کا مدفن بن جائے۔

☆☆☆

مینا کا خوف سے برا حال تھا کیونکہ اسے ساتھ لے جانے والے راستے میں ہی اس کے ساتھ برا سلوک کر رہے تھے۔ وہ اسے جسمانی طور پر ہراساں کرتے رہے اور ساتھ ہی بہت فحش زبان استعمال کر رہے تھے۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ شاید یہ کوئی اور ہیں، انہیں اس کے باپ نے نہیں بھیجا ہے۔ ایک جگہ پہنچ کر انہوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور اسے جیپ کے فرش پر سر جھکا کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اسے کہاں لے جا رہے تھے۔ خاصی دیر بعد جیپ رکی اور انہوں نے اسے اتار لیا۔ اسے بازو سے پکڑ کر کہیں لے گئے اور پھر اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ وہ ایک کمرے میں کھڑی تھی اور سامنے تخت پر ایک تنومند شخص بیٹھا ہوا گہری نظروں سے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کی نظریں محسوس کر کے مینا خود میں سمٹ گئی۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟" اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ "میرا کیا قصور ہے؟"

"تجھے جلد پتا چل جائے گا۔" وہ شخص بدر تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "اسے لے جا کر بند کر دو اور اس کی کڑی نگرانی کرنا۔"

ایک آدمی نے مینا کو لے جا کر ایک چھوٹے سے تاریک کمرے میں بند کر دیا۔ مینا کو اب بھی شبہ تھا کہ یہ کام اس کے باپ کا نہیں ہے ورنہ وہ اسے یہاں ملتا۔ نہ جانے یہ کون لوگ تھے اور اسے یہاں کیوں لائے تھے۔؟

☆☆☆

اکبر خان ایک کار میں تھا۔ اس کے ساتھ ان میں سے دو افراد تھے جن کے لیے اس نے مکان کا بندوبست کیا تھا۔ وہ ایک عمارت کے سامنے موجود تھے۔ سڑک کے دوسری طرف سے ایک شخص نے عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا نام فواد تھا۔ "یہ ہمارا نشانہ ہے۔"

اکبر خان نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، مجھے کیا کرنا ہے؟"

"تمہیں ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔" دوسرا بولا۔ اکبر خان اسے جاموود خان کے نام سے جانتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ ان کے یہ نام نقلی ہیں۔

"اس جگہ حملہ کیوں کرنا ہے؟"

"تم سوال نہیں کر سکتے۔" جاموود خان نے اسے گھورا۔ "ہم نے تمہارا کام کر دیا ہے، اب تمہیں ہمارا کام کرنا ہے۔"

"میرا کام کر دیا ہے؟" اکبر خان چونکا۔

"ہاں، تمہاری بیٹی بدر کے ڈیرے پر موجود ہے۔ ابھی تمہیں وہاں لے جائیں گے۔"

"تو پھر جلدی چلو۔"

"اتنی جلدی بھی نہیں... پہلے ہماری بات سن لو اور اسے یاد کر لو۔ تمہیں کل شام چار بجے اس عمارت کے سامنے آنا ہے۔ تم پیدل آؤ گے اور سامنے والے حصے سے اندر جانے کی کوشش کرو گے۔ تمہارا کام ایک بیگ اندر پہنچانا ہوگا۔"

"کیسا بیگ؟" اکبر خان نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"وہ تمہیں کل ملے گا۔"

"اس بیگ میں کیا ہوگا؟"

"کچھ اسلحہ جسے عمارت کے اندر پہنچانا ہوگا۔ اس کے بعد ہم حملہ کر کے یہاں موجود ہر فرد کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔" جاموود خان کا لہجہ سفاک ہو گیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے امریکی لہجے میں "گاڈ ڈیم اٹ" کہا تھا اور اکبر خان کو اس پر شک تھا۔ اب اسے لگ رہا تھا کہ یہ اسے بھی مروانے کی تیاری کر رہے تھے لیکن وہ مجبور تھا، بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ گزشتہ چھتیس گھنٹے سے وہ ان کے قبضے میں تھا۔ انہوں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا لیکن ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ ان کا قیدی بن گیا ہے۔

اسے سارا پلان سمجھا کر وہ واپس آگئے۔ ڈیرے پر بدر اس کا منتظر تھا۔ اس نے اکبر خان سے کہا۔ "میں نے تمہارا بیٹی کو اٹھوا لیا ہے، اب وہ ادھر ڈیرے پر ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"ادھر ہی ہے لیکن ابھی تم اس کو مار نہیں سکتا۔ پہلے تم ہمارا کام کرے گا اس کے بعد ہی ہم اسے تمہارے حوالے کرے گا۔"

اس وقت بدر کے ڈیرے پر وہ چھ افراد بھی آگئے جن کو اکبر خان نے مکان لے کر دیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی جنگ کی تیاری کر رہے ہوں۔ وہ جدید اسلحے سے لیس تھے اور ان کی صفائی کر رہے تھے۔ اکبر خان نے بدر سے کہا۔

"ٹھیک ہے، ابھی ہم اسے کچھ نہیں کہے گا لیکن ہم اس سے مل تو سکتا ہے؟"

بدر نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، پر یاد رکھنا کہ اسے ہاتھ مت لگانا۔ ابھی تمہارا اس پر حق نہیں ہے۔"

"میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔" اکبر خان نے اقرار کیا۔

بدر اسے اس کوٹھری تک لایا جس میں مینا بند تھی۔ اسے یہاں آئے ہوئے سولہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ اکبر خان کی عجیب سی کیفیت تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سامنا ہوتے ہی مینا کو قتل کر دے مگر بدر کی جانب سے اس کی اجازت نہیں تھی۔

بدر نے دروازہ کھولا اور اس سے بولا۔

"ہم بار بار نہیں کہے گا، ہمارا بات کا خیال رکھنا۔"

اکبر خان سر ہلا کر اندر داخل ہوا۔ مینا ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے اور سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی تھی۔ اس کے پاس پانی کی ایک بوتل اور ایک خالی پلیٹ تھی جس میں اسے کھانے کو کچھ دیا گیا تھا۔ آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا اور یوں اکبر خان کی طرف دیکھا جیسے اسے یقین نہیں آرہا ہو۔

"بابا! یہ تم ہو؟"

"مجھے بابا مت کہہ۔" اکبر خان نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ شاید اس کا دل چاہ رہا تھا کہ مینا کی گردن مروڑ دے۔ "تو میرے لیے مر چکی ہے۔"

مینا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے یقین تھا کہ تم مجھے معاف نہیں کرو گے۔ مجھے تلاش کر لو گے۔"

اکبر خان فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ "دیکھا، میں نے تجھے تلاش کر لیا نا؟"

مینا نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں بابا! مجھے تم نے نہیں... ان لوگوں نے تلاش کیا ہے۔"

اکبر خان چونکا۔ "تو... تو یہ کیسے کہہ سکتی ہے؟"

"یہ بتاؤ کہ تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟"

"تو نے گھر سے نکل کر میری عزت کو داغ لگایا ہے۔"

"کیا ایسا ہی ہے بابا؟" مینا کے لہجے میں طنز آگیا۔ "اگر تجھے میری عزت کا خیال ہوتا تو ان لوگوں کو مجھے واپس لانے کو کہتا؟"

اکبر خان نے اسے غور سے دیکھا۔ "تو کہنا کیا چاہتی ہے؟"

مینا اس کے پاس آئی اور سرگوشی میں بولی۔ "بابا! یہ مجھے اپنے لیے لائے ہیں، تیرے لیے نہیں۔"

www.pkdigest.com

اکبر خان بھڑکا۔ "ایسا کیسے... ہو سکتا ہے؟"

مینا اسے دیکھتی رہی۔ "بابا! یہ تو میں نہیں جانتی... لیکن یہاں لاتے ہوئے انہوں نے میرے ساتھ جو کیا ہے اور جس طرح کی باتیں کی ہیں، مجھے یقین ہے کہ یہ مجھے اپنے لیے لائے ہیں۔"

"میرا ان سے معاہدہ ہے۔ جب میں ان کا کام کر دوں گا تو یہ تجھے میرے حوالے کر دیں گے۔"

"یہ کبھی مجھے تیرے حوالے نہیں کریں گے۔" مینا بولی۔ "بابا! بعد میں شاید تجھے موقع بھی نہیں ملے گا۔ مجھے ابھی مار دے۔"

اکبر خان کا ارادہ تو یہی تھا لیکن جب مینا نے اس سے کہا تو وہ بدک گیا۔ "کیا کہہ رہی ہے؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" مینا نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "بابا! مجھے ماں کی قسم ہے... میں پاک صاف ہوں۔ میں بے عزت ہو کر نہیں مرنا چاہتی۔ اب عزت سے مرنے کا ایک ہی راستہ ہے۔"

"بکواس مت کر... تو نے جیسی تصویریں بنوائی تھیں، وہ کیا تھیں؟" اکبر خان بھڑک گیا۔

"بابا! وہ میری مجبوری تھی۔ جو عورت مجھے اپنے ساتھ لے گئی تھی، اس کے ساتھ رہنے کی شرط یہی تھی۔ میں انکار کرتی تو وہ مجھے باہر نکال دیتی اور میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔"

"اب تو مرنا چاہتی ہے؟" اکبر خان کے لہجے میں طنز آ گیا۔

"ہاں بابا! کل سے اب تک میں نے ان لوگوں کی آنکھوں میں اپنے لیے جو شیطان دیکھا ہے، اس کے بعد میں مر جانا چاہتی ہوں۔ یہ دیکھو، میں نے دوپٹے سے گلا گھونٹنے کی کوشش کی تھی۔" مینا نے اسے اپنا گلا دکھایا۔ "لیکن پھر میری ہمت نہ ہوئی۔"

اکبر خان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے غرا کر کہا۔ "اگر ایسا ہے تو ہم ان کو نہیں چھوڑے گا۔"

"بابا! یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔" مینا نے دروازے کی طرف دیکھا۔ "جانے تم انہیں مار پاؤ یا یہ تمہیں مار دیں۔ اس لیے پہلے تم مجھے مار دو۔"

اکبر خان نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ابھی چند منٹ پہلے تک وہ اسے مار ڈالنے کے لیے بے چین تھا۔ اس کے اندر جوش رہ رہ کر اسے اکسا رہا تھا لیکن اب اس کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ مینا کی بات نے اس کے جذبات کا رخ بدل دیا تھا۔ اب وہ ان لوگوں کے خلاف دل میں ابل رہا تھا جو اس کی عزت کی طرف میلی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے سامنے ہی اسے بے عزت کر رہے تھے۔ اس نے زیر لب کہا۔

"ہم ان لوگوں کو چھوڑے گا نہیں۔ یہ خود کو کیا سمجھتا ہے؟ میرا نام بھی اکبر خان ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اچانک ہی مینا کو زور سے تھپڑ مارا اور گرجا۔ "تجھ سے میں بعد میں پوچھوں گا بے حیا۔"

مینا دنگ رہ گئی۔ اکبر خان کے چہرے کے جو تاثرات تھے، اس کے بعد اس کا اچانک تھپڑ مار دینا بالکل غیر متوقع تھا۔ "بابا..." اس نے کہنا چاہا۔

"مت کہہ مجھے بابا۔" اکبر خان نفرت سے بولا۔ "بس اتنا یاد رکھ تو میرے ہاتھ سے مرے گی۔"

جس وقت اکبر خان نے مینا کو تھپڑ مارا، اسی وقت دروازہ کھلا اور بدر نے اندر جھانکا۔ گویا وہ دروازے کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ شاید اسے خطرہ تھا کہ اکبر خان جوش میں مینا کو مار ہی نہ دے۔ اگرچہ وہ نہتا تھا لیکن اتنا طاقت ور تھا کہ مینا کا گلا دبا کر ایک منٹ میں اسے مار سکتا تھا جبکہ وہ مینا کو زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد واضح تھا اور انہوں نے اسے مینا سے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ان میں سے بعض کی رال اس بری طرح ٹپک رہی تھی کہ اگر بدر نے ان کو نہ روک رکھا ہوتا تو وہ مینا پر ٹوٹ پڑتے۔

"بس دوست! باہر آ جاؤ۔" بدر نے پکارا۔ "اسے بعد میں دیکھنا، یہ کہیں نہیں جا رہی۔"

اکبر خان باہر آیا اور مشتعل لہجے میں بولا۔ "اگر تم نے منع نہ کیا ہوتا تو اس وقت میں اسے مار چکا ہوتا۔"

"تم اسے بعد میں مار سکتے ہو۔"

"تم میرے محسن ہو، میں تمہاری بات ضرور مانوں گا۔" اکبر خان نے ممنونیت سے کہا۔

بدر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ابھی تو تمہیں ایک موقع اور ملے گا۔ تمہارا ایک دشمن باقی ہے۔ وہ عورت جس نے تمہاری عزت کو تماشا بنایا۔"

"شیبا...؟" اکبر خان بولا۔

"ہاں وہی شیبا... تم کو معلوم ہے ہم نے کل جس عمارت پر حملہ کرنا ہے، وہاں اس کے کپڑوں کی نمائش ہو رہی ہے۔" بدر کے لہجے میں نفرت آ گئی۔ "وہاں ایسے ننگے لباس پہن کر عورتیں سب کے سامنے خود کو دکھائیں گی۔ اگر ہم مینا کو نہیں لاتے تو یہ بھی ان میں شامل ہوتی۔ بے ہودہ کپڑے پہن کر اپنی نمائش کرتی۔"

بدر یوں بات کر رہا تھا جیسے اس کے دل میں عورت کی بہت عزت ہو۔ اگر وہ مینا سے بدر اور اس کے ساتھیوں کی سوچ نہ جان چکا ہوتا، تب بھی وہ ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ شراب اور عورت ان کی زندگی تھی۔ اکبر خان اس سے بات کرتا ہوا دوسرے کمرے میں آ گیا۔

"شیبا کے خلاف کیا کرنا ہے؟"

"کل اس کی نمائش کے وقت وہاں ہم حملہ کریں گے۔ پہلے تم ایک بیگ اندر پہنچاؤ گے۔ اس میں حملے میں استعمال ہونے والا اسلحہ ہو گا۔"

"حملہ کون کرے گا؟"

"اس کے لیے میرا آدمی پہلے ہی اندر ہو گا۔" بدر نے اس کے اور اپنے لیے گلاسوں میں شراب ڈالتے ہوئے کہا۔ "جیسے ہی تم اسلحہ اندر پہنچاؤ گے۔ وہ اسلحہ لے کر اندر موجود لوگوں کو اڑانا شروع کر دے گا۔ پولیس کے آنے سے پہلے وہاں سے نکلنا ہو گا۔"

"اگر پولیس نے گھیر لیا تو؟"

"تو تمہارے پاس اسلحہ کس لیے ہو گا؟" بدر سفاکی سے بولا۔ "راستہ روکنے والوں کو اڑا دینا۔"

اکبر خان سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان لوگوں کا مقصد کیا ہے۔ یہ تو طے تھا کہ ایک ایسی جگہ جہاں عام لوگ ہوں، یہ حملہ سراسر دہشت گردی تھی لیکن اس کے لیے اسے اس طرح کیوں استعمال کیا جا رہا تھا؟ ایک بیگ لے کر سامنے سے جانے پر اصرار کرنا... جبکہ یہ کام چھپ کر آسانی سے ہو سکتا تھا اور اگر یہ عوامی قسم کی نمائش تھی تو لازمی بات تھی کہ وہاں پولیس موجود ہوتی۔ اس کی موجودگی میں وہ اتنی آسانی سے ایک بیگ لے کر عمارت میں کس طرح چلا جاتا؟ اسے روکا جاتا اور اس موقع پر اس کے بیگ سے اسلحہ نکل آتا تو وہ پکڑا جاتا اور اندر موجود بدر کے ساتھی بنا اسلحے کے رہ جاتے۔ نہیں... یہ منصوبہ نہایت ناقص تھا یا اسے اصل منصوبے کی خبر نہیں تھی۔ وہ پیتا رہا اور سوچتا رہا۔

اکبر خان چالاک آدمی نہیں تھا۔ وہ نہ تو کوئی چالاکی کر سکتا تھا اور نہ ہی آسانی سے کسی کی چالاکی پکڑ سکتا تھا۔ اس لیے الجھ رہا تھا اور پیے جا رہا تھا۔ شاید بدر بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ پیتا رہے اور سوچنے کے قابل نہ رہے۔ تیسرے گلاس کے بعد اکبر خان لڑھک گیا۔ بدر نے اسے ہلا جلا کر دیکھا اور اپنا اطمینان کرنے کے بعد دوسرے کمرے میں آیا جہاں چھ افراد موجود تھے۔ انہوں نے اپنا اسلحہ تیار حالت میں کر لیا تھا۔ ان کا لباس بھی تیار تھا اور صحن میں ایک چوری کی ہوئی تبدیل شدہ نمبر کی پجیرو بھی کھڑی تھی۔ وہ واردات میں اسے ہی استعمال کرتے۔ بدر ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "تم لوگوں نے ساری تیاریاں مکمل کر لی ہیں؟"

"یہ ہمارا کام ہے۔" نواز نامی شخص رکھائی سے بولا۔ "تم یہ بتاؤ کہ باہر کوئی تبدیلی تو نہیں آئی؟"

"نہیں، سارے انتظامات مکمل ہیں۔ تم لوگوں کو کام کرتے ہی پیچھے کی طرف سے باہر نکلنا ہے۔ ایک بریڈ کمپنی کی وین کھڑی ہو گی، تم لوگ اس میں سوار ہو گے اور راستے میں حلیہ تبدیل کر لو گے۔ آدھے گھنٹے بعد یہ تم لوگوں کو وی آئی پی ایریا سے کچھ دور اتارے گی۔ وہاں سے تم دو الگ الگ گاڑیوں میں فائیو اسٹار ہوٹلز میں چلے جاؤ گے اور اس کے دو دن بعد تمہاری فلائٹ ہے۔"

نواز نے بدمزگی سے کہا۔ "یہ تم کسے بتا رہے ہو... میں سیکیورٹی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں؟"

بدر ایک لمحے کو چپ ہوا پھر اس نے کہا۔ "اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، وہاں معمول کی سیکیورٹی ہو گی۔ اس سے نمٹنا تم لوگوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔" بدر کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ "ویسے بھی تم لوگ تو دنیا میں سب سے بڑی طاقت ہو۔ چند پولیس والوں سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

نواز منہ بنا کر چپ ہو گیا لیکن اس کا ساتھی بولا۔ "تم یہ بات بھول جاؤ کہ ہمارا یہاں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کل ہونے والے واقعے کی رپورٹس بھی تیار ہو چکی ہیں۔"

نواز مسکرایا۔ "میڈیا پر آنے والی ان رپورٹس کے مطابق یہ حملہ افغانستان میں لڑنے والے دہشت گردوں کی یہاں روپوش قیادت نے کرایا ہے۔ اس لیے تم بھی اس بات کو ذہن میں بٹھا لو۔"

بدر بولا۔ "ہمیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا... ہمارا کام تو پیسا کمانا ہے۔"

"تب جیسا کہا جائے، ویسا کرو اور فضول باتیں مت کرو... سمجھ گئے؟" نواز نے اسے جھڑک دیا۔ "ہمارے لیے شراب لاؤ۔"

بدر وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کا خون کھول رہا تھا لیکن وہ ان کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ وہ ان کے لیے بوتل لے کر آیا۔ اکبر خان اسی طرح بے سدھ پڑا تھا۔ وہ واپس آیا تو وہ لوگ مینا کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے تجویز دی کہ مینا کو آج رات ہی پامال کر دیا جائے کیونکہ پھر تو ان کو موقع نہیں ملے گا۔ بدر نے مداخلت کی۔

"یہ بات طے ہو چکی ہے کہ جب تک اکبر خان سے

www.pkdigest.com

کام نہیں لے لیا جاتا، اس کی لڑکی کو نہیں چھیڑا جائے گا۔"

نواز نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم سے کس نے مشورہ مانگا ہے؟ ہمارا جو دل چاہے گا، کریں گے۔"

"یہ اصل میں اس بیوٹی کو اپنے لیے محفوظ رکھنا چاہ رہا ہے۔" دوسرا ہنس کر بولا۔

"مرضی ہے تم لوگوں کی۔" بدر نے منہ بنایا۔ "بعد میں اکبر خان کا دماغ گھوم گیا اور اس نے کام کرنے سے انکار کر دیا تو خود ہی بھگتنا۔"

ان لوگوں کا سربراہ نواز تھا۔ بدر کی بات نے اس کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے لیے سب سے اہم مشن تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ "بدر خان ٹھیک کہتا ہے۔ ہمارے لیے اکبر خان کا ساتھ ہونا نہایت ضروری ہے اور اگر ہم اس سے کام نہیں لیتے تو اس مرحلے پر کسی اور کا ملنا بھی مشکل ہے۔"

"یعنی ہم اس لڑکی سے محروم ہی رہیں گے۔" اس کا ساتھی مایوسی سے بولا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم خاموشی سے اپنا کام کر جائیں اور اکبر خان کو پتا ہی نہ چلے۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" بدر جلدی سے بولا۔ "اکبر خان یہیں ہے اور میں اسے مینا سے ملانے سے نہیں روک سکتا۔ اسے پہلے ہی شک ہے کہ تم لوگوں نے لڑکی کے ساتھ بدسلوکی کی ہے۔ ابھی تو میں نے اسے سمجھا دیا ہے لیکن اسے پھر کوئی شک ہوا تو وہ گڑبڑ بھی کر سکتا ہے۔"

"ہمارے لیے مشن اہم ہے۔" نواز نے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ "اس لیے پہلے کام... اور اس کے بعد موقع ملا تو لڑکی۔"

"موقع ہی تو نہیں ملے گا۔" نواز کے ساتھی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ہائے... کیا بیوٹی ہے۔"

بدر ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا اور اس کا خون کھول رہا تھا... اس لیے نہیں کہ اس میں کوئی قومی یا دینی حمیت باقی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ اس کی پسندیدہ لڑکی کے بارے میں پوری بے باکی سے بات کر رہے تھے۔ وہ مینا پر دل و جان سے مرمٹا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ اس کام کے بعد وہ مینا کو شمالی علاقے میں اپنے گھر لے جائے گا اور اس سے نکاح کر لے گا۔ جب تک چاہے گا، ساتھ رکھے گا اور جب دل بھر جائے گا تو طلاق دے دے گا۔ وہ تین شادیاں پہلے ہی کر چکا تھا اور اس کی دو بیویاں اس کے آبائی گھر میں موجود تھیں۔ رات ہو چکی تھی۔ وہ لوگ پیتے رہے اور آپس میں فحش گوئی کرتے رہے۔ اکبر خان بدستور بے سدھ پڑا تھا۔ بدر بھی اس کے پاس قالین پر دراز ہو گیا۔

☆☆☆

مینا سوئی نہیں تھی۔ جب سے وہ یہاں آئی تھی، اسی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ زمین پر بس ایک دری تھی اور وہ چاہتی تو اس پر لیٹ جاتی لیکن اسے لگ رہا تھا کہ وہ سونے کے لیے لیٹی تو پھر اس کی آنکھ کبھی نہیں کھلے گی۔ وہ خوف کے باعث جاگ رہی تھی۔ ان لوگوں نے اسے کھانا دیا تھا۔ اس نے بھوک شدید ہونے پر تھوڑا سا کھا لیا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ چاروں طرف سے بھیڑیوں میں گھری ہو اور اگر اس نے آنکھ بھی جھپکی تو وہ اس پر ٹوٹ پڑیں گے اور اس کی تکا بوٹی کر دیں گے۔ وہ اکبر خان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب اس نے اسے بتایا تھا کہ اسے لانے والوں نے اس کے بارے میں کیا منصوبے بنائے ہیں تو اکبر خان کے انداز میں ایک باپ کی غیرت نظر آنے لگی تھی... جو اپنی بیٹی کی طرف اٹھنے والی میلی آنکھ کو پھوڑ دینا چاہتا ہو لیکن اکبر خان نے اچانک ہی تھپڑ مار کر اس کی ساری خوشی بھی ہوا کر دی تھی۔ اکبر خان کا کردار اس کے سامنے تھا۔ اس میں بیٹی کے لیے محبت ہوتی تو وہ اس کی شادی نہ کر دیتا؟ اسے اتنے عرصے گھر بٹھا کر رکھتا اور اسے مارنے کی کوشش کرتا؟ وہ مایوس ہو گئی اور اب لگ رہا تھا کہ اس کے باپ کو شاید اس پر کوئی اعتراض نہ ہو کہ یہ لوگ اسے بے آبرو کر کے مار ڈالیں۔

رات رفتہ رفتہ گزرتی گئی۔ بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی اچانک اسے لگا جیسے اس کے پاس کوئی ہے۔ اس کے منہ سے چیخ نکلنے والی تھی کہ ایک ہاتھ آ کر اس کے منہ پر جم گیا۔

"آواز نہ نکلے۔" اکبر خان نے اس کا منہ دباتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کو مینا کو لگا کہ وہ اسے قتل کر دے گا۔ اس کی گرفت اتنی ہی سخت تھی لیکن پھر اس نے گرفت نرم کر دی۔

"بولنا مت... میں چپکے سے آیا ہوں۔"

"بابا... تم!" مینا کی آواز کانپ رہی تھی۔ "تم مجھے مارنے آئے ہو؟"

اکبر خان کا سر جھک گیا۔ "سوچ کر تو یہی آیا تھا۔" وہ تھکی تھکی آواز میں بولا۔ "پر تیری صورت دیکھی تو تیری ماں یاد آ گئی۔ اس عورت نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا اور میں نے اسے کچھ نہیں دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ تیری زندگی مانگ

رہی ہے۔"

مینا کو زندگی میں پہلی بار اکبر خان اپنا باپ لگا تھا۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔ "بابا! مجھے ان سے بچا لو۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"میں کوشش کر سکتا ہوں۔" اکبر خان نے بے بسی سے کہا۔ "میں بھی تیری طرح ان کا قیدی ہوں۔"

"تب مجھے مار دو۔" مینا نے اس کے ہاتھ تھام کر اپنے گلے پر رکھ دیے۔ ایک لمحے کو اکبر خان کے ہاتھوں کی گرفت اس کے گلے پر سخت ہوئی لیکن پھر اس نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ "مینا! مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا۔"

مینا رونے لگی۔ "ابھی نہیں مارو گے تو بعد میں زیادہ ذلت سے مروں گی۔ بابا! میں عزت سے مرنا چاہتی ہوں۔"

اکبر خان سوچتا رہا... جیسے کوئی فیصلہ کرنا چاہ رہا ہو پھر اس نے مینا کا سر تھپکا۔ "تو نہیں مرے گی۔ جب تک میں زندہ ہوں تو نہیں مرے گی۔ ہاں، میرے بعد تجھے اختیار ہوگا۔"

"بابا! ایسی باتیں مت کرو۔" مینا پھر اس سے لپٹ گئی۔ "کیا تم کسی طرح مجھے یہاں سے نہیں لے جا سکتے؟"

اکبر خان مسکرایا۔ "یہاں سے ہم دونوں نہیں جا سکتے۔ کوئی ایک ہی جا سکتا ہے... بلکہ تو ہی جا سکتی ہے کیونکہ میرے لیے ان کا فیصلہ موت ہے۔ یہ مجھے نہیں چھوڑیں گے اور میں زندہ رہا تو تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ اس لیے ہم میں سے ایک ہی زندہ رہ سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں تجھے معاف نہیں کروں گا۔ یہ تو حالات ہی ایسے ہیں... اگر تو عام حالات میں میرے سامنے آتی تو میں تجھے مار چکا ہوتا۔ اب تو زندہ رہنا چاہتی ہے تو یہ اسی وقت ممکن ہے جب میں زندہ نہ ہوں۔"

"بابا..." مینا کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی۔ اکبر خان ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو مینا اس کے لیے غیرت کا مسئلہ بنی رہتی اور وہ اسے مار کر ہی سکون کا سانس لیتا۔

"تم کیا کرو گے؟"

"میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔" اکبر خان بولا۔ "میں تجھے ابھی یہاں سے نہیں نکال سکتا۔ ممکن ہے، کوئی موقع ملے تو تجھے خود ہمت کرنا ہوگی۔"

"میں سمجھی نہیں۔" وہ بولی۔

"اسے چھوڑ... اگر تیرے نصیب میں یہاں سے نکلنا ہے تو تو نکل جائے گی۔ اب غور سے سن... تو یہاں سے پشاور جائے گی۔ وہاں ایک وکیل ہے بنارس خان... اس سے ملنا۔ اس کے پاس میری زمین کے کاغذات ہیں... تو اسے بتائے گی کہ تو میری بیٹی ہے تو وہ تیری مدد کرے گا۔ میری بات سمجھ رہی ہے نا؟"

مینا بس سن رہی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہاں سے کیسے نکلے گی؟ یہ بات تو شاید خود اکبر خان کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی لیکن اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ مینا کو ان لوگوں سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اس نے پھر مینا سے کہا۔ "کوئی بات ہو تو یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا... کم سے کم آج تیرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"آج کیوں بابا؟"

"یہ لوگ کہیں حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ مجھے بھی لے جا رہے ہیں۔ یہ دہشت گرد ہیں۔"

مینا کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ تو ان کو عام سے جرائم پیشہ سمجھ رہی تھی۔ اکبر خان نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ بتایا۔ "یہ اسی جگہ حملہ کریں گے جہاں تیری کپڑوں والی نمائش ہونے جا رہی ہے۔"

"وہاں... لیکن کیوں؟"

"یہ تو ان کو بھی نہیں پتا... ان کو بھی کہیں سے حکم ملا ہے۔" اکبر خان نے کہا۔ "تو ان چکروں میں نہ پڑ... خود کو بچانے کا سوچ۔"

"میں کیسے بچاؤں خود کو؟"

"مینا! تو ذہین ہے۔ سوچے گی تو کچھ نہ کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔" اکبر خان نے جواب دیا۔ "اب میں جاتا ہوں، ان میں سے کوئی اٹھ گیا تو میں بھی پکڑا جاؤں گا۔"

اکبر خان کمرے سے نکل گیا۔ اس نے گزشتہ رات پی کم تھی لیکن ظاہر یوں کیا تھا جیسے بہت زیادہ پی گیا ہو اور بے ہوش بن کر لیٹ گیا تھا۔ وہ گزشتہ کچھ عرصے سے مستقل پی رہا تھا اور اتنی تھوڑی مقدار میں پینے سے وہ بے ہوش نہیں ہو سکتا تھا۔ جب بدر کمرے سے نکلا تو وہ بھی چپکے سے اس کے پیچھے آ گیا تھا اور اس نے ان لوگوں کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ درمیان میں ایک بار بدر ان لوگوں کے لیے شراب لینے آیا تھا تو اکبر خان بھی جلدی سے جا کر واپس لیٹ گیا تھا۔ جب بدر گیا تو وہ دوبارہ اس کے پیچھے گیا تھا۔ ان کی باتیں سن کر وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اسے بھی نہیں بخشیں گے اور اس کام میں وہ ان کے لیے بہت ضروری تھا، تب ہی وہ مینا کو ہاتھ نہیں لگا سکے تھے۔

www.pkdigest.com

رات جب اسے یقین ہو گیا کہ سب سو چکے ہیں تو وہ باہر نکلا اور مینا کے کمرے تک آیا تھا۔ وہ نہ تو خود باہر جا سکتا تھا اور نہ مینا کو بھگا سکتا تھا کیونکہ دروازے پر بدر کا پالتو کتا تھا۔ وہ بھونک بھونک کر سب کو جگا دیتا اور وہ بھاگنے سے پہلے ہی پکڑے جاتے۔ ویسے بھی وہ خوں خوار کتا تھا۔ اس لیے اکبر خان نے فرار کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مینا سے مل کر اس کا ارادہ بدل گیا تھا ورنہ وہ مینا کو قتل کرنے کے ارادے سے گیا تھا۔ وہ واپس بدر والے کمرے میں آیا تو اس نے اچانک پوچھ لیا۔

''کہاں تھے تم؟''

اکبر خان اچھل پڑا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے جھوٹ بولا۔ ''یار! لیٹرین تک گیا تھا۔''

''اچھا سوچ... رات کو اس طرح مت باہر نکلا کر... بالا بہت خطرناک ہے۔'' بدر کے لہجے میں دھمکی چھپی تھی۔ بالا اس کے کتے کا نام تھا۔

''مجھے بھی اس سے ڈر لگتا ہے۔'' اکبر خان لیٹ گیا۔ ''بس مجبوری میں جانا پڑا۔''

انہیں شام کے وقت نکلنا تھا اور مغرب سے ذرا پہلے کارروائی کا آغاز کرنا تھا تاکہ فرار ہوتے وقت تاریکی کا سہارا لے سکیں۔ وہ سب صبح دیر سے اٹھے تھے۔ اکبر خان مینا کا ذکر کرنے سے بھی گریز کر رہا تھا۔ ایک دو بار بدر نے اس کی بات بھی کی تو اکبر خان نے کسی قدر غصے سے کہا کہ وہ اس کے سامنے مینا کا ذکر نہ کرے۔ بدر مینا کو ناشتا دے آیا تھا اور وہ بہت خوش تھا کہ مینا اس کے لیے بچ گئی تھی۔ ان لوگوں کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ اب وہ واپس نہیں آئیں گے اور بدر کو بھی آج ہی یہ ٹھکانا چھوڑ کر جانا تھا اور ممکن تھا کہ وہ اگلے دن تک شہر سے ہی نکل جاتا۔

دوپہر کو وہ سب ایک کمرے میں جمع ہوئے۔ نواز ان سب کو بتا رہا تھا کہ انہوں نے وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ اکبر خان کے لیے ایک بیگ تیار تھا لیکن یہ اس طرح بند تھا کہ اکبر خان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کھولنا کس طرح ہوگا کیونکہ یہ چاروں طرف سے سیل تھا۔ البتہ اسے پشت پر باندھنے کے لیے بیلٹس لگی تھیں۔ سب سے عجیب بات اکبر خان کو یہ نظر آئی کہ ان کا اسلحہ تو ان کے پاس تھا۔ خودکار رائفلیں، شاٹ گنز اور پستول... اس کے علاوہ دستی بم بھی تھے جو انہوں نے اپنی جیکٹوں سے لٹکا رکھے تھے۔ انہیں صرف کھینچنے سے ان کی پن نکل جاتی اور پانچ سیکنڈ کے اندر اندر ان کو ہدف پر پھینکنا لازمی تھا ورنہ یہ پھٹ جاتا۔ انہیں

یہی سارا اسلحہ درکار تھا... تب اس بیگ میں کون سا اسلحہ تھا جسے اندر لے جانا لازمی تھا؟ اکبر خان کو اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ یہ لوگ اس کے خلاف کوئی سازش کر رہے تھے۔

انہیں ٹھیک پانچ بجے نکلنا تھا۔ ان سب نے اپنے لباسوں کے اوپر چادریں لے لیں تاکہ اسلحہ نظر نہ آئے۔ وہ اس چوری کی پجیرو میں اس طرح آئے تھے کہ دو سامنے تھے، دو درمیان والی سیٹوں پر اور تین عقبی نشست پر... ان کے ساتھ اکبر خان بھی تھا۔ بدر ان کو چھوڑنے آیا تو اکبر خان نے اس سے پوچھا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ یہ اندر ہوں گے اور مجھے ان کو یہ بیگ پہنچانا ہوگا۔''

''اب پلان بدل گیا ہے۔'' بدر کے بجائے نواز نے کہا۔ ''اندر بیٹھو... میں تمہیں راستے میں بتاتا ہوں۔''

بادلِ ناخواستہ اکبر خان بیٹھ گیا۔ انہوں نے اسے عقب میں پھنسا کر بٹھا لیا تھا جیسے اس کے فرار کا راستہ بند کرنا چاہتے ہوں۔ اس نے راستے میں نواز سے پھر پوچھا۔ ''تم لوگوں نے منصوبے میں کیا تبدیلی کی ہے؟''

''تبدیلی یہ ہے کہ پہلے تم اتر کر اس بیگ سمیت عمارت کے مین گیٹ تک جاؤ گے۔ تمہارے پیچھے ہم آئیں گے۔''

اکبر خان نے دہشت زدہ ہو کر سامنے رکھے بیگ کو دیکھا اور چلا کر بولا۔ ''مگر کیوں... پہلے ہم کیوں جائے؟''

''چلاؤ مت۔'' اس کے برابر والے نے اس کی پسلی میں پستول لگا دیا۔ ''یہ حکم ہے اور تمہیں جانا ہی ہوگا۔''

''ورنہ ہم تمہیں مار کر راستے میں پھینک جائیں گے۔'' نواز نے پلٹ کر کہا۔ وہ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

''تم لوگ میرے ساتھ کیا کر رہے ہو؟'' اکبر خان کسمسا کر بولا۔ ''تم نے جھوٹ بولا تھا۔ اس بیگ میں بم ہے۔ جیسے ہی ہم عمارت کے پاس جائے گا، یہ پھٹ جائے گا۔''

''ہم نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ بم بھی اسلحہ ہی ہوتا ہے اور ہمیں اس کی ضرورت بھی تھی۔'' نواز ہنسا۔

''میں یہ کام نہیں کروں گا۔'' اکبر خان بولا۔ ''ورنہ میں بھی مارا جاؤں گا۔''

''اگر تم نہیں مارے گئے تو تمہاری بیٹی ماری جائے گی۔'' نواز بولا۔

اکبر خان کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ''میری بیٹی...''

نواز اس کی طرف گھوما۔ ''ہاں... ناکامی کی صورت میں ہم واپس جائیں گے اور تمہاری بیٹی بہت اذیت سے اور سسک سسک کر مرے گی۔''

''وہ بھی تمہارے سامنے!'' نواز کے ساتھی نے کہا۔

''نہیں۔'' اکبر خان لرز گیا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''تب تمہیں یہ کام کرنا ہوگا۔'' نواز نے کہا۔ ''بیگ اپنی پشت پر باندھ لو... وقت کم رہ گیا ہے۔''

اکبر خان نے دہشت سے اس بیگ کو دیکھا۔ اس میں اس کی اور نہ جانے کتنے لوگوں کی موت چھپی تھی۔ اس کا سائز بتا رہا تھا کہ بم خاصا بڑا ہے اور اس کے پھٹنے سے بڑی تباہی ہو سکتی ہے۔ اس وقت وہ ایک مصروف شاہراہ سے گزر رہے تھے۔ نواز کے ساتھی نے بیگ اٹھا کر اکبر خان کی گود میں رکھ دیا۔ اس نے بیگ اٹھا کر پہننے کی کوشش کی لیکن یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اس کے دائیں بائیں موجود افراد نے اس کی مدد کی تو وہ بیگ پہن سکا۔ اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو رہی تھی۔ اتنا تو وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ لوگ اسے اس طرح خودکش حملے میں استعمال کر رہے تھے لیکن انہوں نے اسے جو دھمکی دی تھی وہ بڑی ہولناک تھی۔ مینا کو اپنے سامنے بے آبرو ہوتے دیکھنے پر وہ ہزار بار مرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس کا قبائلی خون یہ ذلت برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔

''تیار ہو جاؤ۔'' نواز نے پلٹ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''ہم پہنچنے والے ہیں۔''

وہ ایک کھلی شاہراہ پر تھے جہاں ٹریفک تھا اور ان کی پجیرو بھی ٹریفک میں تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ اکبر خان نے بے بسی سے ان لوگوں کو دیکھا۔ شاید اس کا مکافات کا دن آ گیا تھا۔ اپنے مظالم کا بدلہ اسے اس دنیا میں بھگتنا تھا اور دوسری دنیا میں بھی۔ لیکن یہ لوگ بچ جاتے اور مزے سے اپنے ملک واپس چلے جاتے۔ اکبر خان نے ان لوگوں کو دیکھا اور سوچا کہ وہ انہیں ایسا کرنے نہیں دے گا۔ اس نے اپنے برابر والے کو دیکھا۔ اس کی چادر تلے دستی بم کا ابھار نظر آ رہا تھا۔ اکبر خان نے اچانک ہی چادر کے اوپر سے ہی دستی بم پکڑ کر اسے کھینچ لیا۔ وہ اپنی پن سے نکل گیا اس لیے پانچ سیکنڈ کے اندر دھماکا لازمی تھا۔

''یہ کیا کیا؟'' وہ شخص انگریزی میں چلایا۔ موت کو سامنے دیکھ کر وہ پشتو بھول گیا تھا۔ اس نے چادر تلے سے دستی بم نکالنے کی کوشش کی لیکن اکبر خان اس سے چمٹ گیا۔ صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی وہ سب چلانے لگے۔ اس بار سب اپنی مادری زبان میں اور اصل لہجے کے ساتھ چلا رہے تھے۔ نواز نے جیپ روکنے کو کہا لیکن اس تیز رفتار سڑک پر یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اکبر خان کے دوسری طرف بیٹھے شخص نے اس کے سر میں گولی مار کر اس کی مزاحمت ختم کی لیکن اس کا فائدہ نہیں ہوا۔ ان سب کا وقت پورا ہو چکا تھا۔

شور ہنگامے میں پجیرو بری طرح لہرانے لگی۔ اس وجہ سے اس کے آس پاس کا ٹریفک دور ہو گیا اور اس کے کچھ دیر بعد ہی پوری جیپ ایک شدید ترین دھماکے سے بکھر گئی۔ دستی بم کے ساتھ اکبر خان کی پشت سے بندھا بیگ بھی اس تباہی میں شامل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

مینا نے گاڑی جانے کی آواز سنی تو اس کے اندر خوف بڑھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب وہ یہاں اکیلی رہ جائے گی اور صرف بدر ہوگا۔ وہ اس کے پاس آئے گا۔ اس کا ڈر درست ثابت ہوا۔ ابھی جیپ کو مکان سے نکلے دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ کوٹھری کا دروازہ کھلا اور بدر نظر آیا۔ مینا سہم گئی۔ بدر کے چہرے پر ایک پرہوس تاثر تھا اور وہ کھا جانے والی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''باہر نکل۔''

''نہیں۔'' وہ دیوار سے لگ گئی تو بدر اسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر لایا اور اس نے ایک چھوٹی سی کار کا عقبی دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا۔

''خاموش بیٹھنا ورنہ راستے میں گولی مار دوں گا۔''

ایسا لگ رہا تھا کہ بدر بھی یہاں سے نکل رہا ہے۔ اس نے دروازے بند کیے اور ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ اس نے کار مکان سے نکالی اور روانہ ہو گیا۔ یہ بھی کوئی کچی آبادی تھی۔ وہ عقبی طرف سے نکلا تھا۔ یہاں جھاڑیاں تھیں اور ویرانہ تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد اچانک بدر کے موبائل کی گھنٹی بجی اور اس نے فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف کی بات سنتے ہی اس نے دہاڑ کر کہا۔ ''کیا بک رہا ہے؟''

اس نے بے ساختہ کار روک دی۔ ''کب... کیسے... میرے خدا!''

مینا نے دیکھا کہ وہ اس کی طرف سے بے خبر ہے اور کار کا انجن بھی چل رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور نیچے اتر کر آہستہ سے بیٹھے بیٹھے ہی جھاڑیوں میں سرکنے لگی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ وہ دور نکل آئی ہے تو وہ اٹھ کر پوری شدت سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ وہ بدر کی پہنچ سے دور نکل

www.pkdigest.com

جانا چاہتی تھی۔

بدر کو ذرا دیر سے احساس ہوا کہ مینا غائب ہے۔ وہ چونکا۔ فون پر ملنے والی اطلاع نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔ پجیرو جیپ راستے میں دھماکے سے تباہ ہو گئی تھی اور اس میں موجود تمام افراد مارے گئے تھے۔ ان کا مشن ناکام رہا تھا۔ اوپر سے مینا موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ گئی تھی۔ وہ کار سے نکل کر دیوانہ وار اسے تلاش کرنے لگا۔ پھر وہ گالیاں دیتا ہوا واپس کار میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

''پولیس کے مطابق دہشت گرد کہیں کارروائی کرنے جا رہے تھے لیکن راستے میں ہی بلاسٹ ہو گیا۔ اس سے پجیرو میں سوار ساتوں دہشت گرد ہلاک ہو گئے اور اس طرح شہر کسی بڑی تباہی سے بچ گیا۔ تفتیش کے نتیجے میں کچھ لوگ گرفتار ہوئے ہیں... انہوں نے دہشت گردوں کے ایک نیٹ ورک کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں۔ پولیس معلومات کو فی الحال خفیہ رکھ کر تحقیق کر رہی ہے۔ امید ہے کہ جلد مزید گرفتاریاں...''

مینا نے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ بدر سمیت بہت سارے لوگ گرفتار ہوئے تھے۔ اس نے خود پولیس کو بدر کے بارے میں بتایا۔ کسی خفیہ ادارے کے لوگوں نے اس سے پوچھ گچھ کی تھی اور اس کے انکشافات کی روشنی میں ہی یہ سب گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ملوث نہیں کیا گیا تھا۔ مینا نے اپنے باپ کے بارے میں بتا دیا تھا کہ وہ تباہ ہونے والی جیپ میں موجود تھا۔ ڈی این اے سے یہ ثابت بھی ہو گیا تھا کہ مارے جانے والوں میں ایک مینا کا باپ تھا۔ مینا کو یقین تھا کہ جیپ کی تباہی اور دہشت گردوں کی ناکامی میں اس کے باپ کا ہی ہاتھ تھا۔

یہ بات مینا کو بھی نہیں معلوم تھی کہ باقی افراد کے ڈی این اے ٹیسٹ بھی ہوئے تھے اور باقی دہشت گردوں کا باب بند کر دیا گیا تھا۔ البتہ بدر اور اس کے ساتھیوں سے حاصل معلومات کی روشنی میں گرفتاریوں کا دائرہ ملک کے شمالی حصے تک دراز کیا جا رہا تھا۔

مینا نے عارضی طور پر شیبا کا تعاون حاصل کیا تھا لیکن اپنے باپ کی زمین پر قبضے اور اسے فروخت کر کے وہ مالی طور پر مضبوط پوزیشن میں آ گئی تھی۔ اس نے اپنے دادا اور چچاؤں سے رابطہ کر لیا تھا اور انہوں نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اسے قبول کر لیا تھا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کی تھی لیکن مینا نے ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ البتہ اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ماڈل نہیں بنے گی۔

☆☆☆

عزیز خان اپنے حجرے میں پاگلوں کی طرح ٹہل رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور رابطہ کار اندر آیا۔ عزیز اسے دیکھ کر غرایا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ میرے سارے آدمی پکڑے جا چکے ہیں۔''

''اس قسم کے کاموں میں ایسا ہوتا ہے۔'' رابطہ کار مسکرایا۔

''اب میں کیا کروں؟ میرے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔''

''میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔ اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں رہی ہے۔ تم آزاد... ہو جو مناسب سمجھو وہ کرو۔''

''تم بس یہی بتانے آئے ہو؟'' عزیز خان نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔ رابطہ کار نے سر ہلایا۔

''خدا حافظ عزیز خان۔'' اس نے کہا اور حجرے سے نکل گیا۔ عزیز خان دیکھ نہیں سکا تھا کہ وہ جاتے جاتے دروازے کی پشت پر ایک چھوٹی سی چیز چپکا گیا ہے۔ ابھی رابطہ کار اپنی کار میں اس علاقے سے زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ فضا میں ایک ڈرون طیارہ نمودار ہوا اور اس نے دور سے دو میزائل فائر کیے اور چند سیکنڈ بعد یہ میزائل عزیز خان کے حجرے میں ٹھیک اس جگہ جا کر ٹکرائے جہاں رابطہ کار نے ننھی سی چپ چپکائی تھی۔ حجرے کے ساتھ عزیز خان بھی ملبے کا ڈھیر بن گیا۔

اس جگہ سے ہزاروں میل دور ڈرون کنٹرول کرنے والے کمانڈ سینٹر میں فوجی کمانڈر نے اپنے باس سے کہا۔ ''اب ہمیں اس کی جگہ کسی اور سے کام لینا ہوگا۔''

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' باس نے بے پروائی سے کہا۔ ''یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ مرتا یا کوئی عام عورت... یا بچہ مرتا، ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے لیے سب ایک ہیں۔''

''درست کہا جناب۔'' کمانڈر نے کہا۔ ''لیکن جس روز انہیں یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ہم ان کو ایک ہی سمجھتے ہیں، اس روز یہ سچ مچ ایک ہو جائیں گے۔''

باس مسکرایا۔ ''ہم اسی وقت کو ٹالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

www.pkdigest.com

ہوں۔ یہ تو آر کے صاحب کی مہربانی ہے کہ ابھی تک مجھ پر کسی نے تشدد نہیں کیا ہے یا پھر یہ بھی ان کی کسی لمبی پلاننگ کا حصہ ہے۔ ابھی تیمور سے بھی میری بات ہوئی ہے۔ وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ تم اسے سمجھاؤ کہ وہ مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرے ورنہ فضول میں میرے ساتھ وہ بھی مارا جائے گا۔ وہ باہر رہ کر میری زیادہ مدد کر سکتا ہے۔ تم بھی پریشان مت ہونا۔ آر کے صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد ہی مجھے یہاں سے نکال لیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دینے کو دانستہ جھوٹ بولا۔ ”بس تم اپنا خیال رکھنا۔“

”تم بھی اپنا خیال رکھنا کامران!“ جینی نے کہا۔ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

میں نے جلدی سے سلسلہ منقطع کر دیا۔

تیسری کال میں نے آر کے کو کی۔ کئی دفعہ بیل بجنے کے بعد انہوں نے فون اٹھایا۔ ”ہیلو!“

”آر کے صاحب! میں کامران بول رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”تم... تم کہاں سے بول رہے ہو؟“

”میں ابھی تک اسی حوالات میں ہوں۔“

”یہ سیل فون تمہارے پاس کہاں سے آیا؟“ انہوں نے فکرمندی سے پوچھا۔

”میں نے منگوایا ہے۔“ میں نے الجھ کر کہا۔

”اسے فوراً آف کر دو۔ شاید وہ لوگ اس حوالات میں ہونے والی بات چیت کو بھی ریکارڈ کر رہے ہوں۔ تم نے کسی سے ایسی کوئی خاص بات تو نہیں کی ہے؟“

”نہیں، میرا خیال ہے کہ ابھی تک میں نے صرف جینی اور تیمور سے بات کی ہے اور ان سے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی ہے۔“

”تم فوراً سیل فون آف کر دو۔ باقی اگر کچھ ہوا تو میں سنبھال لوں گا۔ ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ شام تک صحیح صورتِ حال سامنے آجائے گی۔ اور تم فکر مت کرنا، تمہارے دوست تمہاری طرف سے غافل نہیں ہیں... اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے بھی اپنا سیل فون آف کر دیا۔

شام کو مراد خان آیا تو اس نے بتایا کہ آر کے صاحب نے اپنے اندر کے ایک آدمی سے معلوم کرا لیا ہے۔ اس حوالات کی گفتگو کہیں نہیں سنی جا رہی ہے۔ لیکن پھر بھی سیل فون پر بات کرنے میں احتیاط کریں۔ اس مرتبہ پھر وہ مجھے آر کے کی طرف سے دس ہزار روپے دے گیا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ لوگ مجھے لاک اپ میں ڈال کر بھول گئے ہیں۔ پاکستان ہوتا تو اب تک پاپا نے پورے کراچی کو سر پر اٹھا لیا ہوتا۔ ایک ہفتہ گزرنے کے باوجود پولیس نے مجھے ابھی تک کورٹ میں پیش نہیں کیا تھا۔ میں اس صورتِ حال سے عاجز تھا۔ وہ لوگ کوئی تو فیصلہ کرتے... آر یا پار! زیادہ سے زیادہ وہ لوگ مجھے موت کی سزا ہی دے سکتے تھے۔ اس کے لیے میں ذہنی طور پر اسی وقت تیار ہو گیا تھا جب انہوں نے مجھے گرفتار کیا تھا۔ مجھ پر کئی قتل کا الزام تھا اور الزام کیا... واقعی وہ قتل میرے ہاتھوں ہوئے تھے۔ مجھے اگر پھانسی بھی ہو جاتی تو افسوس نہ ہوتا... ظاہر ہے قتل کرنے کے بعد تو میں بے قصور بھی نہیں رہا تھا۔

میں اخبار پابندی سے پڑھ رہا تھا۔ اجمل قصاب کے کیس کو اخبارات اور ٹی وی نے خوب اچھالا تھا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ صرف بارہ یا چودہ لڑکوں نے پورے ہوٹل کو کئی دن تک یرغمال بنائے رکھا۔ وہ لوگ آخر کب سوتے ہوں گے؟ کب کھاتے ہوں گے؟ انڈیا کی فورس بلیک کیٹس جسے اس پر بہت ہی ناز ہے، وہ بھی ان لڑکوں پر قابو نہیں پا سکی۔ مجبوراً انہیں اسرائیل سے کمانڈوز بلانا پڑے۔ مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ کمانڈو کارروائی کے باوجود ان لوگوں میں سے کوئی بھی زندہ پولیس کے قبضے میں نہیں آیا تھا۔ وہ سب کے سب مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے تھے۔ یہ سب اخباری خبریں تھیں۔

پھر اجمل قصاب کا مسئلہ تھا۔ وہ نہ جانے کہاں سے ان کے قبضے میں آگیا تھا؟ وہ دہشت گرد تھا بھی یا نہیں؟ مجھے تو اس کے پاکستانی ہونے میں بھی شبہ تھا۔ ابھی تک انہیں اجمل قصاب کے خلاف بھی کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔

میں نے دوسرے دن کے اخبار میں ایک عجیب اور نئی خبر پڑھی۔ ”پاکستانی دہشت گردوں کا ایک گروہ بھارت میں داخل ہو گیا ہے۔ سیکیورٹی کو ہائی الرٹ کر دیا گیا ہے۔ خفیہ اداروں کی اطلاعات کے مطابق ان دہشت گردوں کو بھارت میں پہلے سے موجود پاکستانی ایجنسی کے ایجنٹوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہ لوگ بھارت کی حساس تنصیبات کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ حساس اداروں نے لال قلعہ اور دیگر اہم مراکز پر سیکیورٹی کی تعداد دوگنی کر دی ہے اور اجمل قصاب کو نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ یہ دہشت گرد اجمل قصاب کی رہائی کے لیے بھی کوئی کارروائی کر سکتے ہیں۔ بھارت کی پولیس اور خفیہ ایجنسیاں مزید تفتیش کر رہی ہیں۔“

یہ بھارتی حکومت نے ایک نیا شوشہ چھوڑا تھا۔ میری

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس خبر کا مطلب کیا تھا؟ کیا واقعی پاکستانی دہشت گرد بھارت میں داخل ہوئے تھے یا پھر یہ دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور خود کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش تھی؟

شام تک حوالات میں دو نئے قیدیوں کا اضافہ ہو گیا۔ ایک پر چوری کا الزام تھا اور دوسرا مار پیٹ اور دنگے فساد کے کیس میں آیا تھا۔ رگھو نے پہلے ہی دن ان سے خدمت لینا شروع کر دی۔ نہ صرف اس نے اپنی خدمت کرائی بلکہ ایک قیدی سے اس نے میرے پیر بھی دبوائے۔

پیر دباتے دباتے وہ قیدی آہستہ سے بولا۔ ”کامران صاحب! میرا نام عزیز ہے اور میں آر کے صاحب کا آدمی ہوں۔ انہی کے حکم پر لڑائی جھگڑا کر کے جیل میں آیا ہوں۔“

”ارے... تو اس زحمت کی کیا ضرورت تھی؟ آر کے صاحب ٹیلی فون پر مجھ سے بات کر سکتے تھے۔“ میں نے کہا۔

”وہ بات ٹیلی فون پر نہیں ہو سکتی تھی۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

”ابھی نہیں۔“ اس نے رگھو اور دوسرے قیدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ بات میں رات کو بتاؤں گا جب [illegible]“

میں عجیب پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ کہیں تیمور نے تو کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کر دی... یا پولیس نے سعید بھائی کو گرفتار تو نہیں کر لیا یا پھر جینی پکڑی گئی؟ لیکن یہ سب وہ باتیں تھیں جو آر کے مجھے ٹیلی فون پر بتا سکتا تھا۔

”کیا بات ہے کامران بابو!“ رگھو نے پوچھا۔ ”کوئی پریشانی ہے؟ کہیں ٹیلی فون پر کوئی ایسی ویسی خبر تو نہیں سن لی؟“

”نہیں رگھو! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنا ٹیلی فون تو میں آف ہی رکھتا ہوں۔ صرف اس وقت کھولتا ہوں جب کسی سے بات کرنا ہوتی ہے۔“

”تو پھر کیا بات ہے؟“ رگھو بھی جرح کرنے پر آمادہ تھا۔ ”میں نے تمہیں اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا۔ کہیں اس قیدی نے تو تمہیں کوئی دھمکی نہیں دے دی جو تمہارے پیر دبا رہا تھا؟“

”رگھو! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ بس یہی سوچ کر پریشان ہوں کہ یہ لوگ مجھے حوالات میں ڈال کر بھول کیوں گئے ہیں۔ مجھے عدالت میں پیش کریں اور قصہ ختم کریں۔“

پھر رگھو نے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ اپنے طور پر کچھ سوچ رہا تھا۔

رات کو میں نے پھر عزیز کو پیر دبانے کے بہانے بلا لیا۔ دوسرا قیدی رگھو کے پیر دبا رہا تھا۔ چند منٹ بعد رگھو کے خوفناک خراٹے گونجنے لگے۔ میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ رگھو انتہائی خوفناک خراٹے لیتا تھا کہ دوسرے حوالاتی بھی صبح سنتریوں سے شکایت کرتے تھے۔

اس کے پیر دبانے والا قیدی بھی اونگھ رہا تھا پھر وہ بھی ایک طرف پڑ کر سو گیا۔

”ہاں عزیز! اب بتاؤ، ایسی کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”را“ نے آپ کو مکمل طور پر پھنسانے کا پلان بنایا ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ لوگ کل یا پرسوں رات کو آپ کو کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیں گے۔ وہاں کئی اور پاکستانی بھی ہوں گے۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنہیں پولیس نے یہاں کسی نہ کسی بہانے سے گرفتار کیا ہے۔ کچھ راستہ بھٹک کر ان کی سرحد میں آگئے ہیں اور کچھ ماہی گیر ہیں۔ پولیس آپ کو وہاں لے جائے گی۔ پھر اخبارات اور ٹی وی کے نمائندوں کی موجودگی میں وہاں چھاپا مارا جائے گا اور سب رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا جائے گا۔ رنگے ہاتھوں ان معنوں میں کہ آپ لوگ پاکستانی دہشت گرد ہیں اور وہاں بیٹھ کر انڈیا کے خلاف اہم منصوبے بنا رہے ہیں۔ آپ کو انہوں نے پاکستانی خفیہ ایجنسی کا ایجنٹ ظاہر کیا ہے اس لیے آپ ان کے لیڈر ہوں گے۔ آپ کے پاس سے نہ صرف آپ کا پاسپورٹ بلکہ دوسرے ایسے کاغذات بھی برآمد ہوں گے جو آپ کی آئندہ پلاننگ کا حصہ ہوں گے۔“

”مجھے کہاں لے جایا جائے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بات ابھی تک بالکل خفیہ ہے اور صرف ”را“ کے چیف اور دوسرے بڑے افسروں کے علم میں ہو گی۔ آر کے صاحب باوجود کوشش کے یہ بات معلوم نہیں کر سکے کہ آپ کو کہاں لے جایا جائے گا ورنہ وہ راستے ہی میں آپ کو ان لوگوں کی قید سے چھڑا لیتے۔ اب تو جو کچھ بھی کرنا ہے، آپ ہی کو کرنا ہے۔ میں نے یہ بات اس لیے آپ کو بتا دی کہ آپ ذہنی طور پر تیار رہیں۔ ممکن ہے یہ لوگ آپ کو یہاں سے بے ہوش کر کے لے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ کریں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”یار عزیز! مرنا تو ایک دن ہے ہی۔ اگر کہیں سے کوئی ہتھیار مل جاتا تو میں کم از کم ان کے دو چار آدمیوں کو ساتھ لے کر تو مرتا۔“

www.pkdigest.com

"میں کوشش کروں گا کہ آپ کے لیے کسی ہتھیار کا بندوبست ہو جائے لیکن یہاں ایسا کوئی انتظام ہونا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔"

"ہتھیار کی فکر کیوں کرتے ہو کامران بابو؟" اچانک رگھو نے کہا تو عزیز کے ساتھ ساتھ میں بھی بری طرح اچھل پڑا۔

"تم سمجھ رہے تھے کہ رگھو سو رہا ہے۔ رگھو اگر نیند کا اتنا ہی کچا ہوتا کامران بابو تو اس کے دشمن اب تک اسے قتل کر کے کھا چکے ہوتے۔ میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ تم آر کے جیسے بڑے ڈان کے آدمی ہو۔ میں تو چھوٹا موٹا ایک بدمعاش ہوں۔ کسی زمانے میں راجن کے لیے کام کرتا تھا لیکن وہ پرلے درجے کا کمینہ آدمی ہے۔ ہمارے دھندے میں بے ایمانی بھی بہت ایمان داری کے ساتھ کی جاتی ہے۔ جہاں تک ہتھیار کا مسئلہ ہے، وہ کل تک آر کے صاحب حل کر دیں گے ورنہ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کوئی ہتھیار مل جائے۔"

عزیز نے مجھے مزید الجھن میں ڈال دیا۔ مجھے اپنی موت کا افسوس نہیں تھا۔ مرنا تو ایک دن سب کو ہے لیکن ایسی رسوا کن موت! مرنے کے بعد مجھے پاکستانی ایجنسی کے ایجنٹ کے طور پر پیش کیا جائے اور میری وجہ سے پاکستان اور بھارت کے کشیدہ تعلقات میں مزید تناؤ پیدا ہو...!

مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ رگھو بھی جاگ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "رگھو! تمہارے پاس سگریٹ ہے؟"

"تم سگریٹ پیو گے کامران بابو! اس کا مطلب ہے کہ تم کچھ زیادہ پریشان ہو۔" اس نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میرا بس چلتا تو میں بھی تیرے ساتھ ہی چلتا لیکن میں بھی مجبور ہوں۔ اندر میرے بھی کچھ آدمی ہیں۔ میں ان کے ذریعے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ تمہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ یہ معلوم ہو جائے تو آر کے صاحب تمہیں منٹوں میں ان کی قید سے چھڑا لیں گے۔"

☆☆☆

دوسرا دن بھی یونہی گزر گیا۔ کسی نے میری خبر نہیں لی۔ رات گئے عزیز نے بتایا۔ "آج چار بجے کے قریب آپ کو یہاں سے لے جایا جائے گا۔ اب پتا نہیں اس کے لیے وہ کوئی عام گاڑی استعمال کریں گے یا آرمرڈ کار۔"

"ہتھیار کا بندوبست ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"آر کے صاحب نے بہت کوشش کی کہ کم از کم آپ کو ایک گن ہی دے دی جائے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میرے یہ ہاتھ بھی کسی ہتھیار سے کم نہیں ہیں۔ کچھ اندازہ ہے کہ وہاں پولیس والوں کی تعداد کیا ہوگی؟"

"وہاں پولیس کی اچھی خاصی نفری ہوگی۔ آپ کے علاوہ دس بارہ آدمی اور ہیں۔ پولیس کمشنر میڈیا کی موجودگی میں وہاں چھاپا مارے گا اور گرفتاری کا ڈراما کرے گا۔"

اسی وقت رگھو میرے پاس آیا اور بولا۔ "کامران بابو! ہتھیار کا بندوبست ہوا؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے ایک دو دھاری خنجر کا انتظام کر لیا ہے۔ کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہی ہے۔ بس اسے چھپانا آپ کی ذمے داری ہے۔ پولیس والوں نے اگر یہاں سے روانگی کے وقت تلاشی لے لی تو وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ویسے وہ بہت خوف ناک خنجر ہے۔ اتنا تیز دھار ہے کہ انسانی جسم کو یوں کاٹ دیتا ہے جیسے وہ انسانی گوشت نہ ہو، مکھن کی ٹکیا ہو۔ میں نے بھی بہت جتن کر کے وہ خنجر باہر سے منگوایا ہے۔"

اس نے بہت محتاط انداز میں خنجر میرے حوالے کر دیا۔ وہ چمڑے کے خوب صورت کور میں تھا۔ اسے پنڈلی پر بہت آسانی سے باندھا جا سکتا تھا۔ اس کا دستہ بہت خوب صورت تھا۔ اسے پلک جھپکتے میں نکالا بھی جا سکتا تھا۔ میں نے وہ خنجر نکال کر دیکھا۔ اس کی دھار جھلملا رہی تھی۔ اس کی بناوٹ اوپر سے صلیب کی طرح تھی جس سے گرفت مزید مضبوط ہو جاتی ہے۔

وہ تو غنیمت ہے کہ میں نے اس وقت ٹائٹ جینز نہیں پہن رکھی تھی۔ ورنہ اس خنجر کو چھپانا ہی ایک مسئلہ ہو جاتا۔

میں نے اسے اپنی بائیں پنڈلی پر باندھ لیا۔ میں کوشش کرتا تھا کہ کوئی بھی ہتھیار میں اپنے بائیں ہاتھ پر رکھوں تاکہ میرا دایاں ہاتھ آزاد رہے۔

خنجر باندھنے کے بعد رگھو اور عزیز نے میرا تنقیدی جائزہ لیا اور کہا کہ جب تک پولیس جامہ تلاشی نہ لے، اسے خنجر کا علم نہیں ہو سکتا۔

تقریباً ساڑھے تین بجے کے قریب پولیس اسٹیشن میں ہلچل شروع ہو گئی۔ میرے پاس آر کے کے دیے ہوئے تقریباً پچاس ہزار روپے تھے۔ میں نے رگھو سے کہا کہ یہ رقم تم رکھ لو ورنہ پولیس والوں کے ہتھے چڑھ جائے گی۔

"تم اتنے مایوس کیوں ہو کامران بابو! بھگوان نے چاہا تو تم ان لوگوں کی قید سے آزاد ہو جاؤ گے... پھر تمہیں اس رقم کی ضرورت پڑے گی۔ میرے لیے آر کے صاحب سے بس اتنی سفارش کر دینا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ شامل کر لیں۔"

"اس کی تو تم فکر ہی مت کرو۔" عزیز نے کہا۔ "کامران صاحب کی مدد کر کے تم ہمارے گینگ میں شامل ہو چکے ہو... میں بھی آر کے صاحب کو بتاؤں گا اور کامران صاحب بھی تمہاری سفارش کر دیں گے۔"

اسی وقت پولیس کا ایک انسپکٹر اور چار کانسٹیبل لاک اپ کے باہر آ کر رک گئے۔

"کامران!" انسپکٹر نے کہا۔ "تمہیں پوچھ گچھ کے لیے یہاں سے کہیں اور شفٹ کیا جا رہا ہے۔" سنتری نے دروازہ کھولا اور انسپکٹر نے مجھے ہتھکڑیاں لگا دیں۔ وہ تو شکر ہے کہ اسے بیڑیاں ڈالنے کا حکم نہیں ملا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ پشت پر کر کے ہتھکڑی لگائی تھی۔ اس پوزیشن میں آدمی نہ بھاگنے کے قابل ہوتا ہے، نہ کچھ کرنے کے۔

پھر انسپکٹر نے جیب سے چمڑے کا ایک چشمہ سا نکالا اور بولا۔ "اسے بلائنڈ فولڈ کہتے ہیں۔" اس نے وہ چشمہ میری آنکھوں پر باندھ دیا۔ آر کے کی دی ہوئی رقم میں ایک رومال میں باندھ کر دوسری پنڈلی پر باندھ چکا تھا۔

پھر وہ لوگ مجھے دھکیلتے ہوئے وہاں سے لے چلے۔ تھانے کے طویل کوریڈور طے کرنے کے بعد ہم پولیس اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ گئے۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا کے جھونکے اس وقت مجھے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ پھر انسپکٹر نے مجھے کسی گاڑی میں دھکیل دیا۔

وہ پولیس کار نہیں، بلکہ عام کار تھی۔ میرے اردگرد دو آدمی بیٹھ گئے۔ ان کے جسم سے ایسا تعفن اٹھ رہا تھا جیسے وہ مہینوں سے نہائے نہیں ہیں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ٹویوٹا گاڑی تھی کیونکہ اس سے چھوٹی گاڑی میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ تین آدمی آرام سے عقبی سیٹ پر بیٹھ سکیں۔ ممکن ہے گاڑی کے شیشے بھی رنگین ہوں جن سے اندر کا منظر نظر نہیں آتا۔

گاڑی چلی تو مجھے خوش گوار ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ گویا وہ گاڑی ایئرکنڈیشنڈ تھی۔

ان لوگوں نے شاید جان بوجھ کر مجھے پولیس کی کسی جیپ میں نہیں نکالا تھا۔

گاڑی تقریباً ایک گھنٹے تک چلتی رہی۔

میں نے ہنس کر پوچھا۔ "کیا تم لوگ مجھے بائی روڈ ممبئی لے جا رہے ہو؟"

"خاموش بیٹھو۔" میرے برابر بیٹھے ہوئے متعفن زدہ شخص نے کہا جو یقینی طور پر پولیس کا کانسٹیبل تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ گاڑی تقریباً سوا گھنٹے تک چلنے کے بعد رک گئی تھی۔ ہارن بجانے پر کوئی آہنی گیٹ کھولا گیا پھر گاڑی اندر داخل ہوئی تو اسے دوبارہ بند کر دیا گیا۔

انسپکٹر پسنجر سیٹ پر تھا۔ اس نے گاڑی سے اتر کر پہلے میری آنکھوں سے چمڑے کا وہ اندھا چشمہ اتارا۔ وہ کوئی وسیع و عریض بنگلا تھا۔ اس میں پولیس کی دو جیپیں پہلے سے موجود تھیں۔ انسپکٹر مجھے دھکیلتا ہوا آگے بڑھا اور برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ مجھے ایک کوریڈور میں لے گیا۔ وہاں ایک انسپکٹر اور پولیس کے تین سپاہی موجود تھے۔

"سب ٹھیک تو ہے نا؟" مجھے لانے والے انسپکٹر نے پوچھا۔

"ہاں، سب کچھ ٹھیک ہے۔ دوسرے لوگوں کو بھی یہاں شفٹ کر دیا گیا ہے، ان کی تعداد گیارہ ہے۔ بارھواں ہمارا یہ سورما ہے۔"

"پولیس کی نفری کتنی ہے؟" مجھے لانے والے انسپکٹر نے پوچھا۔

"یہاں اس وقت دو سب انسپکٹر اور بارہ سپاہی ہیں۔ ہمیں ملا کر کل چودہ آدمی ہیں۔"

"تم کیوں ملا رہے ہو؟ ہم تو صبح کمشنر صاحب کے ساتھ یہاں چھاپا ماریں گے۔"

پھر وہ مجھے دھکیلتے ہوئے ایک کشادہ ہال میں لائے۔ وہاں فرش کے بجائے کرسیوں پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے شیو کئی دن کے بڑھے ہوئے تھے اور کپڑے میلے تھے۔ اس ہال کمرے میں ایک طویل میز تھی جس پر ایک کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے جانے سے پہلے میری جیب میں میرا پاسپورٹ اور کچھ کاغذات ٹھونس دیے۔ "اس وقت سوا پانچ بج رہے ہیں صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ تم لوگوں کو چند گھنٹوں کی رعایت دی گئی ہے۔ ٹھیک گیارہ بجے تم لوگوں کو ایک دفعہ پھر گرفتار کیا جائے گا۔ ہم لوگ ہال کمرے سے باہر ہیں۔ تم لوگ چاہو تو آپس میں بات چیت کر سکتے ہو۔ یہ کامران تمہارا لیڈر ہے۔ تم موجودہ حالات پر اس سے گفتگو کر سکتے ہو۔" یہ کہہ کر وہ سب باہر چلے گئے اور دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔

ان لوگوں نے ہمیں دہشت گرد ثابت کرنے کا پورا انتظام کر دیا تھا۔ کمرے میں ٹیبل بھی تھی اس پر ایک لیپ ٹاپ اور ایک کمپیوٹر بھی تھا۔ ٹیبل پر کچھ کاغذات بھی بکھرے ہوئے تھے۔ وہاں کچھ بال پوائنٹس بھی پڑے تھے۔ پولیس کمشنر اگر وہاں چھاپا مارتا تو ہم دنیا کو کسی بھی قیمت پر یقین

www.pkdigest.com

نہیں دلا سکتے تھے کہ ہمارا پاکستانی ایجنسی یا کسی دہشت گرد تنظیم سے تعلق نہیں ہے۔

ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں آیا۔ اگر ہم دہشت گرد تھے تو ہمارے پاس سے اسلحہ بھی برآمد ہونا چاہیے تھا۔ وہاں تو اسلحے کے نام پر پنسل تراشنے والا چاقو تک نہیں تھا۔ میز پر جگہ جگہ چائے کے کپ اور کھانے کے خالی برتن بکھرے ہوئے تھے۔ گویا ہم اس مکان میں کئی دن سے مقیم تھے اور کام میں اتنے مصروف تھے کہ ہمیں میز پر سے چائے اور کھانے کے برتن تک ہٹانے کا وقت نہیں ملا تھا۔

میرے عین سامنے کرسی پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ دوسروں کے مقابلے میں اس کے چہرے پر مجھے گھبراہٹ کے بجائے اعتماد نظر آیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"میرا نام ناصر علی ہے۔ کراچی سے تعلق ہے اور میں نے کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں نہ صرف انجینئرنگ کی ڈگری لی ہے بلکہ ایم سی ایس بھی کیا ہے۔ میں اپنی بیوی کو انڈیا گھمانے لایا تھا۔ اسے تاج محل دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میرے پاس آگرے کا ویزا نہیں تھا لیکن میرے کزن نے کہا کہ دہلی سے آگرہ دور ہی کتنا ہے۔ ہم صبح جائیں گے تو شام تک واپس آجائیں گے۔ میں اس کی باتوں میں آ گیا۔ آگرہ سے واپسی پر متھرا میں بس کے مسافروں کی چیکنگ ہوئی اور پولیس نے مجھے دھر لیا۔"

"اور تمہاری بیوی؟" میں نے پوچھا۔

"اس وقت میرے کزن نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ یہ میری بیوی ہے۔ یوں میری بیوی ان کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئی۔ ہم تو ہنی مون منانے آئے تھے۔ کیا خوب ہنی مون منایا ہے۔"

بقیہ لوگوں کی کہانیاں بھی مختلف نہیں تھیں۔ ناصر کے علاوہ تین نوجوان مزید ویزا نہ ہونے کی وجہ سے گرفتار ہوئے تھے۔ ان کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ تین آدمی راستہ بھٹک کر بھارت کی سرحد میں آ نکلے تھے۔ ان میں سے دو کا تعلق لاہور اور ایک کا تعلق سیالکوٹ سے تھا۔ دو تین ماہی گیر تھے جو راستہ بھٹک کر بھارتی سمندری حدود میں آ نکلے تھے۔ وہ لوگ اپنے اپنے ٹرالے (ماہی گیری کی کشتی) کے مالک تھے، اس لیے پڑھے لکھے بھی تھے۔ شاید بھارتی حکومت نے انہیں اسی وجہ سے ہمارے گروپ میں شامل کیا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ یہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کا وقت نہیں تھا۔

میں نے زور زور سے آواز دی۔ "سنتری بادشاہ... سنتری جی!" فوراً ہی سانڈوں کی طرح دو پلے پلائے سپاہی اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے انتہائی اکھڑ لہجے میں پوچھا۔

"کیا بات ہے اوئے... کیوں شور مچا رہے ہو؟"

"مجھے باتھ روم جانا ہے ورنہ تم کہو تو میں یہیں بیٹھے بیٹھے بھی فارغ ہو سکتا ہوں۔"

"ایک منٹ صبر کرو۔" اس نے کہا۔ "میں ایس آئی صاحب سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔"

"ایس آئی صاحب سے کیا پوچھو گے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ کہ میں پیشاب کروں یا نہ کروں؟"

سپاہی مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایس آئی نیند میں جھومتا ہوا وہاں آیا اور بولا۔ "اسے پیشاب کرنا ہے تو لے جا۔ مجھے بے آرام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"سر جی! قیدی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے۔ اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں۔ اس طرح بندھے ہاتھوں کے ساتھ وہ کیا کر سکتا ہے؟"

"ہتھکڑی کی چابی کس کے پاس ہے؟" ایس آئی نے پوچھا۔

"صاحب! انسپکٹر صاحب جاتے ہوئے ان سب کی چابیاں آپ کو دے گئے تھے۔" سپاہی نے کہا۔

"ہاں، مجھے یاد آ گیا۔ اس کی ہتھکڑی کا نمبر دیکھو اور چابی نکال لاؤ۔" ایس آئی نے کہا۔ وہ نیند میں جھوم رہا تھا۔ پھر وہ چونک کر بولا۔ "مگر نہیں... اس کی ہتھکڑی تو کھولنا ہی نہیں ہے۔ یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ انسپکٹر صاحب بتا رہے تھے کہ یہ پاکستانی خفیہ ایجنسی کا ایجنٹ ہے۔ اسے تو اسی طرح باتھ روم لے جاؤ۔ اس کے لیے تو تمہیں ہی محنت کرنا ہوگی۔"

"سر جی... مجھے؟" سپاہی نے کہا۔ "میں اسے باتھ روم لے جاؤں...؟"

"اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے۔ پولیس میں آئے ہو تو ہر کام کرنا پڑے گا اور اب میری نیند خراب مت کرنا۔ ویسے بھی ایک گھنٹے بعد پولیس کے دوسرے بڑے افسر یہاں آجائیں گے۔" ایس آئی نے منہ پھاڑ کر کتے کی طرح جماہی لی اور دوبارہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

پولیس کا سپاہی مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے نظروں ہی نظروں میں مجھے کھا جائے گا۔ وہاں موجود دوسرے لوگ بھی جاگ رہے تھے اور پولیس والے کی اس کیفیت سے لطف

اندوز ہو رہے تھے۔ پھر سپاہی نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ "تو کیا سمجھتا ہے کہ تو بہت توپ قسم کی کوئی چیز ہے۔ میں ایک تھپڑ زور سے ماروں تو تو دوبارہ اپنی جگہ سے اٹھ نہ سکے۔ میرے افسر پتا نہیں تجھ جیسے بیرو سے کیوں ڈر رہے ہیں؟ میرے پاس چابی ہوتی تو میں کسی سے پوچھے بغیر تیری ہتھکڑی کھول دیتا۔"

"او بھائی! تمہاری تقریر میں میرا کام ہو جائے گا۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "میں تو بہت سیدھا اور مسکین انسان ہوں۔ تمہارے یہ افسر پتا نہیں کیوں مجھ سے ڈر رہے ہیں۔ میں تو یہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتا۔ اندر تم لوگ موجود ہو اور باہر فوجیوں کا پہرا ہے۔"

"فوجیوں کا پہرا ہے؟" سپاہی نے حیرت سے کہا۔ "یہ تجھ سے کس نے کہا کہ باہر فوج ہے؟ اوئے! تم لوگ اتنے بڑے دہشت گرد نہیں کہ تمہارے لیے فوج... بلائی جائے۔ ہمارے افسر نے تجھے ڈرانے کو کہا ہوگا ورنہ تمہارے جیسوں کے لیے تو ہمارے بارہ آدمی بھی بہت ہیں۔"

"تم مجھے لے جا رہے ہو یا پھر میں تمہارے ایس آئی کو آواز دوں؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"چلو، پھر ہو جا..." اس نے اپنی بغل میں [illegible] اتارے بغیر کہا اور مجھے دھکیلتا ہوا کوریڈور میں ایک طرف لے چلا۔ ہال کے برابر میں تیسرے کمرے کے دروازے پر رک کر اس نے دھکا دے کر دروازہ کھولا اور کمرے کی لائٹ جلا کر باتھ روم کی طرف بڑھا۔ وہ بھی کوئی بیڈ روم تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بنگلہ کسی پوش علاقے میں تھا اور حکومت نے باقاعدہ منصوبے کے تحت اسے حاصل کیا تھا تاکہ دنیا کو دکھایا جا سکے کہ پاکستانی دہشت گرد کس بڑے پیمانے پر اپنا نیٹ ورک چلا رہے ہیں۔

میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس صورت حال سے کیسے فائدہ اٹھاؤں؟ لیکن میرے پاس بھی یہ آخری موقع تھا۔ اس کے بعد شاید پھر مجھے یہ موقع نہ مل پاتا۔

سپاہی نے باتھ روم کی لائٹ آن کی اور مجھے باتھ روم میں دھکیل دیا۔ وہ اپنے افسر کا سارا غصہ مجھ پر اتار رہا تھا۔

میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے میرے شانوں میں درد ہو رہا تھا۔ پھر ہتھکڑی بھی روایتی نہیں بلکہ جدید قسم کی اسٹین لیس اسٹیل کی تھی۔ ان ہتھکڑیوں کی چابیاں بھی مخصوص ہوتی ہیں۔

سپاہی جونہی میرے سامنے آیا، میں نے اپنا گھٹنا پوری قوت سے اس کے پیٹ میں دے مارا۔ اس کے منہ سے کربناک آواز نکلی اور وہ دہرا ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ چند لمحے کے لیے اس کا سانس بھی رک گیا ہوگا۔ وہ تکلیف سے دہرا ہوا تو میں نے اس کی کھوپڑی پر اپنے سر سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ شرابیوں کی طرح آگے پیچھے ڈولا پھر فرش پر گرنے لگا۔ میں نے اپنے جسم سے اسے گرنے سے روکا ورنہ گرنے سے اچھا خاصا دھماکا ہوتا۔ اسے حتی الامکان میں نے آہستگی سے فرش پر گرا دیا۔

پھر میں نے باتھ روم ہی میں اچھل کود کر کے اپنے جسم کو وارم اپ کیا اور اپنے دونوں ہاتھ حتی الامکان نیچے تک پہنچا دیے۔ میں نے اپنے جسم کو کمان کی طرح موڑا۔ اس وقت میری ایکسرسائز کام آئی۔ میں نے تھوڑی سی کوشش سے اپنے دونوں ہاتھ جسم کے پچھلے حصے سے گزار کر سامنے کر لیے۔

مسئلہ اب بھی اس منحوس ہتھکڑی کا تھا جس کی چابی اس نیند میں غرق ایس آئی کے پاس تھی۔

میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ ان کے درمیان تقریباً ڈیڑھ دو فٹ لمبی اسٹیل کی مضبوط زنجیر تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ زنجیر صرف کسی آری سے کٹ سکتی ہے۔ ہتھکڑی بھی آری سے کٹ سکتی تھی لیکن اس کے لیے کم از کم ایک گھنٹا درکار ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ وہاں آری کا موجود ہونا بھی شرط تھا۔

سب سے مشکل مرحلہ اس ہتھکڑی سے نجات حاصل کرنا تھا۔ میں اس دروازے پر پہنچ گیا جہاں سے خراٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ پولیس والے اسی کمرے میں ہوں گے۔ ممکن ہے وہ دوسرے کمروں میں بھی ہوں لیکن یہ رسک تو مجھے بہرحال لینا ہی تھا۔

میں نے کوریڈور میں جلنے والے دو بلبوں میں سے ایک بند کر دیا۔ پھر میں نے کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دوسری دستک کے جواب میں مجھے اسی ایس آئی کی آواز سنائی دی جس نے سپاہی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مجھے ہتھکڑی سمیت لے جائے۔

"اب کیا بات ہے؟" وہ اندر سے غرایا۔

میں نے حتی الامکان اس سپاہی کی آواز اور لہجہ بنا کر کہا۔ "یہ نہیں مانتا صاحب جی! کہتا ہے کہ مجھے شرم آ رہی ہے۔"

"اس کی تو..." ایس آئی نے مجھے انتہائی غلیظ گالی دی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

وہ جونہی باہر نکلا، میں نے خنجر سے وار کرنے کے

بجائے ہتھکڑی کی زنجیر کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا اور جھٹکا دے کر اسے مزید باہر کھینچ لیا۔

''کک... کون ہو تم؟'' اس نے بوکھلا کر گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

''میں... موت ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ہم لوگ اسے موت کا فرشتہ کہتے ہیں۔ ہتھکڑی کی چابی کہاں ہے؟''

''وہ میرے پاس نہیں ہے۔'' ایس آئی نے کہا۔

میں نے اس کی گردن کے گرد زنجیر کا دباؤ مزید بڑھایا اور اسے جھٹکا دے کر فرش پر گرا دیا۔ ''چابی تو خیر میں لے ہی لوں گا لیکن تیری زندگی پر ہمیشہ کے لیے موت کا تالا پڑ جائے گا۔'' میں نے زنجیر کی گرفت خطرناک حد تک بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بتاتا ہوں... مجھے... سانس تو... لینے دو۔'' اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

میں نے گرفت کچھ ڈھیلی کر دی۔ ''بتاؤ، چابیاں کہاں ہیں؟''

''چابیاں کمرے کے سیف میں ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کمرے میں تمہارے علاوہ اور کون ہے؟''

''ایس آئی وشواناتھ۔'' اس نے جواب دیا۔

''اندر چلو۔'' میں نے کہا اور جھٹکا دے کر اسے کھڑا کر دیا۔

میرے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے گرد تھے۔ میں نے بیدردی سے اس کا رخ موڑا اور اسے کمرے میں چلنے کے لیے دھکا دیا۔

میں جونہی کمرے میں داخل ہوا، کوئی سخت سی چیز میری گردن سے آ لگی اور کوئی درشت لہجے میں بولا۔ ''اسے چھوڑ دے اور دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جا۔ اب مجھے تیرے پیر بھی باندھنا پڑیں گے۔ تو کیا سمجھتا ہے، ہم اتنے ہی بے خبر ہیں کہ تو یوں آسانی سے نکل جائے گا؟ چھوڑ اسے۔''

میری مثال ایسی تھی کہ... ٹوٹی کہاں کمند!

میں نے ایس آئی کے گلے میں پڑا ہوا ہتھکڑی کی زنجیر کا پھندا نکال لیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا اور اپنی گردن ملنے لگا۔ پھر اس نے مڑ کر تابڑ توڑ میرے منہ پر کئی زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیے اور بولا۔ ''وشواناتھ! اس کے پیر باندھو اور اسے اتنی بری طرح مارو کہ یہ دوسروں پر ہاتھ اٹھانا بھول جائے۔''

میں شکست خوردہ انداز میں کھڑا تھا۔ وہ پہلے والے ایس آئی کے مقابلے میں زیادہ چالاک تھا۔ اس نے میرے سامنے آنے کی جرأت نہیں کی تھی بلکہ رائفل کی نال پشت سے میری گردن پر ہی رکھی تھی۔

وقت تیزی سے گزر... رہا تھا۔ میں ان لوگوں کو جتنا بے وقوف سمجھ رہا تھا وہ لوگ اتنے تھے نہیں۔ اب بھی وہ اوور کانفیڈنس کا شکار تھے ورنہ وہ آواز دیتے تو بقیہ آٹھ دس مسلح اہلکار بھی وہاں آ جاتے۔

وشواناتھ کی رائفل کی نال ابھی تک میری گردن سے لگی ہوئی تھی۔ اوم بار بار اپنی گردن مسل رہا تھا۔ میں نے اسے مشتعل کرنے کے لیے کہا۔ ''تم تو نازک مزاج لڑکیوں کی طرح ہو۔ ابھی تک اپنی گردن مسل رہے ہو۔ اتنے ہی نازک تھے تو پولیس میں ملازمت ہی کیوں کی تھی؟''

وہ ایک دفعہ پھر مشتعل ہو گیا اور جنونی انداز میں میری طرف جھپٹا۔

میں پھرتی سے بیٹھ گیا۔ وہ اپنے ہی زور میں وشواناتھ سے ٹکرایا اور دونوں زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ میں نے پھرتی سے رگھو کا دیا ہوا خنجر نکالا اور اوم کے سینے میں پیوست کر دیا۔ میرے ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ سے وہ خنجر دستے تک اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ مجھے اس کا افسوس ہوا۔ میں نے ایک اور جیتے جاگتے انسان کو موت کی اندھی وادیوں میں دھکیل دیا تھا۔

یہ وقت افسوس کرنے کا نہیں تھا کیونکہ اگر میں یہ نہ کرتا تو میرا انجام بھی یہی ہو سکتا تھا۔

وشواناتھ رائفل کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی۔ میں نے اس کی رائفل پر لات مار کے اسے دور کر دیا اور اس کے گلے میں ہتھکڑی کی زنجیر کا پھندا ڈال دیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں وہ چیخ کر دوسرے لوگوں کو نہ بلا لے۔

''ہتھکڑی کی چابیاں کہاں ہیں؟'' میں نے زنجیر کا دباؤ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

وہ اوم کا حشر دیکھ چکا تھا اور خون آلود خنجر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا اس لیے اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ''چابیاں... سیف میں... ہیں۔''

''سیف کھولو اور چابیاں نکالو۔'' میں نے اسے جھٹکا دے کر بیدردی سے کھڑا کر دیا۔ اس چکر میں اس کے شانے پر خنجر کا ایک چرکا بھی لگ گیا۔

''مم... مجھے... سانس... تو لینے دو۔'' اس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے اپنی گرفت کچھ ڈھیلی کر دی۔

وشواناتھ نے سیف کھولا اور اس میں سے چابیاں نکال لیں۔ ''ہتھکڑی کھولو۔'' میں نے اسے حکم دیا۔

اس نے ہتھکڑی پر لکھا ہوا نمبر دیکھا، پھر چابیوں کے گچھے میں اس نمبر کی چابی تلاش کی اور کانپتے ہاتھوں سے ہتھکڑی کھول دی۔

ہاتھ کھلتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے مجھے نئی زندگی مل گئی ہو۔ رگھو کا خنجر ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس خنجر کو اوم کے کپڑوں سے صاف کیا اور دوبارہ پنڈلی کے ساتھ باندھ لیا۔ پھر وشواناتھ سے کہا۔ ''تم اپنے سب آدمیوں کو ہال کمرے میں بلا لو۔ اگر ایک لمحے کی بھی دیر کی تو گردن دھڑ سے علیحدہ کر دوں گا۔ چلو، جلدی کرو۔''

مجھے اس الماری میں پسٹل بھی نظر آئے تھے جس میں سے وشواناتھ نے چابیاں نکالی تھیں۔ میں نے وشواناتھ کی رائفل کندھے سے لٹکائی۔ الماری سے ایک ماؤزر اور اس کے کئی فاضل میگزین نکالے اور وشواناتھ سے باہر چلنے کو کہا۔

''کوئی چالاکی مت دکھانا۔ میں ایجنسی کا ٹرینڈ بندہ ہوں اور لمحے میں گولی چلا سکتا ہوں۔'' میں نے اسے خوف زدہ کرنے کو کہا۔

پاکستانی ایجنسی کا نام سن کر ہی اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

ہم ہال میں پہنچے تو وہاں موجود لوگوں نے مجھے اور وشواناتھ کو حیرت سے دیکھا۔ زیادہ حیرت انہیں میرے آزاد ہونے پر تھی۔

پھر وشواناتھ نے بلند آواز میں کہا۔ ''ساونت، گوبند، راجو، سب لوگ جلدی یہاں آؤ۔ تم لوگ کیا یہاں سونے آئے تھے؟''

وہاں بھگدڑ سی مچ گئی اور لمحوں میں پولیس کے دس کمانڈوز (میرا خیال ہے کہ وہ کمانڈوز ہی ہوں گے) ہال کمرے میں آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

ہال کا منظر دیکھ کر ان سب کے چہروں کا تناؤ ختم ہو گیا۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا۔ میں سمجھا کہ سب قیدی فرار ہو گئے۔ فرار تو خیر نہیں ہو سکتے... باہر بھی ہمارے آدمی موجود ہیں... بتائیے، کیا بات ہے؟''

''اپنی رائفلیں پھینک دو۔'' وشواناتھ نے میری ہدایت کے مطابق کہا۔

''رائفلیں پھینک دیں... مگر کیوں؟'' ایک پولیس والا بولا۔

میں نے جیب سے ماؤزر نکالا اور اس آدمی کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ میں شوٹنگ کلب کا ممبر تھا اور میرا نشانہ اچھا تھا مگر مجھے امید نہیں تھی کہ میرا نشانہ اتنا اچھا ہو گا۔ میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ لیا تھا اور گولی اس کی پیشانی ہی پر لگی تھی۔ وہ اچھل کر پیچھے کی طرف گرا۔

''اب معلوم ہوا کہ کیوں؟'' میں نے کہا۔

''رائفلیں پھینکو اور زمین پر لیٹ جاؤ۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

اسی وقت میں نے دوسرا فائر کیا کیونکہ ان میں سے ایک اور سپاہی ہیرو بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بھیانک چیخ مار کے پیچھے کی طرف الٹ گیا۔

اپنے دو آدمیوں کا انجام دیکھنے کے بعد باقی میں سے کسی کی ہیرو بننے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ان سب نے رائفلیں پھینکیں اور وہ اوندھے منہ زمین پر لیٹ گئے۔

میں نے وشواناتھ کے سر پر اپنا مخصوص گھونسا مارا۔ میرے اس گھونسے اور دائیں لات کی ضرب سے بہت کم لوگ بچتے تھے۔

وشواناتھ کی کھوپڑی چٹخ گئی اور وہ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔

میں نے آگے بڑھ کر بہت پھرتی سے سپاہیوں کی رائفلیں سمیٹیں اور ناصر کی ہتھکڑی کا نمبر دیکھ کر اس کی چابی نکالی اور اس کے ہاتھ کھول دیے۔ ان سب کے ہاتھ پشت پر نہیں تھے۔ پھر میں نے ناصر سے کہا۔ ''تم باقی لوگوں کی ہتھکڑیاں کھولو۔ میں یہاں کا جائزہ لیتا ہوں۔''

میں نے وہی ہتھکڑیاں ان سپاہیوں کے ہاتھوں میں ڈال دیں جو اوندھے منہ زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ پھر انہیں ہانک کر ایک کمرے میں بند کر دیا اور انتہائی درشت لہجے میں کہا۔ ''اگر کسی نے ذرا بھی آواز نکالی یا ایک دوسرے سے بات چیت کی تو میں تم سب کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔''

ان سے نمٹنے کے بعد میں نے اپنے پاسپورٹ کا جائزہ لیا۔ وہ میرا ہی پاسپورٹ تھا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ کاغذات اور میری جیب سے نکلے۔ ان میں ہوٹل اوبرائے کا پورا نقشہ، سیکیورٹی کے انتظامات اور دیگر تفصیلات تھیں۔ دوسرا نقشہ لال قلعے کا تھا۔ اس میں بھی کچھ اسی قسم کی معلومات تھیں۔ نقشے میں ایسی جگہوں کی نشان دہی کی گئی تھی جہاں

www.pkdigest.com

سیکیورٹی نسبتاً کمزور تھی یا جہاں سے قلعے میں داخل ہونا نسبتاً آسان تھا۔ اس کے ساتھ ہی ٹائپ کیا ہوا ایک لیٹر بھی تھا۔ ”بلیک گن! آپریشن اسٹار ٹریک کی تمام تفصیلات اور آپریشن بلیک وارنٹ کی ڈیٹیل تمہارے پاس ہیں۔ میں یہاں سے تمہاری مدد کے لیے کچھ کمانڈوز بھیج رہا ہوں۔ فوراً یہ آپریشن کرو تاکہ بھارتی حکومت کی توجہ ممبئی حملوں سے ہٹ سکے۔ مجھے امید ہے کہ یہ دونوں کارروائیاں کامیابی سے کرلو گے، تمہارا مخلص!“

اس اطلاع میں کوئی تاریخ نہیں تھی۔ جب یہ نقشے، میرا پاسپورٹ اور وہ خط میری جیب سے برآمد ہوتا تو دنیا کی کوئی بھی عدالت مجھے بے گناہ ماننے سے انکار کر دیتی۔ نہ جانے اس ورما کو مجھ سے کیا پرخاش تھی یا پھر اس کے سپرد یہ مشن کیا گیا تھا کہ کسی بھی پاکستانی کو پھانس کر اس صورت حال میں ملوث کرو تاکہ دنیا کی ہمدردیاں سمیٹی جاسکیں اور پاکستان کو بین الاقوامی سطح پر رسوا اور تنہا کیا جاسکے۔

میں نے وہ چیزیں دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیں۔ اس دوران میں ناصر کمپیوٹر میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک نکالی اور اسے دیوار پر دے مارا پھر کچن میں جا کر چولہا جلایا اور ہارڈ ڈسک کو اس پر رکھ دیا۔ واپس آ کر اس نے کمپیوٹر کا مانیٹر توڑ پھوڑ دیا۔ ”تم سب لوگ مختلف سمتوں میں نکل جانا۔ کوشش کرنا کہ دوبارہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھو۔ میں بھی تم لوگوں کے لیے اتنا ہی کرسکتا تھا۔“

”آپ نے اتنا کر دیا... یہ بھی بہت ہے۔“ ایک نوجوان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ اتنا بڑا ملک ہے، ہم فوری طور پر کہیں بھی چھپ جائیں گے پھر واپسی کا کوئی راستہ تلاش کریں گے۔“

میں نے اور ناصر نے ایک ایک رائفل سنبھالی اور ہم لوگ محتاط انداز میں باہر نکلے۔

برآمدے میں دو آدمیوں کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ان میں سے ایک بولا۔ ”یار! اس پولیس کمشنر نے ایسا کون سا دہشت گرد پکڑ لیا ہے کہ وہ صبح اسے اخبار والوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے؟ پھر اس کی نگرانی کے لیے کیا پولیس کافی نہیں ہے جو اس نے بلیک کیٹس کی ڈیوٹی یہاں لگوائی ہے؟“

”ہمیں اس سے کیا۔ ہمارا تو ڈبل سے بھی زیادہ اوور ٹائم بن رہا ہے۔ لا... تو سگریٹ پلا۔“

وہ دونوں شاید ٹہلتے رہے تھے اور برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی پشت ہماری طرف تھی۔

میں نے ناصر کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ اپنی پنڈلی سے خنجر نکالا اور چیتے کی طرح ان کی پشت پر پہنچ گیا۔ اس وقت نہ جانے کیوں مجھ پر خون سوار تھا۔ میں نے سگریٹ پینے والے کی گردن پر پشت سے خنجر کا بھرپور وار کیا اور دوسرے آدمی کو پوری طاقت سے گھونسا رسید کر دیا۔ ان دونوں کو تو آواز نکالنے کا موقع بھی نہ ملا۔ میں نے ناصر کی مدد سے گھسیٹ کر انہیں لان میں لگی ہوئی ڈم ڈم کی باڑ کے پیچھے ڈالا اور محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا۔ گویا یہ تھیں ان کی کالی بلیاں یعنی بلیک کیٹس جو آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگئی تھیں۔

بنگلا بہت وسیع و عریض تھا۔ ممکن ہے وہاں مزید ”کالی بلیاں“ موجود ہوں۔ ہم دونوں بہت محتاط انداز میں گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

مین گیٹ کے نزدیک بھی بہت بڑا گارڈ روم تھا۔ وہاں بھی روشنی ہورہی تھی اور باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”بچے! اب بس کر... اور کتنے پیسے ہارے گا؟ یہ بڑا تو شاطر ہے شاطر! تیری مہینے بھر کی کمائی اور اوور ٹائم سب کچھ لوٹ لے گا۔“

”تجھے کیا پریشانی ہے؟“ کسی دوسرے نے جواب دیا۔ [illegible] یہاں [illegible] ہماری فورس اسی لیے رہ گئی ہے کہ وہ ادھر مرے پاکستانی دہشت گرد دیکھ کر ان کی نگرانی کرے۔“

وہ بھی بلیک کیٹس کے آدمی تھے۔

”تجھے اتنی ہی پریشانی ہے تو باہر کا ایک چکر لگالے۔ ٹھنڈی ہوا کھوپڑی پر لگے گی تو تیرا دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوگا۔“

”میرا دماغ اب بھی تم سے زیادہ سوچ رہا ہے۔“ پہلے آدمی نے کہا۔ ”پانچ بلیک کیٹس کا مطلب جانتے ہو؟ حکومت کا دعویٰ ہے کہ ہماری اس اسپیشل فورس کا ایک ایک جوان دس دس کمانڈوز پر بھاری ہے۔ تو اندر کیا سو سے زیادہ کمانڈوز ہیں جو ہمیں فضول میں یہاں خوار کیا جارہا ہے؟“

”ارے یار! ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہوتی ہے۔“ تیسرے نے کہا۔ ”کمشنر صاحب ہمیں کسی خارش زدہ کتے کی نگرانی کرنے کا حکم بھی دے دیں گے تو ہمیں ان کا حکم ماننا ہوگا۔“

ان کی باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ باہر صرف پانچ آدمی تھے جن میں سے اب تین رہ گئے تھے۔ پہلے دو تو بے خبری میں مارے گئے تھے۔ ان تینوں کو قابو کرنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ آخر انڈیا کی بہترین کمانڈو فورس کے لوگ تھے۔

انہیں کسی طرح وہاں سے باہر نکالنا تھا۔ میں نے ناصر سے پوچھا۔ ”تمہیں رائفل چلانا آتی ہے؟“

”میں ہر قسم کی رائفل چلا لیتا ہوں۔ میں کراچی میں تھا تو ہر مہینے شکار پر جایا کرتا تھا۔ یہ رائفل چلانا تو بہت آسان ہے۔ یہ اے کے فورٹی سیون ہے۔“

میں چونک اٹھا۔ میں نے اب تک اس پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ واقعی اے کے فورٹی سیون تھی۔ گویا پولیس نے پاکستان کو اس کیس میں ملوث کرنے کا پورا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ اے کے فورٹی سیون پاکستان کی مخصوص رائفل ہے۔

”تم یہاں جھاڑیوں میں بیٹھو۔“ میں نے ناصر سے کہا۔ ”میں ان لوگوں کو اندر سے باہر نکالتا ہوں۔“

میں نے ناصر کو ڈم ڈم کی باڑ کے پیچھے ایسی جگہ بٹھا دیا جہاں سے گارڈ روم صاف نظر آرہا تھا۔ وہ وہاں سے نکلنے والے ہر آدمی کو نشانہ بنا سکتا تھا۔

میں نے رائفل کے بجائے ریوالور کو ترجیح دی اور خود بھی جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ پھر میں نے زور زور سے کتے کی طرح بھونکنا شروع کر دیا۔

گارڈ روم وہاں سے دور نہیں تھا۔ اندر سے کوئی بولا۔ ”ابے [illegible] کہاں سے آیا؟“

”یار! باہر کہیں سے آ گیا ہوگا؟“ دوسرے آدمی نے کہا۔

”نہیں۔“ پہلا سنجیدگی سے بولا۔ ”ان پوش علاقوں میں آوارہ کتے نہیں ہوتے اور پھر کتا اندر کیسے آئے گا؟ گیٹ بند ہے۔ کتا پندرہ سولہ فٹ کی باؤنڈری وال تو پھلانگنے سے رہا۔ یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔“

”میں نے اس سے پہلے بھی فائرنگ کی آواز سنی تھی لیکن توجہ نہیں دی۔“ تیسرے آدمی نے کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ فائرنگ کہیں دور ہورہی ہے۔“

”ایک منٹ!“ پہلے آدمی کی آواز آئی۔ ”ایسے باہر مت نکلو۔ مجھے باہر خطرے کی بو محسوس ہورہی ہے۔“

وہ آدمی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی ذہین تھا اور کسی حد تک خود کو ”کالی بلی“ ثابت کر رہا تھا۔

میں گارڈ روم پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی کرالنگ کرتا ہوا وہاں سے باہر نکلا ہو۔ اس کے پیچھے دوسرا آدمی بھی اسی طرح باہر نکلا۔ وہ واقعی ٹرینڈ کمانڈوز تھے۔ وہ لوگ چھپکلی کی طرح تیزی سے کرالنگ کر رہے تھے۔

کمرے سے نکلنے کے بعد وہ لوگ مختلف سمتوں میں پھیل گئے تھے۔ ان میں سے ایک اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ باڑ ایسی نہیں تھی کہ وہاں مجھ جیسے تن و توش کا آدمی بالکل ہی چھپ کر بیٹھ جاتا۔

وہ اگر اچانک میرے سامنے آجاتا تو پہلی ہی نظر میں مجھے دیکھ لیتا۔ وہ جب مزید کچھ آگے بڑھا تو میں نے چھوٹا سا ایک پتھر اٹھا کر مخالف سمت میں پھینک دیا۔ وہ چونک کر اس طرف پلٹا۔ میرے لیے یہی وقفہ کافی تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگائی اور اپنا دو دھاری خنجر اس کی پیٹھ میں پیوست کر دیا۔ میں نے احتیاطاً اس کا منہ بھی دبا لیا تھا۔ خنجر دستے تک اس کی پیٹھ میں پیوست ہوگیا تھا۔ وہ چند لمحے تڑپا پھر ساکت ہوگیا۔ میں نے خنجر نکالا تو خون کا ایک فوارہ سا نکلا جس سے میرے کپڑے خراب ہوگئے۔

اچانک مجھے رائفل چلنے کی آواز آئی پھر فوراً ہی ایک کرب ناک چیخ سنائی دی۔ گویا دوسرے آدمی کو ناصر نے گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔

اچانک کسی نے پشت سے مجھ پر چھلانگ لگائی اور میرا گلا دبوچنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ بلاشبہ انتہائی طاقتور تھا اور لڑنے بھڑنے کے فن میں طاق تھا۔ اس نے اپنے گھٹنے سے میری ریڑھ کی ہڈی کو نشانہ بنانا چاہا لیکن عین وقت پر میں دائیں طرف کھسک گیا۔ اس کا گھٹنا زمین پر پڑا۔ میری گردن ابھی تک اس کے قبضے میں تھی لیکن اسے علم نہیں تھا کہ موت کا دو دھاری فرشتہ ابھی تک میرے ہاتھ میں ہے۔ میں نے اطمینان سے اس کے پہلو پر وار کیا تو اس کے حلق سے ایک غراہٹ سی نکلی اور وہ پہلو کے بل مجھ ہی پر گر گیا۔ میں نے اس کا جسم اپنے اوپر سے اچھالا اور دوسرا وار اس کے سینے پر کیا۔ میرا دو دھاری خنجر اس کے سینے میں یوں اتر گیا جیسے وہ انسان نہ ہو صابن کی ٹکیہ ہو۔ وہ چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

میں نے ناصر کو آواز دی اور اس کی مدد سے ان کی تلاشی لی۔ ان کی جیبوں سے سوائے کرنسی نوٹوں کے کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ میں نے ان لاشوں کو دوبارہ گارڈ روم میں پھینکا تو ناصر نے مجھ سے کہا۔ ”کامران صاحب! یہاں کپڑے بھی موجود ہوں گے۔ آپ کے کپڑے اور چہرہ خون میں تر ہے۔ آپ خون کے دھبے صاف کر کے کپڑے بدل لیں ورنہ باہر نکلتے ہی آپ پکڑے جائیں گے۔“

اس کا مشورہ معقول تھا۔ الماری میں کپڑے موجود تھے۔ میں نے باتھ روم جا کر گرم پانی سے شاور لیا اور

www.pkdigest.com

دوسرے کپڑے پہن لیے۔ جینز اور جیکٹ تو میرا پسندیدہ لباس تھا۔ جینز تھوڑی لوز تھی لیکن میں نے بیلٹ کے ذریعے اسے ٹائٹ کرلیا۔ جیکٹ البتہ میرے جسم پر تقریباً فٹ تھی۔ اپنے کپڑوں کا گولہ بنا کر میں کچن میں گیا اور چولہا جلا کر انہیں اس پر رکھ دیا۔ اس سے پہلے میں نے کپڑوں کی جیبوں سے تمام چیزیں نکال لی تھیں۔

جب میرے کپڑوں کی صرف راکھ رہ گئی تو میں کچن سے باہر آگیا۔

ناصر میرے ساتھ ساتھ تھا۔ ان تمام لوگوں میں صرف ناصر ہی تھا جو مستعد...... اور پڑھا لکھا تھا۔ باقی لوگ تو معصوم سے پاکستانی شہری تھے۔ ان میں چند تو بالکل ان پڑھ تھے۔ وہ بے چارے تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ یہاں سے انہیں رہائی ملے گی بھی یا نہیں۔

میرے پاس آر کے کے دیے ہوئے تقریباً پچاس پچپن ہزار روپے تھے۔ میں ہال میں آیا تو وہ سب امید بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''تم لوگوں کے پاس انڈین کرنسی ہے؟''

ان سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ایک نوجوان نے کہا۔ ''پولیس والے تلاشی کے بعد جیبوں میں کچھ چھوڑتے کب ہیں؟''

میں نے ناصر کو پیسے دے کر کہا۔ ''ان سب کو تین تین ہزار روپے دے دو۔ ان پیسوں سے یہ لوگ کم سے کم اس جگہ سے تو کہیں دور چلے جائیں گے۔''

ناصر نے ان سب کو پیسے دے دیے۔ میں نے پانچ ہزار روپے اسے بھی دیے۔ اس نے دو ہزار روپے مجھے واپس کر دیے اور کہا کہ جب یہ لوگ تین ہزار میں گزارہ کر سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں کر سکتا؟

مجھے اس کی یہ بات پسند آئی۔ پھر میں دوسرے لوگوں سے مخاطب ہوا۔ ''تم سب ایک ایک، دو دو کر کے یہاں سے نکل جاؤ۔ میں نہیں جانتا کہ اس وقت ہم کہاں ہیں لیکن تلاش کرنے کے بعد معلوم ہو ہی جائے گا۔ بس کوشش یہ کرنا کہ ان راستوں پر نہ چلو جن پر گاڑیوں کے نشانات ہوں... کیونکہ وہ لوگ انہی راستوں سے آئیں گے۔ جاؤ، اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔''

وہاں موجود ایک ایک شخص مجھ سے گلے ملا اور باہر نکل گیا۔

افق پر صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ ناصر ابھی تک میرے ساتھ موجود تھا۔ میں نے اس سے بھی کہا۔ ''تم کیا سوچ رہے ہو؟ جلدی کرو۔ اب وہ لوگ کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔''

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔'' ناصر نے کہا۔

''احمقانہ باتیں مت کرو۔ میرے ساتھ تم پکڑے گئے تو پھانسی کے پھندے کے تختے سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔'' میں نے بہت مشکل سے اس کو جانے پر راضی کیا۔ چلتے ہوئے میں نے اسے اپنا ای میل ایڈریس دے دیا اور کہا کہ انشاء اللہ جلد ہی پاکستان میں ہماری ملاقات ہوگی۔

وہ بھی بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔

اب میں اس وسیع و عریض بنگلے میں چند لاشوں اور قیدیوں کے ساتھ تنہا تھا۔ وہاں عجیب سا پُرہول سناٹا تھا جو میری روح میں اترا جا رہا تھا۔

میں نے بھی آخری نظر اس بنگلے کے کمروں پر ڈالی اور مطمئن ہو کر باہر آگیا۔

اب صبح کا اجالا ہر طرف پھیلنے لگا تھا۔ وہ بنگلا عجیب سے ویران علاقے میں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کون سی سمت میں جانا چاہیے۔

پھر میں اللہ کا نام لے کر مشرق کی سمت چل پڑا۔ وہ راستہ عام استعمال میں نہیں تھا اس لیے اس پر خودرو اور کانٹے دار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میرے پیروں میں موٹے سول کے جوگرز نہ ہوتے تو میرے تلوے لہولہان ہو جاتے۔

چلتے چلتے مجھے کافی دیر گزر گئی تھی۔ اچھی خاصی دھوپ نکل آئی تھی لیکن اب تک مجھے کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ نہ ہی کوئی سڑک نظر آئی تھی جس پر گاڑیاں گزر رہی ہوں۔

میں راستہ بدل کر پھر روانہ ہو گیا۔ پیاس کی وجہ سے میرا حلق سوکھ رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے چلتے ہوئے کم سے کم دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔

میں تھک کر اسی راستے پر آگیا جو عام لوگوں کے استعمال میں تھا۔

اچانک مجھے گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ میں پھرتی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر مجھے اپنی اس حرکت پر خود ہی ہنسی آگئی۔

وہ کوئی بیل گاڑی تھی۔ بیلوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ اس گاڑی میں بھوسا لدا ہوا تھا اور گاڑی بان پوربی کا کوئی گیت بلند آواز میں گا رہا تھا۔

میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ ''کیا بات ہے بابو صاحب! اتنے سویرے سویرے اس جنگل میں کیسے نکل آئے؟''

''یہاں نزدیک میں کوئی مکینک ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ اسے کوئی مکینک ہی ٹھیک کر سکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے مستری؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، مستری... وہ جو گاڑیاں ٹھیک کرتے ہیں۔''

''یہاں تو تمہیں کوئی مکینک نہیں ملے گا۔''

''کوئی نزدیکی بس کا اڈا جہاں سے میں بس میں بیٹھ کر مکینک لا سکوں؟'' میں نے پوچھا۔

''لاری اڈا بھی یہاں سے چھ سات میل دور ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہاں، میں تمہیں کرشنا پور تک چھوڑ سکتا ہوں۔ وہاں سے تمہیں لاری اڈے تک کوئی سواری مل جائے گی۔ آج کل لونڈوں نے موٹر سائیکلیں خرید لی ہیں، وہ انہی موٹر سائیکلوں پر لوگوں کو چھوڑتے ہیں اور پیسے کماتے ہیں۔''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام رام دیال ہے سرکار!'' اس نے کہا۔

''میں پیاسا ہوں۔ [illegible] ہوں۔ تمہارے پاس پانی ہو تو مجھے پلا دو۔''

پانی پینے کے بعد میری جان میں جان آئی۔ رام دیال نے بھوسا ہٹا کر میرے لیے بھی بیٹھنے کی جگہ بنا دی۔ میں بھوسے کے ڈھیر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر وہی لوک گیت بلند آواز میں شروع کر دیا جو پہلے گا رہا تھا۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ گاڑی کے ہچکولوں سے مجھے نیند آنے لگی۔ میری کوشش یہی تھی کہ مجھے نیند نہ آئے۔ میں نے نیند بھگانے کے لیے رام دیال سے کہا۔ ''رام دیال! تمہارے پاس سگریٹ ہے؟''

''سگرٹ تو نہیں ہے بابو صاحب! میرے پاس بیڑی ہے۔ اگر آپ بیڑی پینا چاہو تو لے لو۔''

میں نے اس سے بیڑی لے لی اور اسے سلگا کر دو تین ہی کش لیے تھے کہ پھندا سا لگ گیا اور میں زور زور سے کھانسنے لگا۔

رام دیال ہنسنے لگا اور بولا۔ ''بیڑی آپ کے بس کی نہیں ہے بابو صاحب!''

میں نے سلگتی ہوئی بیڑی رام دیال کو واپس دے دی۔ اس طرح وقتی طور پر میری نیند بھاگ گئی لیکن کچھ ہی دیر بعد پھر مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا۔

اچانک میری نیند کافور ہو گئی۔ میرے کانوں میں کچھ گاڑیوں کی آوازیں آئی تھیں۔ وہ گاڑیاں تیزی سے ہماری ہی طرف بڑھ رہی تھیں۔

''یہ کیا معاملہ ہے؟'' رام دیال بڑبڑایا۔ ''پولیس اس جنگل میں کیا کر رہی ہے؟''

مجھے بھی دور سے پولیس کی جیپیں اور گاڑیاں نظر آگئی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے میڈیا کی ٹیم تھی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ماؤزر پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔

وہ گاڑیاں تیز رفتاری سے ہمارے پاس سے گزر گئیں۔ میں نے اس وقت دانستہ اپنا چہرہ جھکا لیا تھا کہ کسی کی نظر مجھ پر پڑے تو وہ مجھے پہچان نہ سکے۔

''کرشنا پور کتنی دور ہے رام دیال؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ایک گھنٹے کا راستہ اور ہے اچھے بابو!'' رام دیال نے کہا پھر پُرتشویش لہجے میں بولا۔ ''یہ اتنی گاڑیاں اس طرف کیوں گئی ہیں... کیا پولیس نے ڈاکوؤں کو گھیر لیا ہے؟''

''ارے یار! وہ لوگ اپنے مہمانوں کو شکار پر لے گئے ہوں گے۔ تم نے دیکھا نہیں، ان کے پیچھے دو تین بڑی بڑی گاڑیاں بھی تھیں۔'' میرا اشارہ ٹی وی چینلز کی بڑی گاڑیوں کی طرف تھا جو وہاں کا منظر براہِ راست نشر کرنے جا رہے تھے۔

مجھے پریشانی یہ تھی کہ وہ لوگ مشکل سے دس منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر میدان صاف پا کر اسی تیزی سے واپس آئیں گے۔ واپسی میں اگر انہوں نے بیل گاڑی کو روک لیا تو میں ایک بار پھر ان کے ہتھے چڑھ جاؤں گا۔ اگر میں وہاں اترتا، تب بھی رام دیال مشکوک ہو جاتا اور پولیس کے پوچھنے پر بتا دیتا کہ اس حلیے کے آدمی کو میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اتارا ہے۔

میں تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھا رہا۔ پولیس فوراً واپس نہیں آسکتی تھی۔ میڈیا والے انہیں گھیر لیتے اور طرح طرح کے سوالات کرتے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد گاڑیوں کی آواز پھر آئی۔ میرے اعصاب کشیدہ ہو گئے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آسانی سے ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آؤں گا بلکہ ان لوگوں کے کم از کم چار پانچ آدمیوں کو جہنم رسید کر کے اپنی جان دوں گا۔ ان میں سرِفہرست ورما تھا پھر پولیس کمشنر اور دیگر افسران تھے۔ میں چن چن کر انہی لوگوں کو مارنا چاہتا تھا جو میری بربادی کا باعث بنے تھے۔

www.pkdigest.com

گاڑیوں کی آوازیں اب بہت واضح ہوتی جارہی تھیں۔

میں نے اپنا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات نکالے اور انہیں غیر محسوس طور پر بھوسے کے ڈھیر میں چھپا دیا تاکہ ان لوگوں کو یہ ثابت کرنے کا موقع نہ ملے کہ مرنے والا غیر قانونی طور پر بھارت میں داخل ہوا تھا اور اس کی جیب سے انتہائی اہم اور حساس نوعیت کے علاقوں کے نقشے برآمد ہوئے تھے۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ مرنے سے پہلے بھوسے کے اس ڈھیر کو بھی آگ لگا دوں گا۔

گاڑیاں اب بالکل ہمارے سر پر پہنچ گئی تھیں۔ میں نے اپنا چہرہ جھکا لیا اور سر پر رومال ڈال لیا تھا۔ بہ ظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ میں نے گرمی سے بچنے کے لیے رومال سر پر ڈالا ہے۔

گاڑیاں اسی تیزی سے ہمارے پاس سے گزر گئیں۔ رام دیال نے پہلے ہی گاڑیوں کے لیے راستہ صاف کردیا تھا۔

میں نے سکون کا سانس لیا کہ ایک بڑی مصیبت ٹل گئی تھی۔

کچھ فاصلے پر جاکر اچانک ایک پولیس کی جیپ رک گئی۔

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے رام دیال سے کہا۔ ”بھیا! ذرا گاڑی روکنا مجھے بہت دیر سے پیشاب آرہا ہے۔“

رام دیال نے گاڑی روکی تو میں پھرتی سے کودا اور تیزی سے ان خود رو جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا جو راستے کے دونوں طرف موجود تھیں۔

پولیس کی جیپ ریورس ہوئی اور تیزی سے ہماری گاڑی کی طرف آئی۔ میں نے جھاڑیوں کی اوٹ سے دیکھا، اس میں پولیس کمشنر اور ورما دونوں موجود تھے۔

ورما نے رعونت سے پوچھا۔ ”او گاڑی والے! تو نے کچھ دیر پہلے یہاں سے کچھ لوگوں کو گزرتے دیکھا ہے؟“

رام دیال پولیس کو دیکھ کر پہلے ہی گھبرا گیا تھا۔ وہ بوکھلا کر بولا۔ ”کچھ... لوگوں کو... میں...“

”سیدھی طرح جواب دے۔“ پولیس کمشنر نے پوچھا۔ ”وہ دس بارہ آدمی تھے۔ تو نے انہیں یہاں سے گزرتے دیکھا ہے؟“

”نہیں حضور! میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔“

”شٹ!“ پولیس کمشنر کی آواز آئی۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ وہ اس جنگل میں کہاں جاسکتے ہیں۔ دوسری طرف دریا ہے۔ ہاں، وہ دریا میں ڈوب کر مر گئے ہوں تو اور بات ہے۔“ اس کے ساتھ ہی پولیس کمشنر کے اشارے پر ڈرائیور نے جیپ آگے بڑھا دی۔

ان کے جانے کے بعد میں بھی جھاڑیوں سے نکل آیا اور گاڑی میں سوار ہوگیا۔

پھر کرشنا پور تک کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔

کرشنا پور کا علاقہ دیکھ کر مجھے اپنے ملک کا صادق آباد اور رحیم یار خان یاد آگیا۔ وہاں بھی نوجوانوں نے موٹر سائیکلیں خرید رکھی ہیں اور انہیں ٹیکسی کے طور پر چلاتے ہیں۔ وہ عموماً دو آدمیوں کو ورنہ تین آدمیوں کو بھی اس موٹر سائیکل پر بٹھا لیتے ہیں۔ وہاں کی پگڈنڈیاں اور راستے اتنے تنگ ہیں کہ وہاں ٹیکسی یا رکشا نہیں چل سکتے۔

میں بھی ایک اسی قسم کی ”ٹیکسی“ میں جھٹکے کھاتا ہوا لاری اڈے تک پہنچ گیا۔ رام دیال کی گاڑی سے اترنے سے پہلے میں نے اپنے تمام کاغذات دوبارہ جیب میں رکھ لیے تھے۔

مجھے شک تھا کہ پولیس اس لاری اڈے پر بھی موجود ہو سکتی ہے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ وہاں ٹیکسیاں اور رکشے موجود تھے۔

میں نے ایک ٹیکسی والے سے کہا۔ ”بھیا! میری تھوڑی مدد کردو۔ دلی جانے والی لاری میں میرا سامان چلا گیا ہے۔ تم مجھے اگلے اڈے تک پہنچا دو۔“

ٹیکسی والے نے غور سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ ”ڈیڑھ سو روپے ہوں گے۔“

میں فوراً ہی راضی ہو جاتا تو وہ شبے میں پڑ سکتا تھا۔ کافی بحث کے بعد وہ ایک سو بیس روپے پر راضی ہو گیا۔

میرے بیٹھتے ہی اس کی ٹیکسی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں اس نے مجھے اگلے لاری اڈے پر پہنچا دیا۔ وہاں بہت سی بسیں کھڑی تھیں۔

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ ”اب خود پتا کرو کہ تمہاری لاری کون سی تھی۔ یہ مت کہنا کہ لاری یہاں سے بھی نکل چکی ہے۔“

میں نے اسے پیسے دیے اور بسوں کی طرف بڑھ گیا۔ ہمارے ملک کے لاری اڈوں کی طرح وہاں بھی کنڈکٹر آوازیں لگا رہے تھے۔ ”الٰہ آباد، شاہ جہاں پور، دلی، بریلی... جلدی کریں... لاری جانے والی ہے۔“

میں نے چند لمحے سوچا پھر دلی جانے کے بجائے احمد آباد کی بس میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

احمد آباد پہنچ کر سب سے پہلے تو میں ایک حمام میں نہایا۔ باتھ روم غلیظ تھے اور وہاں رکھی ہوئی بالٹیاں اور صابن دانیاں اس سے بھی زیادہ غلیظ تھیں لیکن اب میں اس قسم کی باتوں کا عادی ہو گیا تھا۔ پھر میں نے اوسط درجے کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اور چائے پینے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم میں ایک نئی روح دوڑ گئی ہو۔ میرے ہاتھ پر لگا ہوا چاقو کا زخم بھی اب کافی حد تک مندمل ہو چکا تھا۔

بھارت کے چھوٹے بڑے شہروں میں قدم قدم پر پی سی او ہیں۔ مجھے جینی کا نمبر یاد تھا۔ میں نے ایک پی سی او میں جاکر مالک سے جینی کا نمبر ملانے کو کہا۔

اس نے نمبر ملا کر مجھے ایک بوتھ میں جانے کا اشارہ کیا اور خود دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ وہ پی سی او کے ساتھ ساتھ جنرل اور کریانا اسٹور بھی تھا۔

دوسری طرف بیل بجتی رہی لیکن جینی نے کال ریسیو نہیں کی۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ کہیں ان لوگوں نے جینی کو گرفتار تو نہیں کرلیا... یا ورما نے اسے اغوا کرا لیا ہو؟ ان لوگوں سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ میں مایوس ہو کر لائن کاٹنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے فون ریسیو کرلیا گیا اور جینی کی مترنم آواز سنائی دی۔ ”ہیلو! آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“

”مجھے ایک خوب صورت لڑکی جینی سے بات کرنی ہے۔“ میں نے شوخ لہجے میں کہا۔

”کامی! تم... کہاں ہو... میں تو سمجھی تھی... کہ...“ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

”میں جہاں بھی ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”پولیس نے دہشت گردوں کے نام پر پانچ آدمیوں کو گرفتار کیا ہے۔ اس کی تفصیل میں تمہیں ملنے پر بتاؤں گی... تم ہو کہاں؟“

”میں اس وقت احمد آباد میں ہوں۔ شام تک دلی پہنچ جاؤں گا۔“

”تمہیں یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ... میں اور تیمور وہیں پہنچ جائیں گے۔“

”میں تو خود بھی ابھی یہاں پہنچا ہوں۔ تم لوگ وہاں سے احمد آباد کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ میں ایک گھنٹے بعد تم سے پھر رابطہ کروں گا۔“

میری سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ مجھے وہاں کے راستوں کا علم نہیں تھا۔ میں نے اس مرتبہ ٹیکسی یا رکشا کے بجائے سائیکل رکشا کو ترجیح دی۔

اس نے دس منٹ میں مجھے احمد آباد کے ایک صاف ستھرے سے ہوٹل ”وسرام“ میں پہنچا دیا۔ میں نے وہاں دو کمرے بک کرائے اور کاؤنٹر گرل کو بتایا کہ ابھی کچھ دیر میں میری مسز اور ایک دوست بھی پہنچنے والا ہے۔

ہوٹل بہت اچھا نہیں تھا لیکن اتنا برا بھی نہیں تھا۔ کمرے زیادہ کشادہ نہیں تھے لیکن صاف ستھرے تھے۔

پھر مجھے آر کے کا خیال آیا۔ مجھے اس کا فون نمبر یاد نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ جینی کے آنے کے بعد اس سے بھی بات کروں گا۔

پھر میری آنکھ لگ گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ آواز کیسی ہے۔ جب دستک دوبارہ بلند آواز میں ہوئی تو میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دستک کا انداز پولیس والوں جیسا تھا۔ میں نے پھرتی سے ماؤزر نکالا اور دروازے کے نزدیک پہنچ کر بولا۔ ”کون ہے؟“

”ہم لوگ دس منٹ سے دروازہ بجا رہے ہیں اور تم اب بھی یہ پوچھ رہے ہو کہ کون ہے؟“ جینی کی جھنجلائی ہوئی آواز سن کر میرے بدن میں گویا بجلیاں سی بھر گئیں۔

میں نے کچھ دیر پہلے اسے اپنے ہوٹل کے بارے میں بتایا تھا اور پھر کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

جینی والہانہ انداز میں میری طرف لپکی لیکن تیمور کے کھنکھارنے پر کھسیانی ہو کر رک گئی۔

تیمور مجھ سے یوں ملا جیسے کئی برس بعد مل رہا ہو۔ مجھ سے گلے مل کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”ہم لوگ تیری وجہ سے مر مر کے جیے ہیں کامی!“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اور ہماری یہ ابتلا اور آزمائش ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے۔“ اس نے قمیص کے کف سے اپنے آنسو پونچھے۔

”ارے! اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہارے سامنے موجود ہوں، اب کیوں رو رہے ہو؟ اب تک سعید بھائی نے ارجن سنگھ کے ذریعے میرے پاسپورٹ کا بندوبست بھی کرلیا ہوگا۔“

”تمہارے لیے ہمارے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے

www.pkdigest.com

کامی!'' جینی نے کہا۔
''کیا ہوا؟'' میں ایک دم گھبرا گیا۔ ''آنٹی، پاپا اور فرحانہ تو ٹھیک ہیں؟ نسیمہ آنٹی کو تو کچھ نہیں ہوا؟''
''کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' تیمور نے افسردگی سے کہا۔ ''انکل، آنٹی اور فرحانہ تو اللہ کے فضل سے خیریت سے ہیں لیکن نوشین اور سعید بھائی...''
''کیا ہوا ان لوگوں کو؟'' میں نے تیمور کی بات کاٹ دی۔
''انہیں اغوا کرلیا گیا ہے۔''
تیمور کی بات میرے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح لگی۔
''اغوا کرلیا گیا ہے؟ سعید بھائی کو... اتنی جرأت کس میں پیدا ہوگئی؟'' میں نے یہ سوال تیمور کے بجائے اصل میں خود سے کیا تھا۔
''تمہارے ویزا فارم پر انکل اور آنٹی کا نام بھی تھا۔ فارم میں رشتے داروں کا ایک کالم بھی ہوتا ہے۔''
''ہاں ہاں، مجھے کیا بتا رہے ہو... میں نے ان کے نام خود اپنے ہاتھ سے لکھے تھے۔'' میں نے مضطرب ہوکر کہا۔
''پولیس ان کے پاس پہنچی اور تمہارے بارے میں پوچھا۔ سعید بھائی نے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ کامران میرا کزن ہے لیکن وہ اب تک یہاں پہنچا نہیں ہے۔ پولیس نے ان کے گھر کے ملازموں سے بھی اگلوانے کی کوشش کی لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس بات کا اقرار نہیں کیا کہ تم وہاں پہنچے ہو۔ انہوں نے گھنٹوں نوشین اور آنٹی سے بھی جرح کی کہ یہ خواتین ہیں، ان کی باتوں میں آکر کچھ بتا دیں گی لیکن ان لوگوں کا بھی یہی جواب تھا کہ کامران یہاں نہیں پہنچا۔ پولیس مایوس ہوکر چلی گئی۔ اس کے دوسرے روز دن رات کو سعید بھائی اور نوشین کو اغوا کرلیا گیا۔ انکل نے پولیس میں رپورٹ لکھائی، پورے دلی کو ہلا کر رکھ دیا لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ انکل نے تو یہاں تک کہا کہ اس کارروائی میں پولیس کا ہاتھ ہے۔''
''ان لوگوں کو ایک ہی شخص اغوا کرسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ہے منحوس ورما۔ میں جب تک اپنے ہاتھ سے اس کے جسم کے ٹکڑے نہیں کروں گا، مجھے سکون نہیں ملے گا۔''
''تم پر اتنا خون کیوں سوار ہے؟'' جینی نے پوچھا۔ ''جانتے ہو اب تک تم کتنے قتل کرچکے ہو؟''
''جانتا ہوں۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ ''اور اگر میری عزت پر آنچ آئی تو اس سے دگنے قتل مزید کرسکتا ہوں۔'' پھر میں نے چونک کر کہا۔ ''جینی! مجھے ذرا اپنا سیل فون دو۔ میں آر کے صاحب سے بات کرلوں۔ ان سے تو اب تک میری بات ہی نہیں ہوئی ہے۔ میرے پاس ان کا نمبر ہی نہیں تھا۔''
جینی نے اپنے بیگ سے سیل فون نکال کر میرے حوالے کردیا۔
میں نے آر کے کا نمبر نکالا اور ڈائل کردیا۔
فوراً ہی ان کی آواز سنائی دی۔ ''ہاں جینی! اب کیا پرابلم ہے؟''
''میں کامران بول رہا ہوں سر... السلام علیکم۔'' میں نے کہا۔
''وعلیکم السلام!'' انہوں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم اس وقت کہاں ہو۔ جینی مجھے سب بتا چکی ہے۔ میں کل صبح تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔''
''آر کے صاحب! وہ سعید بھائی اور نوشین...''
''وہ اچھا آدمی ہے، مجھ سے بہت پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ بقیہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ ہاں، میں نے جینی کو کچھ رقم دی ہے، تمہیں ضرورت ہوگی۔ میں کل ملوں گا پھر بات ہوگی... خدا حافظ۔'' انہوں نے سلسلہ منقطع کردیا۔
میں حیرت سے سیل فون کو گھورتا رہ گیا۔ میں نے جینی سے کہا۔ ''ایسا لگ رہا تھا جیسے آر کے صاحب جان بوجھ کر گفتگو کو ٹال رہے ہوں یا پھر ان کے پاس ایسا کوئی آدمی بیٹھا تھا جس کے سامنے وہ کھل کر بات نہیں کرسکتے تھے۔''
''ہاں، اکثر ایسا ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ کوئی ایسا آدمی ہوتا ہے جس کے سامنے وہ بات نہیں کرسکتے۔ ویسے وہ کل تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کے ساتھ شاید امجد بھی ہوگا۔''
''امجد؟'' میں نے پوچھا۔
''وہی امجد جس کی وجہ سے آر کے صاحب تم پر مہربان ہوئے ہیں۔ جس کی جان بچانے کے چکر میں تم نے تین قتل کردیے تھے۔'' جینی نے ہنس کر کہا۔
''تیمور! میں امی اور پاپا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تو بتا، مجھے ان سے بات کرنی چاہیے؟''
''اگر تو چاہتا ہے کہ پاکستانی پولیس ان کے پیچھے لگ جائے تو ضرور ایسا کر۔ تیرے گھر کے سب فون آبزرویشن پر ہیں۔ ممکن ہے تیرے گھر کے سیل فون بھی آبزرویشن پر ہوں اور ان کی ریکارڈنگ پولیس تک جاتی ہو۔ یہ دو ملکوں کے خارجی تعلقات کا معاملہ ہے بیٹے! تو نے اچھے خاصے تعلقات میں دراڑ... ڈال دی ہے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ

ملکہ شراوت سے دوستی کروں گا۔ پریانکا چوپڑا کے ساتھ ڈنر کروں گا اور لارا دت سے...“

”جوتے کھاؤں گا۔“ میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

”یہ سوچ کہ ورما نے ان لوگوں کو اغوا کرنے کے بعد کہاں رکھا ہوگا؟“ میں نے کہا۔

”تیرے پاس تو ورما اور اس کے آدمیوں کے ایڈریس کی پوری لسٹ تھی۔ وہ ڈائری کہاں گئی؟“

”وہ ڈائری... وہ تو شاید آنٹی نسیمہ کے گھر میں ہے۔ میری پینٹ یا شرٹ کی جیب میں ہوگی۔“

”ذمے داری کا یہ عالم ہے اور بنتے ہیں پاکستان کی خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ۔“ تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ہاں، یہ تو بتا... جب پولیس کمشنر اور ورما میڈیا کی ٹیم لے کر وہاں پہنچے تو کیا ہوا؟“

”اس کی تفصیل تمہیں جینی بتائے گی کیونکہ یہ بھی ایک رپورٹر کے روپ میں ان لوگوں کے ساتھ گئی تھی۔“

”تمہیں خودکشی کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کسی بھی اونچی بلڈنگ سے چھلانگ لگا دو۔ پولیس کے ہاتھوں بے عزتی کرانے کا کیا شوق ہے؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”میں نے اپنا حلیہ بالکل بدل لیا تھا۔ ویسے بھی وہاں اتنے غیر ملکی صحافی تھے کہ کوئی مجھ پر کیسے دھیان دے سکتا تھا؟“ جینی نے ہنس کر کہا۔ ”پولیس کمشنر نے پہلے تو اعلان کیا کہ پاکستانی دہشت گرد کامران اور اس کی ٹیم دہلی کے مضافات میں ایک غیر آباد بنگلے میں موجود ہے۔ پولیس کے لوگ ان کی نگرانی کر رہے ہیں۔ مزید حفاظت کے لیے میں نے انڈیا کی انتہائی خوفناک کمانڈو فورس بلیک کیٹس کے پانچ کمانڈو بھی وہاں بھیج دیے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ سب کچھ براہ راست دنیا کو دکھائیں۔ ہم پر ہمیشہ یہ الزام لگ جاتا ہے کہ ہم سب کچھ پس پردہ کرتے ہیں۔ اب آپ اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کی گرفتاری کا منظر دیکھیں گے اور اپنے اپنے چینلز پر لوگوں کو دکھائیں گے۔

جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں سناٹا تھا۔ پولیس کمشنر کے ساتھ ورما بھی تھا۔ ہم لوگ اندر داخل ہوئے تو کچھ ہی فاصلے پر تین لاشیں پڑی تھیں۔ میڈیا نے ان لاشوں کو کور کیا، پھر دو لاشیں برآمدے کے پاس پڑی تھیں۔ اندر کا منظر تو تم خود بھی جانتے ہوگے۔ پولیس کمشنر بوکھلا کر رہ گیا۔ اس وقت میڈیا نے اس سے بہت چبھتے ہوئے سوال کیے کہ اگر کامران کا سراغ مل ہی گیا تھا تو اسے فوراً ہی گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟ میڈیا کے سامنے گرفتار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہمیں تو یہ ڈراما لگ رہا ہے پھر آپ کے بیان کے مطابق وہ لوگ پولیس کی نگرانی میں تھے۔ پولیس والے مسلح بھی تھے پھر وہ نہتے لوگ پولیس کو بے بس کر کے فرار کیسے ہو گئے؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ آپ کی ”بلیک کیٹس“ کے وہ جوان کہاں ہیں جن کی تعریف میں آپ زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ کیا وہ بھی کامران کے ساتھ ملے ہوئے تھے؟

”ایک رپورٹر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اصل میں کامران ایک فرضی کردار ہے۔ آپ کا کلیم ہے کہ اس کا پاسپورٹ آپ کے قبضے میں ہے۔ آپ وہ پاسپورٹ میڈیا کو کیوں نہیں دکھاتے؟ اس کے ملک کے ہائی کمیشن سے احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ آپ نے ایک ڈرامے کی خاطر ہمارا وقت برباد کیا۔

”اس وقت پولیس کمشنر اور ”را“ کے چیف کی حالت دیکھنے والی تھی۔ انہوں نے ہزار کوشش کے باوجود بھی یہ نہیں بتایا کہ بلیک کیٹس کہاں ہیں۔ وہ ڈیوٹی پر کیوں نہیں پہنچے؟“

”بلیک کیٹس!“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”گیٹ کے پاس جو تین لاشیں تھیں، وہ بلیک کیٹس کی لاشیں تھیں۔ دو کالیاں بلیاں برآمدے کے پاس مردہ پڑی تھیں۔ ان پانچوں میں [illegible] نے ہلاک کیا تھا، [illegible] باہر [illegible] نے ہلاک کیا تھا۔ یہ تو جانتے [illegible] کا خیر، بلیک اور وائٹ کیٹس کا ذکر چھوڑو۔ مجھے سوچنے دو کہ ورما نے سعید بھائی اور نوشین کو کہاں رکھا ہوگا۔ وہ انہیں دہلی سے باہر بھی لے جا سکتا ہے۔“

”کل آر کے صاحب آئیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ورما نے ان لوگوں کو کہاں رکھا ہے؟“ تیمور نے کہا۔ ”ان کے آدمی پولیس میں بھی ہیں اور مجھے سو فیصد... یقین ہے کہ اس اغوا میں پولیس بھی ملوث ہے۔ یہ تو اچھا ہے کہ پولیس نے انہیں گرفتار نہیں کیا۔ اب ہم بھی ان لوگوں کو ورما کی قید سے چھڑا کر آرام سے گھر لے آئیں گے۔ کچھ مارے بھی جائیں تو کوئی حرج نہیں... پولیس کو تو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔“

☆☆☆

دوسرے دن صبح آر کے پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ امجد بھی تھا۔ وہ مجھ سے یوں گرم جوشی سے ملا جیسے کوئی برسوں پرانا بچھڑا ہوا عزیز ملتا ہے۔ پھر وہ فخریہ انداز میں بولا۔ ”مجھے اندازہ تھا کہ کامران اس مصیبت سے نکل آئے گا۔ تمہیں تو واقعی پاکستانی ایجنسی میں ہونا چاہیے تھا۔“

پھر امجد مجھ سے گلے ملا اور بولا۔ ”کامران صاحب!

آپ کی وجہ سے مجھے نئی زندگی ملی ہے۔ آپ نہ ہوتے تو آج میں بھی نہ ہوتا۔“

”یہ تمہارا خیال ہے۔“ میں نے کہا۔ ”زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ ہے۔ میں نہ ہوتا تو کوئی اور ہوتا۔“ میں نے کہا۔

اچانک آر کے نے کہا۔ ”کامران! تمہیں ایک سرپرائز دینا تو بھول ہی گیا۔“

دوسرے ہی لمحے میری کھوپڑی ناچ کر رہ گئی۔ میرے سامنے سینا کھڑی تھی۔ وہی سینا جس کے فلیٹ میں، میں نے پناہ لی تھی۔

”سینا... تم... کیسی ہو تم؟“

”شکر ہے، تمہیں میرا نام تو یاد ہے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ پاکستانی ایجنٹ اپنا کام نکلنے کے بعد لوگوں کو بھول جاتے ہیں۔“

”یہ تم لوگوں کو بھارت سرکار کی طرح ایجنسی فوبیا کیوں ہو گیا؟ انڈیا کرکٹ میچ ہار گیا تو اس میں پاکستانی ایجنسی کا ہاتھ ہے، ممبئی حملوں میں پاکستانی ایجنسی کے انوالو ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امتابھ کو ایوارڈ کے لیے نامزد نہیں کیا تو پاکستانی ایجنسی کی کوئی سازش ہے۔“ پھر میں نے سینا سے پوچھا۔ ”تم بتاؤ، تم پولیس سے کیسے چھوٹیں؟“

”یہ سب آر کے صاحب کی مہربانی ہے۔ انہوں نے نہ جانے کیا چکر چلایا کہ پولیس نے مجھے رہا کر دیا۔ میں وہاں سے اپنے فلیٹ جانے کے بجائے آر کے صاحب کے پاس چلی گئی۔“

”اچھا، اب کام کی بات سنو۔“ آر کے نے کہا۔ ”میں نے پولیس میں موجود اپنے آدمی سے معلوم کرا لیا ہے کہ ورما نے سعید اور نوشین کو کہاں رکھا ہے۔ ورما کی کیا... وہ لوگ اصل میں پولیس ہی کی قید میں ہیں۔ اس مرتبہ انہوں نے واقعی ان لوگوں کی نگرانی کا زبردست بندوبست کیا ہے۔ انہیں جس عمارت میں رکھا گیا ہے، اس کے چاروں طرف پولیس کا پہرا ہے۔ عمارت کے اندر اور باہر بلیک کیٹس کی ایک پوری کمپنی موجود ہے۔ ان لوگوں نے دبے لفظوں میں سعید سے کہا بھی تھا کہ کامران کو ہمارے حوالے کر دو یا اس کا پتا بتا دو تو ہم تمہیں اور تمہاری بہن کو چھوڑ دیں گے۔ سعید بے چارے کو کچھ معلوم ہوتا تو بتاتا۔ ان لوگوں نے اسے دھمکی دی ہے کہ اگر تین دن کے اندر اندر کامران کو ہمارے حوالے نہیں کیا گیا تو پہلے تو تمہاری بہن کی تمہاری آنکھوں کے سامنے بے حرمتی کی جائے گی، پھر تمہیں بھی گولی مار کے پھینک دیا جائے گا۔ یوں بھی پولیس تو تمہارے بارے میں کچھ جانتی ہی نہیں ہے۔ پولیس کو تو تم لوگوں کی لاشیں ملیں گی جو تمہارے لواحقین کے حوالے کر دی جائیں گی۔“

”مجھے بتائیے کہ وہ لوگ کہاں ہیں؟“ میں نے مٹھیاں بھینچ کر پوچھا۔

”عقل سے کام لو کامران! میں ان کی کالی بلیوں کو اپنی سفید بلیوں سے قتل کراؤں گا۔ ان کے پہرے دار یا پہرا دیتے ہی رہ جائیں گے۔ آر کے ابھی اتنا بے بس نہیں ہے۔ بس ذرا صبر سے کام لو۔“ پھر وہ چونک کر بولے۔ ”ہاں، تمہارا جیل کا کوئی ساتھی رگھو میرے پاس آیا تھا۔ وہ پہلے راجن کے ساتھ کام کرتا تھا۔ آج کل چھوٹے موٹے کام کر کے گزارہ کر رہا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، وہ قابلِ اعتبار آدمی ہے؟“

”وہ آدمی وہ سو فیصد قابلِ اعتبار ہے آر کے صاحب!“ میں نے کہا۔ ”اس نے لاک اپ میں میری بہت مدد کی ہے۔“

”ہاں، عزیز بھی اس کی بہت سفارش کر رہا تھا۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ رگھو آدمی جی دار ہے۔ اب تم بھی کہہ رہے ہو تو میں اسے اپنے ساتھ شامل کر لیتا ہوں۔“

میں نے انہیں بتایا۔ ”رگھو ہی نے مجھے لاک اپ میں سیل فون منگوا کر دیا تھا۔ اسی نے مجھے وہ دو دھاری خوفناک خنجر دیا تھا جس سے میں نے کالی بلیوں کو لاشوں میں تبدیل کر دیا۔ اس خنجر کی دھار اتنی خوفناک ہے کہ وہ ہڈی تک کو کاٹ ڈالتی ہے۔ ہاں، آپ کوئی کام کی بات بتا رہے تھے؟“ میں نے آر کے سے کہا۔

”سب سے پہلے تو ہم لوگوں کو یہاں سے شفٹ ہونا ہے۔“ آر کے نے کہا۔ ”احمد آباد میں ہمارا ایک محفوظ ٹھکانا موجود ہے۔ اس کے بعد ہمیں سعید اور نوشین کو آزاد کرانے کے لیے ورما کے ٹھکانے پر حملہ کرنا ہے۔ اس نے اپنے خیال میں بہت عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے اور ان لوگوں کو دلی کے بجائے احمد آباد لے آیا ہے۔ اس کا خیال ہوگا کہ تم اور تمہاری ایجنسی دلی میں ان کی تلاش میں ٹکریں مارتی رہے گی۔“

”تو کیا آپ کو ان کے ٹھکانے کا علم ہے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”میں نے کہا نا کہ صبر کرو۔ ابھی تھوڑی دیر میں ہمیں ان کے ٹھکانے کا علم ہو جائے گا۔“

☆☆☆

www.pkdigest.com

آر کے کا احمد آباد والا بنگلا ہر طرح سے محفوظ تھا۔ اس کی باؤنڈری وال کم سے کم اٹھارہ فٹ بلند تھی اور اس میں ضرورت کے وقت کرنٹ بھی چھوڑا جا سکتا تھا۔ بنگلے کی چھت پر چار ایسے مورچے تھے جہاں سے صرف ایک آدمی اندر داخل ہونے والے کئی آدمیوں کو روک سکتا تھا۔ بنگلے کے برآمدے اور لان میں بھی اس کے آدمی تھے جو ظاہر ہے کہ اس کے گارڈز تھے۔

بنگلے پر پہنچ کر آر کے نے کافی لانے کے لیے کہا۔ ابھی ہم کافی پی ہی رہے تھے کہ انٹرکام کی بیل بجی۔ آر کے نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف کی بات سنی اور کہا۔ "ٹھیک ہے، ان دونوں کو اندر بھیج دو۔"

تھوڑی دیر بعد دو انتہائی ماڈرن اور حسین لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر آر کے کو نمستے کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہندو ہیں۔

"کیا خبریں ہیں؟" آر کے نے پوچھا۔

"خبریں کچھ اچھی نہیں ہیں سر!" ان میں سے ایک لڑکی نے کہا۔ "پولیس نے دونوں افراد کو احمد آباد کے مضافات میں ٹھاکر پرنام سنگھ کی کوٹھی میں رکھا ہے۔ ٹھاکر پرنام سنگھ اس وقت سنٹرل ایم پی اور سینٹرل منسٹر ہے۔ اس کی کوٹھی کے گرد پولیس کا بھاری پہرا ہے۔ کوٹھی کے اندر فوج اور پولیس کے کم از کم بیس جوان ہیں اور عمارت کی چھت پر "بلیک کیٹس" کی ایک پوری کمپنی ہے۔ وہاں تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"

آر کے کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ "تمہیں یقین ہے کہ کوٹھی میں آرمی کے جوان بھی موجود ہیں؟"

"یس سر! مجھے یقین ہے کیونکہ یہ بات مجھے ورما نے خود ہی بتائی ہے۔"

"میں اس کوٹھی کو بم سے بھی اڑا سکتا ہوں لیکن اس میں ہمارے آدمی بھی موجود ہیں۔" آر کے نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "کچھ اندازہ ہے کہ کوٹھی کے گرد کتنے پولیس والے پہرے پر ہیں؟" آر کے نے پوچھا۔

"کوٹھی کے گرد چار گاڑیاں پٹرولنگ پر ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف جگہوں پر پولیس کے پانچ جوان کھڑے ہوئے ہیں۔ ان سے نمٹ بھی لیا جائے تو کوٹھی میں داخلہ بھی ایک پرابلم ہے۔ باؤنڈری وال پر چاروں طرف خطرناک کرنٹ دوڑ رہا ہے۔ مین گیٹ پر پولیس والوں کے ساتھ ساتھ دو بلیک کیٹس بھی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، تم لوگ جا کر آرام کرو۔"

آر کے نے کہا پھر امجد سے بولا۔ "امجد! یہاں احمد آباد میں ہمارے پاس کتنے آدمی ہیں جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتے ہیں؟"

"یہاں بیس آدمی تو ہوں گے سر! اور ہمارا ایک ایک آدمی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتا ہے۔"

"یہاں ہمارے پاس گاڑیاں کتنی ہیں؟"

"ہمارے پاس اس وقت ایک ٹیجیرو، دو ٹویوٹا اور تین ماروتی ہیں۔ ویسے تو احمد آباد کی ہر گاڑی ہماری ہے۔"

"فالتو باتوں سے پرہیز کیا کرو۔" آر کے نے تلخ لہجے میں کہا۔

امجد سہم کر رہ گیا۔

"بیس منٹ کے اندر اندر ساری گاڑیاں اور بندے یہاں ہونے چاہئیں۔" آر کے نے کہا۔ "اور ہاں... ان لوگوں کو اسلحے کے کمرے میں لے جاؤ اور جو اسلحہ یہ لوگ پسند کریں، ان کے حوالے کر دو۔"

بیس منٹ کے بجائے آر کے کے سب آدمی وہاں پندرہ منٹ ہی میں آ گئے۔

آر کے نے ٹیجیرو کا انتخاب کیا اور امجد سے بولا۔ "تم ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھو۔" مجھے اس نے اپنے ساتھ عقبی سیٹ پر بٹھایا اور امجد سے بولا۔ "احمد آباد کے پولیس کمشنر کے بنگلے پر چلو۔"

میرے ذہن میں اس وقت بہت سے سوالات پیدا ہوئے تھے لیکن امجد کی طرح میں نے بھی آر کے سے کوئی سوال نہیں کیا۔

ٹیجیرو بیس منٹ کے اندر اندر پولیس کمشنر کے بنگلے پر پہنچ گئی۔

گیٹ پر دو باوردی سنتری موجود تھے۔ اندر گارڈ روم میں بھی سنتری ہوں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آر کے یہاں کیوں آیا ہے؟

سنتری گاڑی کے پاس آیا تو آر کے نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "کمشنر صاحب کو بتاؤ کہ آر کے ملنا چاہتا ہے۔"

"وہ تو اب سو گئے ہیں سر! آپ صبح آ جائیں۔" سنتری نے کہا۔

"سو گئے ہیں تو انہیں اٹھاؤ۔" آر کے نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں ان کے پاس بہت ضروری کام سے ایمرجنسی میں آیا ہوں... کوئی گپ شپ کرنے نہیں آیا۔"

سنتری اندر چلا گیا۔ آر کے کی نظریں اپنی رسٹ واچ کی سوئیوں پر تھیں۔

دو منٹ بعد اندر سے ایک انسپکٹر نکلا اور بولا۔ "اتنا ہی ضروری کام ہے تو آپ میسج دے دیں۔ کمشنر صاحب جیسے ہی اٹھیں گے، انہیں میسج دے دیا جائے گا۔"

"کیا تمہارا پولیس کی نوکری سے دل بھر گیا ہے؟" آر کے بلند آواز میں بولا۔ "جب میں کہہ رہا ہوں کہ کمشنر کو اٹھا دو تو تمہیں کیا مصیبت ہے؟ مجھے اس سے ضروری کام نہ ہوتا تو میں اس وقت اسے اپنے بنگلے پر طلب کرتا۔ جلدی کرو... تم لوگوں نے تین منٹ پہلے ہی ضائع کر دیے ہیں۔"

مزید دو منٹ بعد بنگلے کا گیٹ کھل گیا اور ایک سنتری نے گاڑی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

امجد نے گاڑی پورچ میں روکی تو پولیس کمشنر خود برآمدے میں موجود تھا۔ وہ اپنے سلیپنگ گاؤن کی ڈوریاں باندھ رہا تھا۔

"کہیے آر کے صاحب! اس وقت کیسے زحمت کی؟"

"اندر چلو۔" آر کے نے کہا۔ "سب بتا دوں گا۔" ہم لوگ اندر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔

آر کے نے بلا تمہید کہا۔ "دلی کے پولیس کمشنر اور ایک پولیس کمشنر ورما نے میری بہن اور بھائی کو کڈنیپ کر لیا ہے۔ یہ بات پولیس کے ریکارڈ میں نہیں ہے۔ تم اس سلسلے میں ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"میں ابھی پولیس بھیج کر ان لوگوں کو وہاں سے برآمد کرا لوں گا۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے کمشنر صاحب! وہ لوگ ٹھاکر پرنام سنگھ کی کوٹھی میں ہیں۔ کوٹھی میں نہ صرف آرمی بلکہ بلیک کیٹس بھی موجود ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے آر کے صاحب!" کمشنر نے صاف گوئی سے کہا۔ "میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ٹھاکر پرنام سنگھ سے جھگڑا مول لینے کا مطلب ہے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا۔"

"اور آر کے سے جھگڑا مول لینے کا مطلب جانتے ہو؟" آر کے نے تلخ لہجے میں کہا۔ "آر کے سے جھگڑا مول لینے کا مطلب ہے، اپنی دونوں بیٹیوں سے ہاتھ دھونا۔"

"نہیں آر کے صاحب! آپ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"میں ایسا ہی کروں گا۔" آر کے نے کہا۔ "میں تمہاری دونوں بیٹیوں کو لے جاؤں گا۔ وہ دونوں میری بیٹیوں کی طرح ہیں لیکن مجبوری ہے۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ اپنی سرکاری گاڑی میں ہمارے ساتھ ٹھاکر کی کوٹھی تک چل کر گیٹ کھلوانا ہے۔ باقی کام تم ہم پر چھوڑ دو۔"

"یہ کام تو میں ویسے بھی کر سکتا ہوں۔ بعد میں کہہ دوں گا کہ آر کے مجھے گن پوائنٹ پر لایا تھا۔"

"آر کے نہیں بلکہ کامران!" آر کے نے کہا۔

"کامران... وہ پاکستانی کا ایجنٹ؟"

"ہاں وہی.... کامران۔" آر کے نے کہا۔ "اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ویسے ہمارا ایک آدمی یہاں تمہاری بیٹیوں کے سر پر رہے گا۔ تم نے اگر پٹری سے اترنے کی کوشش کی تو وہ تمہاری بیٹیوں کو زندگی کی پٹری سے اتار دے گا۔"

پولیس کمشنر دو منٹ سے بھی کم وقت میں تیار ہو گیا۔ امجد اس کے ساتھ تھا کہ کہیں وہ کسی کو ٹیلی فون پر اطلاع نہ دے دے۔ آر کے نے کمشنر سے کہا تھا کہ اپنا سیکیورٹی اسکواڈ لینے کی ضرورت نہیں ہے، تم ذاتی حیثیت میں ورما سے بات کرنے جا رہے ہو۔

پولیس کمشنر کی گاڑی گیٹ سے نکلی تو ہماری ٹیجیرو بھی اس کے پیچھے تھی۔

کمشنر نے ڈرائیور کو ساتھ نہیں لیا تھا بلکہ اس کی گاڑی امجد ڈرائیو کر رہا تھا۔

وہاں سے نکلنے سے پہلے آر کے نے تمام منصوبہ بندی کر لی تھی۔ اس نے تیمور سے فون پر کہا۔ "پرنام سنگھ کے بنگلے کی طرف جا رہے ہیں۔ تم لوگ بھی وہاں پہنچو۔ جب تم لوگ پہلے فائر کی آواز سنو تو پولیس کی گشتی گاڑیوں کو بم سے اڑا دینا۔" تیمور نے اسے بتایا کہ وہ بھی یہاں پہنچ گیا ہے۔ آر کے نے تیمور سے کہا کہ وہ دستی بم کے ذریعے پرنام سنگھ کی کوٹھی کی باؤنڈری وال اڑا دے اور وہاں سے اپنے لوگوں کو لے کر اندر داخل ہونے کی کوشش کرے۔ چھت کی طرف سے ہوشیار رہے کیونکہ وہاں بھی پولیس فورس کے جوان مورچہ بنائے بیٹھے ہیں۔ پھر اس نے احمد آباد کے پولیس کمشنر سے کہا۔ "وہاں فائرنگ اور بمباری ہو گی۔ مقامی پولیس اس وقت تک مداخلت نہ کرے جب تک ہم لوگ وہاں سے نکل نہ جائیں تم فون پر حکم جاری کرو۔"

پولیس کمشنر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس حملے میں اس کے مارے جانے کے چانسز بہت زیادہ تھے۔

میں اور آر کے کمشنر کی گاڑی کی عقبی نشست پر تقریباً لیٹنے کے انداز میں بیٹھے تھے تاکہ پہلی نظر میں باہر سے کسی کو نظر نہ آ سکیں۔ امجد البتہ پولیس یونیفارم میں تھا۔

گاڑی گیٹ پر پہنچی تو اندر سے ایک انسپکٹر باہر نکلا۔

www.pkdigest.com

پولیس کمشنر نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے ابھی اور اسی وقت مسٹر ورما سے ملاقات کرنی ہے۔ یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔ ورما صاحب اگر سو گئے ہیں تو انہیں جگا دو۔"

انسپکٹر فوراً ہی اندر داخل ہو گیا اور دو منٹ بعد پھر نمودار ہوا۔ اس نے گارڈز کو گیٹ کھولنے کا حکم دیا۔

امجد نے گاڑی پورچ میں روک دی۔ پورچ میں دو مسلح پولیس والے موجود تھے۔ گیٹ پر انسپکٹر سمیت اس وقت چار آدمی تھے۔ وہ چاروں مجھے وہاں سے بھی نظر آ رہے تھے۔

میں نے فوری طور پر کارروائی کا فیصلہ کر لیا۔ گاڑی کی کھلی ہوئی کھڑکی سے وہ میرے نشانے پر تھے۔ مجھے یقین تھا کہ انسپکٹر کا تعلق بلیک کیٹس سے ہے کیونکہ اس کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ٹرینڈ کمانڈو ہے۔ مجھے ریوالور نکالتے دیکھ کر آر کے نے بھی ماؤزر نکال لیا۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور انسپکٹر کے سینے کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے گرا۔ ابھی دوسرے لوگ سنبھل بھی نہ سکے تھے کہ میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر مزید کیے اور دو آدمی مزید ڈھیر ہو گئے۔ تیسرے آدمی نے رائفل سنبھالی لیکن میرے ریوالور کی گولی اسے بھی چاٹ گئی۔

اچانک کان پھاڑ دینے والے دو دھماکے ہوئے۔ اس کا مطلب تھا کہ تیمور نے اپنی کارروائی شروع کر دی ہے۔

آر کے نے برآمدے میں کھڑے ہوئے دونوں گارڈز کو نشانہ بنایا تھا۔ پھر ہم لوگ گاڑی کی اوٹ میں باہر کی طرف لڑھک گئے۔ امجد ہم سے پہلے ہی نکل چکا تھا۔ برآمدے میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ امجد نے نشانہ لے کر وہ ٹیوب لائٹ توڑ دی۔ برآمدے میں اندھیرا چھا گیا لیکن وہاں ابھی اتنا اندھیرا نہیں تھا۔ لان اور گیٹ سے آنے والی روشنی میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

ہم لوگ زمین پر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھے اور اوپر جانے والے ایک زینے کی آڑ میں چھپ گئے۔

اوپر سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسی وقت تیسرا دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا پہلے دو دھماکوں سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔

اوپر سے آنے والے اچانک رک گئے۔

اچانک بنگلے کا لان اور ارد گرد کا علاقہ تیز روشنی میں نہا گیا۔ اوپر موجود محافظوں نے سرچ لائٹس روشن کر دی تھیں۔ ہم زینے کی آڑ میں تھے اس لیے اس روشنی سے محفوظ رہے۔

پھر ایک اور زوردار دھماکا ہوا اور باؤنڈری وال کا ایک حصہ زمین بوس ہو گیا۔ پھر دو فائر ہوئے اور دونوں سرچ لائٹس اندھی ہو گئیں۔ اوپر سے پھر قدموں کی آوازیں آئیں۔ اس دفعہ اترنے والے بہت محتاط تھے لیکن انہیں اندازہ نہیں تھا کہ موت ان کے پہلو میں بیٹھی ہے۔ وہ جونہی زینے سے نیچے اترے، ہم سے پہلے امجد نے انہیں نشانہ بنا لیا۔ وہ زینے کے عین سامنے ایک ستون کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔

پھر ٹوٹی ہوئی دیوار سے تیمور، جیتی اور آر کے کے کئی آدمی وہاں آ گئے۔

"تیمور! میں اور کامران اندر جا رہے ہیں، تم یہاں کی پوزیشن کو کنٹرول کر لینا۔" آر کے نے کہا پھر ہم کرالنگ کرتے ہوئے اندر بڑھے۔

اندر کا منظر دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ ورما نے پولیس کمشنر کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا اور اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ فوری طور پر یہاں پولیس فورس طلب کرے۔ وہ ہمیں نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ ہم لیٹے ہوئے تھے۔

آر کے نے اپنی گن سیدھی کی اور نشانہ لے کر ورما کا ہاتھ ناکارہ کر دیا۔ اس کی گن اچھل کر دور جا گری اور وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔

"بس... تمہارا کھیل ختم ہو گیا ورما۔" آر کے نے کہا۔ "اب خاموشی سے خود کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"اب میں سمجھا۔" ورما نے کہا۔ "تو بھی یہاں پاکستانی ایجنسی کے لیے کام کر رہا ہے اور یہ حرامزادہ پولیس کمشنر بھی تجھ سے ملا ہوا ہے۔"

پولیس کمشنر نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ مارا اور بولا۔ "اب مجھے گالی دی تو تھپڑ کے بجائے گولی ماروں گا۔"

"تم لوگ کیا سمجھتے ہو، تم یہاں سے بچ کر نکل جاؤ گے؟"

"ہم صرف اتنا سمجھتے ہیں کہ تجھے نرک میں پہنچا دیں گے۔" آر کے نے کہا۔

اسی وقت پردے کے پیچھے ایک سایہ لہرایا۔ میں نے بے دریغ فائر کر دیا۔ وہ چیخ مار کے باہر گرا۔ وہ بھی ورما کا کوئی گارڈ تھا۔

"تم نے سعید اور نوشین کو کہاں رکھا ہے؟" آر کے نے پوچھا۔

"اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ لوگ یہاں ہیں تو یہ تمہاری

بھول ہے۔ وہ یہاں نہیں ہیں۔"

"کوئی بات نہیں... تو تو یہاں ہے۔" آر کے نے کہا۔ "ہم فی الحال تجھے ہی ختم کر کے چلے جائیں گے۔ ان کا سراغ بھی مل ہی جائے گا۔" پھر وہ پولیس کمشنر سے مخاطب ہوا۔ "اس کی تلاشی لو۔"

ورما کا ایک ہاتھ پہلے ہی زخمی تھا۔ پولیس کمشنر نے انتہائی مہارت اور بیدردی سے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے پرس کے علاوہ کچھ کاغذات اور چابیوں کا ایک گچھا برآمد ہوا۔ اس کے کوٹ کی جیب میں ایک ریوالور اور بھی تھا۔ پولیس کمشنر نے وہ ریوالور بھی نکال لیا۔

"سعید اور نوشین کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو تم قیامت تک مجھ سے معلوم نہیں کر سکو گے۔"

اسی وقت کمرے میں تیمور اور جیتی داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی ریوالور تھے۔ تیمور نے بتایا۔ "اوپر سے اترنے کے لیے دو زینے ہیں۔ ایک پر میں نے رگھو اور دو آدمیوں کو لگایا ہے اور دوسرے پر ہمارا ایک آدمی ساجد ہے۔ اس کے ساتھ بھی دو آدمی ہیں۔"

"ساجد بہت جی دار آدمی ہے۔" آر کے نے کہا۔ "وہ مر جائے گا لیکن اپنی جگہ نہیں چھوڑے گا۔"

"میں تم سے آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں کہ نوشین اور سعید کہاں ہیں؟" میں نے ورما سے پوچھا۔

وہ جواب میں انتہائی حقارت سے مسکرایا۔

میں نے اچانک اس کا گریبان پکڑا اور اسے جھٹکا دے کر فرش پر گرا دیا۔ پھر بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پشت سے اس کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔

وہیں میز پر سگریٹ کا ایک پیکٹ پڑا تھا۔ میں نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ جیتی اور تیمور کے ساتھ ساتھ آر کے بھی حیران تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔

میں نے سگریٹ کے دو تین گہرے کش لیے اور ورما سے پوچھا۔ "بتاؤ... سعید اور نوشین کہاں ہیں؟"

وہ خاموشی سے سامنے دیکھتا رہا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اس کا سر پکڑا اور سگریٹ کا جلتا ہوا سرا اس کے کان میں ڈال کر رگڑ دیا۔

وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخا۔ میں نے دوسرا سگریٹ نکال کر سلگایا اور اس سے کچھ پوچھے بغیر پھر اس کے اسی کان کو ایش ٹرے کے طور پر استعمال کیا۔ اس مرتبہ میں نے سگریٹ مزید اندر کی طرف ڈال کر رگڑا تھا۔ وہ پھر

بری طرح چیخا۔

تیمور اور جیتی حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ آر کے کی توجہ داخلی دروازے کی طرف تھی۔ میں نے تیسرا سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اس کے دو تین گہرے کش لیے اور اس مرتبہ ورما کا دوسرا کان پکڑ لیا۔

وہ بری طرح چیخا۔ "بتاتا ہوں... بتاتا ہوں۔"

"جلدی بتاؤ ورنہ یہ سگریٹ ختم ہو گئی تو پھر مجھے پورا سگار سلگانا پڑے گا کیونکہ پیکٹ میں اب اور سگریٹ نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ دونوں اسی بنگلے کے تہ خانے میں موجود ہیں۔ تہ خانے کا راستہ تو مجھے معلوم ہے لیکن ان کی نگرانی پر جو گورکھا ہے وہ بہت خطرناک ہے۔ وہ میری بات بھی نہیں مانتا۔" ورما نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم بھی تو میری بات نہیں مان رہے تھے۔" میں نے ورما کو دھکا دیا۔ وہ نیچے گر پڑا۔

ورما لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور گرتا پڑتا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر اس نے ایک سوئچ آن کیا اور پتنگوں کی طرح جلنے لگا۔

میں نے ورما کے سر پر ہلکا سا ایک ہاتھ رسید کیا۔ وہ فوراً ہی ناک آؤٹ ہو گیا۔ مجھے کسی خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ میں احتیاطاً زمین پر لیٹ گیا۔ جیتی اور تیمور صوفے کے پیچھے چھپ گئے اور امجد ایک پردے کے پیچھے چلا گیا۔ آر کے بھی بڑے سے صوفے کے پیچھے چلا گیا۔

فوراً ہی کمرے میں چار مسلح جوان داخل ہوئے۔ انہوں نے الجھے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے، صوفے کے پیچھے سے بیک وقت دو فائر ہوئے۔ تیسرا فائر ایک دو سیکنڈ کے وقفے سے ہوا۔ مرنے والوں کی چیخیں بہت بھیانک تھیں۔

چوتھے آدمی نے فرش پر لیٹتے ہوئے پوزیشن لینے کی کوشش کی۔ اس کی پھرتی داد کے قابل تھی لیکن زمین پر تو میں پہلے ہی موجود تھا۔ میں نے فوراً ہی فائر کر کے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔

پولیس کمشنر بری طرح سہما ہوا تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "یہ پاکستانی ایجنسی والے واقعی بہت ظالم ہوتے ہیں۔"

"یہاں سے کوئی کسی کو ٹیلی فون نہ کر دے۔" آر کے نے فکرمندی سے کہا۔

www.pkdigest.com

’’رگھو نے ٹیلی فونز کی لائنیں کاٹ دی ہیں بھائی! زندہ رہ جانے والوں کے پاس جو سیل فون تھے، وہ اس نے اپنے قبضے میں لے لیے ہیں۔ یہ رگھو واقعی بہت کام کا آدمی ہے۔‘‘

’’تم چلو ہمارے ساتھ، تہ خانے کا راستہ تلاش کرو۔‘‘ آر کے نے پولیس کمشنر سے کہا۔

’’مم... میں تو...‘‘

’’میں تمہیں یہاں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔‘‘ پھر وہ امجد سے مخاطب ہوا۔ ’’امجد! اس ورما کی لاش کو ہوش میں لا... یا اسے کندھے پر اٹھا کر لے چل۔‘‘

’’یہ ابھی ہوش میں آجائے گا۔ میں نے بہت ہلکا ہاتھ مارا تھا۔‘‘ میں نے کہا۔ پھر وہاں رکھے ہوئے پانی کے جگ سے اس کے منہ پر چھینٹے مارے تو چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا پھر اپنے آدمیوں کی لاشیں دیکھ کر اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔

’’تہ خانے میں چلو۔‘‘ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

ورما گرتا پڑتا کمرے کی طرف بڑھا۔ کمرے کا کارپٹ پہلے ہی ایک جگہ سے ہٹا ہوا تھا اور فرش میں ایک خلا سا موجود تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں کوئی سلائڈنگ دروازہ موجود تھا۔ ورما کے چہرے پر اطمینان تھا اور اسی اطمینان سے مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے سوچ دبا کر یقینی طور پر اپنے ان گارڈز کو طلب کیا تھا جو ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ وہ لوگ شاید تہ خانے کے اسی راستے سے نکلے تھے۔

ورما نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ تہ خانے کا راستہ ہے۔‘‘

’’پہلے تم اندر جاؤ گے۔‘‘ آر کے نے کہا۔

’’مم... میں...‘‘ ورما ہکلایا۔ ’’اچھا ٹھیک ہے... پہلے میں ہی اندر چلا جاتا ہوں۔‘‘

وہ ایک مرتبہ پھر دیوار کا سہارا لیتا ہوا تہ خانے میں اتر گیا۔ اس کے پیچھے آر کے تھا۔ آر کے کے پیچھے میں تھا۔ ہم تینوں آگے پیچھے ہی تہ خانے میں اترے تھے۔

اچانک ایک فائر ہوا اور آر کے اچھل کر پیچھے گر پڑا۔ میں پھرتی سے دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ اس دوران میں مجھے ریوالور کی جھلک اور ایک ہاتھ دکھائی دے گیا تھا۔ میں نے ہاتھ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ انسانی چیخ کی کرب ناک آواز گونجی اور زخمی ہاتھ سے ریوالور اچھل کر دور جا گرا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ بھی کوئی کمانڈو تھا اور اب دوسرے ہاتھ سے ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک ہی فائر میں اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر میں آر کے کی طرف متوجہ ہوا۔ گولی اس کے دائیں ہاتھ میں لگی تھی۔ اس نے کہا۔ ’’میں ٹھیک ہوں، تم سعید اور نوشین کو تلاش کرو اور یہاں سے نکلو۔‘‘

اسی وقت جینی بھاگتی ہوئی تہ خانے میں نمودار ہوئی۔ آر کے کو زخمی دیکھ کر اس نے مرنے والے کمانڈو کی شرٹ کی آستین پھاڑی اور آر کے کے ہاتھ پر باندھ دی تاکہ اس کا خون زیادہ ضائع نہ ہو۔

پھر جینی میرے ساتھ محتاط انداز میں آگے بڑھی۔

وہ خاصا بڑا تہ خانہ تھا۔ اس میں لاک اپ کی طرح کئی کمرے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ لاک اپ میں دروازے پر سلاخیں ہوتی ہیں، وہاں ٹھوس دروازے تھے۔

میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھا۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے آس پاس کا کوئی پلر مجھ پر آن گرا ہو۔ مجھ پر چھلانگ لگانے والا شخص انتہائی کیم شیم اور مضبوط تھا۔ اس کا سر گنجا تھا اور کان میں بڑا سا کنڈل پڑا ہوا تھا۔ اس کی جست سے ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے مجھے یوں دبوچ رکھا تھا جیسے عید کے موقع پر کچھ لوگ خود سے کمزور لوگوں سے عید ملتے ہیں اور مذاق ہی مذاق میں انہیں دباتے ہیں۔

اس نے بھی مجھے کچھ اسی انداز میں جکڑ رکھا تھا اور مسلسل میرے جسم کو دبا رہا تھا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ بھی ایک طرح سے ناکارہ کر دیے تھے اور دونوں پیر بھی۔ میں گھٹنے سے بھی اس کے جسم پر ضرب نہیں لگا سکتا تھا۔ اس کا سر بھی اتنا اونچا تھا کہ میں اس کے سر پر ٹکر بھی نہیں مار سکتا تھا۔

اچانک جینی نے حلق سے تیز آواز نکالی اور اس کے کدو جیسے سر پر زوردار لات رسید کر دی۔

اس سے صرف اتنا فرق پڑا کہ اس کی گرفت کچھ ڈھیلی ہوگئی۔ میں نے گھٹنے سے اس کے پیٹ پر وار کیا تو وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہوگیا۔ میں نے دوسرا وار اس کے کدو جیسے سر پر کیا تو وہ فرش پر گر گیا اور کچھ ایسا اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ ایک عورت کے سہارے لڑ رہے ہو۔ مرد ہو تو اکیلے مجھ سے مقابلہ کرو۔

میری کھوپڑی بھی سنک گئی۔ میں نے جینی سے کہا۔ ’’اب تم بالکل بیچ میں مت آنا۔ میں ابھی اس کا گونگا پن نکالتا ہوں۔‘‘ پھر میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور چہرے پر بھرپور گھونسا رسید کر دیا۔ وہ پھر گر گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گا لیکن وہ کم بخت پھر اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اس کے سر پر ہلکی سی ایک لات رسید کی تو اس کی حالت ایسی ہوگئی جیسے بے ہوش ہونے سے پہلے کسی مریض کی ہوتی ہے۔

میں نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے اس میں سے دو چابیاں ملیں۔

میں گونگے کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھا اور بولا۔ ’’سعید بھائی! آپ میری آواز سن رہے ہیں... آپ کہاں ہیں؟‘‘

’’ہم یہاں ہیں کامران!‘‘ ایک کمرے سے سعید بھائی کی آواز سنائی دی۔

میں جھپٹ کر اس دروازے پر پہنچا اور اس کا لاک کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ دوسری چابی اس لاک میں لگ گئی۔

سعید بھائی باہر نکل کر والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئے اور بولے۔ ’’شکریہ میرے بھائی! میں تو اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا تھا۔‘‘ مجھے ان سے زیادہ نوشین کی عزت کا خیال تھا۔

اگر سعید بھائی نہ ہوتے تو شاید نوشین بھی اسی انداز میں ملتی لیکن وہ صرف آنسو بہا کر اور مجھے حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

مجھے تجسس تھا کہ یہ دوسری چابی کس کمرے کی ہے۔ یقیناً وہاں بھی کوئی اہم آدمی ہوگا۔ ورنہ گونگا وہ چابی اپنے پاس کیوں رکھتا؟

میں نے دو تین کمرے آزمائے۔ تیسرے کمرے کا دروازہ اس چابی سے کھل گیا۔

اس کمرے میں کسی انسان کے بجائے مختلف فائلیں، سی ڈیز اور نہ جانے کس قسم کے کاغذات تھے۔ میں نے نوشین سے کہا۔ ’’اگر تمہارے کمرے میں بیڈ پر چادر ہو تو وہ لے آؤ۔‘‘

نوشین فوراً ہی بیڈ کی چادر اٹھا لائی۔ میں نے وہ تمام سی ڈیز، فائلیں، مائیکرو فلمز اور کاغذات اس چادر پر ڈھیر کر کے ان کی گٹھڑی بنالی۔

ورما میری یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اسے زندہ دیکھ کر ایک مرتبہ پھر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبوچا اور اسے پوری قوت سے دبانے لگا۔ وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ میں نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کا جسم ساکت ہو کر میرے ہاتھ میں جھول نہیں گیا۔ میں نے نفرت سے اس کے منہ پر تھوکا اور مزید غصے کے طور پر اس کے مردہ جسم پر دل کے مقام پر ایک فائر کر دیا۔

اسی وقت میری نظر گونگے پر پڑی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اب مجھے اس کے ہاتھوں میں خوفناک قسم کا ایک چاقو دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے یہ ظاہر کیا جیسے وہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتا ہے، پھر اچانک وہ پھرتی سے مڑا اور نوشین کے سینے پر چاقو کا وار کر دیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس سے پہلے کہ اس کا چاقو نوشین کے سینے میں اترتا، جینی برق رفتاری سے اس کی طرف جھپٹی۔ وہ گونگے کو روکنا چاہتی تھی لیکن اس سے اندازے کی غلطی ہوگئی۔ نوشین پر کیا جانے والا چاقو کا وار اس نے اپنے سینے پر سہہ لیا۔ چاقو دستے تک اس کے جسم میں پیوست ہوگیا۔ چاقو اس کے سینے میں بائیں طرف پیوست ہوا تھا اس لیے اس کے بچنے کے چانسز نہ ہونے کے برابر تھے۔

’’جینی!‘‘ میں جذباتی انداز میں چیخا اور گھوم کر گونگے کے سر پر اتنی زور سے پنچ مارا کہ اس کی کھوپڑی چٹخ گئی۔

جینی کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے وحشت زدہ لہجے میں کہا۔ ’’جینی! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔‘‘

’’اب بہت دیر ہو چکی ہے کامی!‘‘ وہ مسکرا کر بولی اور خون کی ایک پتلی سی لکیر اس کے ہونٹوں سے بہہ کر ٹھوڑی تک آگئی۔

اسی وقت تیمور بھی وہاں آگیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ’’جینی! ہمت مت ہارو۔ ہم تمہیں ابھی اسپتال لے جائیں گے۔ تم تو ہمیں دل پاور کے بارے میں سمجھایا کرتی تھیں۔‘‘

’’اب... بہت... دیر ہو... چکی ہے... دوستو!‘‘ جینی نے کہا۔ ’’انسان کی دل... اسی وقت تک... کام کرتی ہے... جب اس میں پاور ہو۔‘‘ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ’’کامی!... مجھ سے وعدہ کرو کہ... تم... ہمیشہ... نوشین... کا خیال رکھو گے... مجھے... نہ جانے کیوں... یقین تھا کہ... تم... صرف نوشین کے لیے ہو... میں تو... فضول میں... تم دونوں کے بیچ میں آگئی... نوشین... تم بھی... تم بھی... کامی کا...‘‘ اتنا کہنے کے بعد اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں دھاڑیں مار مار کے روؤں۔ تیمور تو لڑکیوں کی طرح سسکیاں لے رہا تھا۔ آر کے اور امجد کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

نوشین تو اس بری طرح بلک بلک کر رو رہی تھی جیسے

اس کی کسی بہت قریبی عزیز کی موت ہوئی ہو۔
میں سکتے کے عالم میں جینی کے مردہ جسم کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے جسم سے چاقو نکالا تو خون کا ایک فوارہ سا نکلا۔ میں نے جنون کے عالم میں وہی چاقو نہ جانے کتنی دفعہ گونگے شخص کے جسم میں پیوست کیا۔ اگر تیمور مجھے پکڑ نہ لیتا تو شاید میں گونگے کی لاش کا قیمہ کر دیتا۔
پھر میں نے جینی کو اٹھایا اور وہاں سے نکلا جیسے ابھی ابھی اسے تدفین کے لیے لے جا رہا ہوں۔
پھر مجھے علم نہیں کہ ہم تہ خانے سے باہر کیسے نکلے؟ میں نے ورما کی بنائی ہوئی ویڈیوز کی سی ڈیز، مائیکرو فلمز، فائلیں اور کاغذات جس گٹھڑی میں باندھے تھے، اسے کس نے اٹھایا؟
مجھے ہوش تو اس وقت آیا جب ہم آر کے کے بنگلے پر پہنچ چکے تھے۔
احمد آباد کا پولیس کمشنر اب بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اگر نہ ہوتا تو شاید ہم اتنی آسانی سے وہاں دھماکے اور آزادانہ فائرنگ نہیں کر سکتے تھے۔ بقول رگھو کے، اس نے پرنام سنگھ کے بنگلے کی باؤنڈری وال پر پانچ گلوو زنی بم مارا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے بنگلے کے گرد پھیلے ہوئے گارڈز پر بھی انتہائی طاقتور بم برسائے تھے ورنہ ہم اتنی آسانی سے اس بنگلے میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔
ان لڑکیوں کی وہ اطلاع غلط تھی یا شاید انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ بنگلے میں آرمی موجود ہے۔ آرمی اس قسم کے کاموں میں ملوث نہیں ہوتی۔ بلیک کیٹس کے صرف بارہ آدمی تھے جن میں سے دو گیٹ پر تھے۔ چار تہ خانے میں سعید بھائی اور نوشین کی نگرانی پر تھے اور چار آدمی چھت پر مورچا بند تھے جو فائرنگ کے بعد فوری نیچے آگئے تھے۔
یہ بھی بعد میں معلوم ہوا کہ ورما نے جو سوئچ دبایا گیا تھا، اس سے ایک ریڈ بلب روشن ہو گیا تھا جو وہاں کے گارڈز کے لیے اشارہ تھا کہ اوپر موجود لوگوں کی جان خطرے میں ہے اور گونگے کے لیے اشارہ تھا کہ اب اسے ہر قیمت پر وہاں آنے والوں کو روکنا ہے۔

☆☆☆

ہم جو اسٹف وہاں سے لائے تھے، اس میں ایسی ایسی سی ڈیز تھیں کہ بھارت کے بڑے بڑے سیاست داں ننگا برہنہ ہو گئے تھے۔ کچھ مائیکرو فلمز ایسی تھیں جن میں پاکستان کے خلاف مستقبل میں کی جانے والی سازشوں کے مکمل منصوبے تھے اور کچھ مائیکرو فلمز ایسی تھیں جو سیاسی لحاظ سے پاکستان کے لیے بہت قیمتی تھیں۔ سب سے قیمتی تو وہ نقشے تھے جو ورما اور دلی کے پولیس کمشنر نے میری جیب میں رکھے تھے۔ وہ واقعی اوریجنل نقشے تھے۔ وہ پاکستانی انٹیلی جنس کے بہت کام آسکتے تھے۔
اس سفر میں، میں نے کھویا بہت کچھ تھا... پایا کچھ بھی نہیں تھا۔ آر کے کا خیال تھا کہ ہم نے جینی کو ضرور کھویا ہے لیکن اس کے بدلے میں ہمیں وہ کچھ ملا ہے جو پاکستان کے لیے بہت قیمتی ہے۔
سعید بھائی نے ارجن سنگھ سے میرا پاسپورٹ بنوا لیا تھا لیکن وہ پاسپورٹ پاکستانی نہیں بلکہ انڈین تھا۔ اس پر پاکستان کا ویزا بھی تھا۔ پاسپورٹ میں میرا نام ارجن سنگھ تھا اور میں اپنے عزیزوں سے ملنے ایبٹ آباد جا رہا تھا۔
میں ابھی تک آنٹی نسیمہ سے نہیں ملا تھا۔ وہ نوشین کے اغوا پر اتنی حواس باختہ تھیں کہ اسے فوراً ہی رخصت کر دینا چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں اسے اپنے ساتھ ہی لے کر پاکستان جاؤں۔
واپسی کے سفر میں جینی کے بجائے نوشین میرے ساتھ تھی۔ میں نے نوشین کی طرف دیکھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے [illegible]
کے بعد میں پہلی دفعہ رویا تھا۔
وہ لوگ بھی چاہتے تھے کہ میرے دل کی بھڑاس نکل جائے۔

☆☆☆

پاکستان پہنچ کر میں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنا انڈین پاسپورٹ پھاڑ کر پھینک دیا۔ پھر وہ تمام مائیکرو فلمز اور لال قلعے کے نقشے میں نے پاپا کے جاننے والے بریگیڈیئر انکل اقبال کے حوالے کر دیے اور انہیں تفصیل سے بتا بھی دیا کہ یہ نقشے کیسے مجھے ملے ہیں۔

☆☆☆

ابھی کچھ ہی دن پہلے آرمی کی طرف سے مجھے ایک لیٹر موصول ہوا ہے جس میں مجھ سے کہا گیا ہے کہ پاکستان آرمی خصوصاً ایس ایس جی کو آپ جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔
میں سوچ رہا ہوں کہ آرمی کی اس آفر کو قبول کروں یا نہیں؟ نوشین کا خیال ہے کہ مجھے یہ آفر قبول کر لینا چاہیے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ مگر پھر سوچتا ہوں کہ ایسی بدخصلت قوم کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے پاکستان آرمی ضرور جوائن کرنا چاہیے۔

نمبرپلیٹ

نسیم شفیق

بیتے ہوئے وقت کو بہت کم لوگ یاد رکھتے ہیں ...... کم و بیش ہر ایک کی نظر حال و مستقبل پہ مرکوز رہتی ہے ...... گزرے وقت کی پرچھائیں آنکھوں سے اوجھل ضرور ہو جاتی ہیں ماضی سے وابستہ یادوں کے ان مٹ نقش جو حقیقت کا روپ دھار کر ایک بار پھر سامنے کھڑے تھے

قتل کی متواتر وارداتیں...... جو معمے کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھیں

لندن پولیس ہیڈ کوارٹرز میں روزمرہ کی چہل پہل تھی۔ سارجنٹ مائک اپنی میز پر بیٹھا ناشتا ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے نائب سے کچھ ڈیٹا بھی کلیکٹ کروا رہا تھا۔ جب سے اس کا نیا سلسلۂ عشق شروع ہوا تھا، اس کی بیوی نے اسے ناشتا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کانسٹیبل صوفی اپنے ہاتھوں فائل کرنے کے ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے مائک کو دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ اپنے اگلے افیئر کی منصوبہ بندی کرنے میں مگن تھی۔
سارجنٹ روجر حسب معمول فائلوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ وہ ایک خودکشی کے کیس کا جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ ہی عرصے میں وہ ترقی کر کے انسپکٹر کے عہدے تک پہنچنے والا تھا۔ وہ ایک ذمے دار اور قابل آفیسر تھا۔ جس کیس میں ہاتھ ڈالتا، اسے مکمل کر کے ہی رہتا۔ اس کی نائب میری تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس کے قریب آئی۔
”ایک اور خودکشی۔“ وہ ایک تصویر روجر کی ٹیبل پر رکھ کر بولی۔
روجر نے بغیر کچھ کہے تصویر اٹھائی۔ یہ پینتیس سے چالیس سالہ عورت تھی۔ بال سرخ اور جسم قدرے بھاری تھا۔ اس عورت میں مرد کو متوجہ کر لینے کی قدرتی صلاحیت موجود تھی۔
”ایلزبتھ سل... اس نے بھی خود کو اپنی ہی ٹیکسی میں بند کر کے خودکشی کی ہے۔“ میری اسے خاموش دیکھ کر دوبارہ بولی۔
”ہونہہ!“ روجر نے ایک طویل سانس لی اور تصویر میز پر پھینک دی۔ ”حالات آج کل مردوں کے تنگ ہیں اور خودکشی عورتیں کر رہی ہیں۔“
مائک اپنا ناشتا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتا وہیں آگیا۔ ”کافی دلکش عورت ہے۔“ وہ تصویر دیکھتے ہوئے بولا۔
”پہلے والی بھی کافی خوب صورت تھی۔“ روجر نے پُرسوچ انداز میں کہا۔
”کاش! یہ مرنے سے پہلے مجھ سے مل لیتیں۔“ مائک نے حسرت سے کہا۔
”ابھی تمہاری بیوی نے صرف ناشتا بند کیا ہے، یقیناً جلد ہی تمہارا داخلہ بھی بند کر دے گی۔“ روجر نے پیش گوئی کی۔

www.pkdigest.com

''یقیناً یہ مردوں کی بے وفائی کا شکار ہیں ورنہ اتنی خوب صورت عورتوں کو کیا ضرورت تھی خودکشی کرنے کی؟''

''ضروری نہیں کہ ان کی موت کی وجہ خودکشی ہو... یہ قتل بھی ہو سکتے ہیں۔''

''سر! میں آپ کی بات سے اتفاق کروں گی۔'' میری بولی۔ ''پہلی عورت کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اپنی موت سے پہلے وہ مکمل ہوش میں نہیں تھی کہ اسی دوران اس کی موت واقع ہو گئی۔ مارنے والے نے یقیناً پہلے اسے بے ہوش کیا پھر اسے اس کی ٹیکسی میں بند کر کے گاڑی کا ایگزاسٹ پائپ اندر ڈال دیا۔ بظاہر یہ خودکشی لگتی ہے مگر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ یہ ثابت نہیں کرتی۔'' میری نے رپورٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے تفصیل بتائی۔ روجر کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ عام سا نظر آنے والا کیس اچانک ہی خاص ہو گیا تھا۔

''آج کی رپورٹ نہیں آئی؟'' اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ ہی دیر میں مل جائے گی۔'' میری نے اسے بتایا۔

''جائے وقوعہ کا جائزہ تم نے اپنی نگرانی میں کرایا تھا؟''

''یس سر! ایلز تھ رسل کی ٹیکسی کون ڈوٹ اسٹریٹ کے آخری سرے پر کھڑی ملی تھی۔ یہ اسٹریٹ لندن تھیٹر کے قریب ہی ہے۔ تمام شواہد میں نے اپنی نگرانی میں اکٹھے کیے ہیں۔ گاڑی میں موجود انگلیوں کے نشانات اور اس کے اردگرد جوتوں کے نشانات بھی لے لیے ہیں اور کمپیوٹر سیکشن میں پہنچا دیے ہیں۔ جلد ہی کچھ نتیجہ سامنے آجائے گا۔'' میری نے اپنے فرائض کی رپورٹ دی۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ شراب کی زیادتی سے بے ہوش ہوئی ہو یا کوئی گہرا صدمہ پہنچا ہو؟'' مائنک نے لقمہ دیا۔

''نہیں، چہرے اور گردن پر کچھ ضربوں کے نشانات ہیں اور رپورٹ کے مطابق اس نے شراب بھی نہیں پی ہوئی تھی۔'' روجر بولا۔

''اپنی وے... اگر یہ واقعی قتل ہے تو قاتل نہایت بے ہودہ ہے۔ ایسی عورت کو محبوبہ بنایا جاتا ہے نہ کہ مارا جاتا ہے۔'' مائنک تاسف سے بولتا ہوا اپنی سیٹ پر چلا گیا۔

''جیسے ہی موجودہ رپورٹ ملے، میرے پاس پہنچا دینا۔'' روجر پاس کھڑی میری سے بولا تو وہ سر ہلا کر چلی گئی۔ نیلی آنکھوں والی میری، روجر کے لیے بہت مستعد اور ذہین ساتھی ورکر ثابت ہوئی تھی۔ وہ کافی کم عمر تھی اور بڑی تیزی سے ترقی کرتی اس عہدے تک پہنچی تھی۔ روجر اسے جاتا ہوا دیکھ کر کسی خیال میں کھو گیا۔ اس کی اپنی بیٹی بھی ایک آدھ سال کے فرق سے میری جتنی ہی ہو چکی تھی۔ اسے اکثر میری میں اپنی بیٹی کی جھلک نظر آتی تھی۔ اسی لیے اس نے ہمیشہ میری سے اچھا برتاؤ رکھا تھا۔ بیٹی کا خیال آتے ہی وہ کچھ متفکر سا ہو گیا۔ اس کی بیٹی کیرل اب آکسفورڈ لا اسکول سے گریجویشن کر رہی تھی۔ پہلے وہ ایک فرماں بردار بیٹی تھی مگر پچھلے دو سال میں اس کے اندر کافی تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ پہلے سے زیادہ فیشن ایبل ہونے کے ساتھ اس کی باتوں کو بھی چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی۔ اس کا روز بروز مختصر ہوتا لباس اسے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ ایک دو مرتبہ وہ اسے کچھ آوارہ قسم کے لڑکوں کے ساتھ بھی دیکھ چکا تھا۔ باپ کے سمجھانے پر وہ اس سے دور بھاگنے لگی تھی۔

یہ سب کچھ اس کی بیوی کیتھی کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ کیتھی شروع سے ہی الگ مزاج کی مالک تھی۔ وقتاً فوقتاً مختلف مشغلے اپنائی رہتی پھر انہیں ترک کر دیتی۔ نہ جانے کتنی ہی کمپنیوں میں کام کر کے چھوڑ چکی تھی مگر پچھلے تین سالوں سے وہ مستقل ایک ہی پیشہ اپنائے ہوئے تھی... اور وہ تھا لندن سٹی میں اپنی بلیک کیب چلانا۔

روجر کو کیتھی کے اس پیشے سے شدید نفرت تھی۔ وہ پولیس میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا اور اسے یہ سوچ کر ہی الجھن ہونے لگتی تھی کہ اس کی بیوی ٹیکسی چلاتی ہے مگر کیتھی کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے اس پیشے سے بہت مطمئن اور خوش ہے جبکہ روجر کے خیال میں اس کے اسی پیشے کی وجہ سے ہی کیرل بگڑتی جا رہی تھی۔ اس پیشے کی وجہ سے کیتھی کی زبان بھی کافی بگڑ چکی تھی اور اس کا سارا اثر جوان ہوتی کیرل پر پڑ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ انہی خیالوں میں گم رہا پھر سر جھٹک کر اپنی فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

روز اپنی ٹیکسی کلب کی پارکنگ میں کھڑی کر کے سبک روی سے چلتے ہوئے کلب میں داخل ہوئی۔ کچھ دیر بعد اس نے ویٹر کو وہسکی کا آرڈر دیا اور کلب کا جائزہ لینے لگی۔ یہ نائٹ کلب تھا اور اس میں چار بارز اور ایک بڑا ڈانس فلور تھا۔ اسپینش اور لاطینی لائیو سالسا (SALSA) پیش کیا جاتا تھا۔ وہ ایسے مہنگے بارز کا رخ مہینے میں ایک آدھ بار ہی کیا کرتی تھی جب کسی گاہک سے کچھ اچھے دام مل جاتے۔

اسے ٹھیک آدھ گھنٹے بعد ایک مسافر کو نیو آکسفورڈ اسٹریٹ سے لینا تھا۔ یہ اسٹریٹ چیرنگ کراس سے کچھ ہی فاصلے پر تھی اور اسے وہاں پہنچنے میں صرف پانچ منٹ کا وقت درکار تھا۔ وہسکی کے گھونٹ لیتی وہ کلب کی بڑھتی ہوئی رونق سے محظوظ ہونے لگی۔ اس نے صرف ایک پیگ ہی لیا تھا۔ اس سے زیادہ وہ افورڈ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہسکی کا خمار چڑھنا شروع ہوا تو وہ اپنے کام کے بارے میں سوچنے لگی۔ ٹیکسی چلانے کے علاوہ اس نے کچھ عرصے سے ایک سائڈ بزنس شروع کیا تھا جو اب خوب چل نکلا تھا۔ اس بزنس سے حاصل ہونے والی رقم جس رفتار سے بڑھ رہی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دولت مند ہونے والی ہے۔ پھر وہ وہسکی کے جتنے چاہے پیگ پی سکتی تھی۔ کبھی کبھار پینے کی وجہ سے ایک ہی پیگ نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ سر جھٹک کر اس نے خود کو نارمل کیا اور اطراف کا جائزہ لینے لگی۔ اردگرد نظر آنے والی حسین دنیا بھی وہسکی کے کسی پیگ سے کم نہیں تھی۔

اس کی نظریں سالسا کرنے والوں پر ٹک گئیں۔ کسی زمانے میں وہ بھی بار ڈانسر رہ چکی تھی۔ کتنے دلوں پر بجلیاں گرا چکی تھی مگر کسی کو لفٹ نہیں کرائی تھی۔ وہ سب اتنے ہی گھٹیا تھے جتنا سستا اور گھٹیا وہ بار تھا۔ وہ خود کو اتنا سستا بیچنا نہیں چاہتی تھی مگر اس کی قسمت سستی نکلی۔ بار میں وہ زیادہ دیر چل نہ سکی۔ اس کے انداز و اطوار دیکھ کر بار والوں نے اسے فارغ کر دیا۔ وہ وہاں سے کیا نکلی کہ اس کا وجود ہی بکھر کر رہ گیا۔ کتنے ہی برس اس نے اپنے آپ کو کیش کرانے کے انتظار میں گنوا دیے۔ بالآخر جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا سستا وجود اب کوئی قیمت نہیں رکھتا تو اس نے ٹیکسی لے لی۔ اس کی جوانی ڈھل گئی تھی مگر بڑھاپا ابھی دور تھا۔ وہ اس درمیانی وقفے کو بھرپور کیش کر رہی تھی۔ وقت کے ساتھ اس کی عقل و شعور میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ ٹیکسی چلانا ہی اب اس کا پیشہ اور سائڈ بزنس تھا۔

وہ اپنی انہی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک اُسے احساس ہوا جیسے کوئی اُسے کافی دیر سے گھور رہا ہے۔ اس کی متلاشی نظر جلد ہی مطلوبہ شخص تک پہنچ گئی۔ گھورنے والا شخص اسے جانا پہچانا لگا مگر وہسکی کا خمار ابھی حواسوں پر چھایا ہوا تھا۔ وہ بار بار پلکیں جھپک کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر وہ اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ وہ الجھ سی گئی۔ ''صورت تو جانی پہچانی ہے مگر یاد کیوں نہیں آرہا؟'' وہ بڑبڑائی اور پھر اسے احساس ہوا کہ آدھ گھنٹہ گزر چکا ہے، وہ جلدی سے اٹھ گئی۔ پیگ کے پیسے گن کر میز پر رکھے اور باہر نکل آئی۔ دل نے کہا، آج گن کر رکھے ہیں کل بغیر گنے رکھا کروں گی اور کل زیادہ دور نہیں رہا ہے۔

☆☆☆

پارکنگ سے ٹیکسی نکال کر وہ نیو آکسفورڈ اسٹریٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر میں اُسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ لاشعوری طور پر اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ رفتار بڑھتے ہی پچھلی گاڑی کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ ایکسلریٹر پر بڑھتے دباؤ نے اس کے نشے کو ہوا کر دیا۔ نیو آکسفورڈ سے اینڈل اسٹریٹ پھر وہاں سے گریٹ کوئن اسٹریٹ پر وہ بے تحاشا ٹیکسی دوڑاتی رہی۔ پیچھا بدستور جاری تھا۔ اس ہنگامی صورت حال میں اسے اچانک یاد آیا کہ اسے ایمرجنسی فون کرنا چاہیے۔ اس کی گاڑی میں ایک جدید وائرلیس سیٹ تھا جو کافی طاقتور رینج کا تھا۔ بمشکل اس نے ہنگامی لائن پر رابطہ کیا اور موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا۔

''آپ کا پیغام ریکارڈ ہو چکا ہے۔'' دوسری طرف سے آنسرنگ مشین کی آواز آئی تو اس نے جھنجلا کر دوبارہ نمبر ملایا مگر جواب بدستور وہی تھا۔

''تو... تو...'' اس نے زور سے وائرلیس ڈیش بورڈ پر دے مارا۔ بیک ویو مرر سے پچھلی گاڑی کو بدستور تعاقب میں دیکھ کر اس کے پورے وجود میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ہلکنے لگی۔ گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ اچانک ہی پچھلی گاڑی نے اُسے اوورٹیک کرتے ہوئے بریک لگا دیے۔ سامنے رکتی گاڑی سے وہ بمشکل دو چار انچ کی دوری پر بریک لگا پائی ورنہ اس کی ٹیکسی گاڑی سے ٹکرا جاتی۔ بریک لگاتے ہی اس کے پورے وجود میں خوف بھرنے لگا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ گاڑی ریورس کرتی۔ اسی اثنا میں اگلی گاڑی سے ایک سایہ سا نکل کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ کالے لباس میں، چہرے پر عجیب سا ماسک لگائے یہ اس شخص سے قطعی مختلف تھا جسے اس نے کلب میں دیکھا تھا۔

سایہ اس کے قریب آیا تو جیسے اُسے کچھ ہوش آنے لگا۔ گاڑی کا دروازہ بند کرنے کی غرض سے اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور سیاہ وجود نے اس کے سنبھلنے سے پہلے اس کی کنپٹی پر ایک زوردار ضرب لگائی اور وہ سیٹ پر لڑھک گئی۔ سیاہ لبادے میں ملبوس شخص نے اسے دوبارہ سیٹ پر بٹھایا۔ گاڑی اسٹارٹ کی... پھر پچھلے حصے کی طرف آکر ایک لمبا ربڑ کا پائپ گاڑی کے ایگزاسٹ سے منسلک کر کے گاڑی میں ڈال دیا اور گاڑی کے سارے دروازے لاک کر دیے۔ کچھ دیر بعد سیاہ کپڑوں میں ملبوس شخص اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آگے بڑھ گیا۔

گاڑی میں جیسے ہی دھواں بھرنا شروع ہوا، روز کو... ہوش آنے لگا مگر یہ معمولی سا دورانیہ تھا۔ اس کے وجود میں کاربن ڈائی آکسائڈ اور مونو آکسائڈ اتنی وافر مقدار میں داخل ہو چکی تھی کہ وہ کچھ ہی دیر میں تڑپ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ وہ

www.pkdigest.com

اپنے وجود کی قیمت بڑھانے کے شوق میں موت کی وادی میں دفن ہوگئی۔ پیسا دینے والی ٹیکسی ہی اس کی قبر بن گئی...

☆☆☆

کیتھی نے ناشتا میز پر لگایا اور ساتھ ہی دونوں بچوں کے لیے لنچ باکس بھی تیار کر کے میز پر ہی رکھ دیے۔ وہ نائٹ کیب چلاتی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی تقریباً صبح سات بجے کے قریب وہ گھر لوٹی تھی۔ اس کے سر میں شدید درد تھا مگر روجر اور بچوں کو ناشتا دے کر ہی وہ لیٹ سکتی تھی۔ کیرل اور روجر ناشتا شروع کر چکے تھے جب اس کا دس سالہ بیٹا ٹم آیا۔

"میں سلائس اور انڈے لوں گا۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تمہاری گڈ مارننگ کو کیا ہوا؟" کیتھی نے پوچھا۔

"گڈ مارننگ۔" وہ چڑ کر بولا۔ "مجھے اسکول کے لیے دیر ہو رہی ہے۔"

"مجھے تمہیں یہ بتا کر خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ تم حساب میں فیل ہو۔" کیرل ناشتے کے دوران اسے دیکھ کر بولی۔

"حساب اتنا اہم نہیں۔"

"کیا یہ کوئی مذاق ہے؟"

"میں ذاتی طور پر بھی نہیں سمجھتا یہ فنی ہے۔" اس نے بہن کو دیکھا۔ "لیکن اگر تم کچھ فنی (FUNNY) چاہتی ہو تو جا کر شیشہ دیکھ لو۔"

"ٹم! بہت ہو گیا۔" کیتھی ڈانٹ کر بولی۔ "اپنے رویے پر غور کرو۔" اس کے سر کا درد یک دم بڑھنے لگا...

روجر خاموشی سے ناشتا ختم کر رہا تھا۔

"میں چلتی ہوں، میری وین آگئی ہوگی۔" کیرل ادھورا ناشتا چھوڑ کر اٹھ گئی۔ ٹم نے اس کی نوٹ بک سے جھٹکا کاغذ نکال لیا۔

"ڈیئر کیرل! کل رات "فرینڈز" میں 9 بجے آجانا، پارٹی ہے۔" وہ بہ آواز بلند کاغذ کھول کر پڑھنے لگا۔

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرا پیپر پڑھنے کی۔" کیرل نے لپک کر کاغذ لیا اور ٹم کو گھورتے ہوئے باہر جانے لگی، تبھی روجر نے اسے مخاطب کیا۔

"ٹھہرو کیرل!" باپ کی آواز سن کر وہ بادل ناخواستہ رکی اور گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم آج کل اسکول نہیں جا رہی ہو... بتاؤ گی کہاں جا رہی ہو؟"

"تو آپ میری نگرانی کرتے ہیں؟" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "جب اتنا پتا چل گیا ہے تو باقی بھی معلوم کر لیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔ روجر نے غصے سے میز پر ہاتھ مارا اور کیتھی کو گھورنے لگا۔

"رات کو یہ گھٹیا ڈیوٹی کر کے تم صبح سے شام تک سوتی رہتی ہو یا اپنی آوارہ فرینڈز کے ساتھ گل چھرے اڑاتی ہو۔ تمہیں کچھ علم ہے تمہارے بچے کتنے بگڑ چکے ہیں؟" ٹم کے اسکول جاتے ہی وہ بولا۔

"میرے سر میں پہلے ہی بہت درد ہے، آہستہ بولو۔" کیتھی بے پروائی سے سر جھٹکتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ روجر نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔

"جانتی ہو وہ کہاں جاتی ہے... وہ ہم جنس (LESBIAN) کلبز میں جاتی ہے۔ تم مہربانی کر کے اپنی گھٹیا نوکری چھوڑ دو اور بچوں کو وقت دو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" وہ دہاڑ کر بولا تو کیتھی اپنا بازو چھڑواتے ہوئے اندر چلی گئی۔ وہ روجر کی بکواس زیادہ دیر برداشت کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اس وقت تو اس کی حالت بھی کافی خراب تھی۔ اب سر درد کی گولی کھائے بغیر نیند آنے والی نہیں تھی۔ روجر ٹھوکر سے کرسی دھکیلتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کی گہری آنکھیں جو ہر وقت ذہانت سے چمکتی رہتی تھیں، اس وقت شعلے برسا رہی تھیں۔

☆☆☆

آفس آ کر وہ اپنی ٹیبل پر بیٹھا ہی تھا کہ میری آگئی اور آتے ہی جو خبر اس نے سنائی [illegible] نے اپنا سر تھام لیا۔ ایک اور نائٹ کیب ہولڈر اپنی ہی کیب میں زندگی سے ہاتھ دھو چکی تھی۔ معاملہ کافی سنجیدہ اور گمبھیر ہو چکا تھا۔ لگاتار مرنے والی تینوں ٹیکسی ڈرائیورز اپنی ہی ٹیکسیوں میں دم توڑ چکی تھیں۔ پہلی دو پوسٹ مارٹم رپورٹس کے مطابق مرنے والیوں کو عارضی طور پر بے ہوش کر کے گاڑی میں ڈال کر مارا گیا تھا۔ تیسری رپورٹ بھی کچھ ہی دیر میں ملنے والی تھی اور اس کا نتیجہ بھی اب پہلی دو رپورٹس سے ملتا جلتا نظر آتا تھا۔

"سر! مجھے لگتا ہے کہ تینوں وارداتوں کا آپس میں کوئی تعلق ہے۔ قاتل کی تینوں سے دشمنی تھی۔"

"سوال یہ اٹھتا ہے کہ تینوں ٹیکسی ڈرائیورز ہی کیوں قتل ہوئیں جو قاتل کا طریقۂ واردات بھی ایک جیسا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ سلسلہ رکے گا نہیں۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

"یقیناً کوئی قاتل گھس آیا ہے شہر میں جو ٹیکسی ڈرائیورز کو مار رہا ہے۔" میری بولی۔

"ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی... لیکن قاتل نے ابھی تک کوئی نشان نہیں چھوڑا۔ لازماً وہ کوئی منجھا ہوا قاتل ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر میری کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہمیں ٹیکسی کلب جا کر معلومات اکٹھی کرنی ہوں گی۔"

"یس سر!" وہ الرٹ ہو کر بولی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ پولیس کار میں ٹیکسی کلب کی طرف چل پڑے۔

"سر! آپ کی وائف بھی ٹیکسی ڈرائیور ہیں... ان سے کچھ پتا چلا ان مرنے والیوں کے بارے میں؟" مین روڈ پر آتے ہی میری بولی۔

"میری اس عورت سے کسی بھی موضوع پر کسی بھی قسم کی تفصیلی بات چیت کرے سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ میرے بس میں ہو تو اس سے آج ہی طلاق لے لوں، صرف بچوں کی وجہ سے خاموش ہوں لیکن لگتا ہے کہ اب مزید خاموش رہنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

وہ غصے سے بولا پھر میری کے استفسار پر اسے کیرل اور ٹم کی موجودہ صورت حال بتانے لگا۔ اسے میری پر اعتبار تھا اور وہ اس سے اپنے گھریلو مسئلے آرام سے شیئر کر لیتا تھا۔ اپنی بیٹی کیرل کے حوالے سے تو اس کی پریشانی حقیقتاً دیکھنے لائق تھی۔ وہ اسے متعدد بار غلط لڑکے لڑکیوں کے ساتھ دیکھ چکا تھا اور اب تو اس نے اپنی پڑھائی بھی چھوڑ دی تھی جس کی وجہ سے روجر، کیتھی سے اور نفرت کرنے لگا تھا۔

پولیس کار [illegible] سروس کلب [illegible] پہنچ چکی تھی۔ وہ دونوں سیدھے ٹیکسی آفس میں گئے۔ وہاں سے انہیں پتا چلا کہ تینوں ٹیکسی ڈرائیورز ان کے ہی کلب سے رجسٹرڈ تھیں۔ یہ ایک رائل آٹو موبائل کلب تھا جہاں فری فون سروس تھی۔

کلب سیکریٹری کے نائب سے انہوں نے تینوں خواتین سے متعلق مزید معلومات حاصل کیں۔ ان کی کچھ قریبی دوستوں کے پتے لے کر وہ وہاں سے نکلنے لگے تھے کہ نائب نے ایک اور بات بتائی۔

یہ ایک پیغام تھا جسے رات روز نے آنسرنگ مشین پر ریکارڈ کروایا تھا۔ اسے سن کر ان دونوں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"اس کا مطلب ہے کہ قاتل ایک آدمی ہے جس نے کلب سے روز کا پیچھا کیا اور پھر اسے مار ڈالا۔ مرنے والی نے دو تین مرتبہ پیغام ریکارڈ کروایا تھا مگر کوئی آپریٹر موجود نہیں تھا۔" روجر نے کڑی نظروں سے نائب کو دیکھا۔ وہ بوکھلا گیا۔

"سر! آپریٹر ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو ہمارے کسٹمر خراب ہوتے ہیں۔ ہمارے زیادہ تر گاہک فون پر معاملات طے کرتے ہیں۔ مائیکل کا پیٹ خراب تھا اور ساری رات اس کی ٹوائلٹ آتے جاتے گزری ہے۔" اس نے آپریٹر کا نام لے کر تفصیل بتائی۔

"تو اس نے آپ کو مطلع نہیں کیا تھا؟"

"کیا تھا سر... مگر دوسرے آپریٹر کی بیٹی کی شادی تھی۔ ہمارے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا۔"

"اینی وے! جیسے ہی اس کی حالت بہتر ہو، پولیس اسٹیشن بھیج دینا۔ اس کی بے پروائی سے ایک عورت اپنی جان سے چلی گئی۔ ہمیں اس کا بیان لینا ہوگا۔"

"اوکے سر!" وہ پوری مستعدی سے بولا تو روجر اور میری وہاں سے چل پڑے اور پھر تمام دن وہ ان تینوں مقتولین کے قریبی دوستوں اور رشتے داروں سے ملتے رہے مگر کوئی قابل ذکر بات معلوم نہ ہو سکی۔ سوائے ایک مشترک بات کے... کہ تینوں ہی خوب صورت اور جنس مخالف کے لیے کشش کا باعث تھیں۔ تینوں کے کردار کے حوالے سے بھی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے ان کے خدشات سچ ثابت کر دیے۔ تیسری موت بھی پہلی دو اموات جیسی ہی تھی۔

"سر! مجھے تو لگتا ہے کہ قاتل کو خوب صورت عورتوں سے نفرت ہے ورنہ بغیر کسی وجہ کے وہ قتل کیوں کرتا؟" میری، روجر کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بولی۔ وہ کافی مشتعل لگ رہا تھا۔ میری کو علم تھا کہ اس کی اس پریشانی کی وجہ اس کی بیٹی ہے۔

"میری! بغیر کسی وجہ کے کوئی کسی کو قتل نہیں کر سکتا اور یہاں بھی قاتل کے پاس کوئی بڑی وجہ ہے اور وہ وجہ ہمیں معلوم کرنی ہے... اس سے پہلے کہ قاتل مزید قتل کرے۔" روجر ہنکارا بھرتے ہوئے بولا۔ "تم ٹیکسی کلب اور باقی ٹیکسی ہولڈرز سے مزید معلومات حاصل کرتی رہو۔ ہمیں لازماً کوئی کلیو مل جائے گا۔"

"اوکے سر! لیکن میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہو۔"

"سر! میری معلومات کے مطابق آپ کی بیوی کیتھی بھی تو اسی کلب سے منسلک ہے۔ آپ اگر ان سے..."

"میں بات کروں گا اس سے۔" روجر اس کی بات کاٹ دی اور وقت دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں چلتا ہوں، بہت وقت ہو گیا ہے۔" وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ گھر جا کر وہ آرام کرنے کے ساتھ ساتھ اس معاملے پر مزید غور کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

www.pkdigest.com

ہینسل، میری کا بوائے فرینڈ تھا۔ وہ کالے بالوں اور ہری آنکھوں والا مضبوط قد و قامت کا حامل خوب صورت لڑکا تھا۔ کچھ عرصے پہلے اس نے ٹریفک پولیس جوائن کی تھی۔ ہر مہینے تنخواہ ملنے پر وہ میری کو کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلاتا اور لمبی ڈرائیو پر نکل جاتا۔ میری اور اس کی ملاقات ہر ہفتے ہوتی تھی۔ میری اس سے اپنی اکثر باتیں شیئر کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ وہاں کا کھانا بھی بہت اچھا ہوتا تھا۔ ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ دونوں سامنے روڈ پر پیدل چلنے لگے۔ ہلکی ہلکی برف باری جاری تھی جو سردیوں میں ایک عام معمول تھا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے وہ ملازمت کے دوران ہونے والے واقعات دہرانے لگے۔ جب میری نے اُسے ٹیکسی مرڈرز کے بارے میں بتایا تو وہ چونک گیا۔

"جس عورت کا تم نے نام لیا ہے، اس کا تیز رفتاری پر چالان کیا تھا ہم نے اور یہ غالباً اسی رات کی بات ہے۔ دوسرے دن چالان بھجوانے پر معلوم ہوا کہ اس نے اُس رات خودکشی کر لی تھی۔"

"تمہارے پاس اس کی تصویر تو ہوگی؟" وہ ایک دم سے اضطراری انداز میں بولی۔

"ہاں ہے، ہم کسی بھی قسم کا فضول میٹریل مہینے کے اختتام پر ضائع کرتے ہیں۔" وہ تحمل سے بولا۔

"تم وہ تصویر صبح ہی میرے آفس بھجوا دینا۔" وہ بے قراری سے بولی تو وہ ہنس دیا۔ "ارے بھئی، بھجوا دوں گا... پریشان مت ہو۔"

"تم نہیں جانتے کہ روجر کتنا پریشان ہے۔ اس کی اپنی بیوی بھی ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے۔"

"تو پھر اسے پہلی فرصت میں اسے ٹیکسی ڈرائیو کرنے سے منع کر دینا چاہیے۔"

"وہ بہت ضدی عورت ہے، روجر کے بس سے باہر... مجھے تو لگتا ہے کہ روجر دعا مانگ رہا ہوگا اس کے قتل کی۔"

"تو پھر یہ تمہارا فرض ہے کہ تم روجر کو سمجھاؤ۔"

"روجر اپنی بیوی سے متعلق کوئی بات نہیں سنتا۔"

"اینی دے... تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔"

"پتا ہے، وہ قاتل خوب صورت عورتوں کو ہی مار رہا ہے۔"

"وہ یقیناً بدذوق ہے۔"

"ارے، یہ تو کیرل ہے۔" میری ایک دم زور سے بولی۔

"کون کیرل؟" ہینسل اس کی نگاہوں کے تعاقب میں ناکام ہو کر بولا۔

"وہ دائیں جانب جو ٹیوب سائن نظر آ رہا ہے اس سے ٹیک لگائے جو لڑکی کھڑی ہے، وہ کیرل ہے اور کافی خوف زدہ بھی دکھائی دے رہی ہے۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "دیکھو... بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہی ہے۔ چلو دیکھتے ہیں کیا معاملہ ہے۔" یہ کہہ کر میری آگے بڑھ گئی۔ ہینسل بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

کیرل اب اپنا سیل فون کانوں سے لگائے کسی سے بات کر رہی تھی جب میری اُس کے پاس پہنچی۔ "سب کچھ ٹھیک ہے نا؟" وہ اس کے پاس پہنچ کر بولی۔

کیرل نے بدحواس نظروں سے موبائل بند کر کے اُسے دیکھا۔

"ک... کون ہو تم؟" وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اور ساتھ ہی مڑ مڑ کر پیچھے بھی دیکھ رہی تھی پھر انہیں نظر انداز کر کے آگے چل پڑی۔

"میں میری ہوں... پولیس آفیسر۔ تمہارے والد کے ساتھ کام کرتی ہوں۔" میری بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جلدی سے بولی تو وہ ٹھٹک گئی۔

"دیکھو، مجھے بچا لو... میرا مطلب ہے لفٹ دے دو۔ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔"

"تم اب بالکل محفوظ ہو مگر مجھے بتاؤ کہ کون تمہارا پیچھا کر رہا ہے؟"

"میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہے مگر جب سے میں کلب سے نکلی ہوں، تب سے وہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔"

"اس نے تم سے کچھ کہا؟"

"نہیں بلکہ وہ بڑے سکون سے میرا پیچھا کر رہا ہے... جیسے مجھے تھکا کر مارنا چاہتا ہو۔"

"تمہیں کیوں لگا کہ وہ تمہیں مارنا چاہتا ہے؟"

"کوئی رات کے اس وقت کسی کا پیچھا کیوں کرتا ہے؟ وہ میرا بوائے فرینڈ تو ہے نہیں۔" کیرل قدرے چڑ کر بولی۔

میری خاموش ہو گئی۔ اسے لے کر وہ پارکنگ میں آئے۔ گاڑی میں بٹھایا اور اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

"تمہیں اس کا حلیہ یاد ہے؟"

"نہیں لیکن وہ کوئی جوان لڑکا ہرگز نہیں لگتا۔"

کیرل کو اس کے گھر اتار کے وہ لوگ آگے روانہ ہو گئے۔ ابھی انہوں نے موڑ کاٹا ہی تھا جب ڈرائیو کرتی میری کی آنکھوں میں سامنے سے آنے والی گاڑی کی تیز روشنی پڑی۔ گاڑی کے گزرتے ہی میری کی آنکھیں چمک اٹھیں کیونکہ یہ وہی گاڑی تھی جسے کچھ دیر پہلے اس نے موڑ مڑتے

دیکھا تھا۔ گاڑی کے ڈرائیور کو اس نے بخوبی دیکھ لیا تھا۔

"تم مجھے بتاؤ گی کہ تم اس لڑکی کو کیسے جانتی ہو... جبکہ وہ تمہیں بالکل نہیں جانتی؟"

"بے وقوف! وہ روجر کی بیٹی ہے۔"

"اوہ۔" ہینسل کے ہونٹ سکڑ گئے۔ "کافی خوب صورت ہے۔" وہ بولا تو میری نے اس کی ناک پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ ناک سہلاتے ہوئے اسے گھور رہا تھا پھر ایک دم سے دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔

☆☆☆

کیتھی کا آج آف تھا۔ اس نے اپنی دوستوں کو گھر پر بلایا ہوا تھا۔ مقصد روز کی موت کا جشن منانا تھا۔

"خس کم جہاں پاک! بڑی توپ چیز سمجھتی تھی خود کو۔" کیتھی نے اسکاچ کا گھونٹ لیتے ہوئے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "ساتھ میں اپنی چمچہ گیری کرنے والیوں کو بھی لے گئی۔" اس کا اشارہ الیزبتھ، رسل اور جینا کی طرف تھا۔ وہ تینوں پہلے ان کے گروپ میں ہی ہوتی تھیں مگر کچھ عرصے سے اپنی خوب صورتی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے علیحدہ ہو گئی تھیں۔ وہ ساتھ تھیں تو ان لوگوں کا بزنس بھی خوب چمک رہا تھا۔ جب سے علیحدہ ہوئی تھیں، یہ لوگ روز بروز گھاٹے کی طرف جا رہی تھیں۔ اب ان کی ناگہانی اموات نے راستے کے کانٹے جیسے چن لیے۔ کیتھی اور اس کی چاروں فرینڈز کافی خوش تھیں۔

"پتا ہے کل سے مجھے چار گاہکوں کے فون آ چکے ہیں۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو بہت جلد ہم امیر ہو جائیں گے۔" کیتھی گردن تان کر بولی۔ باقی چار کی نسبت وہ اچھی شکل صورت کی تھی اور ان کی لیڈر بھی تھی۔

"میں تو اب خوب اچھی سی شاپنگ کروں گی۔ ایک عرصہ ہو گیا کوئی قیمتی جوڑا پہنے ہوئے۔" سوزین مسرت سے بھرپور انداز میں بولی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو امیر عورت تصور کرنے لگی تھی۔

"اور میں ورلڈ ٹور پر جاؤں گی اور یہ ٹور جیسن اینڈ جیسن کمپنی سے آرگنائز کرواؤں گی۔" سلینا بولی۔

"سب ہوگا مگر مجھ سے وفاداری شرط ہوگی۔" کیتھی بھویں اچکا کر ایک ادا سے بولی۔

"ویسے سوچنے کی بات ہے کہ ان کو اتنے برے طریقے سے مارا کس نے؟" جولی بولی۔

"جس نے بھی مارا ہے، ہمارا تو فائدہ ہی ہوا ہے۔ قاتل میرے سامنے آئے تو میں تو اس کا منہ چوم لوں۔" سوزین بولی۔

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ قاتل ہمارا بھی صفایا کرنے کی کوشش کرے۔" جولی کافی خوف زدہ ہو چکی تھی بلکہ اسے لگ رہا تھا کہ قاتل کا اگلا شکار وہی نہ ہو۔

"تم سدا کی ڈرپوک ہو جولی... تمہیں روز کی اڑان کا علم تو ہے ہی... غلط لوگوں کے ہاتھ چڑھ گئی ہوگی۔" کیتھی چڑ کر بولی۔ "اور پلیز! رنگ میں بھنگ مت ڈالو۔"

جب روجر گھر میں داخل ہوا۔ ان کی پارٹی اپنے اختتام پر تھی کیتھی کی دوستوں پر نظر پڑتے ہی اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ ایک غصیلی نظر کیتھی پر ڈالتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"تمہارے شوہر نے تمہیں بتایا تو ہوگا روز وغیرہ کے بارے میں؟"

"ہاں، بتا رہا تھا کہ ان کا کوئی پرانا عاشق تھا۔ روز نے لفٹ نہیں کرائی تو تینوں سہیلیوں کو مار ڈالا... بے چاری روز۔" کیتھی آنکھیں سکیڑ کر قدرے سرد لہجے میں بولی۔

"او کے کیتھی! ہم چلتے ہیں۔ تمہارا شوہر آ چکا ہے۔ بھئی ڈر لگتا ہے، پولیس آفیسر ہے۔ کہیں ہماری تفتیش شروع نہ کر دے۔" سوزین ہنستے ہوئے اٹھ کر بولی تو باقی بھی اٹھ گئیں۔

ان کے جاتے ہی کیتھی نے ایک استہزائیہ نظر روجر کے کمرے کے بند دروازے پر ڈالی۔ "باسٹرڈ! سمجھتا ہے جیسے میں اس کے پیسوں پر عیش اور مزے اڑا رہی ہوں، بس کچھ عرصے کے لیے اس سڑے ہوئے ڈبے میں رہ رہی ہوں پھر ٹھوکر مار کے چلی جاؤں گی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اسکاچ کا ایک اور گلاس چڑھا گئی۔ اس وقت نشہ ہی اس کا غصہ دور کر سکتا تھا۔

☆☆☆

دو دن کے وقفے سے ہونے والے چوتھے قتل نے پورے پولیس ڈپارٹمنٹ میں تہلکہ مچا دیا۔ کمشنر نے قاتل کو جلد از جلد ڈھونڈنے کے آرڈرز جاری کر دیے تھے۔ چیف انسپکٹر نے روجر کی اچھی خاصی خبر لے لی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے اوپر سے اتنے سخت احکامات سننے کو ملے۔ عوام بھی اشتعال میں آ گئی تھی۔ ساتھ ہی ٹیکسی ڈرائیورز نے ہڑتال کی دھمکی دے دی تھی اور اب روجر اپنا سارا غصہ میری پر نکال رہا تھا۔

"ابھی تک تمہاری رپورٹ زیرو ہے۔ ڈینس مارنے کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ ہینسل یہ ملک چھوڑ کر نہیں جا رہا۔"

"اوہ... تو میرا اندازہ درست تھا۔ وہ آپ ہی تھے جو کیرل کا پیچھا کر رہے تھے۔"

www.pkdigest.com

''وہ میری بیٹی ہے اور مجھے اس کی فکر ہے۔ میں اُسے اندھے کنوئیں میں جاتا نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ رات میں اکیلی باہر نکلنے سے گریز کرے گی۔'' روجر کڑی نظروں سے اسے دیکھ کر برہم لہجے میں بولا۔

''آپ کو واقعی اپنی بیٹی کی بہت فکر ہے مگر سر! آج کی نسل اولڈ کلچر پر یقین نہیں کرتی۔ آپ اسے کب تک ڈرا کر رکھیں گے؟''

''مس میری! آپ اپنا لیکچر اپنے لیے سنبھال کر رکھیں۔ مجھے اب تک کی رپورٹ چاہیے۔''

''سر! پچھلے کچھ سالوں سے سوہو (SOHO) ایریا ہر قسم کی منفی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا ہے۔ یہ ایسی تفریح گاہ بن چکی ہے جہاں نوعمر لڑکے لڑکیوں کے لیے سب سے زیادہ کلبز رجسٹرڈ ہیں مگر کچھ غیر قانونی ہیں۔ انہی میں سے ایک کلب کو جو گروپ سورسز ذرائع مہیا کرتا ہے، پہلے اس گروپ کی لیڈر روز تھی۔ پھر اس گروپ کے آپس میں اختلافات کے باعث گروپ ٹوٹ گیا۔ روز کے گروپ میں جو عورتیں تھیں، وہ مار دی گئیں۔ آج کل دوسرے گروپ کی لیڈر مس کیتھی روجر ہیں۔'' وہ سانس لینے کو رکی پھر دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑا۔ ''یہ گروپ اپنی ٹیکسیوں میں گاہکوں کو اس کلب تک پہنچاتا ہے۔ گاہکوں کے پاس نشہ کم ہو تو وہ ان کا مطلوبہ مال اپنی ٹیکسی میں ہی مہیا کر دیتی ہیں۔ اس طرح یہ ذاتی طور پر بھی پیسے بنا لیتی ہیں اور کلب سے بھی اپنے چارجز وصول کرتی ہیں۔ اکثر کا تیس فیصد مس کیتھی کو جاتا ہے کیونکہ ایک تو وہ اس گروپ کی لیڈر ہے، دوسرے اس کی بیک مضبوط ہے۔ کسی بھی قسم کے پولیس ریڈ کا اسے فی الوقت کوئی خطرہ نہیں۔ ویسے بھی پولیس کو اس گروپ اور وِیٹرز کلب کے لیے کافی ثبوت اکٹھے کرنے ہوں گے۔'' وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولی تو روجر نے ایک کاٹ دار نظر اس پر ڈالی۔ میری کافی پُراعتماد لگ رہی تھی۔

''تو تمہارے خیال میں، میں اپنی بیوی کی بیک مضبوط کر رہا ہوں؟''

''سر! میں نے اپنا نہیں، کیتھی گروپ کی ٹیکسی ڈرائیورز کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔'' وہ اسی اعتماد سے بولی۔

''اب آپ یہ بتائیں گی کہ اس سارے چکر کا قاتل سے کیا تعلق ہے؟''

''سر! اس ساری صورتِ حال کے پیشِ نظر ایسی عورتوں کے کئی دشمن ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قاتل انہی میں سے کوئی ہو مگر ایک گڑبڑ ہے۔ اگر قاتل انہی میں سے ہوتا تو آج چوتھا قتل نہ ہوتا۔ مرنے والی کیتھی گروپ کی ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ سوزین بہت زیادہ خوب صورت نہیں تھی اور نہ ہی اس میں عورتوں والی خصوصیات تھیں۔ وہ ایک مرد ٹائپ کی عورت تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل... ایک منٹ سر!'' میری بولتے بولتے رک گئی۔ اسے جیسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس نے اپنی فائل سے ایک تصویر نکالی اور روجر کی طرف بڑھا دی۔ یہ ٹریفک کیمرے سے لی گئی تصویر تھی۔

''سر! یہ روز کی گاڑی ہے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے ٹریفک پولیس نے اس کا چالان کر دیا تھا مگر اس کے قتل کے باعث بیکار گیا۔ اس گاڑی کی نمبر پلیٹ پر غور کیجیے، یہ ایک سیریل نمبر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روز اور کیتھی گروپ نے ایک ہی دن ٹیکسی کلب سے ٹیکسیاں حاصل کی تھیں۔ ان کو ایک ہی سیریل کی ٹیکسیاں ملی تھیں۔ ویسے تو یہ بہت کم ہوتا ہے مگر اتفاقاً اُن دنوں یہ ٹیکسیاں فارغ تھیں۔ وہیں سے ان سات آٹھ ٹیکسی بردار خواتین کی دوستی شروع ہوئی۔ پھر یہ دوستی بزنس کا رُخ اختیار کر گئی۔ باقی کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ مرنے والی چاروں ڈرائیورز کی ٹیکسیوں پر سیریل نمبر ایک خاص ترتیب سے ہے۔ اگر قاتل سیریل کے حساب سے قتل کر رہا ہے تو اس حساب سے اگلا نمبر جولی اور اسی طرح باترتیب ہوتا ہوا کیتھی تک آ جائے گا۔'' میری نے مختلف کڑیوں کو جوڑ کر جو انکشاف کیا، اسے سن کر روجر منہ کھولے اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

''[illegible]'' وہ [illegible] لہجے میں بولا۔

''سر! یہ محض ایک اندازہ ہے۔''

''تم کچھ زیادہ تیز نہیں جا رہیں؟'' وہ بولا تو میری نے کندھے اچکا کر گردن ہلا دی۔

☆☆☆

کیتھی روجر کے قتل نے میری کے سیریل نمبر کی ترتیب کو تو غلط ثابت کر دیا مگر قاتل کو پردے کے پیچھے سے نکال کر بے نقاب کر دیا تھا۔ بے نقاب ہونے والا کوئی اور نہیں... روجر تھا۔ کیتھی کا شوہر... اور اُسے بے نقاب کرنے کا سارا کریڈٹ اس کی نائب میری کو جاتا تھا۔

روجر، قاتل کو ہوا بنا کے ہی پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ کیتھی کو لمحہ بہ لمحہ خوف زدہ کر کے اسے آخر میں مارنا چاہتا تھا۔ کیتھی نے روز کی موت کو بے فائدہ قرار دیا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ قاتل کوئی پرانا عاشق نہیں بلکہ اس کا اپنا شوہر ہے جس نے ایک بھرپور منصوبہ بندی کی تھی۔ روجر کو سب ٹیکسی ڈرائیورز سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔ خاص کر کیتھی کی دوستوں سے اُسے جو کراہیت محسوس ہوتی، وہ اسے آپے سے باہر کر دیتی۔ کیتھی ایک آوارہ مزاج عورت تھی جس نے اس کی بیٹی کو خراب کر دیا تھا کیونکہ ماں کی بے راہ روی نے ہی اچھی خاصی لڑکی کو آؤٹ آف کنٹرول کر دیا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ بیٹی کو زیادہ دیر ڈرا کے نہیں رکھ سکتا۔ مصیبت کی جڑ کو ختم کرنا پڑے گا۔ اس کے نزدیک کیتھی اور اس کی ساتھی ڈرائیورز کیرل جیسی کتنی ہی لڑکیوں کو روز بروز برباد کر رہی تھیں۔ وہ فساد کی ان جڑوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ذاتی استعمال کی گاڑی کی دو نمبر پلیٹیں بنوائی تھیں۔ ایک اصل تھی جبکہ دوسری وہ قتل کے وقت استعمال کرتا تھا۔ یوں سراغ نہ ملنے پر پولیس کتنے ہی دن بھٹکتی رہی مگر پھر جس دن وہ کیرل کا پیچھا کر کے اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا، اس کی وہی بدلے ہوئے نمبر والی گاڑی میری کی نظروں میں آئی تو وہ سارا کھیل سمجھ گئی کیونکہ روز کی تیز رفتاری پر آٹومیٹک کیمرے سے کھینچی گئی تصویر میں جو گاڑی اس کے پیچھے تھی اس کی نمبر پلیٹ بھی تصویر میں آ چکی تھی۔ وہ نمبر میری کے لاشعور میں رہا اور جب اس نے بدلے ہوئے نمبر والی گاڑی کو دیکھا تو سب کچھ اس کے ذہن میں آ گیا۔ وہ اسی وقت جان گئی تھی کہ قاتل کون ہے اور وہ اس کی وجہ بھی جانتی تھی۔

روجر کو سیریل نمبر کے بارے میں بتا کر وہ اس کی کیفیت نوٹ کرتی رہی تھی۔ روجر اس کی بات پر پریشان ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کیتھی کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے معاملہ جلد ہی کھل جائے گا۔ اس کا اصل مقصد کیتھی کو ایک بری موت سے ہمکنار کرنا تھا اس لیے اس نے سیریل نمبر پر وقت ضائع کرنے کے بجائے جلد از جلد اسی انداز میں کیتھی کو مار ڈالا۔ اب وہ مطمئن تھا۔ پولیس اگر اسے پکڑ بھی لیتی تو وہ اپنی بیٹی کی بربادی کی ذمے دار کیتھی کو تو ختم کر ہی چکا تھا۔

میری پریس رپورٹرز کو ساری تفصیل سے آگاہ کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ آہستگی سے چلتی ہوئی پولیس کے گھیرے میں ہتھکڑی لگے روجر کے پاس آ گئی۔

''میرا خیال ہے کہ آپ جیسے درندہ صفت انسان کو پہلی سماعت پر ہی موت کی سزا دے دینی چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ رکی نہیں، آگے بڑھ گئی۔ رپورٹرز کا رخ اب روجر کی طرف تھا۔ وہ اس سے سوال پر سوال کر رہے تھے۔ وہ ایک دم سے مشہور ہو گیا تھا۔ کل تک جو قاتل لوگوں کو ہراساں کیے ہوئے تھا، اب جلد سلاخوں کے پیچھے جانے والا تھا۔

☆☆☆

''آج تو لگتا ہے تم بہت خوش ہو۔'' میری، ہینسل سے ملنے آئی تھی جب وہ اسے چہکتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

''خوش ہونا میرا حق بنتا ہے۔ آخر اتنے بڑے قاتل کو پکڑوایا ہے۔ اب میری ترقی پکی ہے۔''

''اُف! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ایک پولیس کا رکھوالا اتنی گندی حرکت کر سکتا ہے۔ اس نے ایک نہیں، پانچ عورتوں کو مارا ہے۔ ارے بھئی، بیوی پر غصہ ہے تو اسے مارو... باقیوں کا کیا قصور؟'' ہینسل افسوس زدہ لہجے میں بولا۔

''شام کو لائم لائٹ جانے کا پروگرام ہے؟''

''وہ چرچ...''

''بے وقوف! اب وہ چرچ نہیں ہے، بہت اچھا کلب بن چکا ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''لیکن میری تنخواہ ملنے میں ابھی دو ہفتے باقی ہیں۔''

''آج میری پاکٹ منی سے انجوائے کریں گے۔'' وہ شاہانہ انداز میں بولی اور اسے گھسیٹتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف لے آئی۔ میری کی گاڑی پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک سا گیا۔

''میری! تم نے ابھی تک اس پینٹ کو نہیں اتروایا؟'' وہ ہیڈ لائٹس کے اوپری حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ یہ سلور پینٹ اس کے پینٹنگ برش سے ہی لگا تھا۔ وہ پینٹر بھی تھا اور شوقیہ پینٹنگ کرتا تھا۔

''ارے بھئی، اتر جائے گا پینٹ بھی... تم بیٹھو۔'' وہ اسے دھکیلتے ہوئے بولی۔ کچھ دیر کی ڈرائیو کے بعد وہ اسے گم صم دیکھ کر چونک گئی۔

''تمہاری شادی مجھ سے ہونے جا رہی ہے، گاڑی سے نہیں جو اتنا پریشان ہو رہے ہو۔'' اس کے بولنے پر وہ چونک گیا۔

''نہیں، میں پریشان نہیں ہوں... بس ایسے ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔''

''خبردار! میرے علاوہ کسی کو یاد کیا تو۔'' وہ مکا لہرا کر بولی تو وہ ہنس دیا لیکن اس کی ہنسی کے پھیکے پن نے میری کو چونکا دیا۔

☆☆☆

ہینسل رات گئے اپنے فلیٹ میں لوٹا تو اسے ایک بے چینی نے آ گھیرا۔ کسی انہونی کے ڈر نے اسے جکڑ لیا۔ وہ بُری طرح الجھا ہوا تھا۔ کوئی بات تھی جو اسے چبھ رہی تھی۔ پھر جیسے یک دم اس کے ذہن میں... جھماکا سا ہوا۔ وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھا۔ ایک ضروری کال کی پھر اسے یک دم پیاس لگنے لگی۔ وہ کچن سے پانی پی کر لوٹا ہی تھا جب اسے اپنے کمرے میں غیر معمولی آہٹ کا احساس ہوا۔ وہ بیڈ روم سے نکلنا چاہتا تھا جب پیچھے سے ایک سرسراتی آواز نے اس کے قدموں کو منجمد کر دیا۔

''فریز!'' وہ پولیس کے اس خاص لہجے کو اچھی طرح

www.pkdigest.com

پہچانتا تھا۔
"میری! میں جانتا تھا کہ تم آؤ گی۔ جو پانچ افراد کو قتل کر سکتی ہے وہ بھلا مجھے کہاں چھوڑے گی۔" وہ مطمئن تھا کیونکہ اس نے ضروری کال کر دی تھی۔
"میں تمہیں مارنا نہیں چاہتی تھی مگر اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمہارا پینٹ کو دیکھ کر ٹھٹکنا مجھے یقین دلا گیا تھا کہ تم مجھ تک پہنچ گئے ہو... تم نے میرا بھید پا لیا ہے۔"
"میری! تم نے ایسا کیوں کیا؟" پینسل نے افسردگی سے پوچھا۔
"ہاتھ اوپر رکھو... میں کوئی چالاکی برداشت نہیں کروں گی۔" وہ سفاک لہجے میں بولی۔
"میری! تم نے میرے اعتماد اور پیار کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔"
"پیار میرا ابھی ختم ہو گیا ہے۔ اتنا چالاک اور ہوشیار شوہر مجھے نہیں چاہیے۔ نفرت ہے مجھے تمہارے جیسے سب مردوں سے۔ وہ روجر بھی ایسا ہی تھا... بے وفا۔" وہ غصے سے چلائی۔
"مگر تمہاری اس سے کیا دشمنی تھی؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔
"دشمنی!" وہ تلخی سے ہنس دی۔ "جانتے ہو میں کون ہوں... روجر کی ناجائز بیٹی۔" اس نے ایک عجیب سا انکشاف کیا۔ "ایسے ہی پیار کرتا تھا وہ میری ماں سے اور جب وہ پریگننٹ ہو گئی تو اس کے بچے کو اپنا نام دینے کے بجائے بھاگ گیا۔ اس نے نہ جانے کتنی ہی حرام بیٹیاں پیدا کی ہوں گی مگر اسے ان میں سے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اسے پروا تھی تو صرف اپنی اس بیٹی کی جو اس کی قانونی بیٹی تھی۔ ہر وقت اس کی فکر میں ڈوبا رہتا تھا۔ مجھے اس کے اس دوغلے رویے سے نفرت ہو گئی۔ میں نے پولیس فورس ویسے بھی اس سے انتقام لینے کے لیے جوائن کی تھی جس کا موقع اس نے خود ہی فراہم کر دیا۔
"میری ماں کتنی ہی مرتبہ اس کے پاس آئی اور میرے بارے میں بتایا مگر اس نے ہر بار اسے دھتکار دیا۔ میں کس طرح پلی بڑھی، اسے کیا پروا ہوتی۔ اسے اگر پروا تھی تو اپنی جائز بیٹی کیرل کی۔ اس کی یہی پروا میری نفرت میں اور اضافہ کرتی گئی۔ جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ اس کے پاس ایک جعلی نمبر پلیٹ ہے جسے وہ اکثر اپنی بیٹی کو ڈرانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ میں نے بھی اسی نمبر کی پلیٹ بنوالی جسے لگا کر میں نے ان ٹیکسی ڈرائیورز کو ختم کیا۔ بہ ظاہر سب کچھ روجر کے خلاف جا رہا تھا اور بالآخر وہ پکڑا بھی گیا۔ میں بھی مطمئن ہو جاتی اگر تم نہ چونکتے۔ مجھے پتا چل گیا کہ تم نے روجر کی اوور اسپیڈنگ والی تصویر میں میری گاڑی جس کا نمبر روجر کے جیسا تھا... اسے پہچان لیا ہے کیونکہ تصویر میں پینٹ کافی نمایاں تھا مگر افسوس تم جیسے بے وقوف کو میری نظروں نے پکڑ لیا۔ تم کبھی اچھے ایکٹر نہیں بن سکتے۔ اب تو ویسے بھی میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ سفاکی سے بولی اور اپنا پستول والا ہاتھ سیدھا کر کے نشانہ لینے ہی والی تھی کہ لائٹس آن ہو گئیں۔ اس کے چاروں طرف پولیس تھی اور اس پر جس پولیس آفیسر نے پستول تانا ہوا تھا، وہ کوئی اور نہیں روجر تھا۔ کچھ دیر پہلے پینسل نے اسی سلسلے میں فون کیا تھا۔
"تم!" وہ ہراساں ہو کر بولی۔ ساتھ ہی اس کی رنگت پیلی پڑ گئی۔ وہ جان گئی کہ بازی اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ ایک پولیس اہلکار نے آگے بڑھ کر اس کے بے جان ہاتھوں سے پستول لے لیا۔
"تم کیا سمجھی تھیں... سارا پولیس ڈپارٹمنٹ تمہاری باتوں کے جال میں آجائے گا؟ جس دن تم نے مجھے روجر کی گاڑی کی تصویر دی۔ میں اسی وقت تمہاری گاڑی اور اس پر لگی اپنے ہی جیسی جعلی نمبر کی پلیٹ کو پہچان گیا تھا۔ اس کے بعد پھیلایا ہوا سارا جال میرا تھا جس میں تم پھنستی گئیں۔ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں پچھلی گاڑی کے نمبرز کو اتنی باریکی میں دیکھوں گا... اور تمہاری گاڑی کی ہیڈ لائٹس کے اوپر لگا سلور پلیٹ تو سارے بھید کو اجاگر کر رہا ہے۔" وہ بولا تو میری کے بدن میں جیسے سارا لہو سمٹ گیا۔ وہ اتنی بڑی بے وقوفی کر چکی تھی کہ اس کا احساس اسے اس سے پہلے ہوا ہی نہیں۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ خاموش بت بنی کھڑی تھی۔
"تم مجھے کیرل جتنی ہی عزیز تھیں۔ میں نے جب بھی تمہیں دیکھا، خود سے قریب پایا۔ اگر تم مجھے اپنی حقیقت بتا دیتیں تو یقین جانو میں تمہاری بھی اتنی ہی حفاظت کرتا جتنی کیرل کی۔ مگر تم نے تو پولیس فورس جوائن ہی مجھ سے انتقام لینے کے لیے کی تھی۔ تمہاری آنکھوں پر بندھی انتقام کی اندھی پٹی نے تمہیں تمہارے ہی بچھائے جال میں پھنسا دیا۔ بہرکیف میں تمہارا شکرگزار ہوں کہ تم نے کیتھی جیسی عورت سے میری جان چھڑائی، ورنہ مجھے نہ جانے اسے اور کتنا برداشت کرنا پڑتا۔" روجر اس کے پاس آکر بولا۔
میری نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر نظریں جھکا لیں۔ اس ایک نظر میں پچھتاوے ہی پچھتاوے تھے۔ اس کے اندھے انتقام نے اس سے سب کچھ ہی چھین لیا تھا۔ وہ ایک آخری نظر پینسل کے چہرے پر ڈالتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

❋

مغربی معاشرے کی اقدار و ثقافت کی عکاس مختصر کتھا

ایجادات کارآمد ہونی چاہئیں تاکہ ضرور رساں ...... ایک ایسے ہی سائنس دان کا قصہ جو اپنے تئیں ایک کامیاب ایجاد کر بیٹھا تھا

موجد

ضیاء مظفر

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں صحافت سے وابستہ تھا یا صحافت میری دامن گیر تھی۔ میں پیرس کے اخبار 'لا ایکسپریس' میں رپورٹر تھا۔ اس اخبار کی اشاعت زیادہ نہیں تھی اور لوگوں کی توجہ کھینچنے کے لیے ہمیں سنسنی خیز خبر یا چٹ پٹی کہانی کی تلاش رہتی تھی۔ اس اعتبار سے میری رپورٹنگ کامیاب بھی اور ایڈیٹر اسٹین بھی مجھ سے خوش تھا۔ میرا نچلے درجے کے لوگوں سے یارانہ تھا۔ ان کی مدد سے میں کسی کونے کھدرے، نگاہوں سے اوجھل کوئی واقعہ یا سانحہ نکال لاتا اور نمک مرچ لگا کر اسے اپنے اخبار کی زینت بنا دیتا۔ میں زیب داستاں کے فن میں ماہر تھا۔ میرے روزگار کی گاڑی بھی خوب چل رہی تھی۔
اس روز ایڈیٹر اسٹین نے مجھے اپنے آفس میں طلب کیا تو میرا ماتھا ٹھنکا کہ کوئی خاص فریضہ میرے سپرد کیے جانے والا ہے۔ وہ بہت کم مجھے اپنے آفس میں آنے کی زحمت دیتا تھا۔ میرا رابطہ اسسٹنٹ ایڈیٹر سے رہتا تھا اور اس کا میرے ساتھ دوستانہ رویہ تھا۔ میں آفس میں گیا تو اس نے کبھی اڑانے کے انداز میں مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔
اسٹین میں واحد خرابی یہ تھی کہ وہ نا قابل برداشت حد تک کم گو تھا۔ دراصل وہ صدق دل سے ٹیلی پیتھی کا قائل تھا اور توقع کرتا تھا کہ جنبش زبان کے بغیر مقابل اس کا خیال جان لے، اس کا مافی الضمیر سمجھ لے۔ اپنے بارے میں اسے زعم یا وہم تھا کہ وہ دوسروں کے خیالات کو پڑھ سکتا ہے۔ وہ حسب عادت مجھے گھورتا رہا اور میں ذہن کا گھوڑا دوڑاتا رہا کہ جہاں میرا ایڈیٹر جا کر ٹھہرے گا، وہاں اس سے پہلے پہنچ جاؤں۔ اس سے پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا۔ وجہ ٹیلی پیتھی کا کمال نہیں تھا۔ ایک کہانی اور چونکہ رپورٹر ہونے کے ناتے تازہ ترین واقعہ یا حادثہ میرے پیش نظر رہتا تھا۔ میری جستجو اکثر رنگ لاتی تھی۔ میں اکثر ذہن میں آئی ہوئی بات ظاہر کر دیتا

اور وہ سمجھتا کہ اس کا نیلی چھتری پر عبور اثر کر گیا ہے۔

''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا مسٹر پیکو۔'' میں نے اچانک کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''کلیروٹ کا سراغ لگا کر ہی لوٹوں گا۔''

اس کے چوڑے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ یہی سمجھا ہوگا کہ اس کی نیلی پیشکش کامیاب رہی۔ تازہ ترین اہم واقعہ معروف کیمسٹ کی پراسرار گمشدگی تھی۔ وہ تقریباً ایک ماہ سے لاپتا تھا۔ پولیس اس کی تلاش میں سر توڑ کوشش کے بعد بیٹھ گئی تھی۔ کیمسٹ آگسٹ کلیروٹ کو ایک مرتبہ نوبل پرائز کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔ بدقسمتی آڑے آگئی اور وہ محروم رہا۔ میں اس سے مل چکا تھا۔ اس کی محققانہ گفتگو سے متاثر اور مرعوب بھی ہوا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ کسی دشمن ملک کے ایجنٹ اسے اغوا کر کے اپنے ملک لے گئے تھے تاکہ اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ میں نے اس معاملے میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔ لیکن اب اسٹین نے مجھے چیلنج دیا تھا اور مجھے سرگرم عمل ہو جانا تھا خواہ نتیجہ کچھ ہی نکلتا۔

اپنی کارکردگی کا آغاز کرتے ہوئے میں کلیروٹ کی بیوی سے ملنے اس کے گھر گیا۔ اس خاتون کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اس کا کلیروٹ سے کوئی جوڑ نظر نہیں آیا۔ وہ چھدرے بالوں والا مخنی سا آدمی تھا۔ ناک کے بانسے پر عینک ٹکا کر ہونق سا لگتا تھا۔ اس کی بیوی عمر میں اس سے کم سے کم چودہ سال چھوٹی لگتی تھی۔ اچھے خدوخال کی بھرپور عورت تھی۔ اس میں ایک عیب تھا کہ چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں لیکن وہ اس کی جسمانی کشش کو نقصان نہیں پہنچاتی تھیں۔ میں نے دروازے پر ہی اپنا تعارف کرایا تو وہ خندہ پیشانی سے مجھے اندر لے گئی اور بڑے تکلف سے بٹھایا۔ یہ سن کر کہ میں ڈرنک نہیں کرتا وہ جا کر نفیس خوشبودار چائے لوازمات کے ساتھ لے آئی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے اندھیرے میں تیر چلایا کہ افواہیں گشت کر رہی ہیں اس کا شوہر کسی عورت کو لے کر ایرس جزیروں کی طرف چلا گیا ہے۔

''وہ چڑ کیا کسی عورت کو لے جائے گا۔'' میڈم کلیروٹ چائے کی پیالی رکھ کر سپاٹ لہجے میں بولی... جیسے اخبار کی کوئی سطر پڑھ رہی ہو۔ ''وہ تو اپنے سائے سے بھی بدکتا تھا۔''

''لیکن اپنے میدان کا بہترین جوکی ہے۔ اس نے ادویات سازی کے گھوڑے کو اپنی گرفت میں...... رکھا ہے۔'' میں نے کلیروٹ کی طرف داری کی۔

''شاید اسی لیے کوئی اسے ریس میں اپنا گھوڑا دوڑانے لے گیا ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''اسے کبھی کوئی دھمکی تو نہیں ملی؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر ملتی تو اس کا ہارٹ فیل ہو چکا ہوتا۔'' اس نے جواب دیا۔

مجھے وہاں مزید رکنا بے سود نظر آیا۔ میں نے اجازت لی اور اس کے گھر سے نکل آیا۔ صاف ظاہر تھا کہ شوہر بیوی میں ان بن رہتی تھی اور یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ میڈم اس پر حاوی تھی۔ عمر، جسم، مزاج یہ سب اس بات کی غمازی کرتے تھے۔

میرے ذہن میں یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ کلیروٹ خود ہی کہیں چلا گیا ہے یا ممکن ہے شہر میں ہی کہیں روپوش ہو۔

میں کیفے پیٹر پہنچا تو وہاں حسب توقع مارنے مل گیا۔ یہ پولیس اور جرائم پیشہ افراد دونوں کی ایک دوسرے کے خلاف مخبری کرتا تھا اور دونوں اس سے بے خبر تھے۔ غالباً میں واحد فرد تھا جو اس بات کو جانتا تھا اور اسی لیے اس کی کل مجھ سے دبتی تھی۔ میں اس پر اعتبار نہیں کرتا تھا اور وہ بھی اس بات کو جانتا تھا۔ اس نے میرے لیے چائے منگوائی اور میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا۔ اس نے ایک گھونٹ میں چائے کی پیالی خالی کر دی اور انگلیوں سے میز بجانے لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا ذہن رفتار پکڑ رہا ہے۔

''بہت مشکل نہیں ہے۔'' اس نے میز پر انگلیوں کا فن دکھانے سے فارغ ہو کر کہا۔

حسب معمول میں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ پھر بھی کہا۔ ''اگر آسان ہے تو فوراً کر دو۔''

''اخراجات کے لیے رقم درکار ہوگی۔'' اس نے تجاہل سے کہا۔

مجھے بینک اکاؤنٹ کھولنے کا شوق کبھی نہیں رہا...... محدود تنخواہ میں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ البتہ ایک خالی چیک بک راستے میں پڑی مل گئی تھی۔ اسے جیب میں رکھے پھرتا تھا اور بہ وقت ضرورت اس کی نمائش کرتا تھا۔ اسے جیب سے نکالا اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانچ سو فرانک کا چیک کاٹ دیا اور اسے مارنے کو دیتے ہوئے کہا۔ ''اس پر تین روز بعد کی تاریخ ڈالی ہے۔ کچھ مصلحت ہے۔''

اس نے بے پروائی سے چیک جیب میں ڈال لیا اور چائے کا بل ادا کر کے جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے کیفے سے نکلا۔ وہ چلا گیا تو میں دکانوں کے شوکیسوں میں جھانکنے لگا۔ ایک پل اور کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ لباس کی سرسراہٹ کے ساتھ خوشبو تیرتی ہوئی

شانے سے ٹکرائی۔ ایک طرح دار قتالہ میرے قریب آ کھڑی ہوئی اور شوکیس کی طرف دیکھنے لگی۔ سلسلہ جنبانی کرنے میں دیر نہ لگی۔ سو فرانک پر معاملہ طے ہوا اور میں اسے اپنے گھر...... لے گیا۔ وہ ڈرنک کی متمنی تھی لیکن میں نے اسے چائے پر ٹرخا دیا۔

صبح میں نیند سے جاگا تو وہ میرے بٹوے سمیت غائب تھی۔ اس میں میری کل پونجی پانچ سو فرانک تھے۔ وہ بذات مجھے قلاش کر گئی تھی۔ میں جلدی سے تیار ہو کر رپورٹ درج کرانے پولیس اسٹیشن گیا تو وہاں انچارج میری کہانی پر یقین کرنے پر کسی طور آمادہ نہ تھا۔ میں نے پریس کی دھمکی دی تو اس کے کہنے سے ایک کانسٹیبل مجھے کالر سے پکڑ کر بلڈنگ سے باہر چھوڑ گیا۔ میں جا کر اسٹین کو بھی تو دوبارہ اپنی افتاد بتا نہیں سکتا تھا۔ اس سے گھرکیوں اور طعنوں کے سوا ملتا بھی کیا؟ میں سر راہ گھاس پر پڑی ہوئی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس گھڑی قسمت مجھ پر مہربان ہو جائے گی۔ معاً میری نظر گھاس پر پڑے ہوئے ایک کریڈٹ کارڈ پر پڑی اور میں نے اسے اٹھالیا۔ کارڈ کا مالک کوئی امریکی سیاح تھا جو اسے وہاں گرا گیا تھا۔ میرے تو وارے نیارے ہو گئے۔

سب سے پہلے میں نے مشہور اسٹور جا کر اس کریڈٹ کارڈ سے ایک عمدہ سوٹ خریدا۔ پھر ایک ریسٹورنٹ میں جا کر شکم سیر ہوا اور شرفا کے گولڈ اسپاٹ پر جا کر وہاں کی بہترین آئس کریم کھائی۔ اپنی بے عزتی کرنے والے پولیس افسر کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے کا خیال ذہن سے نکال دیا۔ بٹوا جانے کے صدمے کو بھی ذہن سے جھٹکا اور گھر جا کر سو گیا۔

شام کو میں کریڈٹ کارڈ سے مزید فائدہ اٹھانے کے لیے ڈینور روڈ پر شاپنگ سینٹر کے قریب گھوم رہا تھا کہ مارنے اچانک سامنے اس طرح نمودار ہوا جیسے جادوئی بوتل سے جن برآمد ہوتا ہے۔ اس کا ایک گال سوجا ہوا تھا اور ایک آنکھ نیم وا تھی۔ پپوٹے بھاری پردے کی طرح گرے ہوئے تھے۔ پتلون جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ میری طرف بڑھایا تو ہتھیلی کی پشت پر موٹی موٹی خراشیں تھیں۔ اس نے مجھے سیاہ ابھرے ہوئے حروف کا سفید ملاقاتی کارڈ دیا اور لڑکھڑاتا ہوا چلنے لگا۔ میں نے کارڈ پڑھا۔ اسے سستول۔ 23 ریوڈی ڈائے۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں تو مارنے راہ گیروں میں غائب ہو چکا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اسے سستول کون تھا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کا کلیروٹ سے کوئی تعلق ضرور ہے۔ میں اسی وقت اس پتے پر چل پڑا۔ میں نے اس بات کو درگزر کر دیا کہ کارڈ سے گھگی لانے والی ہلکی سی بو اٹھ رہی تھی۔ میرے خیال میں وہ مارنے کے پسینے کی بو تھی۔

مجھے سستول کا مکان تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ سرمئی کنکریٹ کا کوئی چالیس فٹ اونچا کسی راہب کدے سے ملتا جلتا مکان تھا۔ میں آگے بڑھا تو فٹ پاتھ پر قریب سے گزرتا ہوا ایک چھوٹا سا کتا رک گیا اور نزاکت سے غرانے لگا۔ میں کتوں سے دور ہی رہتا ہوں۔ اس کی معاندانہ غراہٹ سے میرے قدم رک گئے لیکن وہ ملحقہ کے موڑ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس سے بچتے ہوئے میں نے دروازے پر لگی کال بیل بجائی۔ تیسری بار بجانے پر دروازہ تھوڑا سا کھلا اور ایک تروتازہ پر کشش چہرہ نظر آیا۔ میرے رگ و پے میں بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا۔ اس سے پہلے کہ میرا دماغ میری راہنمائی کرتا، دروازہ پورا کھل گیا اور دو ہاتھوں نے مجھے اندر گھسیٹ لیا۔

''تمہیں یہ ایڈریس کس نے دیا؟'' کلیروٹ نے میرے شانے پکڑ کر پوچھا۔

''میں اخباری آدمی ہوں، ٹریکٹر نہیں چلاتا ہوں۔'' میں نے اس کے ہاتھوں سے شانے چھڑاتے ہوئے تلملاہٹ سے کہا۔

''ہاں، تم اخبار والے قبروں میں مردوں کا کفن بھی جھانکنے چلے جاتے ہو اور پھر ان سے کوئی بیان منسوب کر دیتے ہو۔'' اس نے تلخ مسکراہٹ سے کہا۔

''تم نے یہ ڈراما کیوں رچایا؟'' میں نے انٹرویو لینے کے انداز میں کہا۔

''تم نے میری بیوی کو دیکھا ہے؟'' اس نے جواباً سوال کیا۔

''ہاں، میں اس سے ملا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''پھر تو تمہیں میری روپوشی کی وجہ سمجھ لینی چاہیے۔'' اس نے نیم افسردگی سے کہا۔ معاً اس کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی اور وہ کہنے لگا۔ ''لیکن مجھے زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ کیا کسی کیمیکل فرم یا کیمسٹ شاپ میں نوکری کر کے خود کو ظاہر کرتا؟ سو میں نے ایک ایسا تخلیقی اور مفید کام کرنے کا فیصلہ کیا جس پر زیادہ خرچ نہیں آتا۔''

''اور تم کامیاب ہو گئے؟'' میں نے کہا۔

''بے شک۔'' وہ فاتحانہ مسکراہٹ سے بولا۔ ''آؤ دکھاتا ہوں۔''

ہم قدیم طرز تعمیر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے

www.pkdigest.com

میں ہوتے ہوئے ایک بھیانک سے تہ خانے میں آ گئے۔ اس کی ایک دیوار کی جگہ فرش سے چھت تک فولادی شٹر تھا۔ ہوا کے لیے چھت کے قریب چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ کئی لیبارٹریوں کا کاٹ کباڑ بکھرا پڑا تھا۔ ایک بڑی میز پر کیمیکلز کے ڈبے اور شیشیاں رکھی ہوئی تھیں اور اس کے قریب ایک چھوٹی سی بھٹی تھی۔ ایک پرانا صوفہ تھا۔ کلیروٹ نے مجھے اس پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

''میں نے ایک سفوف بنایا ہے جو کتوں کے لیے تیار کیا ہے۔'' وہ کہنے لگا۔ ''اس کی بو سے مرنجان مرنج، نرم خو اور شریف سے شریف کتا بھی خونخوار بن جاتا ہے۔ کسی شخص کے کپڑوں پر اسے چھڑک دیا جائے تو کتا اسے بھنبھوڑ کر اس کی بوٹیاں نوچ ڈالے گا۔''

''لیکن اس سے کسے فائدہ ہوگا؟'' میں نے اس کے دعوے کو احمقانہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''کتے کے مالک کو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کتے کی مدد سے وہ اپنے دشمن یا مخالف کو اسپتال پہنچوا دے گا، شاید قبرستان بھی۔ چور، نقب زن کو زیر کرے گا۔ کیا یہ کم فائدہ ہے؟''

''تم قانون کو بھول رہے ہو مسٹر کلیروٹ۔'' میں نے ذرا سختی سے کہا۔

''قانون والوں کو کیسے پتا چلے گا کہ کس چیز نے کتے کو بھیڑیا بنا دیا ہے؟'' اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''میری ایجاد ان لوگوں کے لیے ہوگی جن کے کتے ڈرپوک اور ضرورت سے زیادہ صلح جو ہوتے ہیں۔ اپنے مالک کو اس کے دشمن سے بچانے کی ہمت نہیں رکھتے۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر چور گھر میں گھس آئے تو کونے کھدرے میں دبک جاتے ہیں۔''

''تو کیا کتے کا مالک اپنے دشمن یا چور کے کپڑوں پر یہ سفوف چھڑکے گا تاکہ کتا اس پر جھپٹ پڑے؟'' میں نے طنزاً کہا۔

''اسے ہوشیاری سے یہ کام کرنا ہوگا۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''لیکن اس شیطانی ایجاد سے تمہاری روپوشی برقرار نہیں رہ سکے گی۔'' میں نے حرفِ آخر کے طور پر کہا۔ ''تم اسے فروخت کرنے کے لیے لوگوں سے رابطہ کرو گے ہی۔ شاید اخبار میں اشتہار بھی دو گے۔ تمہاری بیوی کو بالآخر علم ہو جائے گا۔''

''میں سارے کام اے سسٹول کے نام سے کروں گا۔ البتہ میری بیوی تک بات صرف تمہارے ذریعے پہنچ سکتی ہے۔ تم سے پہلے ایک لنگڑا یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنا نام مارٹن بتایا تھا۔ میں نے اسے سبق سکھا دیا۔ اب وہ اسپتال میں دم توڑ رہا ہوگا یا توڑ چکا ہوگا۔ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلا اور میں نے تمہاری پتلون پر سفوف چھڑک دیا۔ اب میں میز میں لگا ہوا بٹن دباؤں گا۔ دیوار سے شٹر اوپر اٹھے گا اور میرے خونخوار ہاؤنڈ نکل کر چشم زدن میں تم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ مارٹن تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن تم یہاں سے زندہ سلامت نکل نہیں سکو گے۔'' اس نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا اور میز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

کہاں ایک پینتالیس پچاس سال کا منشی اور کہاں چھبیس سالہ طاقت ور جوان! میں نے اسے دبوچ لیا اور گھونسوں، لاتوں سے مرمت کر کے اسے نڈھال کر دیا۔ پھر اس کی پتلون اتار کر پہن لی اور اپنی اسے پہنا دی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا۔ میں نے اٹھ کر میز کا کنارا ٹٹولا اور بٹن دبا کر شٹر کی گڑگڑاہٹ میں کمرے سے نکل بھاگا۔ میری آنکھیں اس کور بخت کا انجام نہ دیکھ سکیں۔

بدحواسی میں سڑک پار کرتے ہوئے میں اچانک ایک تیز رفتار کار کے سامنے آ گیا اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ میں تین ہفتے [illegible] اسپتال میں زیرِ علاج رہا۔ [illegible] چوٹیں آئی تھیں۔ [illegible] کے بعد [illegible] سے چھٹی ہوئی تو اپنے اخبار کے آفس میں گیا۔ معلوم ہوا کہ ٹیلی پیتھی کے شوق نے ایٹکن کو گھر بٹھا دیا۔ اس نے اخبار کے مالک پر بھی تجربہ کرنا چاہا تھا جو اسے گوارا نہ ہوا۔ نئے ایڈیٹر برٹن نے میری کہانی لاتعلقی سے سنی۔ جب میں ختم کر چکا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے پر لے گیا اور باہر دھکا دے دیا۔

حادثے میں امریکی سیاح کا کریڈٹ کارڈ بیکار ہو گیا اور میں پھر سے قلاش تھا۔ لامحالہ میڈم کلیروٹ کے پاس گیا اور اسے مژدہ سنایا کہ اس کے شوہر کا سراغ مل گیا تھا اور اس نے ایک ماہ پہلے خودکشی کر لی تھی۔ اس نے اپنا نام بدل لیا تھا، اس لیے اس کے جاننے والوں کو معلوم نہیں ہو سکا ہوگا۔

میڈم کلیروٹ کی مونچھوں کے باوجود میں نے اس سے پینگیں بڑھائیں۔ وہ مال دار عورت تھی اور جسمانی کشش بھی رکھتی تھی۔ میری چاہت کا ڈراما چلتا رہا، پھر میں اس کے گھر منتقل ہو گیا۔ میری بے روزگاری کا مسئلہ حل ہو گیا۔ میڈم نے اپنے کیمسٹ شوہر کا بند اسٹور کھلوا لیا اور تجربہ کار سیلزمینوں کی مدد سے میں اسے چلانے لگا۔

اٹھارویں صدی کا لندن دھند میں لپٹا ہوا پُراسرار اور تاریک شہر تھا۔ ایک طرف تو طبقۂ اشرافیہ تھا جس میں شاہی خاندان سے لے کر لارڈز اور دوسرے اُمرا تھے۔ ان کا لندن خوب صورت اور جگمگاتا ہوا تھا۔ یہاں تو رات کو بھی دن ہوتا تھا لیکن دوسری طرف ایک بہت بڑا اور عام لندن تھا۔ اس عام لوگوں کے لندن میں بعض اوقات دن میں بھی رات طاری رہتی تھی۔

اس وقت لندن ایک صنعتی شہر نہیں تھا۔ یہاں زیادہ تر گھریلو صنعتیں قائم تھیں... بندرگاہ کا علاقہ پھر بھی پُررونق تھا لیکن اس سے ہٹ کر عام لندن پر یاسیت اور خاموشی چھائی رہتی تھی۔ یہاں کے لوگ بھی بہت عجیب تھے۔ پُراسرار قسم کے اور اپنے آپ میں مگن رہنے والے۔ کچھ لوگ بڑے عجیب پیشے اختیار کرتے تھے جیسے مُردے چوری کرنا۔ آپ کو حیرت ہوگی... جی ہاں، اس زمانے میں مُردے چرانا بھی ایک پیشہ تھا اور اس سے اچھی آمدنی ہو جاتی تھی۔

مُردوں کی سب سے زیادہ مانگ تو ڈاکٹروں اور طبیبوں کو ہوتی تھی۔ وہ ان کی مدد سے انسانی جسم کا مطالعہ کرتے تھے۔ کسی کا انتقال، کسی لاعلاج یا سمجھ میں نہ آنے والی

حیران کن اور ملال انگیز حقیقت کا انکشاف کرتا جرم پارہ

انسان کو اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے ..... انسان کی بد نیتی اس کو حیوانوں سے بد تر کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے ..... ایسے ہی بد فطرت افراد کے گرد گھومتی کہانی جن کا کام مردے چرانا تھا۔

مُردہ فروش

مریم کے خان

www.pkdigest.com

ں تھا کہ پڑوس میں کون رہتا ہے۔ اس لیے جب چند دن
میں نے پوچھنے والوں کو بتایا کہ میرا باپ مر گیا ہے تو کسی
نے تعجب کا اظہار نہیں کیا بلکہ بہت سوں نے تو افسوس کا اظہار
بھی نہیں کیا۔ نہ ہی کسی نے پوچھا کہ اس کی تدفین کب ہوئی۔
اس طرح یہ معاملہ ختم ہو گیا۔

لیکن مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اب میں گزر بسر کیسے کروں گا؟ اپنے پیشے کے بارے میں مجھے کوئی تذبذب نہیں تھا۔ مُردہ چوری کا آغاز میرے دادا نے کیا تھا اور میرے باپ نے اس پیشے کو ہمارا خاندانی پیشہ بنا دیا تھا اور اب مجھے بھی یہی کام کرنا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں قبر سے لاش تو نکال سکتا تھا لیکن اسے کسی کو فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ میرے باپ سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ اس نے مجھے مُردہ چوری کے بارے میں تمام اسرار و رموز سکھا دیے تھے مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے گاہک کون لوگ تھے جنہیں وہ مُردے سپلائی کرتا تھا۔ اگر وہ بتا دیتا تو مجھے بہت آسانی ہو جاتی۔

خاصی سوچ بچار کے بعد ایک ہی خیال میرے ذہن میں آیا کہ مجھے کسی بڑے اور تجربے کار مُردہ چور کا ساتھی بن جانا چاہیے۔ صرف اسی طرح میں اس کام کو جاری رکھ سکتا تھا۔ یہ خیال آنے کے بعد میں نے مُردہ چوروں کی تلاش شروع کر دی۔ مجھے معلوم تھا کہ قبرستانوں میں جانے والے چور راستے کہاں ہیں۔ مُردہ چور انہی راستوں کو... استعمال کرتے تھے۔

ان راستوں پر کئی بار میرا اور میرے باپ کا سامنا دوسرے مُردہ چوروں سے ہوا تھا لیکن ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر گزر جاتے تھے۔ مُردہ چوروں میں ایک دوسرے سے تعلق کا رواج نہیں تھا کیونکہ ایک پکڑا جاتا تو وہ پولیس کے تشدد سے گھبرا کر دوسروں کے بارے میں بھی بتا سکتا تھا۔ اس لیے مُردہ چور ایک دوسرے سے حتی الامکان دور رہتے۔ میں نے ان راستوں کی نگرانی شروع کر دی۔ مجھے کسی ایسے مُردہ چور کی تلاش تھی جو اکیلا ہو کیونکہ ساتھی والا کسی صورت مجھے ساتھ نہیں رکھتا۔ میں راتوں کو چھپ کر دیکھتا اور مجھے کئی مُردہ چور آتے جاتے نظر آئے لیکن ان میں سے کوئی بھی اکیلا نہیں تھا۔

ایک رات سردی بہت زیادہ تھی اور میں کئی دن سے بھوکا تھا۔ میری آنتوں میں جیسے بل پڑ رہے تھے اور کبھی کبھی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا جاتی تھی۔ جب سردی اور بھوک نے زیادہ ہی تنگ کیا تو میں قبرستان کے قریب ایک شراب خانے میں آ گیا۔ اس زمانے میں شراب خانے میں جانے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں تھی۔ بھلے وہ کوئی بچہ ہو یا اسی سال کا بوڑھا، سب وہاں پائے جاتے تھے اور کوئی انہیں عجیب سے نہیں دیکھتا تھا۔ اس لیے اندر آنے پر کسی نے میری طرف توجہ بھی نہیں دی۔ شراب کا ذائقہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا لیکن میں اس کا عادی نہیں تھا۔

کاؤنٹر پر موجود مناسب قد اور جسامت کا کسی قدر ہلکے بالوں والا ایک شخص شراب پیتے ہوئے زور زور سے ہنس رہا تھا۔ اس کی رنگت ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہی تھی۔ میں اس سے کچھ دور تھا۔ ایک بار اس نے پلٹ کر اپنے عقب میں موجود پیشہ ور عورت کو ہاتھ مارنا چاہا جو وہاں سے ہٹ چکی تھی تاہم اس کا ہاتھ مجھے لگ گیا۔ میں بے دھیانی میں کھڑا تھا اس لیے نیچے جا گرا۔ اس نے جلدی سے اسٹول سے اتر کر مجھے اٹھایا۔

"معاف کرنا لڑکے۔" اس نے معافی مانگی۔ "میں سمجھا کہ کوئی اور ہے۔"

"کوئی بات نہیں مسٹر۔" میں نے کپڑے صاف کرتے ہوئے کہا کیونکہ وہاں فرش پر جا بجا چھلک جانے والی شراب اور لوگوں کی الٹیاں پڑی تھیں۔

"آؤ میرے ساتھ۔" وہ مجھے کاؤنٹر پر لے آیا اور اپنے برابر والے اسٹول پر بٹھا لیا۔ "کیا پیو گے... اے! ایک بیئر۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"مسٹر..." میں ہچکچایا۔ "اگر تم میرے ساتھ کچھ کرنا چاہتے ہو تو مجھے کھانے کو کچھ منگوا دو۔"

www.pkdigest.com

شراب خانے میں کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ اس نے ... ایک نظر مجھے دیکھا اور میرے لیے ڈبل روٹی اور بھنا ہوا گوشت منگوا لیا۔ میں کھانا آتے ہی اس پر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ جب تک میں نے یہ سب ختم نہیں کر لیا، تب تک مجھے کسی طرف دیکھنے کا ہوش بھی نہیں آیا۔ وہ خاموشی سے شراب پی رہا تھا۔ جب میں نے کھانا ختم کر لیا اور میری جان میں جان آئی تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارا شکریہ مسٹر..."

"کلین اسٹارک۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے جان ایڈم کہتے ہیں۔" میں نے کسی قدر ہچکچا کر اپنا نام بتایا۔ "میں تین دن سے بھوکا تھا، تم نے مجھے کھانا کھلا کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ میں اس کا بدلہ اتارنا چاہتا ہوں۔ تم مجھ سے کوئی بھی کام کرنے کو کہہ سکتے ہو۔"

اس نے پُر خیال نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"کوئی بھی کام... تم ہر کام کر سکتے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

"ایک کام ہے اور ابھی کرنے کا ہے۔" اس نے کہا۔

"چلو گے؟"

"بالکل مسٹر اسٹارک۔" میں پُرجوش ہو گیا۔ میں حقیقت میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ میرا پیٹ مکمل طور پر نہیں بھرا تھا لیکن میری جان میں جان آ گئی تھی۔ اس نے میرے لیے بیئر بھی منگوائی اور جب میں نے بیئر ختم کر لی تو وہ کھڑا ہو گیا۔

"چلو جان!"

ہم باہر آئے تو سردی نے ہم دونوں کا برا حال کر دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "مسٹر اسٹارک! کام کیا ہے؟"

"ابھی چلو... تم دیکھ لو گے۔" اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

لیکن جب اس نے دیوار کے ساتھ لگی ایک ہاتھ گاڑی اور اس کی نگرانی کرنے والے کو ایک سکہ دیا تو میں سمجھ گیا کہ وہ بھی ایک مُردہ چور ہے کیونکہ میرا باپ بھی سامان رکھنے اور پھر لاش لانے کے لیے ایسی ہی ہاتھ گاڑی استعمال کرتا تھا۔ اس نے کھدائی کا سامان چھپانے کے لیے اوپر ایک کپڑا ڈال رکھا تھا۔ میرا باپ بھی ایسا ہی خاکی کپڑا استعمال کرتا تھا اور واپسی پر لاش اسی سے چھپا کر لاتا تھا۔ میرا باپ کمزور آدمی تھا اس لیے وہ چھوٹی ہاتھ گاڑی استعمال کرتا تھا جبکہ اسٹارک مضبوط آدمی تھا اس لیے اس نے ایک بڑی گاڑی رکھی ہوئی تھی۔

جب تک ہم شہر کے پاس ایک قبرستان تک نہیں پہنچ گئے میرے دل میں ہلکا سا شک برقرار رہا۔ وہاں پہنچ کر یہ شک بھی دور ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"یہ تو قبرستان ہے۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟"

"نہیں لیکن یہاں تمہیں کیا کام ہے؟"

"اندر چلو لڑکے... ابھی تم دیکھ لو گے۔" اس نے میری پشت پر ہاتھ رکھ کر دھکیلا۔ ہم اندر آئے۔ وہ ایک تازہ بنی قبر کے سامنے رک گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ چاندنی رات تھی اور آسمان بھی صاف تھا اس لیے لالٹین جلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ "مجھے اپنے ایک دوست سے مذاق کرنا ہے۔ اس قبر میں اس کی بیوی دفن ہے۔ وہ اپنی بیوی سے بہت ڈرتا تھا اس لیے جب میں اس کی لاش نکال کر لے جاؤں گا اور اس کے بستر پر اس کے ساتھ لٹا دوں گا... تو صبح اس کا کیا حال ہو گا۔"

وہ مجھے عام بچہ سمجھ کر بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا اور کہانی سنا رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں خود بھی کام کرتا ہوں۔ لیکن میں بے وقوف بن گیا۔ میں نے ڈرنے کی اداکاری کی۔ "لیکن یہ تو جرم ہے جناب۔"

"نہیں نہیں، جرم نہیں ہے... بس مذاق ہے۔" اس نے زور دے کر کہا اور اپنی ہاتھ گاڑی سے پھاوڑا نکال کر قبر کھودنے لگا۔ میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ نہ صرف طاقت ور بلکہ اپنے کام میں ماہر بھی ہے۔ اس نے صرف آدھے گھنٹے میں تابوت کے اوپر سے ساری مٹی ہٹا دی اور میری طرف دیکھا۔ "دوست! اب تمہاری باری ہے۔ اندر اترو اور تابوت سے ڈھکن ہٹا کر لاش کی گردن سے یہ رسی باندھ دو۔"

میں سمجھ گیا کہ لاش کسی عمر رسیدہ اور بھاری عورت کی تھی جس کے اکڑے جسم کو اٹھا کر قبر سے نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے مُردہ چور یہ طریقہ استعمال کرتے ہیں اور لاش بہت آسانی سے نکل آتی ہے۔ میں پہلے بھی کئی بار یہ کام کر چکا تھا۔ اس نے مجھے ڈھکن توڑنے کے لیے ایک بھاری ہتھوڑا دیا اور میں بہ ظاہر ڈرتے ڈرتے قبر میں اتر گیا۔ میں نے ڈھکن توڑ کر لاش کی گردن سے رسی باندھ دی۔ یہ سستا سا تابوت تھا جس کا ڈھکن بہت ہلکی لکڑی کا بنا ہوا تھا اس لیے چند ضربوں میں ٹوٹ گیا اور جب میں اپنا کام کر کے باہر آیا تو اسٹارک نے بہت آرام سے لاش باہر کھینچ لی۔ تابوت کا ڈھکن واقعی بہت ہلکی لکڑی کا تھا۔ لاش اسے توڑ کر نکل آئی تھی۔

"زبردست!" اسٹارک نے کہا۔ وہ خوش تھا۔ "اب ذرا لاش گاڑی تک لے جانے میں میری مدد کرو۔"

میں نے اس کی مدد کی اور لاش کو گاڑی تک لے گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ شاید وہ ڈر رہا تھا کہ میں اس کا راز فاش نہ کر دوں۔ اس کے چہرے پر کشمکش کے تاثرات تھے کہ میرے ساتھ کیا کرے۔ پھر اس نے پھاوڑا اٹھایا تو میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے مار کر اسی قبر میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تم مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟ میں بھی یہی کام کرتا ہوں۔"

وہ چونکا اور اتنا حیران ہوا کہ اس کے ہاتھ سے پھاوڑا گر گیا۔ "تمہیں... کیسے پتا چلا؟"

"میں بھی چور ہوں اور جانتا ہوں کہ ایک چور اپنی حفاظت کے لیے کس طرح پریشان ہوتا ہے۔ تم نے اپنا راز رکھنے کے لیے مجھے مارنے کا سوچا ہے۔"

"ہاں۔" اس نے دوبارہ پھاوڑا اٹھایا۔ "میں اپنا راز اسی قبر میں دفن کر کے جاؤں گا۔"

میں اس کے تاثرات دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا اور پیچھے ہٹنے لگا۔ "میرا باپ بھی مُردہ چور تھا، میں اس کے ساتھ کام کرتا تھا۔"

"کچھ بھی ہو..."

اچانک میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا اور میں گر گیا۔ وہ میرے سر پر تھا اور...... بھاگنے کا موقع نہیں تھا۔ اس نے پھاوڑا بلند کیا تو میں نے آنکھیں بند کر لی اور جلدی جلدی کہنے لگا۔ "مجھے کام کی تلاش ہے... تم اکیلے ہو، مجھے ساتھ کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

جب کچھ دیر پھاوڑا میرے سر سے نہیں لگا تو میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس نے پھاوڑا نیچے کر لیا تھا اور سوچ میں گم تھا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا تو میں سمجھ گیا کہ اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ "ٹھیک ہے دوست! آج سے ہم پارٹنر ہیں... ہاتھ ملاؤ۔"

اس طرح میں نے اسٹارک کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ جلد مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا باپ بہت سادہ مزاج شخص تھا۔ وہ بے چارہ صرف پیٹ بھرنے کے لیے یہ کام کرتا تھا جبکہ اسٹارک اونچے درجے کا چور تھا۔ اس کے تعلقات ایسے لوگوں سے تھے جن کے پاس دولت تھی اور ان کو مُردے بھی درکار ہوتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے نامور ڈاکٹرز جو مریضوں سے بھاری فیس وصول کرتے تھے... ڈاکٹری پڑھنے والے دولت مند گھرانوں کے چشم و چراغ اور بھی دوسرے لوگ تھے جو لاشیں حاصل کرتے تھے اور ان کے ساتھ عجیب و غریب تجربات کرتے تھے۔

اسٹارک کے ساتھ کام کرتے ہوئے رفتہ رفتہ میرے علم میں اضافہ ہوا۔ اسٹارک ویسے تو بہت درشت مزاج شخص تھا لیکن مجھ پر مہربان تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ وہ میرا استحصال کرنے کی کوشش کرے گا اور مجھے صرف کھانے پینے کے لیے دے گا لیکن اس نے مجھے پہلی ہی لاش کے معاوضے میں سے ملنے والی رقم کا چوتھائی دے کر حیران کر دیا۔ میں نے انکار کیا تو اس نے کہا۔ "رکھ لو برخوردار... یہ تمہارا حق ہے۔ ویسے میں نے تمہیں چوتھا حصہ دیا ہے کیونکہ اب تمہارے کھانے پینے اور دیگر ذمے داریاں بھی مجھ پر ہوں گی۔"

"تو میں اس رقم کا کیا کروں گا؟"

"عیش کرنا۔" اس نے مجھے آنکھ ماری۔ "میرا خیال ہے کہ ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے ہو لیکن دو تین سال بعد میں تمہیں قحبہ خانے لے جاؤں گا اور پھر دوسرے اخراجات بھی ہوتے ہیں۔"

وہ مجھے ہر لاش کے عوض ملنے والی رقم سے چوتھائی حصہ دیا کرتا۔ کبھی میرے حصے میں چند شلنگ آتے... کبھی ایک پاؤنڈ مل جاتا اور کبھی دو تین پاؤنڈز بھی مل جاتے تھے۔ مجھ جیسے لڑکے کے لیے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ میں اسے جمع کرتا رہا۔ باپ کے مرنے کے بعد میں اکیلا رہتا تھا اور یہ گھر میرا تھا۔ اسٹارک کا کوئی گھر نہیں تھا اور وہ کرائے کی ایک کھولی میں رہتا تھا۔ میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ ہم دونوں دوست بن گئے۔ اگرچہ اس کی اور میری عمر میں بہت فرق تھا۔ وہ تقریباً تیس برس کا تھا یعنی مجھ سے کوئی بیس اکیس برس بڑا۔

زندگی کا اصل سفر میں نے اسٹارک کے ساتھ ہی شروع کیا۔ اس کے ساتھ رہ کر مجھے انسانوں کے مختلف روپ دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے بے شمار تجربات حاصل کیے۔ وہ بے خوف انسان تھا۔ میرا ساتھ ہونے کے بعد وہ کچھ عرصے تک محتاط رہا۔ مجھے اس کی فطرت کا صحیح معنوں میں اندازہ ہو گیا لیکن ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔

"ایک ایسی لاش چاہیے جسے زمین میں دفن نہ کیا گیا ہو۔"

"ایسی لاش کہاں ملے گی؟" میں نے اس کی بات پر غور کیا۔

وہ مسکرایا۔ "لوگ کہاں مرتے ہیں؟"

"گھروں میں اور اسپتال میں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کے علاوہ دفنانے سے پہلے انہیں کہاں رکھا جاتا ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"چرچ میں۔" میں نے جوش سے کہا۔

"بالکل... تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ ایک مقامی رئیس کی نوجوان بیوی کا انتقال ہو گیا ہے اور مجھے اس کی لاش چرانے کا کام ملا ہے۔"

"لیکن اس میں بہت خطرہ ہے... چرچ میں جہاں لاش ہوگی وہیں اور بھی بہت سارے لوگ ہوں گے۔ ان کی موجودگی میں ہم لاش کیسے چرا سکتے ہیں؟"

"ہاں، یہ مسئلہ ہے۔" اس نے اپنی ہلکی سی ڈاڑھی کھجائی۔ "معاوضہ بہت اچھا مل رہا ہے۔ پورے دس پاؤنڈز!"

عام طور سے ہمیں ایک لاش کے عوض اوسطاً تین پاؤنڈز ملتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ بہت اچھا معاوضہ تھا مگر سوال وہی تھا کہ لاش کس طرح چرائی جائے؟ ظاہر ہے، وہاں موجود لوگ آسانی سے ہمیں یہ کام نہیں کرنے دیتے اور پکڑے جاتے تو مجھے معلوم تھا کہ کیا سزا ملے گی۔ اسٹارک کو نرم پھندے پر لٹکا دیا جائے گا اور مجھے بھی کم سے کم پھانسی ہو گی۔ ہم دونوں غور کر رہے تھے کہ کس طرح لاش چرائی جائے اور ہم لاش سمیت فرار ہو سکیں۔

"ایک ترکیب آرہی ہے۔" اسٹارک بولا۔ "لیکن تم نے وہی کرنا ہے جو میں کہوں گا۔"

"بتاؤ۔" اسٹارک نے چرچ دیکھا ہوا تھا اور اسے معلوم تھا کہ آخری سروس کے لیے لائی جانے والی لاشیں کہاں رکھی جاتی ہیں۔ وہ مجھے سمجھانے لگا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں غور سے سنتا رہا۔ جب میں اس کی بات سمجھ گیا تو اس نے سب سے پہلے میرے لیے ذرا ڈھنگ کا لباس مہیا کیا جسے پہن کر میں متوسط طبقے کا کوئی لڑکا لگنے لگا۔ اس نے مجھے تفصیل سے سمجھایا کہ مجھے چرچ میں جا کر کیا کرنا ہے۔ لاش کی تدفین اگلے روز تھی اور اس کا دیدار کرنے کے لیے آج کا دن مخصوص تھا کیونکہ کل صبح سروس کے بعد لاش کو دفنانے کے لیے لے جایا جاتا اور وہاں اس کی قبر پر پہرا ہوتا۔

"یہ کون ہے جسے اتنی تازہ لاش چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

"ہے ایک سنکی۔" اسٹارک نے جواب دیا۔ "جب میں لاش لے کر جاؤں گا تو تم بھی اسے دیکھ لینا۔"

میں اور اسٹارک سورج غروب ہوتے ہی چرچ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اسٹارک نے مجھے ایک بار پھر سمجھایا کہ مجھے اندر جا کر کیا کرنا ہے۔ وہ چرچ کی عقبی گلی میں چلا گیا۔ میں چرچ میں داخل ہوا اور ایک خادم سے رئیس آدمی کی بیوی میریا کی لاش کے بارے میں پوچھا۔ اس نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ "سیڑھیوں سے اوپر چلے جاؤ، بائیں طرف کا پہلا کمرا ہے۔"

حالانکہ مجھے معلوم تھا لیکن میں نے پھر بھی معلوم کیا۔ میں اوپر آیا تو کمرے میں ایک عورت موجود تھی اور دو نوجوان لڑکے تابوت کے پاس کھڑے ہوئے پی رہے تھے اور واہیات قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔ عورت نے مجھے دیکھا۔

"کون ہو تم؟"

"میرا نام کورن ایسٹ مین ہے۔" میں نے کہا۔ "میں مہربان میریا خاتون کا آخری دیدار کرنے آیا ہوں۔"

اس پر ایک لڑکے نے میرا بہ غور جائزہ لیا اور بولا۔ "تمہاری عمر تو ایسی نہیں کہ وہ تم پر مہربان ہو سکے۔"

میں ٹوپی اتار کر اور روتی سے صورت بنا کر کھڑا ہو گیا۔ زیادہ بولنا خطرناک ہو سکتا تھا اس لیے میں صرف اپنے تاثرات سے ایکٹ کر رہا تھا۔ آخر عورت کا دل پسیج گیا اور اس نے لڑکوں سے کہا۔ "دیکھنے دو بے چارے کو۔"

اس لڑکے نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "آؤ دیکھ لو... اگر کچھ عرصے اور زندہ رہ جاتی تو تم پر بھی مہربان ہو جاتی۔"

میں ان کی بے ہودہ باتیں سمجھ رہا تھا۔ یہ خاتون اگر اپنی زندگی میں دل پھینک رہی تھی، تب بھی انہیں اس کی اس طرح کردار کشی کرنے کا حق نہیں تھا۔ لیکن میں انہیں کیا کہتا؟ میں تو خود اس لاش کو اس لیے چرانے آیا تھا کہ اسے بیچا جا سکے۔ میں کھلے تابوت کے پاس آیا۔ جب میں نے میریا کو دیکھا تو ساکت رہ گیا۔ وہ بلاشبہ بہت ہی حسین عورت تھی۔ عورت بھی میں اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ وہ شادی شدہ تھی۔ ورنہ اس کی عمر بائیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ موت کی سختی بھی اس کی دل کشی کو ماند نہیں کر سکی تھی۔ مجھے سچ مچ رونا آ گیا۔ مجھے روتے دیکھ کر عورت آگے آئی اور اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "صبر کرو لڑکے۔"

میں نے ناک سڑکتے ہوئے سر ہلایا اور بھرائی آواز میں بولا۔ "کیا مجھے کچھ دیر کے لیے یہاں اکیلا چھوڑا جا سکتا ہے؟"

میری اس فرمائش پر دونوں لڑکوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا اور واہیات گفتگو کرنے والے نوجوان نے پھر کہا۔ "لگتا ہے یہ اس کی آخری مہربانیوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔"

عورت کو غصہ آ گیا۔ وہ انہیں کمرے سے باہر دھکیلنے لگی۔ "تم سب کو اپنی طرح مت سمجھا کرو۔" اس نے ان کو کمرے سے نکال دیا اور میری طرف پلٹی۔ "لڑکے! تمہارے پاس دو منٹ ہیں... اور لوگ بھی دیکھنے آرہے ہیں۔"

"میرے لیے یہ دو منٹ بہت ہیں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

جیسے ہی عورت نے باہر نکل کر دروازہ بند کیا، میں تیزی سے حرکت میں آیا اور دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ اس کے بعد میں تابوت دھکیل کر کھڑکی تک لے گیا۔ ایک رسّی سے میریا کی لاش باندھی اور اسے کھڑکی کے راستے نیچے دھکیل دیا۔ وہ بہت ہلکی سی تھی، مجھے خاص دشواری پیش نہیں آئی لیکن اس دوران میں دو منٹ پورے ہو گئے اور ان لوگوں نے اندر آنا چاہا تو دروازہ اندر سے بند ملا۔ وہ دروازے کو دھکے دینے کے ساتھ شور بھی مچانے لگے۔ اس دوران میں نیچے اسٹارک نے لاش وصول کر لی تھی۔ میں بھی کھڑکی پر چڑھا اور رسّی کے سہارے نیچے اتر گیا۔ رسّی میں نے تابوت کو رکھنے والے فولادی اسٹینڈ کے پائے سے گزاری تھی اور اسے دُہرا کر کے پکڑ لیا تھا۔ نیچے پہنچتے ہی میں نے رسّی بھی کھینچ لی۔ اس دوران میں اسٹارک لاش کو ایک تھیلے میں ڈال چکا تھا اور اسے شانے پر لاد لیا تھا۔ یہاں سے ہم لاش کو گاڑی میں نہیں لے جا سکتے تھے کیونکہ کوئی ہمارا تعاقب کرتا تو پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ ہم تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گئے۔

کچھ دیر بعد اسٹارک لندن کے نسبتاً پوش علاقے میں داخل ہوا۔ یہاں گلیاں چوڑی اور صاف ستھری تھیں اور

قطار میں خوب صورت مکانات بنے تھے جن کے سامنے چھوٹے باغ تھے۔ اسٹارک ایسے ہی ایک مکان کے باغ میں داخل ہوا...... اس نے سامنے سے جانے کے بجائے عقبی حصے کا رخ کیا تھا۔ اس طرف جگہ ویران اور اجاڑ سی تھی۔ اس نے لاش ایک بنچ پر لٹادی اور دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا.... سامنے ایک طویل قامت اور چہرے سے خود مُردہ نظر آنے والا شخص کھڑا تھا۔ اس نے لالٹین اٹھا رکھی تھی۔

"تم!" اس نے اسٹارک کی طرف دیکھا۔ "لاش لے آئے؟"

"ہاں۔" اسٹارک بولا اور اس نے بنچ پر پڑی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ اس آدمی نے لاش اندر لانے کو کہا۔ جب اسٹارک لاش اٹھا کر اندر لے گیا تو اس آدمی نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا۔

"اس پر لٹادو۔"

اسٹارک لاش میز پر لٹا کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اس سے سرگوشی میں پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"ڈاکٹر ولکوونس۔" اس نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔ میں دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر نے لاش پر سے تھیلا اتار دیا تھا اور اب اسے سیدھا لٹا رہا تھا۔ اس نے پپوٹے کھول کر لاش کی آنکھیں دیکھیں اور پھر اس کا لباس اتارنے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس حسینہ کو عریاں دیکھوں گا۔ رفتہ رفتہ ڈاکٹر نے اس کے سارے کپڑے اتار دیے اور پھر اپنے آلات کی مدد سے اس کا جسمانی معائنہ کرنے لگا۔ اس کا انداز اتنا سرد تھا جیسے ایک حسین عورت کی لاش نہیں بلکہ لکڑی کی کسی بے جان چیز کا معائنہ کر رہا ہو۔ مجھے الجھن ہونے لگی اور پھر اس نے لاش کے ساتھ کچھ ایسی حرکتیں کیں کہ مجھے اس سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ میرا دل چاہا کہ اس بڈھے کی پتلی سی گردن دبا دوں۔ مگر میں خاموش کھڑا رہا۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر ولکوونس نے اسٹارک سے کہا۔ "ٹھیک ہے، یہ بالکل ویسی لاش ہے جیسی مجھے درکار تھی۔"

"تب میرا معاوضہ ادا کرو۔" اسٹارک نے مطالبہ کیا۔

ڈاکٹر نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس پاؤنڈز کے مساوی سونے کے سکے نکال کر اسٹارک کو دے دیے۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ فوراً میرے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "آج ہم مزے کریں گے۔"

میں سمجھتا تھا کہ مزے سے اس کی کیا مراد ہے۔ وہ کسی شراب خانے کا رخ کرے گا اور وہاں دل بھر کر پینے کے بعد کسی طوائف کو لے کر اس کے ٹھکانے پر چلا جائے گا اور پھر اگلی صبح ہی اس کی واپسی ہوگی۔ میں پیتا تھا لیکن اتنی نہیں۔ جب وہ شراب خانے سے ایک عورت کے ساتھ اس کے گھر جانے لگا تو اس نے مجھے چلنے کی دعوت بھی دی لیکن میں نے انکار کر دیا اور اس سے کہا۔ "تم کل گھر آجانا۔"

"ہاں... ہاں، میں آجاؤں گا۔" اس نے ہاتھ لہرایا اور تاریک گلی میں غائب ہوگیا۔ اصل میں مجھے تجسس تھا کہ ڈاکٹر ولکوونس نے اس عورت کی لاش کیوں حاصل کی تھی اور وہ اس کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پہلے میں سمجھا تھا کہ وہ بھی اسٹارک کے ایک گاہک مسٹر ولبرٹ کی طرح نفسیاتی مریض ہے۔ مسٹر ولبرٹ ایک دولت مند شخص تھا اور وہ بھی اسٹارک کو لاش لانے کے عوض اچھا معاوضہ دیا کرتا تھا۔ اس کی شرط یہ ہوتی تھی کہ لاش کسی جوان عورت کی ہو اور اگر وہ کمسن اور کنواری ہوتی تو ولبرٹ اس کے بدلے منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار ہو جاتا۔ وہ شیطان ان لاشوں کے ساتھ بدفعلی کرتا تھا۔ جب اسٹارک نے مجھے اس بارے میں بتایا تو مجھے ولبرٹ سے نفرت ہوگئی۔

"تم ایسے شخص کے لیے کیوں کام کرتے ہو؟"

"اچھا تو مجھے بھی نہیں لگتا ہے۔" اسٹارک نے ٹھنڈی سانس لی۔ "مگر کیا کروں، یہ معاوضہ بہت اچھا دیتا ہے اور اگر میں نہیں لاکر دوں گا تو یہ کسی اور سے لاش حاصل کرے گا۔"

یہ بات تو سو فیصد درست تھی، اس شہر میں مُردہ چوروں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر اسٹارک اسے لاش لا کر نہیں دیتا تو وہ کسی اور سے منگوا سکتا تھا۔ اس لیے میں اسٹارک سے متفق ہوگیا تھا کہ ہم اپنا نقصان کیوں کریں۔ البتہ ولبرٹ کے لیے میرے دل میں موجود نفرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ کاش میں اسے لاش لا کر دینے کے بجائے اسے زندہ ہی کسی قبر میں لاش کے ساتھ دفن کر دوں اور اس سے کہوں... بیٹا! اب عیاشی کرو یہاں ہمیشہ کے لیے۔

اسٹارک اگلے دن آیا تو اس کا تھکن سے بُرا حال تھا اور وہ مجھ سے بات کیے بغیر سو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ رات کو ہی اٹھے گا۔ وہ اور میں بھی رات کی مخلوق تھے۔ ہمارا دن سونے میں گزرتا اور دوسرے اب اس کی جیب میں رقم آگئی تھی اس لیے ابھی اسے کام کے بجائے کئی دن عیاشی میں گزارنے تھے۔ میں صبر سے اس کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس نے جاگتے ہی مجھ سے شراب کا مطالبہ کیا تو میں نے اسے

نزدیکی دکان سے بوتل لادی۔ تقریباً نصف بوتل پی لینے کے بعد اس کا موڈ اچھا ہوا تو میں نے اس سے پوچھا۔

"تم نے مجھے ڈاکٹر ولکوونس کے بارے میں نہیں بتایا۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ "لگتا ہے تم بے تابی سے اس کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟"

میں نے اعتراف کیا۔ "ہاں، مجھے بہت تجسس ہو رہا ہے کہ وہ اس لاش کا کیا کرے گا... کہیں وہ بھی ولبرٹ کی طرح جنونی تو نہیں ہے؟"

"وہ بھی جنونی ہے۔" اسٹارک نے ایک گھونٹ اور لے کر کہا۔ "لیکن ولبرٹ کی طرح کا نہیں۔"

"پھر وہ اس لاش کا کیا کرے گا؟"

اسٹارک نے کچھ پُراسرار سے انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا۔ "وہ اسے زندہ کرنے کی کوشش کرے گا۔"

میں حیران ہوگیا۔ "زندہ کرنے کی؟"

"ہاں، اسے یہی جنون ہے کہ وہ کسی مُردہ انسان کو زندہ کردے اور اس مقصد کے لیے اسے ہمیشہ ایک خاص قسم کی لاش درکار ہوتی ہے۔"

"کس قسم کی لاش... میریا کی طرح حسین اور جوان؟"

میری بات پر پہلے وہ ہنسا۔ "لگتا ہے تم جوان ہوگئے ہو۔ تمہیں بھی کسی عورت کے جوان اور حسین ہونے کا احساس ہوگیا ہے۔"

میں جھینپ گیا۔ "وہ تو بس ایسے ہی..."

"شرمندہ مت ہو برخوردار۔" اس نے کہا۔ "ڈاکٹر ولکوونس کو ایک ایسی جوان لاش درکار ہوتی ہے جس کی عمر پچیس برس سے زیادہ نہ ہو۔ وہ کسی ایسی بیماری یا حادثے میں مرا نہ ہو جس سے جسم یا اندر کے اعضا بگڑ جائیں اور اسے دفن نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اس کی آٹوپسی کی گئی ہو۔"

"لاش صرف عورت کی ہو؟"

"نہیں، لاش کسی کی بھی ہو سکتی ہے۔ مرد عورت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اسٹارک نے کہا۔ "لیکن باقی شرطیں پوری کرنا لازمی ہے۔ ڈاکٹر ولکوونس معاوضہ بہت اچھا دیتا ہے لیکن اگر لاش صحیح نہ ہو تو اسے منہ پر دے مارتا ہے۔"

"تمہیں لاش کا کیسے پتا چلتا ہے کہ وہ اس کے مطلب کی ہے یا نہیں؟"

"میں ڈاکٹروں سے رابطہ رکھتا ہوں... جب ایسی کوئی لاش آتی ہے تو مجھے اس کی اطلاع مل جاتی ہے اور میں اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"کیا تم ہر بار لاش چراتے ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "مجبوری ہے کیونکہ اگر میں لاش کے دفن ہونے کا انتظار کروں تو ایک تو لاش پرانی ہو جاتی ہے اور دوسرے دفن کرنے سے وہ ڈاکٹر کے لیے بیکار ہو جاتی ہے۔ وہ بہت چالاک ہے۔ میں نے ایک بار اسے دفن شدہ لاش لادی تھی... وہ جان گیا تھا۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے پھر اسے دھوکا دینے کی کوشش کی تو وہ مجھے قتل کردے گا۔"

میں نے حیرت سے کہا۔ "وہ سوکھا سا آدمی تمہیں قتل کرنے کی دھمکی دے رہا تھا؟"

"اس کی جسامت پر مت جاؤ... اس کے اندر کسی شیطان کی طاقت ہے۔ ایک بار اس نے میری کلائی پکڑ لی تھی... یقین کرو، مجھے یوں لگا تھا جیسے میری کلائی کسی فولادی شکنجے میں آگئی ہو۔"

"اس کے بعد تم نے اس کے ساتھ دھوکا کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں، ویسے بھی وہ میرا سب سے اچھا گاہک ہے اور اس سے مجھے اب تک سو پاؤنڈز سے زیادہ کی آمدنی ہو چکی ہے۔"

"کیا اس نے اب تک کسی لاش کو زندہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اسٹارک نے نفی میں سر ہلایا۔ "کسی ایک کو بھی نہیں۔ میں نے اسے اب تک کوئی دس لاشیں مہیا کی ہیں اور وہ سب مجھے واپس مل گئیں۔"

"واپس مل گئیں؟" میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔

"ہاں... جب لاش اس کے لیے بیکار ہو جاتی ہے تو وہ مجھے واپس بلا کر لاش میرے حوالے کر دیتا ہے۔"

"تاکہ تم اسے دفن کر دو؟"

وہ ہنسا۔ "میں اتنا پاگل نہیں ہوں۔ وہ لاش میں کسی اور کو بیچ دیتا ہوں۔ اسے دفنانے کی حماقت کیوں کروں گا جبکہ میرا کام ہی لاش چرانا ہے۔"

میں بھی ہنس دیا۔ واقعی میں نے احمقانہ بات کی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا۔ "تمہیں کیسے پتا چلتا ہے کہ اسے لاش پہنچوانی ہے؟"

"اس کا ایک ملازم آکر مجھے اس کا پیغام دے جاتا ہے اور میں رات کو جا کر اس سے لاش وصول کر لیتا ہوں۔"

میرا تجسس بڑھ گیا۔ "تم نے کبھی جاننے کی کوشش کی ہے کہ وہ لاش کے ساتھ کیا کرتا ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مجھے بھی اس کا خیال

www.pkdigest.com

آیا تھا اور میں اس سے جو لاشیں لاتا ہوں ان کا معائنہ بھی کیا ہے لیکن میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ ان کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ اکثر اوقات لاشوں میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے زخم ہوتے ہیں جیسے شریانوں پر کٹ لگے ہوتے ہیں لیکن وہ نہ تو لاشوں کی چیر پھاڑ کرتا ہے اور نہ ان کے اعضا کو نقصان پہنچاتا ہے۔"

"ظاہر ہے، اس صورت میں لاش زندہ ہو بھی گئی تو ادھوری ہوگی۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ ان لاشوں پر دوائیں آزماتا ہے۔" اسٹارک بولا۔ "ایک بار میں نے اس سے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے مجھے جھڑک دیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنا طریقہ چھپانا چاہتا ہے۔"

"ظاہر ہے، وہ کام بھی تو کیسا کر رہا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہوگیا تو تہلکہ مچ جائے گا۔ وہ ملک کا سب سے امیر اور دولت مند شخص بن جائے گا۔"

اب میں بے چینی سے منتظر تھا کہ ڈاکٹر ولکوونس کے اس تجربے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اور وہ اس دل رُبا کو زندہ کر پاتا ہے یا نہیں۔ ویسے میری شدید خواہش تھی کہ میریا زندہ ہو جائے اور میں اسے ایک بار زندہ بھی دیکھ سکوں۔ شاید میں اس سے عشق کرنے لگا تھا۔ اس زمانے میں لوگ بڑی آسانی سے کسی پر عاشق ہو جاتے تھے اور کسی چیز کی پروا نہیں کرتے تھے۔ شاید اس وقت لوگوں کے پاس بہت فراغت ہوتی تھی۔ آنے والے دو دن تک اسٹارک عیاشی کرتا رہا۔ وہ شام ہوتے ہی میرے ساتھ کسی شراب خانے کا رخ کرتا اور وہاں سے نشے میں دھت ہو کر کوئی حسینہ بغل میں دبا کر نکل جاتا پھر اگلے روز ہی گھر آتا۔ جن دنوں کام نہیں ہوتا تھا، میں رات کو سو جاتا اور دن میں بور ہوتا یا پھر گھومنے نکل جاتا۔ میری پسندیدہ جگہ بندرگاہ تھی۔ کبھی میں سوچتا کہ کسی دن کوئی بحری جہاز پکڑ لوں اور یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں۔ لیکن ابھی میں اتنا بڑا نہیں تھا کہ خود سے کہیں جا سکوں۔ اس کے لیے مجھے انتظار کرنا تھا۔ شاید میں یہ گھٹیا کام کرتے کرتے اکتانے لگا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میرا کوئی اچھا اور باعزت روزگار ہو اور ایک گھر ہو۔ لیکن ایسا گھر نہیں جہاں میں رہتا تھا۔

تیسرے دن جب اسٹارک کی جمع پونجی ختم ہونے کے قریب تھی تو اسے کام کا خیال آنے لگا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "لگتا ہے ڈاکٹر ولکوونس کا تجربہ کامیاب رہا ہے۔"

میں خوشی سے اچھل پڑا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

اس نے ناک چڑھا کر میری طرف دیکھا۔ "تمہیں اتنی خوشی کیوں ہو رہی ہے؟"

میں جلدی سے سنبھل گیا۔ "وہ... مم... میں ایسے ہی جوش میں آگیا تھا۔ تم نے بتایا نہیں کہ تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"کیونکہ اسے میریا کی لاش دیے ہوئے آج تیسرا دن ہو چکا ہے اور اس نے مجھے ابھی تک لاش لے جانے کے لیے نہیں بلایا۔"

یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسٹارک کی بات درست تھی لیکن پھر بھی میں نے تسلی کے لیے پوچھا۔ "ممکن ہے اس بار اسے اپنا تجربہ کرنے میں زیادہ دن لگ گئے ہوں۔"

اسٹارک نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس سے پہلے کبھی تین دن نہیں لگے۔ وہ دو دن میں مجھے بلا کر لاش میرے حوالے کر دیتا ہے۔"

میں خوش تھا کہ میریا زندہ ہوگئی ہے۔ اگرچہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے زندہ ہونے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا لیکن میں پھر بھی خوش تھا۔ پھر مجھے خیال آیا۔ "ہم نے تین دن سے کوئی کام نہیں کیا ہے۔ اب تو رقم بھی ختم ہونے والی ہے۔"

"آج رات نکلیں گے۔" اس نے مجھے تسلی دی۔ "ممکن ہے قسمت اچھی ہو تو کوئی اچھی لاش ہاتھ لگ جائے۔"

حسب معمول ہم رات ہوتے ہی نکل گئے۔ پہلے ایک شراب خانے میں کھانے اور پینے سے فارغ ہوئے۔ میرا زیادہ زور کھانے پر ہوتا تھا اور اسٹارک کا پینے پر۔ مجھے تو رات ہوتے ہی بھوک لگنے لگتی مگر اسٹارک عام طور سے کام سے فارغ ہو کر ہی کھاتا تھا۔ شراب خانے سے ہم نے قبرستان کا رخ کیا لیکن اس روز ہماری قسمت میں کوئی کامیابی نہیں تھی اور خاصی دیر تلاش کے بعد بھی ہمیں کوئی ایسی تازہ قبر نہیں ملی جس سے ہم کوئی مُردہ حاصل کر سکتے۔ ہم ناکام واپس آگئے۔

"ہمیں کل ہر صورت کوئی مُردہ حاصل کرنا ہوگا۔" اسٹارک نے واپسی میں کہا۔

"کس کے لیے؟" میں نے پوچھا۔

"ولبرٹ کے لیے... اسے مہینے میں ایک بار لاش درکار ہوتی ہے۔"

مجھے ولبرٹ کا نام سن کر غصہ آنے لگا۔ "مجھے اس سے نفرت ہے۔"

"وہ تو مجھے بھی ہے۔" اسٹارک نے بے دلی سے کہا۔ "لیکن کیا کروں، وہ بہت اچھی رقم دینے والے گاہکوں میں

سے ایک ہے۔"

"کیا اس نے پھر کسی نوجوان لڑکی یا عورت کی لاش مانگی ہے؟"

"ہاں، مجھے شراب خانے میں اس کا پیغام ملا تھا۔ اسے ایک دو دن میں لازمی طور پر کسی جوان عورت کی لاش درکار ہے۔"

میں غصے سے بے قابو ہو کر اسے گالیاں دینے لگا۔ گھر آکر ہم تھک کر سو گئے...... اسٹارک کی نیند ویسے ہی کئی دن سے پوری نہیں ہو رہی تھی اس لیے وہ صبح دیر تک سوتا رہا..... میں دوپہر تک اٹھ گیا تھا۔ پہلے میں نے باہر جا کر پیٹ بھرا اور اسٹارک کے لیے بوتل لے کر واپس آرہا تھا کہ ایک سیاہ کوٹ پہنے شخص کو اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے پایا.... وہ پُراسرار سا لگ رہا تھا۔

"کیا بات ہے مسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اسٹارک سے کام ہے۔"

"وہ سو رہا ہے، مجھے بتا دو۔"

"نہیں، اسے ہی بتانا ہے۔ اسے جا کر بتا دو کہ ڈاکٹر ولکوونس کا نوکر آیا ہے۔" پُراسرار شخص نے کہا۔ میں ڈاکٹر کا نام سن کر اچھل پڑا۔ میں نے جلدی سے اندر جا کر اسٹارک کو جگایا اور اسے ڈاکٹر کے نوکر کے بارے میں بتایا۔ وہ جمائیاں لیتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا ڈاکٹر کا تجربہ اس بار بھی ناکام ہو گیا ہے اور کیا وہ میریا کو زندہ کرنے میں ناکام رہا ہے؟ یہ سوچ کر ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں دروازے سے لگا اسٹارک اور ڈاکٹر کے نوکر کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ دونوں اتنی آہستگی سے بات کر رہے تھے کہ کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ اسٹارک اس سے خاصی دیر بات کرتا رہا اور جب وہ اندر آیا تو اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی فکر یا پریشانی میں مبتلا ہے۔ اس نے اندر آتے ہی بوتل کا مطالبہ کیا تو میں نے جلدی سے اسے بوتل تھما دی اور ذرا بے پروائی سے بولا۔

"کیا ہوا... خیریت تو ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ویسے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن ڈاکٹر نے مجھے رات کو بلایا ہے اور کہا ہے کہ اپنا کھدائی کا سارا سامان بھی ساتھ لے کر آؤں۔"

"کھدائی کا سامان... وہ کیوں؟"

"احمق... اس کا مطلب بڑا سیدھا سا ہے۔ مجھے کوئی قبر کھودنی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے اس نے کبھی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ وہ بس مجھے بلاتا ہے اور لاش میرے حوالے کر دیتا ہے۔ اب میری مرضی کہ میں لاش کا جو چاہے کروں۔"

میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "اس کا مطلب ہے کہ ڈاکٹر کا یہ تجربہ بھی ناکام رہا ہے؟"

"یہی کہا جا سکتا ہے ورنہ وہ مجھے کیوں بلاتا۔" اس نے بوتل سے ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "رات کو تیار رہنا... کھانا بھی جلدی کھا لینا... ممکن ہے کام زیادہ لمبا ہو جائے۔"

مجھے کیا تیار ہونا تھا، سامان تیار رکھا ہوتا تھا۔ بس ہمیں ہاتھ گاڑی اٹھا کر نکلنا ہوتا تھا۔ اب مجھے بے چینی سے رات کا انتظار تھا اور میں جاننا چاہتا تھا کہ میریا کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ ڈاکٹر کا تجربہ کیوں ناکام رہا ہے؟ وہ تو ہمیں کچھ نہیں بتاتا لیکن میریا کی لاش سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ میں ایک بار پھر اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ رات ہوتے ہی ہم تیار ہو کر نکل کھڑے ہوئے۔ اس روز بھی خاصی سردی تھی۔ میرا واحد کوٹ پھٹنے کے قریب ہو گیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ایک نیا کوٹ لے لوں۔ اسٹارک ہاتھ گاڑی خود چلاتا تھا۔ اس رات بھی وہ خود ہاتھ گاڑی چلا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ الجھا ہوا ہے۔

ڈاکٹر کے گھر کے سامنے پہنچ کر وہ رکا پھر اس نے گیٹ میں ہاتھ ڈال کر اسے کھول دیا۔ حسب معمول ہم سامنے کے بجائے عقبی حصے سے اندر گئے۔ اجاڑ سے صحن میں اسٹارک نے ڈاکٹر کی تجربہ گاہ کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھل گیا اور مُردہ نما ڈاکٹر ولکوونس سامنے کھڑا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر اشارے سے اندر آنے کو کہا۔ اسٹارک نے ہاتھ گاڑی صحن میں چھوڑ دی اور میرے ساتھ اندر داخل ہوا۔

سامنے میز پر میریا کی لاش ایک چادر تلے ڈھکی رکھی تھی۔ لاش کے سینے پر عین دل کی جگہ چادر میں ابھار سا تھا۔ جیسے کوئی چھ سات انچ کی چیز لاش کے سینے میں پیوست ہو۔ ڈاکٹر نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے لے جا کر کسی قبر میں دفنانا ہے۔"

"تم بے فکر رہو..." اسٹارک لاش کی طرف بڑھا۔

ڈاکٹر نے اسے روک دیا اور درشت لہجے میں بولا۔ "تم میری بات غور سے سنو... اسے لازماً کسی قبر میں دفن کرنا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھ سے جو لاشیں لے کر جاتے ہو انہیں کسی اور کو بیچ دیتے ہو لیکن اس لاش کو بیچنا نہیں ہے۔"

"میں سمجھ گیا جناب!" اسٹارک نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

www.pkdigest.com

"ہاں، ایک بات اور۔" ڈاکٹر نے کہا اور لاش پر سے چادر الٹ دی۔ میں ابھی تک سینے پر نظر آنے والے اس ابھار کے بارے میں متجسس تھا لیکن جب ڈاکٹر نے چادر الٹی تو یہ دیکھ کر مجھے دھچکا لگا کہ میریا کے سینے میں ایک نکیلی لکڑی پیوست تھی۔ اس کا چھ سات انچ کا حصہ باہر تھا، باقی اس کے جسم میں اترا ہوا تھا۔ ڈاکٹر ولکوونس نے اس لکڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے لاش کے جسم سے نہیں نکالنا۔"

"لیکن کیوں جناب...؟"

"سوال نہیں۔" ڈاکٹر کا لہجہ درشت ہو گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ سونے کے سکے نکال کر اسٹارک کو تھما دیے۔ "یہ تمہارے کام کا پیشگی معاوضہ ہے۔ اب اسے لے جاؤ اور آج رات ہی کسی قبر میں دفنا دو... سمجھ گئے؟"

اسٹارک نے سر ہلایا اور آگے بڑھ کر میریا کی لاش اٹھا لی۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اسے مرے چار دن گزر چکے تھے۔ اس کی لاش نہ تو خراب ہوئی تھی اور نہ اکڑی تھی۔ جب اسٹارک نے اسے اٹھایا تو وہ بالکل نرم تھی۔ میں نے سہارا دینے کے بہانے اسے چھو کر دیکھا تو اس کی جلد سرد لیکن بہت نرم تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس خبیث ڈاکٹر نے اس کے سینے میں لکڑی کا یہ خوفناک سا ٹکڑا کیوں گھونپ دیا تھا۔ اسٹارک نے بتایا تھا کہ وہ کسی لاش کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ پھر اس نے میریا کے ساتھ ہی ایسا کیوں کیا؟

میں اور اسٹارک لاش باہر لائے۔ میں نے جلدی سے ہاتھ گاڑی سے ساری چیزیں ہٹا دیں۔ اسٹارک نے میریا کو اس پر لٹا دیا۔ ہم نے سامان اس پر رکھا اور پھر اوپر سے چادر ڈال دی۔ اب پتا نہیں چل رہا تھا کہ ہاتھ گاڑی میں کسی کی لاش ہے۔ میں جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس نے لاش کے ساتھ ایسا کیوں کیا تھا۔ جیسے ہی ہم ڈاکٹر کے گھر سے باہر نکلے، میں نے اسٹارک سے سوال کیا۔

"اس حرامزادے نے میریا کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟"

وہ بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن جواب اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ "مجھے نہیں پتا...... لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ اس بار کچھ الگ ہوا ہے۔ شاید ڈاکٹر کا تجربہ کسی اور طرح سے ناکام ہوا ہے اور اسے میریا کے سینے میں یہ لکڑی گھونپنا پڑی۔"

"مجھے تو یہ اس کی ذلالت لگ رہی ہے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔"

"اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" اسٹارک ہانپتے ہوئے بولا۔ "وہ اتنی دولت اس لیے تو خرچ نہیں کر رہا کہ لاش منگوا کر اس کے سینے میں لکڑی گھونپ دے۔ نہیں... برخوردار... اس معاملے میں کوئی چکر ہے۔"

"ہمیں اس چکر کا کیسے پتا چلے گا؟"

وہ چلتے چلتے رک گیا، میری طرف دیکھا اور درشت لہجے میں بولا۔ "ہمیں معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارا کام صرف لاشیں نکال کر بیچنا ہے... باقی کسی چیز سے ہمیں کوئی مطلب نہیں ہے۔"

اس نے درشت لہجے میں کہا تو میں سہم گیا۔ "میں سمجھ گیا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ پھر ہاتھ گاڑی چلانے لگا.... سردی کی وجہ سے گلیوں میں چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی اور جو لوگ راستے میں ملے، انہوں نے بھی ہم پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ ہم آرام سے قبرستان پہنچ گئے۔ یہ وہی قبرستان تھا جہاں میں نے پہلی بار اسٹارک کے ساتھ کام کیا تھا۔ یہ اس کا پسندیدہ قبرستان تھا اور وہ یہاں کام کر کے خوش ہوتا تھا۔ آسمان صاف تھا لیکن زمین سے اٹھتے کہرے کی وجہ سے ماحول دھندلایا ہوا تھا۔ میں نے سب سے پہلے ایک لالٹین جلائی۔ اس دوران میں اسٹارک نے میریا کی لاش کو گاڑی سے اٹھا کر زمین پر لٹا دیا اور جھک کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی شہزادی سو رہی ہو۔"

"ہاں، یہ بہت خوب صورت تھی۔" میں نے بے دلی سے کہا۔

"یہ اب بھی بہت خوب صورت ہے۔"

"لیکن اس کی خوب صورتی اب کس کام کی؟" میں نے تلخی سے پوچھا۔ "اب یہ ایک لاش ہے۔"

میں نے کہا اور ہاتھ گاڑی سے قبر کھودنے کا سامان نکالنے لگا۔ اسٹارک لاش کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے وہیں سے کہا۔ "ڈاکٹر نے اس کے سینے میں لکڑی کیوں گھونپی ہے؟"

"یہ تم ڈاکٹر سے پوچھو یا اس کے سینے سے لکڑی نکال کر دیکھ لو۔"

پھاوڑا اور دوسرے اوزار نیچے پھینک کر میں مڑا تو میں نے اسٹارک کو پاس کھڑے پایا۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا وہی ٹکڑا تھا جو میریا کے سینے میں اترا ہوا تھا۔ وہ لالٹین کی روشنی میں اس کا قریب سے معائنہ کر رہا تھا۔ میں نے بھی دیکھا کہ یہ لکڑی کا کوئی دس انچ لمبا ٹکڑا تھا جو ایک طرف سے نکیلا تھا... لیکن اس پر خون نہیں لگا تھا۔ اسٹارک نے مایوسی سے کہا۔ "اس میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"تو تم کیا سمجھ رہے تھے... کہ اس میں سے کوئی انوکھی

چیز نکل آئے گی؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "چلو، قبر کھودنا شروع کرو۔"

اسٹارک نے لکڑی کا ٹکڑا ایک طرف پھینک دیا اور اپنی جیب سے شراب کی بوتل نکال کر اس سے ایک گھونٹ لیا۔ وہ کام شروع کرنے سے پہلے لازمی پیتا تھا۔ پھر اس نے پھاوڑا سنبھال لیا۔ "چلو، آج رات رائگاں نہیں گئی۔"

"لیکن الٹا ہو رہا ہے۔" میں پھر ہنسا۔ "اس بار ہمیں لاش نکالنے کا نہیں، دبانے کا معاوضہ دیا جا رہا ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" اس نے پھاوڑا زمین میں مارا۔ "لاش کا خیال رکھنا... یہاں گیدڑ بہت پھرتے ہیں۔"

"تم فکر مت کرو۔" میں نے مڑ کر لاش کی طرف دیکھا اور پھر چونک گیا۔ لاش وہاں نہیں تھی۔ میں بے ساختہ چلا اٹھا۔ "ارے... اسٹارک! لاش غائب ہے۔"

اسٹارک نے دیکھا اور پھاوڑا پھینک دیا۔ "لاش کہاں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔" میں نے آس پاس دیکھا۔ "وہ یہاں نہیں ہے۔"

اسٹارک کو غصہ آ گیا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر دھکا دیا۔ "جا کر اسے تلاش کرو۔"

میں لالٹین لے کر ارد گرد میریا کی لاش تلاش کرنے لگا۔ اسٹارک بھی پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ اچانک مجھے اٹھتی کہر میں کوئی کھڑا نظر آیا۔ میں نے لالٹین بلند کی تاکہ اسے صحیح سے دیکھ سکوں۔ میں نے پکار کر کہا۔ "تم کون ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے لالٹین مزید اونچی کی۔ لباس سے وہ میریا ہی لگ رہی تھی... لیکن میریا تو مر چکی تھی۔ اس کی موت میں کوئی شبہ نہیں تھا کیونکہ کوئی چار انچ لمبی لکڑی میں نے خود اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست دیکھی تھی۔ اب وہ کھڑی تھی۔ میں نے ایک بار پھر زور سے کہا۔ "ارے... کون ہو تم؟"

اب وہ مجھ سے کوئی بیس فٹ کے فاصلے پر پشت کیے کھڑی تھی۔ وہ میریا ہی تھی کیونکہ اس کا لباس وہی تھا۔ میری آواز سن کر اسٹارک بھی آ گیا۔ میریا کو دیکھ کر وہ بھی اچھل پڑا۔ "ارے... یہ زندہ ہو گئی۔"

خوف سے میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ "میم! تم ٹھیک ہو نا؟" میں نے پکار کر کہا۔ وہ اب جھوم رہی تھی اور سر دائیں بائیں گھما رہی تھی۔ اسٹارک نے سرگوشی کی۔

"یہ زندہ نہیں ہے۔"

"اگر یہ زندہ نہیں ہے تو کھڑی کیسے ہے؟" میں نے جوابی سرگوشی کی۔ "میرا خیال ہے کہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

اس نے ہماری آوازیں سن لی تھیں۔ اس نے پہلے سر ہماری طرف گھمایا اور پھر اس کا سر گھومتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس کا منہ ہماری طرف ہو گیا اور جسم ویسے ہی کھڑا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم دونوں کی گھگی بندھ گئی۔ اس کے لمبے بال ہوا سے لہرا رہے تھے۔ پھر جیسے اس کا سر گھوما تھا، اسی طرح اس کا جسم بھی گھوم گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ ہماری طرف بلند کیے اور ایک چیخ مار کر ہماری طرف لپکی۔ یہ دیکھ کر میرا دل رکتے رکتے رہ گیا کہ اس کے پاؤں ہوا میں معلق تھے اور وہ اڑتی ہوئی ہماری طرف آ رہی تھی۔ اسٹارک چلایا۔

"میرے خدا! یہ چڑیل بن گئی ہے... بھاگو۔"

میں اس کے کہنے سے پہلے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ ہمارا رخ ہاتھ گاڑی کی طرف تھا۔ میں آگے تھا، اچانک ہی اسٹارک کی چیخ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میریا یا اس کی چڑیل نے اسٹارک کو عقب سے جکڑ رکھا تھا۔ وہ اس کے منہ پر ناخن مارنے اور اسے دانت سے کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسٹارک اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے عملاً ناچ رہا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ موقع اچھا ہے، میریا اسٹارک کو پکڑے ہوئے ہے اور مجھے اس سے فائدہ اٹھا کر تو دو گیارہ ہو جانا چاہیے۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے پھاوڑا اٹھایا اور ان کی طرف لپکا۔ میریا کا چہرہ اتنا بھیانک ہو رہا تھا کہ اسے دیکھ کر میں ڈر گیا۔ میں اسے پھاوڑے سے ڈرانے لگا لیکن وہ ڈرنے کے بجائے الٹا چلانے لگی۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ اسٹارک سے اس طرح چمٹی ہوئی تھی کہ میں اسے مارتا تو اسٹارک کو بھی پھاوڑے کی ضرب لگ سکتی تھی۔ اس لیے میں اس کے گرد ناچ رہا تھا لیکن کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔ آخر اسٹارک نے اس مصیبت سے خود جان چھڑا لی۔ اس نے کسی طرح میریا کا سر قابو کر لیا اور زور لگا کر اسے گھما کر آگے کی طرف اچھال دیا۔ لیکن وہ زمین پر نہیں گری بلکہ غائب ہو گئی۔ میں اور اسٹارک پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگے۔

"کہاں گئی؟" میں نے چلا کر کہا۔

"مجھے کیا پتا۔" اسٹارک مجھ سے بھی زیادہ زور سے چلایا۔

اسٹارک قبرستانوں کا کیڑا تھا اور میں بھی تین سال سے یہاں آ رہا تھا۔ اس دوران میں ہم نے سیکڑوں راتیں

www.pkdigest.com

قبرستانوں میں بتائی تھیں۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر ہمیں وہاں کوئی بھوت یا چڑیل نظر بھی آجائے تو ہم خوف زدہ نہیں ہوں گے۔ لیکن میریا جس طرح ہمارے سامنے آئی تھی، اسے دیکھ کر ہماری ساری بہادری ہوا ہوگئی تھی۔ ہوا میں اچھالنے کے بعد میریا غائب ہوگئی تھی اور ہم چاروں طرف دیکھ رہے تھے کہ اب وہ کس طرف سے نمودار ہوتی ہے۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور اچانک ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ اسٹارک نے اپنی ہاتھ گاڑی سنبھالی اور اسے لے کر بھاگنے لگا تھا کہ منہ کے بل گرتے گرتے بچا... کیونکہ ہاتھ گاڑی کا اکلوتا پہیا ہی غائب تھا۔ اس کے ساتھ ہی میریا کے قہقہے نے جتا دیا کہ یہ اس کی کارستانی ہے اور وہ ہمیں فرار کا موقع نہیں دینا چاہتی۔ میں لالٹین اٹھا کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی میریا دھند سے نکل کر مجھ پر جھپٹ پڑے گی۔ اسٹارک میری پشت کی طرف تھا تاکہ ہم دونوں طرف دیکھ سکیں۔

میں نے اسٹارک سے کہا۔ ”ہمیں اس مصیبت کو ختم کرنا ہوگا۔“

جب اسٹارک کی طرف سے جواب نہیں ملا تو میں نے گھوم کر دیکھا، وہ غائب تھا۔ میں ہی احمق ثابت ہوا تھا جو اسے بچانے کے لیے پلٹ آیا تھا... اور اسے موقع ملا تو اس نے فرار میں ایک منٹ کی تاخیر نہیں کی تھی۔ اب میں اکیلا تھا۔ میں لالٹین اٹھائے اس کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک مجھے لگا جیسے کوئی چیز برق رفتاری سے میرے سامنے سے گزری ہے۔ میں اس طرف بڑھا ہی تھا کہ مجھے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی۔ میں نے گھوم کر دیکھنا چاہا لیکن اسی لمحے میریا کی چڑیل عقب سے آکر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ کسی کٹ کھنی کتیا کی طرح غرا رہی تھی اور میرے کان پر کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں چلاتے ہوئے خود کو بچانے لگا۔ اس کے پاس سے اتنی گندی بدبو آرہی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ اس کے لمبے اور نکیلے ناخن میرے جسم میں پیوست ہورہے تھے۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی میریا ہے جو مرنے کے بعد بھی اتنی حسین اور نازک اندام لگ رہی تھی۔ جب اسے میرے کان نہیں ملے تو اس نے دانتوں سے میرے لمبے بال پکڑ لیے اور ان کو اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں تکلیف سے چلا رہا تھا۔ اچانک ٹن کی آواز آئی اور میریا میری پشت سے اچھل کر دور جا گری۔ میں نے سنبھل کر دیکھا تو اسٹارک ہاتھ میں پھاوڑا لیے مسکرا رہا تھا۔ اس نے کسی بلے باز کی طرح میریا کو ضرب لگا کر دور اچھال دیا تھا۔ وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہورہی تھی۔

”یہ مر جائے گی۔“ میں نے تشویش سے کہا۔

”یہ مر چکی ہے۔“ اسٹارک بولا۔ ”اب یہ چڑیل ہے۔“

میریا زمین سے اٹھ گئی۔ وہ غرا کر ہماری طرف لپکی تو اسٹارک ایک بار پھر بھاگ کھڑا ہوا۔ میریا نے دور سے چھلانگ لگائی اور مجھ پر آن گری۔ اپنے گندے منہ سے غلیظ رال کے چھینٹے اڑاتے ہوئے وہ اتنے خوفناک انداز میں غرا رہی تھی کہ مجھے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ اس نے میرا گلا دبوچ لیا اور اسے دبانے لگی۔ میں بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ پھر کوئی چیز میرے ہاتھ میں آگئی۔ یہ وہی لکڑی تھی جو اسٹارک نے میریا کے سینے سے نکالی تھی اور ڈاکٹر ولکوونس نے اسے نکالنے سے سختی سے منع کیا تھا۔ اسٹارک نے اس کے باوجود لکڑی نکال لی تھی۔

اس وقت میں میریا کے لیے اپنے سارے جذبات بھول گیا تھا۔ میں نے نفرت سے اسے ”کتیا“ کہا اور لکڑی اس کے سینے میں گھونپ دی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور الٹ کر زمین پر جا گری۔ وہ ساکت ہوگئی تھی اور اس کے وجود سے ابلتی وحشیانہ غراہٹیں بھی رک گئی تھیں۔ میں بڑی مشکل سے کھڑا ہوا۔ اس نے میرا سانس روکنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور میں نے لکڑی مارنے میں چند سیکنڈ کی تاخیر کی ہوتی تو خود مارا جاتا۔ میں اپنا سانس درست کر رہا تھا کہ اچانک اسٹارک نمودار ہوا۔ اس نے زمین پر پڑی میریا کو دیکھا۔

”کیا ہوا اسے؟“

”میں... نے مار... دیا۔“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”اس کے سینے میں وہی لکڑی گھونپ دی جو تم نے نکالی تھی۔“

لالٹین ایک طرف گری ہوئی تھی اور خوش قسمتی سے بجھی نہیں تھی۔ اسٹارک نے لالٹین اٹھائی اور اس کی روشنی میں میریا کا معائنہ کرنے لگا۔ میں ڈر رہا تھا کہ وہ پھر زندہ نہ ہو جائے۔ لیکن جب اسے روشنی میں دیکھا تو وہ مجھے پہلے جیسی معصوم سی میریا نظر آئی۔ اس کی خوفناکی اور بدبو غائب ہوگئی تھی۔ اسٹارک نے لالٹین اس کے پاس رکھی اور اس کے پیٹ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”اس کے دونوں ہاتھ اوپر کرکے مضبوطی سے پکڑ لو۔“ اس نے میرا سوال نظر انداز کرکے حکم دیا۔ ”کچھ بھی ہو جائے، اس کے ہاتھ کسی صورت مت چھوڑنا۔“

میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اسٹارک آگے جھکا اور اس نے میریا کے سینے میں

پیوست لکڑی نکال لی۔ میریا ساکت پڑی رہی۔ میں نے کہا۔ ”یہ مر چکی ہے۔“

”دوست... اس کے ہاتھ مت چھوڑنا۔“ اس نے درشت لہجے میں کہا۔

میں اس کے ہاتھ چھوڑنے والا تھا کہ اس نے ایک بھیانک چیخ ماری اور اس کا چہرہ پہلے کی طرح خوفناک ہوگیا۔ وہ غرانے لگی۔ میں نے چلا کر کہا۔ ”یہ زندہ ہوگئی ہے۔“

اسٹارک کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے لکڑی دوبارہ میریا کے سینے میں اتار دی۔ وہ پھر ساکت ہوگئی اور پہلے کی طرح ہوگئی۔ مجھے لگا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“ میں نے چلا کر پوچھا۔

”بتاتا ہوں۔“ اسٹارک نے کہا اور پھر لکڑی نکال لی۔ میریا ایک بار پھر زندہ ہو کر غرانے لگی۔ اس نے ہاتھوں کو اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ وہ میری گرفت سے نکلتے نکلتے رہ گئے۔ میں نے بدحواس ہو کر کہا۔

”لکڑی مارو... اسے لکڑی مارو۔“

اسٹارک نے ایسا ہی کیا۔ وہ پھر ساکت ہوگئی۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور چلا کر اسٹارک سے کہا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

وہ مسکرایا۔ ”احمق! تم سمجھے نہیں... ہمارے ہاتھ کتنی زبردست چیز لگی ہے۔“

”یہ چیز نہیں، چڑیل ہے۔ اس سے جتنی جلدی جان چھڑالو اتنا ہی بہتر ہوگا۔“ میں نے کہا اور کھڑا ہوگیا۔ ”میں جا رہا ہوں... تم اس سے دل بہلاتے رہو۔“

”رک جاؤ۔“ اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ”احمق، ہم اس سے کما سکتے ہیں۔“

میں رک گیا۔ ”وہ کیسے؟“

”بتاتا ہوں لیکن پہلے اسے گاڑی میں لٹانے میں میری مدد کرو۔“

بادل ناخواستہ میں نے میریا کو گاڑی میں لٹانے میں اس کی مدد کی۔ ہم دونوں نے خیال رکھا تھا کہ کہیں اس کے سینے میں پیوست لکڑی نہ نکل جائے کیونکہ یہ لکڑی ہی اسے مردہ رکھتی تھی۔ میریا کو گاڑی میں لٹانے کے بعد اسٹارک نے گاڑی کا پہیا تلاش کیا جو بڑی مشکل سے ملا تھا اور اس سے بھی مشکل سے گاڑی میں لگا۔ پھر ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستے میں اسٹارک نے کہا۔ ”تم چاہتے ہو ناکہ ولبرٹ کو سبق ملے؟“

”ہاں، مجھے اس کی حرکتوں سے نفرت ہے۔“

اسٹارک ہنسا۔ ”آج اسے ایسا سبق ملے گا کہ وہ پھر اسے کبھی فراموش نہیں کر سکے گا... اگر وہ زندہ رہا تو۔“

اسٹارک کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ”اسے کیسے سبق ملے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”بس تم دیکھتے جاؤ۔“

کچھ دیر بعد ہم ولبرٹ کی رہائش گاہ کے سامنے تھے۔ اسٹارک نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد ولبرٹ نے خود دروازہ کھولا۔ اسٹارک کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ”دوست! تم یقیناً میرے لیے کچھ لائے ہوگے؟“

اسٹارک مسکرایا۔ ”ایسی چیز کہ تم دیکھو تو رقم وصول ہو جائے۔“

”آؤ آؤ... اندر آؤ۔“ اس نے راستہ چھوڑ دیا اور ہم اپنی گندی گاڑی سمیت اس کے سجے ہوئے گھر میں آگئے۔ اسٹارک نے میریا کی لاش گاڑی سے اٹھا کر کاؤچ پر لٹا دی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ولبرٹ کی رال ٹپکنے لگی۔ میں اسٹارک کا منصوبہ سمجھ گیا تھا... میں بھی مسکرانے لگا۔ اسٹارک نے اس سے دس پاؤنڈز کا مطالبہ کیا جو اس نے فوراً ادا کر دیے۔ پھر اس نے میریا کے سینے میں پیوست لکڑی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ کیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ اسٹارک نے رقم جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم چاہو تو ہمارے جانے کے بعد اسے نکال سکتے ہو۔“

وہ ہمیں دروازے تک چھوڑنے آیا اور جیسے ہی دروازہ بند ہوا ہم ہنسنے لگے۔ اسٹارک نے پوچھا۔ ”کیسا لگا میرا فیصلہ؟“

”زبردست!“ میں نے کہا۔ ”اب آئے گا مزہ۔“

اسی لمحے اندر سے ایک خوفناک غراہٹ سنائی دی اور اس کے بعد ولبرٹ کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم فوراً وہاں سے روانہ ہوگئے۔

آج اس بات کو برسوں بیت گئے ہیں۔ اسٹارک ایک لاش نکالتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور اس نے مجھے بھگا دیا تھا۔ دو دن بعد میری آنکھوں کے سامنے اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور اسی دن سے میں نے اس پیشے کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔ صرف پیشے سے ہی نہیں میں نے انگلینڈ کو بھی خیرباد کہہ دیا اور انیسویں صدی کے آغاز پر نئی دنیا یعنی امریکا چلا آیا۔ یہاں میں نے تعلیم حاصل کی اور کہانیاں لکھنے لگا۔ بہت جلد میں ایک مقبول فکشن رائٹر بن گیا۔ میری کہانیاں ہر طبقے میں پسند کی جانے لگیں... لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ میں جو لکھتا ہوں اس میں بہت کچھ فکشن نہیں ہوتا۔

www.pkdigest.com

للکار

ان عاشق پروانوں کا ماجرا جو خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے .. کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ..... سرپھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہے .... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان۔ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے .... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمعِ نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ..... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر ..... ایک للکار ہے۔

تیسری قسط

وہ واقعی ناقابلِ فہم لڑکی تھی۔ اب سلیم کی باتوں سے اس کی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔ مجھے پہلے بھی شک ہوا تھا کہ وہ ہمارے سامنے جان بوجھ کر مختصر ترین لباس میں آئی تھی اور پھر اُس کی حرکات... سب کچھ ایک خاص سمت میں اشارہ کرتا تھا۔

عمران نے سلیم سے نادیہ ایوب کی بڑی بہن کے بارے میں سوالات کیے۔ سلیم نے بتایا۔ ''اسے بڑی میڈم کہتے ہیں۔ اس کی عمر چھوٹی میڈم سے دو تین سال زیادہ ہو گی۔ وہ بھی خاصی اسمارٹ ہے۔ آج کل رئیل اسٹیٹ کا کام چلا رہی ہے۔ اس کے علاوہ...'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

عمران نے کہا۔ ''اس کے علاوہ کے بعد چپ کیوں ہو گئے ہو؟ ہم تو وہی سننا چاہتے ہیں جو اس کے علاوہ ہے...''

سلیم کے چہرے پر تردد کے آثار تھے۔ وہ اپنی

pkdigest.com

پیشانی کی سلوٹوں کو بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”چھوٹی میڈم کی طرح بڑی میڈم کو بھی پرانی چیزوں کا بڑا شوق ہے۔ اُن کے گھر میں بہت سی مورتیاں، تصویریں اور برتن وغیرہ سجے ہوئے ہیں۔ کسی اچھی چیز کے بارے میں انھیں جہاں سے بھی خبر ملتی ہے، وہ وہاں اپنا آدمی بھیجتی ہیں یا خود پہنچ جاتی ہیں۔ اپنے اس شوق پر پیسے خرچ کرنے میں وہ بالکل بھی دریغ نہیں کرتیں۔“

عمران نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو سلیم! ہم ایک دوسرے پر پورا اعتماد کر سکتے ہیں۔ یہاں جو بھی بات ہوگی، وہ بس ہم چاروں کے درمیان ہی رہے گی۔ اس بارے میں تم بالکل بے فکر رہو... میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا میڈم کو صرف پرانی چیزوں کا شوق ہے یا بات اس سے آگے بھی کچھ ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے، ان چیزوں کو ملک سے باہر بھیجنا... اسمگلنگ وغیرہ...“

”ہم... میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا ہیرو بھائی! جہاں تک مجھے معلوم ہے، دو تین بار میڈم نے کچھ چیزیں باہر کے لیے بک تو کرائی تھیں۔ اب مجھے نہیں پتا کہ وہ قانونی طریقے سے بھیجی گئی تھیں یا نہیں...“

”آخر تم وہاں ملازمت کرتے ہو سلیم! اُس چار دیواری کے اندر رہتے ہو۔ تمھیں کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہوگا؟“

”اصل میں ہیرو بھائی! لال کوٹھیوں میں ہر کام بڑی پلاننگ سے ہوتا ہے۔ جس ملازم کا جو کام ہے، وہ اس کے بارے میں جانتا ہے۔ ملازموں کا آپس میں میل جول بھی بالکل پسند نہیں کیا جاتا۔ تنخواہ تو اچھی دی جاتی ہے مگر اس کے ساتھ سختی بھی بہت ہے۔ مثلاً اب مجھے ہی لیں، میری ڈیوٹی چھوٹی میڈم کی کوٹھی میں ہے۔ پچھلے ایک سال میں، میں ایک بار بھی دوسری کوٹھی میں نہیں گیا۔ چھوٹی میڈم کی طرف میری ڈیوٹی کچن میں ہے۔ میں بازار سے سودا سلف لاتا ہوں۔ کوئی پارٹی وغیرہ ہو تو اس کا انتظام بھی کرتا ہوں اور کبھی کبھی خانساماں کا ہاتھ بھی بٹاتا ہوں۔ اردگرد کیا ہوتا ہے، مجھے اس کی کچھ زیادہ خبر نہیں۔ ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ بڑی میڈم سے کچھ اَن جانے لوگ ملنے آتے رہتے ہیں۔ کبھی رات کے وقت کوئی ولر جیپ یا مرسڈیز گاڑی بھی نظر آتی ہے۔ ان میں اکثر پٹھان ٹائپ بندے ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹے قد کا دیہاتی سا شخص اکثر آتا رہتا ہے۔ کافی بڑی پگ ہوتی ہے اس کے سر پر۔ وہ چادر کی بکل مارتا ہے... مجھے لگتا ہے کہ وہ ٹیکسلا یا حسن ابدال کی طرف کا ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اپنے علاقے سے ”اینٹیکس“ وغیرہ لاتا ہو۔“

”ہاں جی، بالکل ہو سکتا ہے۔ اصل میں بڑی میڈم ایسی چیزوں کی منہ مانگی قیمت دیتی ہیں اس لیے بیچنے والے لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ اگر کوئی اچھی چیز ہاتھ لگے تو اس کے سودے کی بات سب سے پہلے بڑی میڈم سے کی جائے۔“

ہمارے اور سلیم کے درمیان تقریباً دو گھنٹے گفتگو ہوئی۔ اس دوران میں کھانے اور چائے سے بھی دو دو ہاتھ ہوئے۔ سلیم کی باتوں سے پتا چلا کہ کل رات ہمارے چلے آنے کے بعد میڈم نادیہ بڑی بے مزہ ہوئی تھی۔ اس نے ملازموں کو آوازیں دی تھیں۔ ان آوازوں کے جواب میں سب سے پہلے سلیم ہی وہاں پہنچا تھا۔ اس نے میڈم نادیہ کے ہاتھ کھولے تھے اور اس کے ہونٹوں پر سے ٹیپ اتاری تھی۔

میڈم نادیہ حیران تھی کہ ہم اس طرح اچانک سب کچھ چھوڑ کر نکل کیوں گئے؟ کیا ہمیں کوئی خطرہ محسوس ہوا تھا یا ہم جس مقصد کے لیے گھر میں داخل ہوئے تھے وہ پورا نہیں ہو سکا تھا؟ ہمارا مقصد کیا تھا، یہ بھی میڈم اور اس کے گارڈز کو ٹھیک سے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ بہرحال، ہوش میں آنے کے بعد میڈم نادیہ نے اپنے ذاتی گارڈز کو خوب خوب ڈانٹ پلائی تھی... خاص طور سے انچارج گارڈ شیرے کو۔ یہ شیرا وہی کسرتی جسم والا چٹا کٹا شخص تھا جس کے ساتھ عمران نے سونی لسٹن والا سلوک کیا تھا۔ مشہور باکسر محمد علی نے ناقابلِ شکست سونی لسٹن کو پہلے ہی راؤنڈ میں آناً فاناً چت کر کے پوری دنیا کے تماشائیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کل رات عمران نے بھی دو تین سیکنڈ کے اندر پہلوان نما شیرے کو دو ٹکروں میں ناک آؤٹ کر ڈالا تھا۔ اس نشست میں سلیم نے میڈم نادیہ کی عجیب و غریب شخصیت کے بارے میں اور بھی کئی باتیں ہمارے گوش گزار کیں۔

رات گیارہ بجے کے قریب سلیم واپس جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے عمران سے وعدہ کیا کہ وہ اس سے رابطہ رکھے گا اور دونوں میڈم بہنوں کے بارے میں اسے جو کچھ بھی مزید معلوم ہو سکا، اس تک پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ عمران کے اس سوال کا جواب وہ یقین سے نہیں دے سکا تھا کہ بڑی میڈم صفورا، اسمگلنگ کے دھندے میں ملوث ہے یا نہیں۔ وقتِ رخصت سلیم نے عمران سے علیحدگی میں بھی مختصر ملاقات کی۔ اس ملاقات میں اس نے یقیناً

عمران سے اپنے سابقہ رویے پر معافی مانگی ہوگی... اسے ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔ عمران کے احسانات کے بدلے سلیم نے اسے رقم کے معاملے میں دھوکا دیا تھا اور تقریباً ایک سال تک اوجھل رہا تھا۔

سلیم کے جانے کے فوراً بعد عمران کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ اس نے اقبال سے کہا۔ ”اس کے پیچھے جاؤ اقبال۔ پتا کرو یہ کہاں جاتا ہے... لیکن ذرا احتیاط سے۔“

اقبال جیسے پہلے ہی سے کسی ایسے اشارے کا منتظر تھا۔ اس نے جلدی سے بوٹ پہنے اور پرس جیب میں رکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

میں حیران تھا اور سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھ رہا تھا۔ اقبال کے باہر جانے کے بعد عمران نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور بولا۔ ”میں سلیم کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔ میرے خیال میں اس نے بتایا کم اور چھپایا زیادہ ہے۔ شاید یہ کچھ ڈر بھی رہا ہے۔“

”اقبال اب کیا کرے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کا پیچھا کرے گا۔ یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ یہ اب کہاں جاتا ہے۔ اگر اس کے گھر کے بارے میں پتا چل سکا تو یہ بھی اچھی بات ہوگی۔“

”اور اگر اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا پیچھا کیا گیا ہے تو؟“

”اقبال کچا کھلاڑی نہیں ہے۔ ایسے معاملوں کا بڑا فائیو اسٹار تجربہ ہے اسے۔ دو سال تک سیالکوٹ پولیس کا انفارمر رہ چکا ہے۔ اس سے پہلے ریڈیو پاکستان میں کام کر چکا ہے... اور ہاں، اس میں ایک بڑی مزے دار صلاحیت بھی ہے۔ آوازوں کی نقل بھی کر لیتا ہے۔ ہر فلمی اور سیاسی ایکٹر کی آواز نکال لیتا ہے اور...“

”یار! میں دوسری بات کر رہا ہوں۔ اگر سلیم کو پتا چل گیا کہ اقبال اس کے پیچھے آ رہا ہے؟“

”میری جان! اس بارے میں بے فکر رہو۔ ویسے بھی وہ زیادہ دیر اس کے پیچھے نہیں رہے گا۔ اگر معاملے نے طول کھینچا تو وہ اپنے کسی اور دوست کو اس کے پیچھے لگا دے گا اور یہ ایسا شخص ہوگا جس کے بارے میں سلیم کچھ نہیں جانتا ہوگا۔“

”فرض کرو کہ اگر کسی طرح سلیم کو پتا چل ہی گیا تو پھر؟ اس طرح تو تمھاری ٹکر سیدھی سیدھی چھوٹی اور بڑی میڈم سے ہو جائے گی۔ سیٹھ سراج سمیت ان سارے لوگوں کو تمھارے ٹھکانے کا پتا بھی چل جائے گا۔ پھر کیا ہوگا؟“

بچت

ایک کنجوس گھنٹا بھر سے بھاٹی گیٹ پر رکشے کے انتظار میں کھڑا تھا۔ آخر اس کی مراد پوری ہوئی اور سامنے سے ایک رکشا آتا نظر آیا۔ کنجوس آدمی نے جلدی سے آگے بڑھ کر رکشے والے سے پوچھا۔ ”ارے بھائی! شالامار باغ کے کتنے پیسے لو گے؟“

رکشے والے نے جواب دیا۔ ”تیس روپے۔“

یہ جواب سن کر کنجوس آدمی خاموشی سے آگے چل دیا۔

رکشے والے نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔ ”آپ ہی بتا دیجیے، آپ کتنے پیسے دیں گے؟“

کنجوس نے کہا۔ ”مجھے تمھارے رکشے میں نہیں جانا ہے۔ میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شالامار باغ تک پیدل جا کر میں کتنے روپے کی بچت کر سکتا ہوں۔“

”وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔“ عمران نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ”یار تابی! ایک تو پتا نہیں تم دور دراز کے اندیشوں میں کیوں کھو جاتے ہو۔ ایک دانشور نے کہا ہے کہ ہماری زندگی کی اسّی فیصد پریشانیاں جھوٹے اندیشوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔“

میں رات پچھلے پہر سو گیا۔ اقبال سے میری ملاقات اگلے روز صبح نو دس بجے کے قریب ہوئی۔ وہ ابھی ابھی اپنی مہم جوئی سے واپس لوٹا تھا اور مطمئن نظر آتا تھا۔ عمران اور وہ دونوں نہاری نان کا ناشتا کر رہے تھے۔ ساتھ میں لسی کے دو بڑے بڑے گلاس تھے۔ ایک گلاس پلیٹ سے ڈھکا ہوا پاس ہی رکھا تھا۔ یقیناً یہ میرے لیے تھا۔ میرا ناشتا بھی پلیٹوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

میں نے منہ ہاتھ دھو کر ناشتے میں شریک ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں بھئی اقبال! کیا رہا تمھاری جاسوسی کا؟“

”سلیم کے گھر کا پتا چل گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ مسلم ٹاؤن کے ایک مکان میں رہتا ہے۔ دس مرلے کی کوٹھی ہے۔ دس بارہ ہزار روپے کرایہ دے رہا ہے۔ موٹر سائیکل بھی رکھی ہوئی ہے۔ لگتا ہے کہ چھوٹی میڈم اچھی تنخواہ دے رہی ہے۔“

”اس کے علاوہ دوسری خاص بات یہ پتا چلی ہے کہ سلیم کی علیک سلیک جنوبی لاہور کے ایک جانے پہچانے گن مین مجید مٹھو سے بھی ہے۔“ عمران نے کہا۔ وہ اس دوسری اطلاع کو زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔

”مجید مٹھو کا نام تو شاید میں نے بھی کہیں سنا ہوا ہے۔

www.pkdigest.com

شاید اخبار میں پڑھا تھا۔ لڑائی جھگڑے یا ڈکیتی وغیرہ کی کوئی واردات تھی۔" میں نے بتایا۔

"ظاہر ہے یار! مجید منظو کا نام کسی مشاعرے یا ادبی کانفرنس کی خبر میں تو آنے سے رہا۔ یہ بیرونِ لاہور کے چند سکہ بند غنڈوں میں سے ہے۔ کل یہاں سے روانہ ہونے کے بعد سلیم سیدھا اپنے گھر مسلم ٹاؤن گیا تھا لیکن راستے میں چند منٹ کے لیے وہ چمن آباد کے علاقے میں بھی رکا۔ یہ مجید منظو کا گھر تھا۔"

"تو کیا اب مجید منظو سے جھگڑا مول لینے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"توبہ توبہ۔" عمران نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "ہم ان کن ٹٹوں سے جھگڑا کر کے اپنی عاقبت کیوں خراب کریں۔ ہم تو اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر بس یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ جن میں خیر سے ہمارے محترم سیٹھ سراج صاحب بھی شامل ہیں، آخر کر کیا رہے ہیں۔ اس گورکھ دھندے کا کوئی سرا ہاتھ آ گیا تو ہم یہ سرا پولیس والوں کو تھما دیں گے اور خود ایک دم الگ ہو جائیں گے۔ ہمارا کام یہ نہیں پیارے... ہمارا کام کچھ اور ہے۔"

"ہمارا کام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا کام ایک دکھیارے دل کی آواز سننا ہے۔ یہ دکھیارا دل خاموشی کی زبان میں فریاد کر رہا ہے، کسی کو پکار رہا ہے... اور جس کو پکار رہا ہے، وہ پتا نہیں کہاں ہے۔ بس اس کو ڈھونڈنا ہے۔" عمران کا لہجہ معنی خیز تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ میرے حالات کی طرف اور ثروت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ثروت کا خیال ذہن میں آتے ہی ایک تیر سا دل میں پیوست ہو جاتا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ایک دبیز اندھیرے کی چادر کھلنے لگتی تھی۔ اس اندھیرے کی دوسری جانب سے وہ مجھے پکارتی تھی... "تم کہاں ہو تابش! دیکھو، وقت ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ میں ہمیشہ کے لیے تم سے جدا ہو رہی ہوں۔ کیا تم اسی طرح مجھے چلے جانے دو گے؟"

بارہ بجے کے قریب عمران اور اقبال دونوں باہر نکل گئے۔ وہ اقبال کی موٹر سائیکل پر گئے تھے۔ عمران نے مجھے کھل کر نہیں بتایا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ سلیم والے چکر میں ہی نکلے ہیں۔ کل رات انہیں معلوم ہوا تھا کہ سلیم اور مجید منظو نامی شخص کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ مزید جاننا چاہتے ہوں۔ میں جوں جوں عمران اور اقبال کو جان رہا تھا، میری حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ اپنی طرز کے انوکھے بندے تھے۔ خاص طور سے عمران تو راہ جاتی مصیبت کو اپنے گلے ڈال کر دلی مسرت محسوس کرتا تھا۔ اپنی خیریت، سلامتی اور زندگی کے بارے میں وہ اتنا بے پروا ہو جاتا تھا کہ سخت حیرت ہوتی تھی۔ اس کے لیے شدید خطرے میں کودنا ایسے ہی تھا جیسے تفریح کے لیے سوئمنگ پول میں چھلانگ لگانا۔ یہ سلسلہ سیٹھ سراج کی وجہ سے شروع ہوا تھا اور سیٹھ کے بارے میں، میں نے ہی عمران کو سب کچھ بتایا تھا۔ اب یہ سلسلہ خود بہ خود ہی ایک خاص سمت میں بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ میرے روکنے سے یہ سب کچھ رکنے والا نہیں تھا۔ ایک بار پھر میرا دل چاہا کہ میں اس ساری صورتِ حال سے الگ تھلگ ہو جاؤں۔ خاموشی سے کہیں نکل جاؤں۔ یہ نہ ہو کہ عمران جس آگ کو ہوا دے رہا ہے، اس کی تپش براہِ راست مجھ تک اور میرے گھر والوں تک پہنچنے لگے۔

عمران اور اقبال کے جانے کے بعد ڈھائی تین گھنٹے تک میں عجیب تذبذب میں رہا۔ اسی دوران میں اقبال کے موبائل پر عمران کی کال آ گئی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ وہ بڑا پُرجوش محسوس ہو رہا تھا۔ "تابی یار! بڑا مزے کا کام ہوا ہے۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ "میں یہاں چمن آباد میں ہوں۔ تم بس فوراً یہاں پہنچ جاؤ۔ یہاں تمہارے لیے ایک بڑے کام کی شے ہے۔"

"کام کی شے؟ میں سمجھا نہیں؟"

"یہاں آ کر سب سمجھ جاؤ گے۔ بس یہ سمجھو کہ اس بندے سے ہمیں ثروت کا کھوج مل سکتا ہے اور یہ بھی پتا چل سکتا ہے کہ اصل میں اُس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔"

ثروت کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ میں نے عمران سے تفصیل جاننا چاہی لیکن ایسے معاملوں میں وہ بکسر چکنا گھڑا ثابت ہوتا تھا۔ بہرحال، اُس کی بات نے میرے اندر بے پناہ تجسس پیدا کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "میری کار کی چابی، سائڈ ٹیبل کی اوپر والی دراز میں ہے۔ گاڑی لے کر فوراً نکل آؤ۔ چمن آباد کے دوسرے گول چکر سے دائیں طرف مڑنا ہے۔ آگے ایک گراؤنڈ آئے گا۔ اس کے بعد..." وہ مجھے پورا ایڈریس سمجھاتا چلا گیا۔

فون پر بات ختم کرنے کے بعد میں چند سیکنڈ شدید الجھن میں رہا۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ عمران ساتھ ہوتا تھا تو مجھے شہر میں گھومتے ہوئے کوئی خاص اندیشہ محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن جب میں اکیلا کہیں نکلنے کا سوچتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ باہر نکلتے ہی سیٹھ سراج کے کارندوں سے ملاقات ہو جائے گی اور

میں کسی سخت مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔

بہرطور، عمران جو کچھ بتا رہا تھا اس کے بعد میرا گھر سے نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس نے ہر طرح تسلی دی تھی کہ وہاں موقعے پر کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ ایسی تسلیاں تو وہ پہلے بھی کئی بار دے چکا تھا اور یہ طفل تسلیاں ہی ثابت ہوئی تھیں... تاہم اب میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کسی طرح کا کوئی رسک ہو بھی تو عمران اس سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیتیں رکھتا ہے۔

میں نے عمران کی کار نکالی اور اس کے بتائے ہوئے ایڈریس کی طرف روانہ ہو گیا۔ بازار کے کئی دکان داروں نے مجھے دیکھ کر سلام کیا۔ وہ اب مجھے اپنے ہیرو بھائی کے مہمان دوست کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ آج میں کئی روز کے بعد ڈرائیو کر رہا تھا۔ سڑکیں، ٹریفک اور لوگوں کی گہما گہمی سب کچھ عجیب لگ رہا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں مطلوبہ ایڈریس پر موجود تھا۔ یہ عام آبادی سے الگ تھلگ بنا ہوا ایک مکان تھا۔ اس کے پچھلی طرف قبرستان تھا۔ سامنے کسی سرکاری دفتر کی سرخی مائل دیوار دور تک چلی گئی تھی۔ میری معلومات کے مطابق یہ منظو نامی غنڈے کی رہائش گاہ تھی۔

اپنی گاڑی کا ہارن بجاتے ہی عمران گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ بالکل مطمئن نظر آتا تھا جیسے اپنے ہی گھر میں مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے موجود ہو۔ گاڑی لاک کر کے میں باہر آیا اور عمران کے ساتھ اندر چلا گیا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ سات آٹھ مرلے کے اس مکان کا نیم پختہ صحن پار کر کے ہم برآمدے میں پہنچے۔ یہاں ایک کتا بندھا ہوا تھا۔ وہ شکل و صورت سے خاصا بیمار نظر آتا تھا۔ اس کے راتب پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ قریب ہی اقبال کی موٹر سائیکل بھی کھڑی تھی۔ ایک کونے میں شراب کی دو خالی بوتلیں اور مرغی کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ منظو یا پھر جو کوئی بھی اس گھر میں رہتا ہے، عورت کے بغیر رہتا ہے۔ یعنی یہاں کوئی ایسی عورت نہیں تھی جو مستقل طور پر اس گھر میں رہتی ہو اور صفائی ستھرائی کا خیال رکھتی ہو۔ عمران نے موٹر سائیکل کی ڈکی میں سے ایک مفلر نما کپڑا نکالا۔ یہ وہی مفلر نما شے تھی جو ہڑپہ میں اور پھر لال کوٹھی میں اپنے چہرے چھپانے کے لیے عمران اور اقبال نے استعمال کی تھی۔

"اس کا کیا کرنا ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے عمران نے اس مفلر نما کپڑے کا ڈھاٹا میرے چہرے پر باندھنا شروع کر دیا۔

ایک منٹ کے اندر اس نے میرا سر اور چہرہ اس طرح چھپا دیا کہ آنکھوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ بولا۔ "فی الحال تمہیں بالکل خاموش رہنا ہے۔ اگر کوئی بات کرنا ہوئی تو مجھ سے مشورے کے بعد کرنا۔"

"لیکن یار! یہ کر کیا رہے ہو؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"یہاں ایک لڑکا ہے۔ وہ اپنا نام رفیق بتا رہا ہے لیکن اس کے پاس سے جو شناختی کارڈ نکلا ہے اس پر قادر نام لکھا ہوا ہے۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ لڑکا ان لڑکوں میں سے ہے جنہوں نے ثروت کو بس اسٹاپ سے اٹھوایا اور بسوں کی فیکٹری میں لے کر گئے۔"

میری دھڑکن میں شدت آ گئی۔ منہ خشک ہوتا محسوس ہوا۔ میں عمران کے ساتھ گھر کے درمیانی کمرے میں پہنچا۔ یہاں ایک چھوٹے دروازے سے دو ڈھائی فٹ چوڑی سیڑھیاں اتر کر نیچے جاتی تھیں۔ یہ ایک تہ خانہ تھا۔ وہاں بلب کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اپنے عین سامنے اقبال نظر آیا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھا تھا اور اپنا سیاہ پسٹل اس نے گود میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے عین سامنے سنگل صوفے پر ایک دوسرا بندہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اپنا سارا خون سر میں چڑھتا محسوس ہوا۔ ایک دم ہی یوں لگا کہ پورے جسم میں انگارے دہک اٹھے ہیں۔ میں اس لڑکے کو کیوں نہ پہچانتا؟ یہ واجی کا ساتھی قادر لمبا تھا۔ یہ اس چنڈال چوکڑی کا رکن تھا جس نے چند ماہ پہلے ثروت کا جینا حرام کیا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ میرا بھی۔ پھر یہ لوگ اس معاملے کو اس حد تک لے گئے تھے کہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ ان کی بدمعاشی نے نہ صرف ثروت کے والدین کی جان لی تھی بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر اچھے امکان کو خاکستر کر دیا تھا۔ قادر لمبے کے چہرے پر ایک نیل نظر آ رہا تھا۔ شاید کچھ دیر پہلے عمران اور اقبال کے ساتھ اس کی ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔ قادر لمبے کو دیکھتے ہی میں طیش اور نفرت کے ایک تند و تیز ریلے میں بہہ گیا۔ عمران نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنی شناخت چھپائے رکھوں اور بولنے کی کوشش بھی نہ کروں۔ لیکن قادر لمبے کو دیکھ کر میں یہ باتیں بھول گیا۔ میں چیل کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔ "حرامزادے... کتے... خنزیر کی اولاد..." میرے منہ میں جو آیا، میں بولتا چلا گیا۔ میرے گھونسوں اور ٹھوکروں نے قادر لمبے کو صوفے سے اچھال کر پختہ فرش پر پٹخ دیا۔ میں اسے مار رہا تھا اور پھنکار رہا تھا۔

www.pkdigest.com

''تم نے مجھے برباد کر دیا... تم نے میری زندگی تباہ کر دی... ثروت کی زندگی تباہ کر دی۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے! اسی جگہ مار کر گاڑ دوں گا۔'' میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی تھی۔

اقبال آگے بڑھا تاکہ قادر لمبے کو مجھ سے چھڑا سکے مگر عمران نے اسے راستے میں روک لیا۔ شاید وہ چاہ رہا تھا کہ اگر میرے ''ہاتھ پاؤں کھل رہے ہیں'' تو انہیں کھلنے دینا چاہیے۔ چند سیکنڈ میں صورتِ حال یہ تھی کہ قادر لمبا دہشت کے عالم میں فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ اس کا رنگ ہلدی تھا۔ میری ٹھوکریں تواتر سے اس کے جسم پر برس رہی تھیں۔

آخر میں ہانپ کر ذرا رکا تو اقبال مجھے اپنی بانہوں میں لے کر کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ میرے چہرے کو ڈھانپنے والا مفلر نما کپڑا ابھی جزوی طور پر کھل گیا تھا۔ اگر اب وہ مکمل طور پر کھل جاتا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اب قادر لمبا مجھے پہچان چکا ہے۔ میں نے وہ کپڑا اتار کر ایک طرف پھینک دیا۔

عمران نے بالوں سے پکڑ کر قادر لمبے کو اٹھایا اور دوبارہ صوفے پر بٹھا دیا۔ قادرے کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اس کی جرسی پھٹ گئی تھی اور قمیص کی بھی بری حالت تھی۔ اپنے خونچکاں چہرے کے ساتھ وہ ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''تو میرا یہ اندازہ درست نکلا کہ یہ حرامزادہ ان غنڈوں میں شامل تھا۔'' عمران نے اطمینان سے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ بدذات، ان سب سے زیادہ کمینہ تھا۔ اس کی ہلاشیری نے ہی اس کتے واجی کے حوصلے بڑھائے تھے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا... مار ڈالوں گا۔'' میں ایک بار پھر اس کی طرف بڑھا۔

اس مرتبہ عمران نے میرا راستہ روکا اور بولا۔ ''یار! اس گدھے کا گلا مروڑنے سے تمہیں کون روکتا ہے... بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ پہلے اس مکروہ کے سارے پر نوچیں، اس کے بعد اس کی گردن مروڑیں۔ لیکن اس کارروائی سے پہلے اس کے منحوس منہ سے کچھ اگلوا تو لیں۔ اگر ہمیں واجی وغیرہ کے بارے میں یہ نہیں بتائے گا تو اور کون بتائے گا؟''

عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ثروت اور اس کے گھر والوں پر قیامت توڑنے کے بعد جب بات تھانے کچہری تک پہنچی تھی تو واجی اور اس کے تینوں دوست اچانک نظر سے اوجھل ہو گئے تھے۔ بعدازاں ان میں سے صرف ایک سامنے آیا تھا مگر یہ وہ لڑکا تھا جو ثروت کے اغوا میں براہِ راست شریک نہیں ہوا تھا۔ مجھے اور ناصر بھائی وغیرہ کو پورا یقین تھا کہ باقی لڑکوں کو سیٹھ سراج نے ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔ ہمارے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید سیٹھ سراج کے سرپرست ایم این اے مشتاق کورایا نے انہیں کہیں اپنی زمینوں پر بھجوا دیا ہے لیکن اب یہ قادر لمبا یہاں ممن آباد کے اس تنہا مکان میں میرے سامنے صوفے پر بیٹھا تھا اور بار بار فرش پر خون تھوک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خوف و ہراس جم کر رہ گیا تھا۔ اقبال تو قادر کے سرہانے کھڑا رہا۔ عمران نے مجھے اشارہ کیا اور میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہاں ایک میز پر تاش کے پتے بکھرے تھے۔ سامنے والی دیوار پر پستول کا خالی ہولسٹر لٹک رہا تھا۔ یہ جگہ واضح طور پر ایک بدمعاش کا ٹھکانا دکھائی دیتی تھی لیکن بدمعاش کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ قادر لمبے پر جھپٹنے اور اسے مارنے کے بعد میرا جسم اب ہولے ہولے لرزنا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے۔ پتا نہیں وہ کیا کیفیت تھی جس کے تحت میں قادر پر پل پڑا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے اعصاب میں دھیرے دھیرے چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ شاید اس کی وجہ میرے سخت ترین حالات تھے اور شاید اس کی وجہ عمران تھا۔ عمران کی موجودگی میں، میں ایک دم اپنی اندرونی کمزوریوں پر غلبہ پالیتا تھا۔

عمران نے مدھم آواز میں کہا۔ ''میں نے تم سے گزارش بھی کی تھی کہ یہاں اپنی شناخت چھپانی ہے۔ اس لیے خاموش رہنا۔ تم نے سب کچھ الٹ کر دیا۔''

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ خبیث کیسے ملا ہے تمہیں؟ اس کے ساتھی کہاں ہیں؟''

''تمہارا دوسرا سوال وائیڈ بال کی طرح ہے۔ اس کا کوئی مطلب نہیں۔ تمہارے پہلے سوال کا جواب میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ میں اور اقبال کل سے اس چکر میں تھے کہ سلیم یہاں مجید مٹھو کے مکان میں کیا کرنے آیا تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں اقبال نے کافی پرچول کی ہے۔ اقبال کا ایک ساتھی کل سے اس مکان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ آج سویرے ہمیں پتا چلا کہ مجید مٹھو گھر کو تالا لگا کر اپنے ایک دوست کے ساتھ رکشے میں بیٹھا ہے اور بادامی باغ کے بس اڈے پہنچا ہے۔ وہاں سے وہ جہلم جانے والی بس پر سوار ہوا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ مٹھو کا گھر اب خالی ہے اور جلد ہی مٹھو کے آنے کا امکان بھی نہیں ہے۔ لہٰذا کچھ دیر پہلے ہم یہاں آن پہنچے۔ پہلے ہم نے ایک ''ماسٹر کی'' سے بیرونی دروازے کا جناتی تالا کھولنے کی کوشش کی لیکن گلی میں اکا دکا راہ گیروں کی وجہ سے یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ ہم مکان کے پچھواڑے گئے اور قبرستان کی طرف سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔ تم نے دیکھا ہی ہو گا، پچھلی دیوار درختوں سے گھری ہوئی ہے اس لیے ہمیں مشکل پیش نہیں آئی۔ پہلے تو ہمیں یہ گھر بالکل خالی لگا مگر پھر تہ خانے کا دروازہ نظر آ گیا اور یہ بھی پتا چل گیا کہ اندر کوئی ہے۔ تھوڑی سی کوشش سے ہم تمہارے اس بدبخت محلے دار قادرے تک پہنچ گئے۔ یہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔ پہلے اس نے بتایا کہ وہ مٹھو کا ملازم ہے پھر کہا کہ دوست ہے۔ اس نے اپنا نام رفیق بتایا لیکن کچھ دیر بعد اس کا شناختی کارڈ مل گیا۔ اس پر قادر ولد امانت علی لکھا ہوا ہے۔ تم نے ثروت کو اغوا کرنے والے جن لڑکوں کا ذکر کیا تھا، ان میں سے ایک کا نام قادر بھی تھا۔ مجھے شک ہو گیا۔ میں نے پوچھ تاچھ کی لیکن اس خبیث نے کچھ بتا کر نہیں دیا۔ پھر میں نے فون کر کے تمہیں بلا لیا۔''

میں نے کہا۔ ''تم بتا رہے ہو کہ گھر کی دیوار پھاند کر یہاں آئے ہو لیکن اب تو دروازہ کھلا ہوا ہے؟''

''وہ ہم نے بعد میں کھولا ہے۔ یہ اس قادر کے پاس گیٹ کی دوسری چابی ہے۔'' عمران نے وضاحت کی۔

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ قادرے کے سامنے آ کر میں کتنی بڑی غلطی کر چکا ہوں۔ میرے جسم کے مساموں سے پسینا پھوٹ نکلا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں قادر لمبے کے سامنے ہی نہیں آیا، سیٹھ سراج، انسپکٹر اشرف اور ایم این اے مشتاق وغیرہ کے سامنے بھی آ چکا ہوں۔ اب وہ سارے خطرات ایک دم زندہ ہو گئے تھے جن سے مجھے یا میرے گھر والوں کو واسطہ پڑ سکتا تھا۔

عمران نے میرے تاثرات بھانپتے ہوئے مجھے حوصلہ دیا اور میرا شانہ تھپک کر بولا۔ ''چلو جو ہو گیا سو ہو گیا... اب فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم اس معاملے کو دیکھ لیں گے لیکن پہلے ہمیں اس قادرے کو نچوڑنا پڑے گا۔''

''نچوڑنا پڑے گا؟'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ مسکرایا۔ ''یار! یہ اپنی خاص لینگویج ہے۔ نچوڑنے کا مطلب ہے کہ اس کے اندر سے باتیں اگلوانی پڑیں گی۔''

''تو تم اس سے مار پیٹ کرو گے؟''

''مار پیٹ تو نہیں... بس تھوڑا سا ڈرائیں دھمکائیں گے۔ وہ جیسے کرکٹ میں بلے باز کو بیک فٹ پر کرنے کے لیے باؤنسر وغیرہ مارے جاتے ہیں۔''

عمران اور اقبال اب بھی بالکل ایزی موڈ میں تھے جبکہ میں خاصا تناؤ محسوس کر رہا تھا۔ جب ہم کمرے میں واپس پہنچے تو اقبال ایک جگ میں سے پانی گرا کر قادر کا منہ دھلوا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور ناک سے مسلسل خون رس رہا تھا۔

عمران نے قادر کے عین سامنے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر کرسی سنبھال لی۔ اس کا چہرہ بدستور مسکرا رہا تھا مگر آنکھوں میں عجیب سی سختی عود کر آئی تھی۔ وہ قادرے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''دیکھو قادر لمبا صاحب! بات یہ ہے کہ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں۔ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے۔ تم واجی کے لنگوٹیے یار قادر ہو اور تم تین چار دوستوں نے مل کر تابش کی منگیتر کو اغوا کیا تھا۔ تمہاری اس بدمعاشی کے جو نتیجے نکلے، وہ سب کے سامنے ہیں۔ اب تم قانون سے بھاگے پھر رہے ہو اور اپنے خلاف کیس کو سخت سے سخت بنا رہے ہو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا حشر بہت زیادہ خراب نہ ہو تو پھر تمہیں اپنے باقی دونوں یاروں کے بارے میں بتانا پڑے گا اور اگر...''

''میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔'' وہ لرزتی آواز میں عمران کی بات کاٹ کر بولا۔

''یہ تم نے کوئی انوکھی بات نہیں کہی۔ ہر چور، ڈاکو ذلیل و خوار ہونے سے پہلے ایسے ہی اقوالِ زریں دہراتا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا، مجھے بے گناہ پھنسایا گیا ہے، میں بے قصور ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر ان سنہری مقولوں پر اعتبار کر لیا جائے تو دنیا میں کوئی بھوتنی کا چور ڈکیت پکڑا نہ جا سکے۔''

''یہ ایسے نہیں مانے گا یار جی! اس کو سیب کھلاؤ۔'' اقبال نے کہا۔

''ہاں، لگتا ہے کہ سیب ہی کھلانا پڑے گا۔'' عمران نے تائید میں سر ہلایا۔

''سیب... کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بھی ہماری خاص لینگویج ہے ڈیئر۔'' عمران نے کہا اور پھر اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں سے ایک سیب نکال لیا۔

گول مٹول سیب کو ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس نے دوسری جیب سے چمک دار چاقو نکال کر کھولا اور بولا۔ ''یہ

www.pkdigest.com

سیب میں تمہیں خود کاٹ کر کھلاؤں گا لیکن میرے کاٹنے کا انداز ذرا دوسرا ہے۔"

قادر ہونقوں کی طرح دیدے پھاڑے بیٹھا تھا۔ میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ عمران نے سیب اقبال کی طرف اچھال دیا۔ اقبال، قادر کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے اچانک سیب قادر کے سر پر رکھا۔ عمران نے تیزی سے اپنے دائیں ہاتھ کو حرکت دی۔ میری نگاہوں میں جیسے برق سی کوند گئی۔ عمران کے دائیں ہاتھ سے جدا ہونے والا لمبے پھل کا چاقو گولی کی رفتار سے قادر کے سر کی طرف گیا۔ چاقو سیب میں گھسا۔ پھر چاقو اور سیب دونوں عقبی دیوار سے ٹکرانے کے بعد اقبال کے قدموں میں لڑھک گئے۔

یہ سارا عمل بس سیکنڈ کے نصف حصے میں مکمل ہو گیا تھا۔ ایسی رفتار تھی کہ قادر اپنی جگہ سے حرکت تک نہیں کر سکا تھا۔ چاقو سمیت سیب کو زمین پر لڑھکتے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ میں بھی ششدر کھڑا تھا۔ یہ عمل ناقابلِ یقین تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بہت سفاک بھی۔ نشانے کی ذرا سی غلطی قادر کو جان لیوا طور پر زخمی کر سکتی تھی۔

میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ بے رحمی سے مسکرا رہا تھا۔

اقبال نے جزوی طور پر کٹا ہوا سیب عمران کو تھما دیا۔ سیب کا جائزہ لینے کے بعد اس نے چاقو سیب میں سے کھینچا اور بولا۔ "اس پر ایک بار اور چاقو چلانا پڑے گا۔ چلو رکھو اسے دوبارہ قادر بیٹے کے سر پر۔"

قادر "بیٹے" کا بُرا حال تھا۔ جب اس نے دوبارہ اپنے سر پر سیب رکھے جانے کی خوش خبری سنی تو ایک دم اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "خبردار!" اقبال اس پر پستول تان کر گرجا۔ "بیٹھ جاؤ... نیچے بیٹھ جاؤ۔" اقبال کی آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ قادر لرز کر بیٹھ گیا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ اقبال نے پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگائی اور پھنکارتے لہجے میں کہا۔ "اس کو خالی خولی دھمکی مت سمجھنا شہزادے! ہم گولی چلانا بھی جانتے ہیں۔ اٹھک بیٹھک کرو گے تو کنپٹی میں تین، آٹھ کا سوراخ ہو جائے گا... اور اس سوراخ میں سے لال لال چیز بہنے لگے گی۔"

"خدا کے لیے... ایسا مت کرو... میں کچھ نہیں جانتا۔ میں جو جانتا تھا تمہیں بتا دیا ہے۔"

"ہم بھی جو جانتے ہیں تمہیں بتا دیا ہے۔ جب اس پستول کا ٹریگر دبایا جائے گا تو تمہاری کھوپڑی شریف میں سوراخ ضرور ہو گا۔ میں گارنٹی دیتا ہوں۔" اقبال نے کہا۔

عمران نے پھر چاقو اپنے ہاتھ میں تولا۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ مجھ پر اس شخص کے نئے نئے گن کھل رہے تھے۔ دو منٹ پہلے اس نے جس طرح قادر پر چاقو پھینکا تھا، وہ کوئی ماہر ترین چاقو باز ہی پھینک سکتا تھا۔ سرکس کے کھیل تماشوں میں خنجر زنی کے ایسے کرتب دکھائے جاتے ہیں لیکن یہ کوئی تماشا نہیں تھا۔ یہ ایک جیتا جاگتا واقعہ تھا اور جس پر یہ واقعہ بیتا تھا، وہ ابھی تک عالمِ وحشت میں لرزاں تھا۔

اقبال نے بڑے اطمینان سے ادھ کٹا سیب دوبارہ قادر کے سر پر رکھا۔ عمران نے چاقو کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہاتھ میں جھلایا مگر اس مرتبہ قادر بیٹھے رہنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ کنپٹی پر پستول ہونے کے باوجود وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ "نہیں... نہیں... ایسا مت کرو۔" وہ گھگیایا۔

اقبال نے کھٹاک سے اس کے سر پر پستول کا آہنی دستہ رسید کیا۔ ضرب زوردار تھی، وہ کراہتا ہوا صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ اقبال نے اس کی گردن اپنے بازو میں جکڑی اور وحشیانہ جھٹکا دے کر بولا۔ "زیادہ پھڑکو گے تو پھر سیب کے بجائے تمہارے سر پر خوبانی یا آلو بخارا رکھیں گے۔ بالکل چپکے بیٹھے رہو۔"

"...میں سچ کہتا ہوں۔ میں نے پچھلے ایک مہینے سے واجی اور اختر کو دیکھا تک نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں، میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا... وہ امیر باپوں کے بیٹے ہیں۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔ ان کی جگہ میں پھنس گیا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے اس لڑکی کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں اس کے زخمی ہونے کا ذمے دار نہیں ہوں۔ میں تو... میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب اس طرح ہو گا۔ میں تو بس واجی کی باتوں میں آ گیا تھا۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ میرا قصور بس یہ ہے کہ میں واجی کا یار تھا۔" ایک دم اس کی آنکھوں سے آنسو جھڑے اور پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ "وہ حرامزادہ واجی بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اس کے لیے بچاؤ کا راستہ نکل آیا ہے۔ جس کا کوئی قصور نہیں، اس کے گلے میں رسّا ڈالا جا رہا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے... کہاں کا قانون ہے؟"

میرا دماغ گھومنے لگا۔ قادر لمبے کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس کا یہ فقرہ تو بالکل ہی ناقابلِ فہم تھا کہ... میں اس کے زخمی ہونے کا ذمے دار نہیں ہوں۔

وہ ثروت کی بات کر رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ کسی نے میرا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہے۔ کیا ثروت کسی وجہ سے زخمی ہو چکی

تھی؟ یہ خیال ہی مجھے دہلانے کے لیے کافی تھا۔ میں گھبرا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟" میں نے کراہتے ہوئے عمران سے پوچھا۔

عمران نے انگلی سے نفی کا اشارہ کیا اور آنکھوں آنکھوں میں مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ شاید مجھے یہ بتا رہا تھا کہ قادر لمبا اپنے اردگرد کے حالات سے بے خبر ہے۔

اگلے دو چار منٹ میں عمران کا یہ اندازہ درست محسوس ہونے لگا۔ قادر لمبا گڑگڑا رہا تھا اور بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ پولیس نے واجی کے وارثوں سے پیسے کھا لیے ہیں اور اسے بے وجہ پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ حد سے زیادہ ڈرا ہوا بھی تھا۔ اس کی باتوں سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ ثروت کے حوالے سے بدترین اندیشے رکھتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ثروت نے خود کو آگ لگا کر اپنی جان لینے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہوئی ہے۔

میرا دل گواہی دینے لگا تھا کہ قادر کی معلومات ناقص ہیں۔ اس کے باوجود یہ صورت حال اتنی گمبھیر تھی کہ میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس گورکھ دھندے کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی خاص مقصد کے تحت کسی نے جان بوجھ کر قادرے کو غلط اطلاعات دے رکھی ہیں اور اسے دہشت زدہ کر رکھا ہے۔

عمران نے اس سے مزید سوال جواب کیے۔ وہ بہت ڈر چکا تھا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ اگلنے لگا۔ عمران کا اہم سوال یہ تھا کہ وہ یہاں مجید منگو کے گھر میں کیسے پہنچا اور اس کے دیگر دونوں ساتھی کہاں ہیں؟

قادرے نے بتایا۔ "میں پھر کہتا ہوں کہ واجی کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں۔ میرے ساتھ صرف شکیل تھا۔ ہمیں پولیس سے بچانے کے لیے انکل سراج نے لال کوٹھی بھجوا دیا تھا۔ لال کوٹھی میں ہم دونوں بڑی میڈم صفورا کے پاس تھے۔ انکل سراج کا خیال تھا کہ ہم پانچ چھ ہفتے یہاں رہیں۔ اس دوران میں مخالف پارٹی سے صلح صفائی کی بات ہو جائے گی۔ مگر پھر ایک دن پتا چلا کہ معاملہ زیادہ بگڑ گیا ہے۔ انکل سراج نے مجھے بتایا کہ تابش کی منگیتر نے اپنے گھر میں خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اس نے خود کو آگ لگائی ہے۔ میو اسپتال میں اپنے بیان میں اس نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی بھی ہوئی ہے اور اسے بس اسٹاپ سے اٹھا کر ویگن میں ڈالنے والوں میں سب سے آگے میں تھا۔ انکل گھبرائے ہوئے لگتے تھے۔ انکل نے مجھے بتایا کہ اب ہمارا بچنا بہت مشکل ہے۔ ہم پکڑے گئے تو بہت لمبی سزا ہونی ہے اور... اور ہو سکتا ہے کہ..." قادر کی آواز بھرا گئی۔ وہ فقرہ مکمل نہیں کر سکا۔

"اچھا پھر کیا ہوا؟" عمران نے چاقو کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"انکل سراج نے کہا کہ اب ہمارا لال کوٹھی میں رہنا ٹھیک نہیں۔ پولیس کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔"

"تو انکل سراج نے تجھے یہاں پارسل کر دیا... مجید منگو کے پاس؟"

"ہاں جی... اب میں پچھلے قریباً دو ہفتے سے یہاں ہوں۔ مجھے اب شکیل کا بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ واجی کی طرح اس کا باپ بھی کھاتا پیتا ہے۔ ہو سکتا ہے، اس کے گھر والوں نے اسے کہیں دبئی یا ابوظہبی کی طرف نکال دیا ہو۔"

قادرے کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک گئے۔ انسان جب کسی مصیبت کے شکنجے میں پھنستا ہے تو کتنا مختلف نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے یاد آیا کہ یہی قادر تھا جس نے واجی کے ساتھ مل کر مجھے اور ثروت کو اسٹیک بار کی پارکنگ میں ذلیل کیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی بڑی بڑی موٹر سائیکلیں میری کار کے پیچھے پارک کر دی تھیں اور ہمیں دیر تک وہاں سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ تب کتنا پھنے خان نظر آ رہا تھا یہ قادرا۔ اب بالکل عاجز بکری بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موت کی زردی تھی اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

اس سارے معاملے میں کوئی بھید نظر نہیں آ رہا تھا۔ ابھی قادرے نے میو اسپتال کا ذکر کیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ ثروت اور اس کے گھر والوں کو ابھی تک لاہور میں مقیم سمجھ رہا تھا جبکہ وہ ڈھائی تین ماہ پہلے جرمنی پہنچ چکے تھے۔

ابھی ہم قادرے سے بات چیت کر ہی رہے تھے کہ میز پر رکھے ہوئے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ قادر چونک گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھا۔ عمران نے کہا۔ "کال ریسیو کرو مگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہیں کرنا..."

اقبال بولا۔ "ورنہ ہم سیب کی جگہ خوبانی بلکہ بیر رکھیں گے تمہارے سر پر۔"

"اور اسپیکر آن کر دو تا کہ ہمیں تمہاری گفتگو سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے۔" عمران نے دوسرا حکم دیا۔

قادرے نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کال اٹینڈ کی اور اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے ایک نرم لیکن بھاری مردانہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو قادر! کیسے ہو؟"

"بس ٹھیک ہوں صدیقی صاحب! آپ نے کہا تھا کہ میں چکر لگاؤں گا جمعرات کو... لیکن آپ آئے ہی نہیں۔"

"بس یار! تمہارے ہی کام میں پھنسا ہوا تھا۔ بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ معاملہ بڑا سنگین ہے۔ لڑکی کی گواہی ہمارے خلاف آ گئی تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا... اور ابھی تو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ بچتی بھی ہے یا نہیں۔"

"آپ... اپنے... کسی ساتھی کا ذکر کر رہے تھے۔"

"ہاں بیرسٹر فیروز خان۔ وہ مجھ سے سینئر ہے اور دوست بھی ہے۔ میں اس سے بھی مشورہ کر رہا ہوں۔ ہم کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گے۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ اللہ رب العزت نے چاہا تو ہم تمہیں گرم ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مصیبت فوراً آ جاتی ہے لیکن جاتے ہوئے کچھ وقت تو لگتا ہے نا۔"

"بس... بس... اب آپ ہی کا آسرا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ آسرا بس اوپر والے کا ہوتا ہے۔ بندے کا کام تو کوشش کرنا ہے۔ کون سی کوشش کامیاب ہوگی اور کون سی نہیں، یہ بس اوپر والے کو پتا ہے۔ بہرحال، تم فکرمند نہیں ہونا اور نہ والدہ اور کنول کو ہونے دینا ہے۔ فون پر بات ہو تو انہیں پوری تسلی دو... اور ایک بار پھر کہوں گا... والدہ اور کنول کے سوا کسی سے بھول کر بھی رابطہ نہیں کرنا۔ پولیس ہر طرف تمہیں سونگھتی پھر رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے جی۔ جیسے آپ کہتے ہیں۔"

"میں ذرا جلدی میں ہوں۔ تمہارے ہی سلسلے میں جا رہا ہوں۔ ایک بڑے خاص بندے سے ملنا ہے۔ کل پھر رابطہ کروں گا... اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ جی!" قادرے نے کہا اور بات ختم کر دی۔

"یہ ذات شریف کون ہیں؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ ابرار صدیقی صاحب بہت بڑے وکیل ہیں۔ بڑی میڈم صفورا کے جاننے والے ہیں۔ میڈم صفورا نے ان سے میری سفارش کر رکھی ہے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ جس طرح بھی ہوا، وہ مجھے اس کیس میں سے نکال لیں گے۔ تسلی تشفی کے فون بھی کرتے رہتے ہیں۔"

"اور یہ کنول؟"

"یہ... میری بہن ہے۔"

"یہ صدیقی صاحب اس کا ذکر کیوں فرما رہے تھے؟"

"دراصل والدہ اور کنول ایک دو بار میرے کیس کے لیے صدیقی صاحب سے ملی ہیں۔ وہ میری والدہ کی بڑی عزت کرنے لگے ہیں۔ ویسے وہ خود بھی نیک بندے ہیں۔ وکالت کے علاوہ دینی کاموں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ انہوں نے کوئی فرم بنا رکھی ہے جس میں بے سہارا لوگوں کو مفت قانونی مدد دی جاتی ہے۔"

"مفت قانونی مدد۔" اقبال نے سر ہلایا۔ "اس لفظ "مفت" میں بڑا جادو ہے بھئی۔ مفت زہر بھی ملے تو ہم لوگ فوراً پھانکنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں... اور جہاں تک صدیقی صاحب کے نیک ہونے کا سوال ہے، اس کے لیے یہ ثبوت ہی کافی ہے کہ وہ تیرے جیسے نیک بندے کا کیس فی سبیل اللہ لڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

قادرے کے ساتھ عمران اور اقبال کی تفتیشی گفتگو جاری تھی اور میری پریشانی لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جذبات کا شکار ہو کر قادرے کے سامنے آ گیا تھا اور اس کا صریح مطلب تھا کہ میں سیٹھ سراج اور دیگر لوگوں کے سامنے بھی آ گیا ہوں۔ اب میرے گھر والوں کے لیے کوئی بھی سنگین خطرہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

عمران میرے ساتھ پہلو کے کمرے میں آیا اور صورت حال کے بارے میں مشورہ کیا۔ عمران بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ قادر لمبے کو بے ہوشی کا انجکشن لگا کر انا منتقل کیا جائے اور پھر گاڑی میں ڈال کر یہاں سے نکال لیا جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ بے ہوشی کا انجکشن اور سرنج وغیرہ اس کی گاڑی میں موجود ہیں۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تمہیں پہلے سے پتا تھا کہ کسی کو بے ہوش کرنا پڑے گا؟"

"دیکھو جگر! ہماری بازی گری کا سارا کام "ججمنٹ" پر ہوتا ہے۔ ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر چھلانگ لگاتے ہوئے، موٹر سائیکل پر کرتب دکھاتے ہوئے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر خنجر چلاتے ہوئے... سب کچھ ججمنٹ پر "ڈی پینڈ" کرتا ہے۔ یہاں بھی بس ایک ججمنٹ ہی تھی کہ شاید ایسا کچھ کرنا پڑے۔"

"لیکن یہ تو بہت خطرناک کام ہوگا۔ سیدھا سیدھا اغوا کا معاملہ بن جائے گا۔"

"میرے خیال میں تو یہ اغوا کا معاملہ نہیں ہوگا... بلکہ ہم ایک اغوا شدہ شخص کو بازیاب کرائیں گے۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"ہمارے ساتھ رہو گے جگر تو سمجھنا بھی سیکھ جاؤ گے۔ مجھے شک پڑ رہا ہے کہ سیٹھ سراج وغیرہ اس بدبخت قادرے کے خلاف ڈبل گیم کھیل رہے ہیں۔ کسی خاص مطلب کے لیے اس کو ثروت کے معاملے میں ضرورت سے

www.pkdigest.com

زیادہ ڈرایا جا رہا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ صدیقی نام کا بندہ بھی سیٹھ سراج کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو۔ وہ قادرے کو اس کیس سے بچانے کا لالچ دے کر اس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو۔“

”نہیں... قادرے کی بہن ہی کا کوئی چکر نہ ہو۔ میرا مطلب ہے صدیقی نے دو تین بار قادرے کی بہن کی بات بھی کی ہے۔“

”ان باتوں کا پتا تو وقت کے ساتھ ہی چل سکتا ہے۔ فی الحال تو فوری طور پر ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم قادرے کو یہاں چھوڑ جائیں یا پھر مہمان بنالیں، اپنے فائیو اسٹار گھر میں۔“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا... اور... مجھے پتا ہے کہ تم میری بات مانو گے بھی نہیں۔“

”دیکھا نا... اب باتیں آہستہ آہستہ تمہاری سمجھ میں آنا شروع ہوگئی ہیں۔“ وہ بڑی ادا سے مسکرایا۔ پھر انگلی سے اپنی کنپٹی کھجا کر بولا۔ ”اچھا ایک کام کرو... دو منٹ کے لیے مجھے اور اقبال کو اکیلے میں مشورہ کرنے دو۔ اس دوران میں تم ذرا اس مصیبت کے پاس رکو۔“ اس نے مجھے پستول دے دیا۔

میں نے روانی میں پستول تھام تو لیا لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بڑی ہوشیاری سے مجھے اپنے نیک کاموں میں شریک کرتا چلا جا رہا ہے۔ آج سے چند روز پہلے میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میں اس طرح ایک بھرا ہوا پستول تھام کر واجی کے ایک بدمعاش دوست کو گن پوائنٹ پر رکھوں گا اور وہ نظریں جھکائے میرے سامنے بیٹھا رہے گا۔

میں عمران کی ہدایت کے مطابق پستول بدست قادرے کے پاس رہا اور دوسرے کمرے میں عمران اور اقبال آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔

کچھ ہی دیر بعد عمران اپنے ہاتھ میں ایک سرنج لیے نمودار ہوا۔ اس کے عقب میں اقبال تھا۔ سرنج دیکھ کر قادرے کے زخمی چہرے پر بہت سے سوالیہ نشان ابھر آئے۔

”یہ ٹیکا لگوا لو۔ تمہارے فائدے کے لیے ہے۔ درد ٹھیک ہوجائے گا اور انفیکشن بھی نہیں ہوگا۔“ عمران نے قادرے سے کہا۔

”نن... نہیں... میں ٹھیک ہوں۔“

”ٹھیک نہیں ہو بیٹا جی۔ دیکھو تمہارا رنگ بالکل پیلا ہو رہا ہے۔ اس سے تھوڑی سی طاقت بھی آئے گی اور تمہارا دماغ بھی اچھے طریقے سے کام کرنے لگے گا۔ اس ایک ٹیکے میں بہت کچھ ہے۔ تمہارے بہت سارے دلدر دور ہوجائیں گے۔ سمجھو ٹیکا نہیں جادو کی چھڑی ہے... چلو شاباش۔“

پستول بدستور اقبال کے ہاتھ میں تھا۔ قادرا جانتا تھا کہ مزاحمت کرے گا تو سر پر پھر پستول کی تکلیف دہ ضرب سہنی پڑے گی۔ اقبال نے اس کی آستین چڑھائی اور عمران نے انجکشن دے دیا۔ دو چار منٹ میں ہی قادرے کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ وہ کچھ دیر بڑبڑاتا رہا۔ پھر صوفے پر ایک طرف کو جھکتا جھکتا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

سارا پروگرام جیسے عمران اور اقبال نے پہلے ہی طے کر لیا تھا۔ عمران نے مجھ سے گاڑی کی چابی لی اور گھر کا گیٹ کھول کر اسے اندر لے آیا۔ بے ہوش قادرے کو اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر اس طرح لٹایا گیا کہ اس کا سر میری گود میں آگیا۔ اس کے اوپر ایک چھوٹا کمبل ڈال دیا گیا۔ اب دیکھنے میں یقیناً یہی لگ رہا تھا کہ ہم کسی بیمار کو اسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ مجید مٹھو کا گھر چھوڑنے سے پہلے عمران اور اقبال نے وہاں اپنی موجودگی کے سارے آثار مٹا دیے۔ جن جگہوں پر فنگر پرنٹس کا اندیشہ تھا، وہاں کی صفائی کردی۔ گھر کی ہلکی پھلکی تلاشی میں انڈین شراب کی چند بوتلیں، ہیروئن کی پڑیاں اور دو رائفلیں بھی نظر آئیں۔ بہرحال، ان اشیا کو جہاں کا تہاں رہنے دیا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم مجید مٹھو کے گھر سے نکل رہے تھے۔ گلی میں اکا دکا افراد نے ہمیں دیکھا لیکن کسی نے بھی خصوصی توجہ نہیں دی۔ قریباً پینتالیس منٹ بعد ہم راوی روڈ میں عمران کے گھر داخل ہوچکے تھے۔

شام کے بعد ہی قادرا مکمل طور پر ہوش میں آسکا تھا۔ اس نے خود کو ایک اجنبی جگہ دیکھ کر واویلا کیا۔ وہ یہ بات جان گیا تھا کہ اسے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کرکے سمن آباد والے مکان سے نکال لیا گیا ہے۔

جب اس کے ہوش کچھ ٹھکانے پر آئے تو عمران نے اسے چائے پلوائی اور اس سے سوالات پوچھنے شروع کیے۔ عمران اس سے ابرار صدیقی نامی شخص کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہ رہا تھا۔ قادرے نے بھرائی ہوئی مسکین آواز میں کہا۔ ”میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ صدیقی صاحب وکیل ہیں۔ ان کا کافی نام ہے۔ جب میں اور شکیل لال کوٹھی میں میڈم صفورا کے پاس تھے، یہ وہاں دو تین بار آئے تھے۔ انکل سراج سے بھی ان کی جان پہچان ہے۔ انہوں نے ڈاڑھی رکھی ہوئی ہے۔ عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہوگی۔“

”میڈم صفورا اور سیٹھ سراج سے اس بندے کا کیا تعلق

ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

”مجھے ٹھیک سے تو پتا نہیں مگر لگتا ہے کہ میڈم صفورا کی طرح صدیقی صاحب کو بھی پرانی چیزوں کا تھوڑا بہت شوق ہے۔ یہی مورتیاں، پرانے برتن اور زیور وغیرہ۔“

”تمہاری والدہ سے صدیقی کی ملاقات کیسے ہوئی تھی؟“ اقبال نے دریافت کیا۔

”میری والدہ اور بہن ایک دو بار لال کوٹھی آئی تھیں، مجھ سے ملنے کے لیے... شاید وہیں پر صدیقی صاحب نے انہیں دیکھا تھا۔“

”اب تم کہتے ہو کہ تمہاری والدہ سے صدیقی کی اچھی جان پہچان ہوچکی ہے؟“

”جی ہاں... میرے خیال میں انکل سراج نے ہی والدہ کو بتایا تھا کہ صدیقی صاحب مجھے اس کیس سے نکالنے میں مدد کرسکتے ہیں۔ اس کے بعد والدہ اور کنول، صدیقی صاحب سے ملنے ان کے دفتر بھی گئی تھیں؟“

”وہ خود کیوں گئی تھیں؟ کیا اس کام کے لیے کوئی مرد نہیں تھا؟“ اقبال نے پوچھا۔

قادرے نے چونک کر اقبال کو دیکھا پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ”اور کون جاتا؟ ایک بھائی کے سوا میرا کوئی اور ایسا نہیں ہے جو یہ بھاگ دوڑ کرسکے۔ وہ بھائی بھی مسقط میں بیٹھا ہوا ہے۔“

عمران نے زہرخند لہجے میں کہا۔ ”اس وقت تو یہی لگ رہا ہے کہ تم دنیا کے مظلوم ترین بندوں میں سے ایک ہو۔ تمہاری آمدن اتنی زیادہ نہیں ہے کہ تھانے کچہریوں کے خرچے برداشت کرسکو۔ تمہیں ناکردہ گناہ کی سزا سے بچانے کے لیے تمہاری بوڑھی والدہ اور جوان بہن کو خود ہی بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی ہے۔ تمہاری اتنی حیثیت نہیں ہے کہ تم بھی شکیل کی طرح جان بچانے کے لیے پاکستان سے باہر جاسکو، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ ساری باتیں تب تمہارے دماغ میں نہیں آئیں جب تم نے ایک غنڈے کا روپ دھارا ہوا تھا... ایک شریف لڑکی کا جینا حرام کیا ہوا تھا اور واجی کے ساتھ مل کر اسے اٹھانے اور بے آبرو کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اگر اس وقت تم اپنی والدہ اور جوان بہن کا خیال کرتے جو اب تمہیں بچانے کے لیے جگہ جگہ دھکے کھا رہی ہیں۔“

قادرے کی جھکی ہوئی گردن بدستور جھکی رہی۔ آج دوپہر والی چوٹوں کی وجہ سے اس کا چہرہ جگہ جگہ سے سوج گیا تھا اور سوزش کے سبب ایک آنکھ تقریباً بند تھی۔ اپنے حلیے کے سبب وہ مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

اقبال نے پوچھا۔ ”تمہیں پتا ہے کہ یہ صدیقی کہاں رہتا ہے؟“

”نہیں، گھر کا تو پتا نہیں... پر ان کا دفتر پرانی انارکلی کی طرف ہے۔ صدیقی لا ایسوسی ایٹس کے نام سے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے، اس وقت وہ اپنے دفتر میں ہوگا؟“

قادرے نے وال کلاک پر نظر ڈالی، ساڑھے آٹھ کا وقت تھا۔ وہ بولا۔ ”ہاں، اگر وہ لاہور سے باہر نہیں گئے تو دفتر میں ہی ہوں گے...“

یہی وقت تھا جب قادرے کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ موبائل فون اب عمران کی جیب میں تھا۔ اس نے فون نکال کر اسکرین کا جائزہ لیا۔ اس پر ”کنول“ کا نام چمک رہا تھا۔ یہ قادرے کی بہن کی کال تھی۔

عمران نے سرسراتے لہجے میں قادرے کو حکم دیا۔ ”چل، کال ریسیو کر... اور خبردار کوئی ہوشیاری نہیں دکھانی۔ اسی طرح بات کر جس طرح مجید مٹھو کے گھر میں کرتا تھا... اور اسپیکر آن کرلے۔“

قادرے کے چہرے پر پریشانی بڑھ گئی۔ اس نے کال ریسیو کی اور اسپیکر آن کردیا۔ ایک جوان نسوانی آواز کمرے میں گونجی۔ ”ہیلو...“

”ہیلو!“ قادرے نے مری مری آواز میں جواب دیا۔

”السلام علیکم قادر بھائی۔“ کنول نے کہا۔

”وعلیکم السلام... کیسی ہو؟“

”بس ٹھیک ہوں۔“

”کیا بات ہے، آج آپ کچھ سست لگ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے؟“

”ہاں ہاں، خیریت ہے۔ بس سر میں ہلکا سا درد تھا۔“

”سردرد پریشانی کی وجہ سے بھی ہوتا ہے بھائی... لیکن اب اللہ نے چاہا تو ہماری پریشانیاں ختم ہوجائیں گی۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اوپر والے نے صدیقی صاحب کو ہمارے لیے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔ وہ دوپہر کو پھر آئے ہوئے تھے۔ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھایا ہے۔ عصر کے بعد گئے ہیں۔ بڑی تسلی دے رہے تھے۔“

قادرا خاموش رہا۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہماری وجہ سے کہہ نہیں پا رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد کنول کی آواز دوبارہ ابھری۔ ”بھائی! آپ میری طرف سے بالکل فکر مند نہ ہوں۔ میں آپ کو یقین

www.pkdigest.com

ولاتی ہوں... میں... صدیقی صاحب... کے ساتھ... میرا مطلب ہے... میں ان کے ساتھ... خوش رہوں گی۔ میں... ان کو بڑی حد تک جان گئی ہوں۔ وہ دل کے بہت بہت اچھے ہیں۔ امی نے چاچا امین کے ذریعے پتا کروایا ہے۔ صدیقی صاحب نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ آٹھ دس سال پہلے ان کی شادی ہوئی تھی۔ دو سال بعد ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اکیلے رہ رہے ہیں۔ بچہ بھی کوئی نہیں ہے۔ خدا ترس اور ہمدرد بندے ہیں۔ علاقے میں ان کی نیک نامی ہے۔"

قادر اب بھی خاموش رہا۔ اس کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا تھا۔ غالباً اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فون بند کر دے مگر ہماری وجہ سے وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا تھا...

"ہیلو قادر بھائی! آپ چپ کیوں ہو گئے؟ کچھ کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"نن... نہیں۔"

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر کنول نے کہا۔ "بھائی! امی بتا رہی تھیں کہ آپ عمر کی بات کر رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ صدیقی صاحب کی عمر تھوڑی زیادہ ہے۔ بھائی! یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں ہے۔ کم از کم میرے لیے تو نہیں ہے۔ میری اور ان کی عمر میں زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کا فرق ہوگا۔ ہمارے ہی خاندان میں دو تین شادیاں ایسی ہو چکی ہیں جن میں میاں بیوی کی عمر میں آٹھ دس سال کا فرق ہے... اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے بھائی کہ صدیقی صاحب نیک اور ہمدرد ہیں۔ ان کی طبیعت میں جو ہمدردی ہے، وہ امی کو اور... مجھے بہت پسند آئی ہے۔"

"اچھا۔ اس بارے میں پھر بات کریں گے۔" قادر بولا۔

"کیا... آپ کے پاس کوئی اور بھی ہے؟" کنول نے پوچھا۔

"نہیں تو... بس ذرا درد ہو رہا ہے سر میں۔"

"اگر زیادہ ہو رہا ہے تو پھر ڈاکٹر کو دکھائیں۔"

کنول کے لہجے میں ایک بہن کی بے تاب محبت تھی۔ دونوں کے درمیان ایک دو جملوں کا مزید تبادلہ ہوا۔ اسی دوران میں قادرے کے فون کی بیٹری جواب دے گئی اور رابطہ ختم ہو گیا۔

صورت حال ایک دم ہی واضح تر ہو گئی تھی۔ ہمارا یہ اندازہ درست نکلا تھا کہ یہ صدیقی نام کا ایڈووکیٹ قادرے کی ماں، بہن کے ساتھ جو والہانہ ہمدردی دکھا رہا تھا، اس کے پیچھے مقصد تھا... اور یہ مقصد تھا قادرے کی بہن۔ قادرے کے نقوش بھی بُرے نہیں تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی بہن خوب صورت رہی ہوگی۔ اس کی یہی خوب صورتی اس صدیقی کو قادرے اور اس کے گھر والوں کے قریب لے آئی تھی۔

یقیناً ایسا ہی تھا۔

قادرا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے ورم زدہ چہرے پر شرمندگی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ بہن جو کچھ بھی کہہ رہی تھی، وہ اپنی جگہ تھا مگر اندر کی حقیقت قادرا بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کی بہن وہی کچھ کر رہی تھی جو حوا کی بیٹی ہمیشہ سے کرتی رہی ہے۔ قربانی دیتی رہی ہے۔ کبھی اپنے باپ اور بھائی کی عزت بچانے کے لیے، کبھی شوہر کو آفات سے نکالنے کے لیے اور کبھی اپنے بچوں کے تحفظ کے لیے۔ اس کے جسم اور اس کی روح کو ناکردہ گناہوں کے کفارے میں ہمیشہ چھیدا گیا ہے۔ اسے ایسی جنگوں کی سزا دی گئی ہے جو اس نے چھیڑی ہی نہیں تھیں۔ اسے ان بداعمالیوں کے عوض قربان گاہوں پر لٹایا گیا ہے جو اس نے کی ہی نہیں تھیں۔ اسے ایسی رسموں کی خاطر آگ میں زندہ جلایا گیا ہے جن کا مقصد صرف مرد کی عظمت کو ثابت کرنا تھا... اور ان سارے مظالم کے حوالے سے عورت کا قصور صرف اور صرف اتنا رہا ہے کہ وہ کمزور تھی اور عورت تھی۔

عمران نے قادرے کی تھوڑی کے نیچے انگلی رکھی اور اس کے جھکے ہوئے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "قادر بیٹا! شرمندہ ہونے کی کون سی بات ہے؟ زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز پیاری نہیں۔ تمہاری جان چھوٹ رہی ہے، اس کے بدلے تمہاری بہن کو ایک بڑی عمر کے عاشق سے شادی کرنی پڑ جائے گی... یہ نقصان کا سودا نہیں۔"

قادرے کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ بے عزتی کا احساس اس کے چہرے کے بگڑے ہوئے نقوش کو اور بھی بگاڑنے لگا۔

"ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو دل سے نہیں لگایا کرتے قادرے صاحب۔" اقبال نے بھی طنز کا زہریلا تیر چھوڑا۔ "یہ ابرار صدیقی تیز طرار بندہ لگتا ہے۔ لمبے چکروں میں نہیں پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار مہینے پاس رکھ کر چھوڑ دے تمہاری بہن کو... اور تم جیسوں کی مائیں بہنیں تو ہوتی ہی اس لیے ہیں۔ تمہارے کارناموں کے بدلے سب سے پہلے ان کو ہی گالی دی جاتی ہے اور کارنامہ جتنا بڑا ہوتا ہے، گالی بھی اتنی بڑی ہوتی ہے۔ تم نے ایک شریف لڑکی کو سڑک سے اٹھایا تھا، اب تمہاری بہن کو بھی کوئی اٹھا رہا ہے... بس طریقے کا فرق ہے۔"

قریباً ایک گھنٹے بعد قادرے کے موبائل کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ موبائل اس وقت چارجر پر لگا ہوا تھا۔ میں نے اسکرین دیکھی۔ اس پر "انکل" کا نام آ رہا تھا۔ دھیان سیدھا سراج کی طرف گیا۔ عمران نے بھی اسکرین دیکھی اور پھر قادرے سے کہا کہ وہ پہلے کی طرح موبائل کا اسپیکر آن کر کے کال ریسیو کرے۔

قادرے نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے سیٹھ سراج کی منحوس آواز ابھری۔ "ہاں بھئی قادر! کیا حال چال ہے؟"

"ٹھیک ہوں جی۔"

"مٹھو کہاں ہے؟"

"وہ تو آج سویرے چلے گئے تھے۔ کہتے تھے ضروری کام ہے۔ کل شام تک آؤں گا۔"

"وہ اپنے صدیقی صاحب نے بھی چکر لگایا ہے یا نہیں؟"

"نہیں، آئے تو نہیں۔"

"بس وہ تمہارے ہی کم میں پھنسا ہوا ہے۔ بڑی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ کل عدالت وچ بھی پیش ہوا تھا۔ نہ پیش ہوندا تو تم کو جج نے اشتہاری بنا دینا تھا۔ بہت چنگا اور پیا بندہ ہے صدیقی۔ بغیر لالچ کے کم کرنے والے ایسے لوک تھوڑے ہی ہوندے ہیں۔"

سیٹھ سراج نے دو چار منٹ صدیقی کی تعریفیں کرنے میں صرف کیے۔ وہ قادرے کو باور کرا رہا تھا کہ فی الوقت اس کا اور اس کے گھر والوں کا نجات دہندہ یہ صدیقی ہی ہے۔ سیٹھ کی آواز اسپیکر سے نکل کر کمرے میں گونج رہی تھی۔ اقبال اپنے موبائل پر اس کی آڈیو ریکارڈنگ کرتا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ابرار صدیقی کے ساتھ ہونے والی گفتگو بھی اپنے موبائل میں محفوظ کی تھی۔

سیٹھ سراج کی باتوں سے عیاں تھا کہ ابھی تک کسی کو کانوں کان یہ خبر نہیں ہے کہ قادرے کو مجید مٹھو کے سمن آباد والے مکان سے اٹھایا جا چکا ہے۔

سیٹھ سراج سے قادرے کی بات ختم ہوئی تو عمران گہری سوچ میں نظر آ رہا تھا۔ اس نے قادرے سے پوچھا۔ "وہاں مٹھو کے مکان میں تمہارے پاس کون کون آتا رہا ہے؟"

"دو تین بار صدیقی صاحب آئے ہیں۔ پھر چھوٹی میڈم کا ایک ملازم سلیم بھی آتا رہا ہے۔"

"اور یہ تمہارا انکل سراج؟"

"یہ بھی ایک بار آیا تھا، سلیم کے ساتھ ہی۔"

عمران کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ وہ اقبال کی طرف بہ غور دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابرار صدیقی سے بات کر لو گے؟"

"اگر تم چاہتے ہو تو ضرور کروں گا۔" اقبال بولا۔

عمران نے قادرے کے ہاتھ سے اس کا موبائل فون لیا۔ ہم تینوں قادرے کو وہیں چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی گئی۔ گھر کے ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اقبال نے اپنا موبائل میز پر رکھا اور اس میں ریکارڈ ہونے والی سیٹھ سراج کی آواز کو بہ غور سننے لگا۔ اس نے تین چار بار یہ ریکارڈنگ چلا کر سنی۔ اس کے بعد وہ سیٹھ کی آواز کی نقل کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ صرف ایک دو بار کی کوشش سے وہ کافی حد تک سیٹھ سراج کی آواز سے ملتی جلتی آواز نکالنے لگا۔ وہ اپنے لب و لہجے کو بھی سیٹھ کے لب و لہجے سے ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کسی اداکار کی طرح سیٹھ سراج کے بولے ہوئے فقرے چند بار دہرائے اور مجھے ششدر کر دیا۔ اسے اس کام میں ساٹھ ستر فیصد کامیابی ہوئی تھی۔ آڈیو ریکارڈنگ سے تو اس کو مدد مل ہی رہی تھی، وہ ایکسیڈنٹ والی لڑائی میں سیٹھ کی LIVE آواز بھی سن چکا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ عمران کی ہدایت کے مطابق ابرار صدیقی کو فون کر رہا تھا۔ اس کال کے لیے وہ قادرے والا فون ہی استعمال کر رہا تھا۔ اس نے ابرار صدیقی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ابرار کی آواز ابھری۔ "ہیلو!"

"ہیلو! صدیقی صیب... میں آپ کا خادم بول رہا ہوں جی، سراج احمد۔"

"اوہو، سراج بھائی تم؟ یہ تو قادرے کا نمبر ہے۔"

"بس میں ادھر آیا ہوا تھا قادرے کے پاس۔ میرے پاس بیلنس ختم ہے اس لیے قادرے کے فون سے کر رہا ہوں۔ ہور سناؤ جی، کیا حال چال ہے؟" اقبال نے کھانستے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے سراج بھائی، تمہاری آواز کچھ بدلی ہوئی ہے۔ زکام لگ گیا ہے؟"

"زکام اور کھانسی دونوں ہی۔ کل رات بس اچار گوشت کھا لیا تھا۔"

"کل؟ کل تو تم رات کو بھٹی صاحب کے بیٹے کے ولیمے پر تھے... وہاں تو ون ڈش تھی۔"

اقبال ذرا گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ "نہیں، بعد میں گھر جا کر تھوڑا سا چکھ لیا تھا۔ اور سناؤ جناب! کب تک انتظار کرواؤ گے۔ کوئی خوش خبری وغیرہ سناؤ جی ہم کو بھی۔" اقبال نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا۔ غالباً اس نے کوشش کی تھی

www.pkdigest.com

کہ ابرار صدیقی اپنی نجی زندگی کے بارے میں کچھ بتائے۔

ابرار صدیقی نے کہا۔ ”یار! کیا بتاؤں تمہیں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ تمہیں فون کروں۔ تمہاری اس خوش خبری کو تو لاہور سے باہر لے جانا پڑا ہے... جہلم میں۔“

”وہ کیوں؟“ اقبال نے پھر اندھیرے کا تیر چلایا۔

”بس یہاں کچھ خطرہ لگ رہا تھا۔ رات کو کوٹھی کے آس پاس کچھ مشکوک بندے گھومتے دیکھے گئے تھے۔ پھر اس کسٹم والے عابد شاہ کا فون آ گیا۔ اسے کسی نے مخبری کی تھی کہ میرے پاس ایک ”پیس“ آیا ہے... بڑی اسپیشل چیز ہے۔ میں نے سوچا کہ اب ”مال“ پر گندی نظریں پڑنا شروع ہو گئی ہیں اس لیے اسے یہاں سے نکال لینا چاہیے۔“

”تو اب کہاں رکھا ہے؟“ اقبال نے سیٹھ سراج کے لہجے میں ٹوہ لی۔

”وہیں جہلم میں۔“ ابرار صدیقی نے گول مول جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی بولا۔ ”تمہاری آواز صاف نہیں آ رہی۔ کچھ گونج رہی ہے...“

اقبال نے ایک بار پھر کھانسنا شروع کیا۔ ”بس طبیعت ذرا خراب ہے۔ اچھا ٹھیک ہے، کل پھر بات کریں گے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ خدا حافظ۔“

”رب راکھا۔“ اقبال نے سراج کے انداز میں کہا اور فون بند کر کے گہری سانس لی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

عمران نے اسے انگوٹھا دکھا کر اشارہ دیا کہ اس نے اچھی ایکٹنگ اور صداکاری کی ہے۔

اقبال نے سراج کی آواز میں بات کرتے ہوئے خوش خبری کا ذکر کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس لفظ کو سن کر شاید صدیقی اپنی ”عاشقانہ مصروفیت“ کا کوئی ذکر کرے۔ یہ بات تو اب ثابت ہو چکی تھی کہ وہ قادرے کی بہن کنول میں دلچسپی لے رہا ہے۔ بہرحال صدیقی نے ”خوش خبری“ کے لفظ سے کوئی اور مطلب لے لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ خوش خبری تو اس نے لاہور سے جہلم پہنچا دی ہے کیونکہ یہاں کچھ لوگ اس کے بارے میں باخبر ہو چکے تھے۔

عمران نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ ”ہاں جگر! کیا اندازہ لگایا ہے تم نے؟“

”میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم دونوں خود کو خواہ مخواہ کی مصیبت میں پھنساتے چلے جا رہے ہو... اور مجھے یہ کوئی چھوٹی مصیبت نہیں لگتی۔“

”مصیبت کوئی بھی چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی یار... بندے کی سوچ اسے چھوٹا بڑا بناتی ہے۔ ذرا غور کرو، وہی بلے باز جو تو بے تک آسانی سے اسکور بنا لیتا ہے... بعد کے دس اسکورز کو ایک بڑی مشکل سمجھنے لگتا ہے اور سنچری کا آخری اسکور تو اس کے لیے پہاڑ بن جاتا ہے۔ حالانکہ وہی پچ ہوتی ہے، وہی باؤلرز اور وہی سب کچھ۔ ثابت یہ ہوا کہ ہماری سوچ ہی کسی کام کو مشکل یا آسان بناتی ہے۔“

میں منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ اقبال سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ہاں، تم بتاؤ... تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟“

اقبال نے تھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے کہ صدیقی نوادر کی بات کر رہا تھا۔ ”پیس“ کا لفظ یہ لوگ عام طور پر نادر چیزوں کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں۔ شاید صدیقی کے پاس کوئی بہت خاص الخاص شے ہے جسے وہ بہت سنبھال کر رکھنا چاہتا ہے۔ اس شے کو حفاظت کی خاطر اس نے لاہور سے جہلم منتقل کر دیا ہے۔“

”ہاں، بات تو سمجھ میں آ رہی ہے۔ صدیقی، میڈم صفورا اور سراج سے ملتا ہے۔ یقیناً وہ بھی نوادرات میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تم نے خوش خبری کی بات کی تو اس کا دھیان فوراً اس نادر شے کی طرف کیوں چلا گیا؟“

”ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اس شے کو کسی بھاری قیمت پر فروخت کرنا چاہ رہے ہوں۔ صدیقی نے خوش خبری والی بات کو اسی بیک گراؤنڈ میں دیکھا ہو یا پھر اس سے ملتی جلتی کوئی اور بات ہو۔“ اقبال نے کہا۔

”یہاں مغز ماری کرنے کے بجائے کیوں نہ قادرے سے پوچھا جائے۔“ عمران نے خیال ظاہر کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم ایک بار پھر قادرے کے پاس پہنچے اور ان نئی معلومات کے حوالے سے اس سے سوال جواب کیے۔ وہ اس بارے میں تو کچھ نہیں بتا سکا، تاہم اس سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ جہلم میں فردوس پلازا نامی بلڈنگ کے اندر صدیقی کا ایک شان دار فلیٹ ہے۔

صدیقی کے بارے میں عمران نے کرید کرید کر قادرے سے کچھ مزید معلومات بھی حاصل کیں۔ ان معلومات کا خلاصہ قادرے کے مطابق یہ تھا کہ ابرار صدیقی صاحب ایک نہایت دین دار، پرہیزگار اور ہمدرد انسان ہیں۔ لوگوں کی فلاح و بہبود کے کام کرتے ہیں اور انہوں نے بے سہارا لوگوں کو فی سبیل اللہ قانونی امداد فراہم کرنے کے لیے ایک باقاعدہ فرم بنا رکھی ہے۔

اس ابرار صدیقی کے بارے میں اب تک ہم اتنا سن چکے تھے کہ اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی۔ اپنی آواز اور لب و لہجے کے اعتبار سے وہ کافی ورکنگ قسم کا شخص محسوس ہوتا تھا۔ ایسا شخص جو اپنی قوتِ گفتار سے کسی کو بھی قائل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے دیکھا کہ عمران اور اقبال کہیں جانے کے لیے تیار ہیں۔ وہ ناشتا کر چکے تھے اور میرا ناشتا حسبِ معمول ڈھکا ہوا رکھا تھا۔ تھرماس میں چائے موجود تھی۔ ”کہاں کا ارادہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جہلم۔“ عمران نے ترت جواب دیا۔ ”آج اور کل کام سے (سرکس سے) چھٹی ہے۔ سوچا کہ ذرا آؤٹنگ ہو جائے گی۔ تم ناشتا کر لو۔“

”میں بعد میں کر لوں گا۔“

”بعد میں... کیا مطلب؟ گاڑی میں کرو گے؟“

”میں کہیں نہیں جا رہا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”تو پھر ہم بھی کہیں نہیں جا رہے۔“ عمران نے دھوپ کا چشمہ اور پی کیپ اتار کر ایک طرف رکھ دی۔

”کیا کوئی زبردستی ہے؟“

”بس یہی زبردستی ہے کہ ہم بھی نہیں جائیں گے۔ ہمارے نہ جانے سے سیٹھ سراج کا جتنا فائدہ ہوگا، اس کے تم ہی ذمے دار ہو گے۔“

”مجھے سیٹھ کے فائدے نقصان سے کچھ لینا دینا نہیں۔ بھاڑ میں جائے وہ اور اس کے چیلے چانٹے۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں صرف ثروت کو ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ شاید تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکو گے لیکن اب پتا چل رہا ہے کہ تمہاری بس اپنی دلچسپیاں ہیں۔ میں کسی ایسے کھیل کا حصہ بننا نہیں چاہتا۔“ میں نے کڑوے کسیلے لہجے میں کہا۔

”یار! ایک تو تم بدگمان بہت ہو۔ اگر تمہارے ساتھ میری تھوڑی سی بے تکلفی اور ہوتی نا، تو میں نے تمہاری اس خوب صورت ناک پر گھونسا مار دینا تھا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بالکل بے خبر بیٹھا ہوا ہوں؟ مجھے تمہارے اندر کی حالت کا کچھ پتا نہیں؟“

”دیکھنے میں تو ایسے ہی لگتا ہے۔“ میرا موڈ بدستور آف تھا۔

وہ فلم اسٹار محمد علی کے انداز میں بولا۔ ”دیکھ لو دنیا والو۔ یہ ہے وفاؤں کا صلہ۔ یہ میرا دوست ہے۔ میری جان ہے... میرا جگر ہے... اور آج... آج اس بھری عدالت میں یہی مجھ پر بے وفائی کا الزام لگا رہا ہے۔ مجھے اپنے دکھ درد سے نا آشنا سمجھ رہا ہے۔ اتنے بڑے الزام کا سامنا کرنے سے بہتر ہے کہ میں خود اپنی جان لے لوں... اپنی زندگی دے کر اپنی سچائی ثابت کر دوں۔ لا نا یار اقبال! کہاں ہے میرا پستول؟“

اقبال نے مسکراتے ہوئے... تکیے کے نیچے سے پستول نکالا اور عمران کی طرف اچھال دیا۔ عمران نے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اسے کنپٹی سے لگایا... مگر پھر ٹریگر دبانے سے پہلے اس کا چیمبر کھول کر دیکھا اور غصے سے اقبال کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”یار! بڑے بے وقوف ہو تم... اس میں تو پوری گولیاں ہیں۔ کم از کم دو تین گولیاں تو نکال لو۔ کچھ نہ کچھ چانس تو باقی رہے۔ وہ شاہین بے چاری تو بے موت ماری جائے گی۔ پرسوں اس غریبنی کی سالگرہ ہے۔ ایسی خوشی کے موقعے پر اسے میرے قل پڑھنے پڑ گئے تو پھر؟“

”سرکس میں تم سے کہیں اچھے مسخرے موجود ہیں۔ اس فیلڈ میں کوشش نہ ہی کیا کرو تو بہتر ہے۔“ میں نے کہا۔

”دیکھ لو دنیا والو۔ میری برباد زندگی کا تماشا دیکھ لو۔ اب مجھے مسخرہ بھی کہا جا رہا ہے۔“ عمران نے ادا سے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

اقبال مسکراتا ہوا میرے پاس آ بیٹھا۔ ”تابش یار! عمران تمہارے والے کام سے غافل نہیں ہے۔ ساتھ ساتھ تمہارا کام بھی ہو رہا ہے۔“

”کیا ہو رہا ہے میرا کام؟“

”بتاؤ عمران! کیا ہو رہا ہے کام؟“ اقبال نے کہا۔

”نہیں یار! تم ہی بتاؤ۔ میں بولوں گا تو کہے گا کہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ عمران مصنوعی ناراضی کے ساتھ بولا۔

اقبال نے کہا۔ ”حاجی صاحب سے بات چیت ہو رہی ہے۔ عمران تمہیں بتائے بغیر ہی دو دفعہ ان سے مل چکا ہے۔“

”کون حاجی صاحب؟“ میں نے پوچھا۔

”اماں یار! وہی پراپرٹی ڈیلر... جن کو تمہارے ناصر بھائی اپنا مکان بیچنے کی ذمے داری دے گئے ہیں۔ یہ حاجی صاحب بھی عمران کے جاننے والے ہی نکل آئے ہیں۔ وہ اپنے بازار کا چاچا نذیر ہے نا جو اونچا سنتا ہے... وہ حاجی صاحب کا چچیرا بھائی ہے۔ حاجی صاحب کبھی کبھی اس کے پاس آتے ہیں۔ وہیں عمران سے بھی ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ اب حاجی صاحب نے عمران سے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔“

”کیسا وعدہ؟“

www.pkdigest.com

"تمہارے ناصر بھائی کے مکان کا بیعانہ ہو گیا ہے۔ دو تین ہفتے میں مکان کی بے منٹ بھی ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس رقم کا پے آرڈر بنوا کر حاجی صاحب نے جرمنی بھیجنا ہے۔ پے آرڈر کے لیے کوئی اکاؤنٹ نمبر، ایڈریس وغیرہ تمہارے ناصر بھائی مہیا کریں گے۔ بس یہی ناصر بھائی کا سراغ ہوگا..."

میرے سینے میں لہر سی دوڑ گئی۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر امید کی کرن پیدا ہوئی تھی۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ "اگر تم حاجی صاحب سے ملے تھے تو پھر مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"یار! میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن تم ایک دم بے صبرے ہو۔" عمران کا منہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔

"چلو سمجھو کہ مجھے سرپرائز مل گیا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

عمران نے مجھے اس حوالے سے تھوڑی سی تفصیل بتائی۔ یہ تفصیل حوصلہ افزا تھی۔ فون کے سلسلے میں تو ناصر بھائی بے حد احتیاط کرتے تھے۔ اب تک حاجی صاحب کو ان کی جتنی بھی کالز آئی تھیں، وہ کسی نہ کسی پبلک بوتھ سے کی گئی تھیں مگر رقم منگوانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنا کوئی پتا ٹھکانا فراہم کرتے۔

عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بتاؤ، اب ناشتا کرنا ہے اور نکلنا ہے یا پھر ہم بھی رضائیاں لے کر لیٹ جائیں؟"

میں گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس شخص کی مرضی کے خلاف چلنا میرے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ان دونوں نے قادرے کو ایک اندرونی کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد عمران کا ایک ساتھی آصف یہاں آنے والا تھا جس نے ہماری غیر موجودگی میں یہاں رہنا تھا اور قادرے کی دیکھ بھال بھی کرنا تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم مہران کار پر سوار لاہور سے براستہ جی ٹی روڈ جہلم کی طرف جا رہے تھے۔ عمران ڈرائیو کر رہا تھا۔ اقبال اس کے ساتھ آگے بیٹھا تھا۔ میں پچھلی نشست پر نیم دراز تھا۔ ڈیک پر غزل کے بول گونج رہے تھے۔

تم سے الفت کے تقاضے نہ نبھائے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

میرے دل میں درد اتر رہا تھا۔ ثروت کا مکان بک گیا تھا۔ وہ در و دیوار، وہ جھروکے اور وہ سارے دھوپ سائے بک گئے تھے جن میں میری اور ثروت کی محبت رچی بسی تھی۔ اس چار دیواری میں ہماری محبت نے جنم لیا تھا پھر وہ پروان چڑھی تھی۔ پھر وہ ہمارے روئیں روئیں میں سما گئی تھی۔ کتنی بے تابی تھی ہمارے اندر ایک دوسرے کے لیے۔ ہم اپنے ملن کے لیے ایک ایک دن گن گن کر کاٹ رہے تھے اور کئی دفعہ تو یہ بے قراری اتنی بڑھ جاتی تھی کہ ہم دنوں کے بجائے گھڑیاں گننے لگتے تھے۔ عجیب جذباتی انداز میں اس دن کا انتظار کرنے لگتے تھے، جب شہنائیاں گونجنا تھیں۔ جب ڈولی سجنی تھی اور ایک حسین شب کی مانگ میں وصل کے ستارے جھلملانے تھے... لیکن اب وہ سب کچھ بعید از قیاس لگتا تھا۔ ہرا بھرا امکان ایک تاریک دھند کے پیچھے چھپ گیا تھا اور ناپید ہو گیا تھا۔

گاڑی جہلم کی طرف رواں دواں تھی۔ یہ موسم سرما کا آخری دور تھا۔ سنہری دھوپ نشیب و فراز کو روشن کر رہی تھی۔

"وہاں جا کر کیا کرنا ہے؟" میں نے عمران سے پوچھا۔

"فردوس پلازا تلاش کریں گے پھر ابرار صدیقی کے فلیٹ پر پہنچیں گے۔ اس سے چائے پئیں گے اور گرما گرم سموسے کھائیں گے ٹماٹو کیچپ کے ساتھ... پھر واپس آ جائیں گے۔"

"اور اگر سموسے زیادہ گرم ہوئے تو پھر؟" اقبال مسکرایا۔

"تو پھر... تابش تو نہیں کھانے دیں گے۔ ہماری زبانیں تو گرم سرد کھا کر کافی ڈھیٹ ہو چکی ہیں۔"

"دیکھو، میں ایک بات تمہیں صاف صاف بتا دوں۔ میں تمہارے ساتھ تو چل پڑا ہوں لیکن کسی بھی الٹے سیدھے کام میں شریک نہیں ہوں گا۔"

عمران بولا۔ "میرے خیال میں الٹے سیدھے کام سے تمہارا مطلب خطرناک کام ہے۔ اول تو یہ کام خطرناک نہیں ہے اور اگر تھوڑا بہت ہو بھی تو یار... "دو... چھ" والے کھیل سے زیادہ خطرناک کیا ہوگا۔ اور "دو... چھ" تم آسانی سے کھیل چکے ہو۔"

وہ ہر ایسے موقعے پر "دو... چھ" کا حوالہ دیتا تھا اور مجھے چپ کرانے کی کوشش کرتا تھا۔ میں تپ کر کچھ کہنے والا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل ہونے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کی گرل فرینڈ شاہین تھی۔ وہ شاہین سے گپ شپ کرنے لگا۔ وہ اسے ڈنر پر چلنے کا کہہ رہی تھی اور وہ اسے ٹالنے کے لیے بے پر کی اڑا رہا تھا۔ اس نے اسپیکر بھی آن کر دیا تھا تاکہ ہم بھی ان کی گپ شپ سن سکیں۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ آج شام مصروف ہے۔ اداکارہ ریما نے اسے اپنی فلم "اندھی لڑکی" میں ایک خاص الخاص رول دینے کے لیے اپنے گھر بلایا ہے۔

شاہین کی آواز ابھری۔ "ویسے یہ ریما غضب کی آرٹسٹ ہے، اندھی لڑکی کا رول کرنے کے لیے اس نے واقعی اپنی آنکھیں نکلوائیں۔ بھئی واہ! بہت بڑی قربانی ہے فن کے لیے۔"

"آنکھیں کیوں نکلوائے گی وہ؟" عمران نے پوچھا۔

"لو... اگر آنکھیں نہیں نکلوائیں تو پھر تمہیں کیوں کاسٹ کرے گی وہ؟ کیا کوئی اور ڈھنگ کا بندہ لاہور میں نہیں ہے؟"

"ڈھنگ کا بندہ ہوتا تو تم میرے بجائے اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھتیں اور موت کے کنوئیں میں داد وصول کرتیں۔ میرے جیسی بے ڈھنگی موٹر سائیکل پاکستان میں کوئی چلا سکتا ہے؟"

"اتنا بھی اترانے کی ضرورت نہیں۔ بڑے بڑے "اسٹنٹ مین" بھرے ہوئے ہیں فلم انڈسٹری میں... وہاں تمہاری دال گلنے والی نہیں۔"

"مونگ کی دال گلنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی اور ریما جی کو مونگ کی دال بڑی پسند ہے۔"

"لگتا ہے کہ تم بس میرا اور اپنا ٹائم ضائع کر رہے ہو۔"

"بس اپنا... تمہارے پاس تو ٹائم ہی ٹائم ہے۔"

"اچھا... بھاڑ میں جاؤ۔" شاہین نے کال منقطع کر دی۔

وہ دل کش انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کے دانت خوب صورت تھے۔ "اب وہ تین دن روٹھی رہے گی۔ پھر ایک دن گھر سے کوئی اچھا سا کھانا پکا کر لائے گی۔ ایک پلیٹ میں ڈال کر سینڈو کے ہاتھ مجھے بھی بھجوائے گی۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوگا کہ وہ ماننے کے لیے تیار ہے۔ میں جاؤں گا تو وہ مان جائے گی۔"

"بہت خوب!" میں نے کہا۔ "روٹھتی بھی وہ ہے اور کھانا بھی وہ کھلاتی ہے۔"

"ہیرو بننے کے یہی تو فائدے ہوتے ہیں جگر۔" وہ ادا سے بولا۔

میں نے نشست پر کشن کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا تم واقعی اس سے پیار کرتے ہو یا بس وقت گزاری ہے؟"

"سچ بتاؤں؟"

"چلو آج یہ کام بھی کر گزرو۔" میں نے کہا۔

"وقت گزاری۔" وہ میری آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ان لمحوں میں پہلی بار مجھے اس کی دل کش آنکھوں میں عجیب سا کرب کروٹ لیتا محسوس ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے اندازہ ہوا کہ عمران کی ہنستی کھیلتی، قہقہے بکھیرتی زندگی کے پیچھے ایک پردہ ہے اور اس پردے کے عقب میں ایک دردناک کہانی چھپی ہے۔

مگر عمران کی آنکھوں کا یہ تاثر بس چند لمحے ہی قائم رہا، اس کے بعد وہی شوخی ایک ریلے کی طرح اس کی آنکھوں میں بہنے لگی۔

... جس وقت ہم جی ٹی روڈ سے اتر کر جہلم شہر میں داخل ہوئے، دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ ایک اچھے ہوٹل سے ہم نے لنچ کیا۔ وہیں سے ہمیں فردوس پلازا کا پتا بھی چل گیا۔ عمران نے مجھے یقین دلایا تھا کہ فی الحال وہ صرف سروے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ پلازا دیکھیں گے اور ابرار صدیقی کے فلیٹ کا بیرونی جائزہ لے کر واپس آ جائیں گے۔ پھر بھی سابقہ تجربوں کی بنا پر میرے ذہن میں شک موجود تھا۔ میں نے عمران سے کہا کہ میں ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا ہوں، وہ چکر لگا کر آ جائیں مگر وہ مجھے ساتھ لے جانے پر مصر رہا۔

ہم شہر کے گنجان علاقے سے گزر کر نسبتاً کشادہ سڑکوں پر آ گئے۔ جلد ہی عمران کو فردوس پلازا کی سبز عمارت نظر آ گئی۔ یہ پانچ منزلہ بلڈنگ یقیناً حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ نیچے دکانیں، اوپر دفاتر اور اس سے اوپر لگژری فلیٹس تھے۔ عمران نے کار پلازا سے قریباً پچاس میٹر دور سڑک کے کنارے روکی۔ اس سے پہلے کہ مزید تحقیق شروع ہوتی، ایک منظر نے اگلی نشست پر بیٹھے اقبال کو بُری طرح چونکا دیا۔ وہ پلازا سے نکلنے والے ایک سانولے سے شخص کو دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور اس کے بال گھنگریالے تھے۔ اپنی چرمی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے...... وہ باہر نکلا اور ایک پرانے ماڈل کی سوزوکی کار میں آ بیٹھا۔

"یہ مجید مٹھو ہے۔" اقبال نے پورے وثوق سے کہا۔

"دیکھ لو۔ کہیں دھوکا نہ ہو رہا ہو۔" عمران بولا۔

"دیکھ لیا ہے یار... سو فیصد وہی ہے۔" اقبال کی آواز میں جذباتی لرزش تھی۔

"پھر پیچھا کریں اس کا؟"

"بالکل کرنا چاہیے۔" اقبال نے جواب دیا۔

مجید مٹھو روانہ ہوا تو ہماری مہران کار اس کے پیچھے چل پڑی۔ یہ مجید مٹھو وہی کن ٹٹا تھا جس کے سمن آباد میں واقع گھر سے عمران اور اقبال نے قادر لمبے کو نکالا تھا... غالباً عمران اور

www.pkdigest.com

اقبال کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ یہاں فردوس پلازا پر پہنچتے ہی مجید مٹھو سے ملاقات ہو جائے گی۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے جہلم کی مختلف سڑکوں سے گزرنے لگیں۔ یہاں ٹریفک زیادہ تھا اور سڑکوں کی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ قریباً دس منٹ بعد مٹھو کی گاڑی ایک کوٹھی میں داخل ہو گئی۔ ہم کوٹھی کی نیم پلیٹ پڑھتے ہوئے سامنے سے گزر گئے۔ کوٹھی کا نمبر 100 تھا اور یہ کسی چودھری منصب علی کی ملکیت تھی۔ کچھ دور جا کر ہم نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور کوٹھی سے کچھ فاصلے پر چند دکانوں کے سامنے رک گئے... اقبال قریبی شاپ سے الائچی سپاری پان لے آیا۔ ہم پان چباتے ہوئے صورتِ حال پر غور کرنے لگے۔ مجید مٹھو کے یہاں ہونے کا مطلب یہ تھا کہ صدیقی وغیرہ سے اس کا براہِ راست تعلق ہے۔ ممکن تھا کہ جو نادر شے لاہور سے یہاں جہلم پہنچائی گئی تھی، مجید مٹھو اسی کے سلسلے میں یہاں پہنچا ہو۔

اچانک مٹھو کی نیلی کار پھر کوٹھی سے نکلتی دکھائی دی۔ عمران کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ مٹھو اتنی جلدی یہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ اقبال نے ابھی پان والے سے بقایا پیسے بھی لینے تھے۔ تاہم یہ ستر اسّی روپے اس کو گفٹ کرتے ہوئے ہم پھر نیلی کار کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ مٹھو نے ایک جگہ رک کر گاڑی میں "سی این جی" ڈلوائی۔ ایک ورکشاپ کے اندر جا کر کسی سے ملا اور باہر آیا۔ یہ لکڑی کی ورکشاپ تھی۔ جب مٹھو ورکشاپ سے باہر آیا تو اس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان بھی تھا۔ نوجوان کا چہرہ افسردہ تھا۔ لگتا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ مٹھو اسے سمجھانے والے انداز میں کچھ بول رہا تھا۔ پھر اس نے نوجوان کا کندھا تھپکا اور اسے واپس ورکشاپ میں بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ شہر کے جنوبی حصے کی طرف چل دیا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے مختلف سڑکوں پر بھاگ رہی تھیں...

اچانک عمران بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ اس باندر کو شک ہو گیا ہے۔"

"ہاں لگ تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔" اقبال نے تائید کی۔

ہم دیکھ رہے تھے کہ مجید مٹھو کی گاڑی یونہی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ وہ چند بغلی سڑکوں پر بھی مڑا۔ عمران نے درمیانی فاصلہ کافی بڑھا دیا مگر لگتا تھا کہ اب فاصلہ بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اقبال بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ اس خبیث نے ایک دم کہیں غائب ہو جانا ہے۔ تم اب اس کے قریب ہی رہو تو بہتر ہے۔"

عمران خود بھی شاید یہی سوچ رہا تھا۔ اس نے رفتار بڑھا دی۔ نیلی کار کی رفتار بھی ایک دم بڑھ گئی۔

دونوں گاڑیاں تیزی سے آگے پیچھے بھاگتی اور مختلف سڑکوں سے گزرتی مضافاتی علاقے میں آ نکلیں۔

"مجھے لگتا ہے یہ باندر وقت گزار رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے موبائل پر اپنے مددگار بلا لیے ہوں۔" عمران نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن ابھی تک کوئی نظر تو نہیں آیا۔" اقبال نے عقب میں اور دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں مٹھو کی نیلی کار نے ایک شارپ ٹرن لیا اور جی ٹی روڈ کی طرف جانے والی سڑک پر چڑھ گئی۔ یوں محسوس ہوا کہ مٹھو کے ذہن میں کوئی خاص منزل ہے۔ شاید وہ ہمیں اس طرف لے جا رہا تھا جہاں اسے مدد مل سکتی تھی۔ اس امر کا امکان تھا کہ اس سڑک پر آگے جا کر مٹھو کے ساتھی موجود ہوں۔

عمران نے کار کی رفتار ایک دم بہت بڑھا دی اور مٹھو کی کار کے برابر آ گیا۔ میرے جسم میں سنسناہٹ پھیل رہی تھی اور دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ وہی ہو رہا تھا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ یہ دونوں سرپھرے ایک بار پھر راہ جاتی مصیبت کو گلے کا ہار بنا رہے تھے اور میری بدقسمتی تھی کہ میں بھی ان کے ساتھ گاڑی میں موجود تھا۔ میں نے اس وقت کو کوسا جب میں ہوٹل کا نیم گرم لاؤنج اور ٹی وی وغیرہ کو چھوڑ کر ان فدائی فوج داروں کے ساتھ چل پڑا تھا۔ عمران کی ہمیشہ مسکراتی آنکھوں میں اب وہی سرد جارحیت نظر آتی تھی جس کا مشاہدہ میں پہلے بڑے پیمانے پر زلیخا کے ہاں اور پھر لاہور رحمن آباد میں مٹھو کے مکان میں کر چکا تھا۔

عمران کے اشارے پر اقبال نے مجید مٹھو کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے رفتار کم کرنے کے بجائے اور تیز کی تو اقبال نے اپنی جیکٹ میں سے پستول نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی عمران نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے مٹھو کی کار کو سائڈ ماری۔ مٹھو کی کار بُری طرح لہرائی اور سائڈ کے کھیت میں جا کر تھوڑا سا گھوم گئی لیکن وہ پھر بھی رکا نہیں۔ جس طرف کو گاڑی کا رخ ہو گیا تھا، وہ اسی طرف کو بھگاتا چلا گیا۔ عمران نے بھی اس کے پیچھے گاڑی ناہموار کھیت میں ڈال دی۔ یہ تقریباً سنسان جگہ تھی۔ گہری ہوتی شام میں بس اِکّا دُکّا راہ گیر نظر آتے تھے۔ دونوں گاڑیاں کھیت میں دوڑتی چلی گئیں۔

مٹھو کھیت میں سے نکل کر دوبارہ ایک چھوٹی سڑک پر آ گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے کھیت سے نکل آئے۔ یہ

ریس بڑی اندھا دھند ثابت ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائیونگ میں عمران کی زبردست مشاقی بھی مجھ پر کھل رہی تھی۔ میں خود بھی بڑی اچھی ڈرائیونگ کر لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دل ہی دل میں اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہو رہا تھا۔ سڑک کی دونوں طرف تاریک پہاڑیاں تھیں، جہلم شہر کی روشنیاں دور عقب میں دکھائی دے رہی تھیں۔ عمران نے کئی خطرناک موڑ تیز رفتاری سے کاٹے لیکن ایک لمحے کے لیے بھی یہ خطرہ محسوس نہیں ہوا کہ گاڑی اس کے کنٹرول سے باہر ہو گی۔

جلد ہی اس نے پھر مٹھو کی گاڑی کو جا لیا۔ "اس کا ٹائر پھاڑ دوں؟" اقبال نے اپنے کولٹ پسٹل پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، ابھی ویسے ہی کوشش کرتے ہیں۔" عمران نے کہا۔

اب ایک بار پھر دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو دوڑ رہی تھیں۔ عمران نے اوورٹیک کرنے کے بجائے مٹھو کی گاڑی کو دبانا شروع کیا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ گاڑی کی رفتار کم کرنے اور اسے روکنے پر آمادہ ہو جائے لیکن مٹھو بھی شاید آخری حد تک مزاحمت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے بجائے اچانک ہماری گاڑی کو زوردار سائڈ ماری۔ یہ بڑی اندھا دھند حرکت تھی۔ دونوں گاڑیوں کی سائڈوں کے تصادم سے زوردار آواز پیدا ہوئی۔ شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا ابھرا۔ عمران تو کسی طرح گاڑی سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا لیکن جس نے ٹکر ماری تھی، وہی اپنی گاڑی سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ موڑ پر اس کی گاڑی بُری طرح لہرائی۔ کسی پتھر سے ٹکرا کر گھومی اور پھر نشیب کے کمزور درختوں کو توڑتی ہوئی تاریکی میں جا گری۔

یہ سنسنی خیز منظر تھا۔ چھوٹی سی بل کھاتی سڑک بالکل تاریک اور سنسان تھی۔ عمران نے گاڑی کو بریک لگائے اور وہ بیس تیس میٹر آگے جا کر رک گئی۔ ہم تیزی سے باہر نکلے اور نشیب کی طرف لپکے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس شاید ٹوٹ چکی تھیں، صرف عقبی بتیوں کی مدھم سی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ گاڑی تیس چالیس فٹ نیچے الٹی حالت میں پڑی ہے۔

عمران کے ہاتھ میں ٹارچ تھی، وہ سب سے پہلے نیچے اترا۔ اس کے عقب میں اقبال تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پسٹل میں صاف دیکھ سکتا تھا۔ "احتیاط سے عمران! ہو سکتا ہے، وہ باہر نکل آیا ہو۔" اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

میں اقبال کے بالکل پیچھے تھا۔ جس سڑک پر سے مٹھو کی گاڑی گری تھی، یہ کسی گاؤں کی طرف جانے والی پتلی سی سڑک تھی۔ دور تک کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم احتیاط سے چلتے آگے بڑھتے رہے اور گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔ پیٹرول کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سائڈ کی دونوں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے تاہم اپنی جگہ پر موجود تھے۔ عمران نے ٹارچ روشن کی۔ مجید مٹھو اندر اوندھی گاڑی میں اوندھا پڑا نظر آیا۔ وہ بے حرکت تھا۔ اقبال نے ایک پتھر کی مدد سے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کو کھڑکی سے علیحدہ کیا اور اندر ہاتھ ڈال کر دروازہ کھول دیا۔ مٹھو کو کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ اس کام میں، میں نے بھی مدد کی۔ وہ خاصا وزنی اور ٹھوس جسم والا تھا..... بہ ظاہر اسے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ ہم اسے اٹھا کر گاڑی سے تھوڑا دور لائے اور یہی وقت تھا جب میری نگاہوں کے سامنے برق سی چمک گئی۔ مجید مٹھو کے دائیں ہاتھ نے بڑی تیزی سے حرکت کی اور جیکٹ کے نیچے گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں مجھے اس کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔ اتفاقاً اس وقت میں ہی مجید مٹھو کے زیادہ قریب تھا۔ میں نے اضطراری طور پر ٹانگ چلائی۔ میرے وزنی بوٹ کی ضرب مجید مٹھو کے ہاتھ پر لگی... یہ بڑی کارگر ضرب تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ مجید مٹھو نے لیٹے لیٹے مجھے لات ماری۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گیا۔ اسی اثنا میں مٹھو نے اٹھ کر دوڑ لگا دی۔ یقیناً اس سے پہلے وہ مکر کر رہا تھا۔

"رک جاؤ... گولی مار دوں گا۔" اقبال دہاڑا۔

مگر وہ رکا نہیں۔ عمران نے اس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ وہ ڈھلوان پر لمبی لمبی جستیں لگاتا ہوا تیزی سے مٹھو کے قریب پہنچ گیا۔ پھر میں نے اس کے سائے کو ہوا میں جست لگا کر مٹھو کے سائے پر گرتے دیکھا۔ اس نے قریباً پچاس میٹر نیچے مٹھو کو جا لیا تھا۔ میں اور اقبال سنبھل سنبھل کر اترتے اور ان دونوں کے سر پر پہنچ گئے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے مجید مٹھو اور عمران کی لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ مٹھو تکلیف سے بُری طرح کراہ رہا تھا اور عمران کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس کا گریبان تار تار تھا۔

"باندر اس کتے کو اسی کے مظر سے۔" عمران نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اقبال نے مٹھو کا گرا ہوا مظر اٹھایا اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر موڑ کر مضبوطی سے کس دیے۔ اس کے بعد وہ

دونوں اسے کھینچتے ہوئے واپس گاڑی تک لے آئے۔ اقبال نے گاڑی کے اگنیشن میں سے چابی نکال لی اور اس کی عقبی روشنیاں آف کردیں۔ گاڑی کی چھت اور ایک سائڈ بری طرح برباد ہوگئی تھی۔ پٹرول ٹنکی سے بہہ نکلا تھا اور بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

مجید مٹھو دھمکیاں دینے لگا۔ ”تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں برباد کردوں گا تمہیں... تمہارے بچے مار ڈالوں گا۔“

عمران نے عقب سے اس کی گدی پر ایک زوردار ہاتھ مارا۔ چٹاخ کی آواز ابھری اور مٹھو اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ عمران پھنکارا۔ ”تمہیں یہ کس نے کہا ہے کہ ہم تمہیں جانتے نہیں۔ تمہیں جانتے ہیں، اسی لیے تو آج تیری آٹھ دس ہڈیاں توڑ کر کسی کھڈ میں پھینکنے والے ہیں۔“

”ایک ہڈی تو شاید اس کی ٹوٹ بھی گئی ہے۔“ اقبال نے مٹھو کے بازو کو کندھے کے نیچے سے ٹٹولا۔

مٹھو سخت جان ہونے کے باوجود کراہ اٹھا۔ اس کے بازو کو واقعی نقصان پہنچ چکا تھا اور یہ کام حادثے کے وقت نہیں ہوا تھا، تب ہوا تھا جب عمران اور وہ اوپر نیچے پتھروں پر گرے تھے اور دور تک لڑھک گئے تھے۔ عمران نے اچھی طرح مجید مٹھو کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے کچھ کرنسی، چند رسیدیں، موبائل اور سگریٹ کا پیکٹ ملا۔ یہ ساری اشیا مٹھو کے رومال میں باندھ کر ایک طرف رکھ دی گئیں۔ ٹارچ کی مدد سے اقبال نے مٹھو کا گرا ہوا پستول بھی ایک پتھر کے نیچے سے ڈھونڈ لیا۔

اس کے بعد عمران نے الٹی ہوئی گاڑی کی ڈکی کھولی۔ اس میں بڑے بڑے تین شاپروں کے اندر بکرے کا بہت سارا گوشت اور ان کے سری پائے پڑے تھے۔ ”یہ اتنی ساری خوراک کس کے لیے لے جارہا تھا مچھندر؟“ اقبال نے اسے ٹہوکا دے کر پوچھا۔

”تیری بہن کی برات کے لیے۔“ مٹھو ایک دم بھڑک کر بولا پھر اس نے اندھادھند اقبال پر لات چلائی۔ وار خالی گیا اور مٹھو پھسل کر پشت کے بل گرا۔ عمران نے اسے دبوچ لیا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا اور چلانے لگا۔ ”حرامزادو! چھوڑ دو مجھے... میں تمہاری جان لے لوں گا۔ کتے کی موت ماروں گا۔ تم جانتے نہیں ہو مجھے...“

شاید وہ چاہ رہا تھا کہ اس کی یہ آہ و بکا اوپر سڑک تک پہنچ جائے اور وہاں سے اسے کوئی مدد مل جائے لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ گرد و پیش کے ٹیلوں کی طرح اوپر سڑک بھی یکسر تاریک اور خاموش تھی۔ اگر ڈرائیونگ کے دوران میں مٹھو نے اپنے کسی مددگار کو فون کیا بھی تھا تو ہمیں اس حوالے سے کچھ زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ کھیت کراس کرنے کے بعد دونوں گاڑیاں مین روڈ سے ہٹ گئی تھیں اور اب ہم جہاں پہنچ گئے تھے، وہاں کسی کی رسائی خاصی مشکل تھی۔

ڈکی میں گوشت سے بھرے ہوئے شاپروں کے علاوہ کچھ اوزار اور ایک نائیلون کی رسی بھی تھی۔ عمران نے رسی نکالی۔ اس دوران میں اقبال نے کوشش کرکے مٹھو کے منہ میں گاڑی صاف کرنے والا کپڑا ٹھونس دیا تھا اور اس کے گلے کے لاؤڈ اسپیکر کو بے کار کردیا تھا۔ اس کام میں، میں نے بھی اقبال کی مدد کی۔ میرے اس تعاون پر عمران دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ٹانگ چلا کر مٹھو کے ہاتھ سے پستول چھڑایا تھا۔ میری اس کارکردگی کو بھی عمران نے بڑی تحسین کی نظروں سے دیکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ فرصت ملتے ہی وہ اس حوالے سے میری لمبی چوڑی تعریف بھی کرے گا۔

”باندھو اس باندر کو... گاڑی سے۔“ عمران نے بڑے اطمینان سے کہا اور نائیلون کی رسی اقبال کی طرف اچھال دی۔

اقبال نے مٹھو کو گھسیٹ کر گاڑی کے قریب کیا پھر وہ دونوں اسے کار کے دونوں دروازوں کے درمیانی بار سے باندھنے لگے۔ مٹھو طیش کے عالم میں واویلا کررہا تھا۔ اب وہ گلے سے بس غوں غاں کی آوازیں ہی نکال پا رہا تھا۔ جلد ہی ان دونوں نے اسے بیٹھی ہوئی حالت میں گاڑی کے ساتھ کس دیا۔ یہ سارا عمل بس ڈیڑھ دو منٹ میں مکمل ہوگیا تھا۔ میں حیران ہورہا تھا۔ مجید مٹھو اپنے علاقے کا نامی گرامی بدمعاش تھا مگر فی الوقت وہ ان دونوں ”سرپھروں“ کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا تھا۔ وہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ اس سے بدترین سلوک روا رکھے ہوئے تھے۔ خاص طور سے عمران کے لیے یہ سب کچھ ایک دلچسپ کھیل کی طرح تھا۔ سچ کہتے ہیں کہ جو لوگ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لیتے ہیں، ان کے لیے بڑے سے بڑا خطرہ ہیچ ہوجاتا ہے۔

چاروں طرف تاریک سناٹا تھا۔ دائیں طرف ٹیلوں سے آگے کئی میل کے فاصلے پر کچھ مدھم روشنیاں نظر آتی تھیں۔ یہ شاید دریائے جہلم کے کنارے آباد کوئی مچھیروں کی بستی تھی۔ ہوا نہیں چل رہی تھی اس لیے موسم میں زیادہ خنکی بھی نہیں تھی۔ مجید مٹھو کی گاڑی کے اندر سے ہی ایک کمبل نما دھسّا بھی ملا تھا۔ اسے اقبال نے ہموار جگہ پر بچھا دیا تاکہ اس پر بیٹھا جاسکے۔ مجید مٹھو کو باندھنے کے بعد عمران بڑے

www.pkdigest.com

اطمینان سے ایک پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اقبال نے بھی اس کی تقلید کی۔

”ہاں بھئی، میاں مٹھو! اب دوٹوک بات ہوجائے۔“ عمران بولا۔ ”تم نے ہمیں کچھ بتانا ہے یا بس ٹیں ٹیں کی رٹ لگانی ہے۔“

”مجھے تو نہیں لگتا یار... کہ یہ آسانی سے کچھ بتائے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے بھی سیب شیب کھلایا جائے یا پھر کوئی کڑوا بادام۔“

”کیوں نہ سگریٹ پلادی جائے اسے؟“ عمران نے رائے دی۔

”ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ اسے سگریٹ کی کمی بھی محسوس ہورہی ہوگی۔“

”نکالو اس کے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ اور لائٹر... لیکن یار ٹھہرو۔ کیوں نہ سگریٹ کے بجائے آج اس اسپیشل ڈے پر اس میاں مٹھو کو سگار پلایا جائے۔ وہاں، ہماری گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھے ہیں دو سگار۔“ وہ دونوں اپنی اسپیشل لینگویج میں بات کررہے تھے۔

”او کے!“ اقبال نے عمران کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔

وہ چھلانگیں لگاتا ہوا چڑھائی کی طرف گیا۔ پہلے اس نے سڑک کنارے کھڑی اپنی عمران کار کو سڑک سے اتار کر بڑے پتھروں کی اوٹ میں کیا پھر سگار لے کر نیچے آگیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں بھی ”سیب کو سر پر رکھنے“ جیسا کوئی تماشا ہونے والا ہے۔

عمران نے سگار کا کونا توڑ کر اسے لائٹر سے سلگایا۔ چند بڑے کش لیے اور دھواں فضا میں چھوڑا۔ یکایک مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہری دوڑ گئی۔ ٹنکی سے بہنے والے پٹرول کی بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہ پتھریلی اور نیم پتھریلی زمین تھی۔ پٹرول اس میں پوری طرح جذب نہیں ہوا تھا۔ وہ گاڑی کے ارد گرد پھیلا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

عمران آگے بڑھا اور اس نے سلگتے ہوئے سگار کو مٹھو سے دو تین فٹ کے فاصلے پر بڑی احتیاط سے ایک اینٹ نما پتھر پر رکھ دیا۔ اس نے سگار اس طرح رکھا تھا کہ اس کا آدھا حصہ پتھر پر اور آدھا ہوا میں معلق تھا۔ پتھر پر وہ حصہ تھا جو سلگ رہا تھا۔ اب اگر یہ حصہ مسلسل سلگتا رہتا تو چند منٹ میں ہلکا ہوجاتا اور سگار پتھر پر اپنا توازن کھو کر نیچے گر جاتا۔ سگار کے پتھر سے گرنے کے بعد جو کچھ ہوسکتا تھا، وہ بالکل عیاں تھا۔ بلکہ جھپکتے میں یہ گاڑی اور گاڑی کے ساتھ بندھا ہوا مجید مٹھو آگ کی لپیٹ میں آجاتے۔

یہ سب کچھ مجید مٹھو کی سمجھ میں بھی آگیا تھا، لہٰذا وہ اسی طرح پھڑپھڑانے لگا جیسے طوطا پنجرے کے سامنے بلی کو دیکھ کر پھڑپھڑاتا ہے۔ اس نے اتنا زور لگایا کہ الٹی ہوئی گاڑی کا پورا ڈھانچا ہلنا شروع ہوگیا۔ بہرحال، نائیلون کی رسی بہت مضبوط تھی۔ مجید مٹھو کچھ بولنے کی کوشش میں مسلسل غوں غاں کررہا تھا۔ پھر چند سیکنڈ بعد وہ ایک دم شانت ہوگیا۔ یہ بات جیسے اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ تڑپنے پھڑکنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا... اگر وہ آنے والے چند منٹ میں ایک خوفناک صورتِ حال سے بچنا چاہتا ہے تو پھر اسے عمران وغیرہ کی ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔ اس کی تبدیل شدہ کیفیت دیکھ کر عمران نے اقبال کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر مٹھو کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ مٹھو تھوڑی دیر تو واویلا کرتا رہا... پھر قدرے پرسکون ہوگیا۔ وہ واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ اگر اس نے وقت ضائع کیا تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔

عمران نے اس سے کہا۔ ”سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ یہ گوشت سے بھرے ہوئے شاپر کس خوشی میں لے کر جارہے ہو؟“

”یہ مولانا صدیقی صاحب کے ہیں۔ انہوں نے یتیم خانے کے لیے بھیجے ہیں۔ وہیں دینے جارہا تھا۔ وہ ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو صدقہ وغیرہ بھیجتے ہیں۔“

”صدقہ وغیرہ؟“

”یہ تین کالے بکروں کا گوشت ہے جو یتیم خانے کے بچوں کے لیے ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ یقیناً اس کے بازو کی سنگین چوٹ ٹھنڈی ہوچکی تھی اور تکلیف دے رہی تھی۔

”تمہیں یہ کب پتا چلا کہ ہم تمہارا پیچھا کررہے ہیں؟“

”میں یتیم خانے والی سڑک پر مڑ رہا تھا جب مجھے شک ہوا تھا۔ اس کے بعد...“

”ہاں... اس کے بعد؟“

”اس کے بعد میں نے گاڑی کو ادھر ادھر گھمایا اور مجھے پتا چل گیا کہ تم لوگ پیچھے آرہے ہو۔“

”تم نے کسی کو اپنے تعاقب کی اطلاع دی؟“

”مم... میں نے سوچا تھا پر اس کا ٹائم ہی نہیں ملا۔ میں بڑی تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔“

شاید مجید مٹھو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ابھی تک اس کے موبائل پر کسی نے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اگر اس نے اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلایا ہوتا تو وہ اس کے گم ہوجانے کے

بعد رابطہ ضرور کرتے۔

''صدیقی سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''بس... علیک سلیک ہے۔ کسی وقت وہ مجھ سے کوئی کام شام لے لیتے ہیں۔''

''کس طرح کا کام شام؟''

مجید مٹھو نے ڈری ہوئی نظروں سے سلگتے سگار کو دیکھا اور بولا۔ ''انہیں پرانی چیزیں اکٹھی کرنے کا شوق ہے۔ اس کے لیے مردان، سوات اور ٹیکسلا وغیرہ جاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔''

''اور میڈم صفورا سے کیا ناتا ہے تمہارا؟'' عمران نے اچانک سوال کیا۔

مجید مٹھو ایک دم گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ ''دراصل... میری جان پہچان میڈم صفورا سے ہی ہے۔ میڈم صفورا کو بھی پرانی چیزوں کا بہت زیادہ شوق ہے۔ میڈم صفورا کا ملنا جلنا صدیقی صاحب سے تھا۔ اس طرح صدیقی صاحب سے بھی علیک سلیک ہوگئی۔''

''دیکھو میاں مٹھو! تجھے ہر بات کھل کر بتانی پڑے گی۔ یہ سگار تجھے زیادہ ٹائم نہیں دے گا۔ یہ گر گیا تو پھر ہم بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

''مم... میں... کچھ نہیں چھپا رہا تم سے۔'' وہ منمنایا۔

''قادر لمبے کو اپنے گھر میں کیوں چھپایا ہوا ہے تم نے؟'' عمران نے پھر اچانک دھماکا خیز سوال کیا۔

اس مرتبہ مٹھو گھبرا گیا۔ ''کک... کون... قادر؟'' وہ ہکلایا۔

''وہی جس کو سیٹھ سراج نے پہلے میڈم صفورا کی کوٹھی میں چھپایا تھا پھر تمہارے حوالے کر دیا۔''

مجید مٹھو ایک دم خاموش ہوگیا۔ وہ جان گیا تھا کہ ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی بڑی اچھی طرح اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کا واسطہ بڑے خطرناک لوگوں سے پڑا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اونٹ خود کو پہاڑ کے نیچے محسوس کر رہا تھا۔

''دیکھو میاں مٹھو! یہ بات بھول جا کہ بس ٹائیں ٹائیں کر کے اپنی جان بچا لے گا۔ اگر ٹھوس باتیں بتائے گا تو پھر تیرے بچنے کی کچھ امید پیدا ہو سکتی ہے... ورنہ... پکی بات ہے کہ کل ٹی وی پر تیری خبر ضرور چلے گی۔ لاہور کے میاں مٹھو صاحب، تیزی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے جہلم کے پاس ایک کھائی میں گر گئے... اور گاڑی کے ساتھ ہی جل کر بھسم ہو گئے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے فلاں فلاں کو چھوڑا ہے۔''

مجید مٹھو نے پھر خوف زدہ نظروں سے سگار کو دیکھا۔ وہ اینٹ نما پتھر پر رکھا تھا اور کسی ''بارودی فلیتے'' کی طرح مسلسل سلگ رہا تھا۔ ہوا بالکل ساکت تھی۔ سگار کے ہوا وغیرہ سے گرنے کے امکانات تو نہیں تھے مگر وہ ''آن بیلنس'' ہو کر کسی بھی وقت گر سکتا تھا۔

مجید مٹھو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں، پر پہلے اسے یہاں سے ہٹاؤ۔'' اس کا اشارہ سگار کی طرف تھا۔

''اسے ہٹائیں گے تو تم بھی پٹری سے ہٹ جاؤ گے۔ ہاں، یہ کر دیتے ہیں کہ اسے تھوڑا سا آگے کھسکا دیتے ہیں۔'' اس نے آگے بڑھ کر بڑی احتیاط سے سگار کو حرکت دی اور اسے تھوڑا سا مزید پتھر پر چڑھا دیا۔

میں عمران کی اس ''انوکھی ترکیب سازی'' پر حیران ہو رہا تھا۔ ایک عام سے سگار کو اس نے ''ٹائم بم'' کی شکل دے دی تھی اور یہ ٹائم بم مجید مٹھو جیسے بے رحم غنڈے کا پتا پانی کر رہا تھا۔ مجید مٹھو کی اس حالت میں کچھ عمل دخل اس کی جسمانی اذیت کا بھی تھا۔ اس کا دایاں بازو کہنی کے اوپر سے ٹوٹ چکا تھا اور اس کی یہ تکلیف مسلسل بڑھتی جا رہی تھی۔

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مٹھو صاحب! بس مختصر لفظوں میں یہ بتاؤ کہ پرانی چیزوں کی یہ اسمگلنگ کس طرح ہو رہی ہے اور اس میں اور کون کون شریک ہے؟''

''اسمگلنگ؟''

''ہاں ہاں، اسمگلنگ... ہمارے پاس اس سارے کالے دھندے کے ثبوت ہیں۔ بس ہم تمہارے منہ سے سننا چاہ رہے ہیں۔''

مجید مٹھو نے پس و پیش کی۔ وہ انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا لیکن دوسری طرف سلگتی ہوئی موت بھی اس کے سامنے تھی۔ سگار کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا تھا۔ نیکی سے ہلکا ہلکا رساؤ جاری تھا... اور مہلک بو نتھنوں میں گھس کر شدید خطرے کا احساس دلاتی تھی۔

بالآخر مجید مٹھو نے ہتھیار ڈال دیے... اور عمران جو جو کچھ پوچھتا گیا، وہ بتاتا چلا گیا۔ اس کی تیز رفتار گفتگو سے حاصل ہونے والی معلومات کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

صدیقی جسے مٹھو نے ایک دو بار مولانا بھی کہا، میڈم صفورا ہی کی طرح نوادرات میں دلچسپی رکھتا تھا اور ان کا بیوپار بھی کرتا تھا۔ یہ لوگ نادر اشیا کو منہ مانگی قیمتوں پر خریدتے تھے۔ اس کے بعد انہیں ملک سے باہر بھیجتے تھے یا پھر مقامی شوقینوں کو فروخت کرتے تھے۔ میڈم صفورا اور ابرار صدیقی کے درمیان دوستی تھی لیکن وہ کاروباری حریف بھی

تھے۔ کچھ دن پہلے ابرار صدیقی نے ٹیکسلا یا تخت بائی کی طرف سے کوئی نہایت نادر چیز خریدی تھی۔ میڈم صفورا بھی اس شے کی خرید میں دلچسپی رکھتی تھی لیکن اس معاملے میں ابرار صدیقی پہل کر گیا۔ وہ مقامی فروخت کنندہ سے ملا اور اس نے آناً فاناً یہ سودا کر لیا تھا۔ اب وہ شے صدیقی کی تحویل میں تھی۔ پہلے اس نے اسے لاہور میں رکھا تھا لیکن پھر وہاں کسی طرح کا خطرہ محسوس کر کے وہ اسے یہاں جہلم میں لے آیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میڈم صفورا کے علاوہ کوئی اور پارٹی بھی اس قدیم پیس آف آرٹ کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تاہم یہ بھی ہو سکتا تھا کہ صدیقی نے صرف اس چیز کی اہمیت بڑھانے کے لیے اور میڈم صفورا کو زچ کرنے کے لیے یہ تیسری پارٹی والا شوشا چھوڑا ہو۔ میڈم صفورا نے سیٹھ سراج کو یہ کام سونپ رکھا تھا کہ وہ کسی طرح ابرار صدیقی سے اس ”پیس آف آرٹ“ کا سودا کرے۔ سیٹھ سراج پچھلے ڈھائی تین مہینے سے صدیقی کے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ وہ کسی طرح یہ ”پیس“ میڈم کو فروخت کر دے۔ اس نے میڈم کی طرف سے ”پیس“ کی خاصی قیمت بھی لگائی تھی مگر صدیقی رضامند نہیں ہوا تھا لیکن پھر انہی دنوں اس صورت حال میں ایک دلچسپ تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ اس تبدیلی کا ذکر مجید مٹھو نے ان الفاظ میں کیا۔

”ان دنوں قادر لمبا اور اس کا یار شکیل میڈم کی کوٹھی میں چھپے ہوئے تھے۔ لڑکی کے اغوا والے چکر میں انہیں گرفتاری کا ڈر تھا۔ قادر لمبے کی ماں، بیٹے کے لیے بڑی پریشان تھی۔ وہ چوری چھپے دو تین بار بیٹے سے ملنے میڈم کی کوٹھی میں آئی۔ اس کی بیٹی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کا نام کنول ہے۔ وہ کافی سوہنی ہے۔ ایک دن جب ماں بیٹی کوٹھی میں آئیں تو صدیقی صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی نظر لڑکی پر پڑ گئی۔ پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ لڑکی ایک دم ان کو بڑی پسند آ گئی۔ سیٹھ سراج بھی اس ویلے وہیں پر تھا۔ سیٹھ کی نظر بھی بڑی تیز ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ لڑکی، صدیقی صاحب کے دل کو بھا گئی ہے۔ اس نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کا سوچ لیا۔ وہ ویسے تو صدیقی صاحب کو خرید و فروخت پر راضی نہیں کر سکا تھا، وہ اس لڑکی کو بیچ میں لے آیا۔ اس نے صدیقی صاحب کو آفر دی کہ اگر وہ اپنی شے بیچنے پر تیار ہو جائیں تو وہ اس لڑکی کا معاملہ ان کے ساتھ سیدھا کرا دے گا۔ صدیقی صاحب نے تھوڑی بہت رضامندی دکھائی تو سیٹھ اس کام میں لگ گیا۔ اس کو پتا تھا کہ قادر لمبا پولیس کیس سے جتنا زیادہ ڈرے گا، اس کی ماں بہن بھی اتنی ہی ڈرتی جائیں گی اور ان کو اپنے راستے پر لانا اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔“

تباہ حال گاڑی کے سامنے، مجید مٹھو سے ہونے والی اس گفتگو کے بعد صورت حال کی بہت سی کڑیاں آپس میں مل گئیں اور حالات کی ایک واضح تصویر ابھرنے لگی۔

مجید مٹھو ابھی تک گاڑی سے بندھا ہوا تھا۔ تاہم اس کے راہ راست پر آنے کے بعد عمران نے سلگتا ہوا سگار پتھر پر سے اٹھا لیا تھا۔ آخری دس پندرہ منٹ کی گفتگو اس سگار کے بغیر ہی ہوئی تھی۔ تکلیف سے مجید مٹھو کا بُرا حال تھا۔ وہ اب باقاعدہ کراہ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے جلد از جلد اس تباہ حال کار سے علیحدہ کر دیا جائے اور اس کی چوٹ کے لیے کچھ کیا جائے تاکہ اسے تکلیف سے نجات ملے۔

عمران نے کہا۔ ”بس پیارے! ایک دو آخری سوال۔ پھر تمہارے بارے میں کچھ سوچتے ہیں۔“

”میں سب کچھ بتا دوں گا لیکن پہلے مجھے یہاں سے کھولو۔“ وہ کراہا۔

”یار! اتنے بے صبرے کیوں ہوتے ہو؟ اب ہم نے کچھ زیادہ پوچھنا نہیں ہے۔ بس ایک دو سوال ہی دماغ میں ابھر رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اگر سیٹھ سراج... صدیقی کے لیے کنول کو حاصل کرنا چاہتا تھا تو اس کے لیے اسے اتنا لمبا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ ماں بیٹی تو کٹھ پتلی کی طرح تھیں۔ لال کوٹھی میں آتی تھیں۔ سیٹھ سراج کسی بھی وقت کنول کو بے بس کر کے صدیقی کے سامنے ڈال دیتا۔ سیٹھ جیسے خبیثوں کے لیے ایسے کام تو معمولی کیس ہوتے ہیں۔“

”لیکن صدیقی صاحب اس کام کو اور طرح کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ نماز روزے کے پابند ہیں۔ وہ کنول سے باقاعدہ نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ سیٹھ سراج بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔ اس لیے وہ کنول اور اس کے وارثوں کو پریشر میں لا کر راضی کرنا چاہتا ہے۔“

”قادر لمبے کو یہ بات کس نے بتائی تھی کہ ثروت نے خود کو آگ لگا کر مرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اسپتال میں زخمی پڑی ہے؟“ اقبال نے پوچھا۔

”یہ جھوٹ بھی سیٹھ نے ہی بولا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ قادرے اور اس کے گھر والوں کو ڈرایا جائے۔ اسے لال کوٹھی سے میرے گھر لانے کی وجہ بھی یہی تھی۔“

”کیا تمہارے محترم صدیقی صاحب کو پتا ہے کہ ان کے لیے کنول کو اس طرح راضی کیا جا رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”شروع میں پتا نہیں تھا، پر اب لگ گیا ہے۔ سیٹھ

سراج نے ان کی منت کی ہے کہ اب وہ اس معاملے میں خاموش رہیں کیونکہ اب اگر بات کھلی تو وہ سب جھوٹے ثابت ہو جائیں گے۔ سیٹھ نے صدیقی سے کہا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اپنی ذمے داری پر کر رہا ہے اور اس کا کسی پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔“

”یہ تیرا صدیقی بڑی خرانٹ شے ہے میاں مٹھو۔“ عمران نے کہا۔ ”اس جیسے کتنے لوگ مذہب کو موم کی ناک بنا لیتے ہیں۔ جدھر چاہا موڑ لی۔ اس سے تو بڑی اچھی طرح نمٹیں گے ہم۔ شرط یہی ہے کہ بس ایک دفعہ ملاقات ہو جائے حضرت سے۔“

گاڑی سے پٹرول رِسنا اب بند ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ ٹینکی خالی ہو چکی ہے۔ ڈھلوان سے اوپر... پکی سڑک پر سے کبھی کبھار کوئی موٹر سائیکل یا ٹریکٹر ٹرالی روشنی بکھیرتی گزرتی تھی اور پھر گہری خاموشی چھا جاتی تھی۔ پٹرول کی بُو ابھی تک خنک ہوا میں موجود تھی۔

ایک دم میرے ذہن میں اس افسردہ صورت لڑکے کا خیال آیا جس سے راستے میں مجید مٹھو کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لکڑی کی ورکشاپ میں سے مجید مٹھو کے ساتھ باہر نکلا تھا اور پھر واپس چلا گیا تھا۔ میں نے مٹھو سے پوچھا۔

”وہ لڑکا کون تھا جس نے رونے والا منہ بنایا ہوا تھا اور تم نے اس کے کندھے پر تھپکی دے کر اسے ورکشاپ میں واپس بھیجا تھا؟“

”وہ... ایک جاننے والا تھا۔ روزگار کے لیے کویت جانا چاہتا ہے۔ وہاں ورکشاپ میں کارپینٹری سیکھ رہا ہے۔“

”صدیقی اور سیٹھ والے معاملے سے تو اس کا تعلق نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں... یہ تھیکرو... معاملہ ہے۔“ مجید مٹھو نے کراہتے ہوئے سر ہلایا۔

عمران، مٹھو کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔ ”میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ کون تھا وہ لڑکا؟ نام کیا تھا اس کا؟“

”اکمل... اکمل سلطان۔“

”رہتا کہاں ہے؟“

”لاہور میں۔“

”تو کام سیکھنے کے لیے یہاں جہلم میں کیوں آ گیا؟“ عمران نے تیزی سے پوچھا۔

”وہ... بس... لاہور میں رہنا نہیں چاہتا۔ بھائیوں سے جھگڑا ہے۔“

”کہیں اس کے ساتھ بھی تو کوئی غنڈا گردی نہیں کر رہے ہو تم؟“

مجید مٹھو نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا مگر لگتا تھا کہ عمران کا شک برقرار ہے۔ اس نے مٹھو سے سوال جواب جاری رکھے۔ یہاں تک کہ اس کو پریشر میں لانے کے لیے ایک بار پھر سگار سلگا لیا۔ سگار کی دہشت بڑی کارگر تھی۔ دوسری طرف بازو کی تکلیف بھی مٹھو کو بے حال کر رہی تھی۔ چار پانچ منٹ بعد اس نے ایک دم ہتھیار ڈال دیے۔ اپنے سر پر عمران کے بوٹ کی ایک زوردار ٹھوکر کھا کر مجید مٹھو نے یہ انکشاف کیا کہ اکمل دراصل قادر لمبے کا ماموں زاد بھائی ہے اور وہ قادر کی بہن کو پسند کرتا ہے۔

یہ چکرا دینے والا انکشاف تھا۔ عمران کے ایک سوال کے جواب میں مجید مٹھو نے اعتراف کیا کہ اس نے اکمل کا نام غلط بتایا ہے۔ اس کا اصل نام فیاض ہے۔ فیاض اور کنول ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن اب فیاض پاکستان سے باہر جانا چاہ رہا ہے۔

عمران نے کہا۔ ”تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ فیاض باہر جانا نہیں چاہ رہا بلکہ تم اسے بھیج رہے ہو۔ اپنا اور صدیقی کا رستہ صاف کرنے کے لیے۔“

جواب میں مجید مٹھو خاموش رہا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ اپنے بازو کی تکلیف برداشت کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے سفاک لہجے میں اقبال سے کہا۔ ”یہ لاتوں کا بھوت ہے... لاتیں پڑتی رہیں گی تو بولتا رہے گا۔ سگار رکھو اس کے سامنے۔“

اس مرتبہ عمران کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجید مٹھو اندر تک ہل گیا۔ اپنے خشک ہونٹ تر کرنے کے لیے اس نے پانی مانگا۔ اقبال نے بوتل سے اسے پانی پلایا۔ اس کے بعد مٹھو نے درخواست کی کہ سگار اس کے سامنے سے اٹھا لیا جائے۔ وہ فیاض کے بارے میں بھی کچھ نہیں چھپائے گا۔ عمران نے سلگتا ہوا سگار جس کی حیثیت اب ٹائم بم سے کم نہیں تھی، مٹھو کے سامنے سے اٹھوا لیا۔

”ہاں، اب بتاؤ۔ کہاں غائب کرنا چاہ رہے ہو لڑکے کو؟“

”غائب کرنے کی بات نہیں۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں پاکستان سے جانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ورک ویزے پر بھجوا دیتا ہوں۔“

”اب لگے ہاتھ یہ بھی بتاؤ کہ وہ کیوں جانا چاہتا ہے؟“

”تم تینوں سمجھ ہی گئے ہو۔ وہ... کنول کو پسند کرتا ہے،

www.pkdigest.com

پر اب کنول اس کی طرف توجہ نہیں دے رہی۔ وہ سمجھ گئی ہے کہ اگر وہ اپنے بھائی کو بچانا چاہتی ہے تو پھر... اس کو صدیقی صاحب سے شادی کرنی پڑے گی۔ دو تین ہفتے پہلے کنول کے گھر میں فیاض اور کنول کی بات ہوئی تھی۔ دونوں میں جھگڑا ہوا تھا۔ کنول نے کہا تھا کہ وہ بار بار ان کے گھر کے چکر نہ لگائے، اس طرح ان کی بدنامی ہوتی ہے۔ کنول کی ماں نے بھی فیاض کو سمجھانے کی کوشش کی۔ دراصل کنول اور فیاض قریباً ہم عمر ہی ہیں۔ کنول کی ماں نے فیاض سے کہا کہ کنول کی شادی کی عمر گزری جارہی ہے اور ایک سال کے اندر اندر وہ اس کی شادی کرنا چاہتی ہے لیکن وہ ابھی بے روزگار ہے۔ دو تین سال سے پہلے کمانے کے قابل نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ کنول کا خیال چھوڑ دے۔ اس کے بعد سے فیاض بڑا بددل تھا۔ الٹی سیدھی باتیں سوچ رہا تھا۔ میں نے اسے سمجھایا اور کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ میں اس کام میں اس کی مدد کروں گا۔"

عمران نے کہا۔ "میاں مٹھو! میرے خیال میں اب بھی تم آدھا سچ بول رہے ہو۔ تم نے اس لڑکے کو سمجھایا نہیں بلکہ دھمکایا ہے۔ چلو، وقت کے ساتھ یہ پول بھی کھل جائے گا۔"

"لڑکے کو لڑکی کے بدلے ہوئے رویے کی اصل وجہ کا پتا چلا ہے یا نہیں؟" اقبال نے سوال کیا۔

"بس اس کا یہی اندازہ ہے کہ کنول کی ماں اپنی بیٹی کی شادی کسی کھاتے پیتے بندے سے کرنا چاہ رہی ہے۔"

مٹھو سے کافی سوال جواب ہو چکے تھے۔ عمران نے مجھے اور اقبال کو اشارہ کیا۔ ہم تباہ حال گاڑی سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ "اب اس کا کیا کرنا ہے؟" عمران نے اقبال سے پوچھا۔ اس کا اشارہ مجید مٹھو کی طرف ہی تھا۔

"اس نے ہماری گاڑی دیکھ لی ہے اور ممکن ہے نمبر وغیرہ بھی پڑھ لیا ہو۔ اب ہم اسے چھوڑیں گے تو مصیبت میں پڑیں گے۔ اس کے علاوہ سیٹھ اور صدیقی وغیرہ بھی ایک دم ہوشیار باش ہو جائیں گے۔" اقبال نے کہا۔ اس نے بڑے اسٹائل سے سگار ہونٹوں میں دبا رکھا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے، لگاؤ اس کو بھی انجکشن اور گاڑی میں ڈال لو۔ چار پانچ گھنٹے تو اتنا عقیل رہے گا۔ اتنے میں لاہور پہنچ جائیں گے۔"

"انجکشن ہے گاڑی میں؟" اقبال نے کش لیتے ہوئے پوچھا۔

"میرے خیال میں ایک پڑا ہوا ہے۔ دیکھ لو نہیں تو پھر گولیوں سے کام چلائیں گے۔"

اقبال اوپر گاڑی کی طرف جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ ٹھٹک گیا۔ دور نیچے نشیب میں کچھ ٹمٹماتی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ ان میں ایک دو روشنیاں شاید لالٹینوں کی تھیں، باقی ٹارچوں کی لگتی تھیں۔ یہ روشنیاں ڈھلوان پر قریباً ایک کلومیٹر دور ہوں گی۔ وہ سست روی سے جائے حادثہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"لگتا ہے، کچھ لوگ اسی طرف آرہے ہیں۔" اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

"تو پھر چلتے ہیں، اس کو انجکشن وغیرہ گاڑی میں ہی لگا لیں گے۔" عمران نے سرگوشی کی۔

اقبال نے میرے ساتھ مل کر مجید مٹھو کی رسیاں کھولنا شروع کر دیں۔ عمران اپنی موجودگی کی دیگر نشانیاں ختم کرنے لگا۔ رسیاں کھل گئیں تو مجید مٹھو درد سے کراہتی ہوئی آواز میں بولا۔

"میرا بازو ٹوٹ رہا ہے۔ ہاتھ کھول دو۔"

واقعی وہ شدید اذیت میں تھا۔ ٹوٹے ہوئے بازو کو پیچھے موڑ کر باندھا گیا تھا جس کی وجہ سے بازو کی شکل عجیب ہو گئی تھی۔

اقبال نے اس کے ہاتھ کھول دیے... اور یہیں غلطی تھی کی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ ہاتھ کھولنے سے پہلے ہی پستول اپنے ہاتھ میں کر لیتا۔ لیکن پستول ابھی تک اس کی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ یہ مجید مٹھو والا بریٹا پستول ہی تھا۔ مجید مٹھو جو بالکل نڈھال بلکہ نیم جان تھا، موقع دیکھ کر ایک دم حرکت میں آیا۔ اس نے پھرتی سے پستول پر جھپٹا مارا۔ پستول تو اس کے ہاتھ میں آگیا لیکن اس سے پہلے ایک اور کام ہو گیا اور اس کام کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ مجید مٹھو کو بھی نہیں تھی۔ اقبال کے ہونٹوں میں دبا ہوا سگار ہوا میں اچھلا اور پٹرول پر جا گرا۔ پستول چھیننے کے بعد مجید مٹھو ایک جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا تھا اور گاڑی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اچانک بھک بھک کی زوردار آوازوں سے آگ بھڑکی اور اس نے مجید مٹھو اور اقبال کو لپیٹ میں لے لیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ ہم ہکا بکا رہ گئے۔ مٹھو گاڑی کے زیادہ قریب تھا اس لیے وہ پورے کا پورا آگ کی زد میں آیا۔ اقبال کا نچلا دھڑ بھی آگ میں تھا۔ اقبال چلاتا ہوا پیچھے ہٹا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ عمران نے اس موقعے پر زبردست حاضر دماغی اور پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے نیچے بچھا ہوا کمبل نما دُھسّا اٹھایا اور اقبال پر پھینک دیا۔ شعلے پوری طرح بھڑکنے سے پہلے ہی

دھوئیں میں تبدیل ہو گئے۔ مگر دوسری طرف کا منظر دیکھنا ہمارے بس میں نہیں تھا...

مجید مٹھو نے سرتاپا آگ پہن لی تھی اور بھیانک آواز میں چلا رہا تھا۔ وہ چند قدم مخالف سمت میں دوڑا پھر ایک دم ٹھوکر کھا کر گرا اور کھائی میں لڑھک گیا۔ قریباً چالیس فٹ نیچے پتھریلی زمین سے اس کے ٹکرانے کی آواز بڑی لرزہ خیز تھی۔ اس آواز کے ساتھ ہی مجید مٹھو کی کربناک آہ و بکا دم توڑ گئی تھی۔ پٹرول، دھوئیں اور جلتے گوشت کی بو نے فضا کو ایک دم مکدر کر دیا تھا۔

فوری طور پر ہم میں سے کوئی بھی ہمت نہ کر سکا کہ کنارے پر جا کر مجید مٹھو کا حشر دیکھ سکے۔ اقبال کی آگ بجھ گئی تھی تاہم وہ نڈھال سا زمین پر پڑا تھا... اور یہی وقت تھا جب ایک خوفناک دھماکا ہوا اور پوری گاڑی آگ کا گولا بن گئی۔ اس کا گیس سلنڈر پھٹ گیا تھا۔ گاڑی کے کئی جلتے ہوئے ٹکڑے اڑ کر دور تک گئے۔ عمران نے ٹارچ تھامی اور دل کڑا کر کے نشیب میں اترا۔ میں بھی چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس کے پیچھے گیا۔ میں نے دس پندرہ قدم کی دوری سے دیکھا، مجید مٹھو کا سلگتا ہوا جسم پتھروں اور سرخی مائل مٹی کے درمیان بے حرکت پڑا تھا۔ ٹارچ کے روشن دائرے میں اس کا سر ایک طرف سے بالکل پچکا ہوا نظر آیا۔ وہ مر چکا تھا۔ ہاں، وہ شخص جو فقط ایک ڈیڑھ منٹ پہلے زندہ تھا اور بول رہا تھا، اب مٹی کا خونچکاں ڈھیر بن چکا اور بہت دور جا چکا تھا۔ یہی حیات کی بوالعجبی ہے۔

ہم دوڑتے ہوئے واپس آئے۔ عمران نے مجید مٹھو کا کمبل نما دُھسّا اٹھا کر شعلوں میں پھینکا پھر اس کا پستول بھی ٹھوکر مار کر آگ میں پھینک دیا۔ نشیب سے اوپر آتی ہوئی روشنیاں اب نزدیک پہنچ گئی تھیں۔ یقیناً ان کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔ آنے والے اب کسی بھی وقت موقعے پر پہنچ سکتے تھے۔ اقبال بغیر سہارے کے چلنے کے قابل تھا۔ ہم نے اسے ساتھ لیا اور دوڑتے ہوئے کار تک پہنچ گئے۔ چند ہی لمحے بعد ہماری گاڑی بل کھاتی پتلی سڑک پر رواں دواں تھی۔ ہمارا رخ واپس جہلم شہر کی طرف تھا۔

اقبال کی پتلون تقریباً نیکر کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ مجھے اس کی ٹانگوں پر جلنے کے سرخی مائل نشان نظر آئے۔ کہیں کہیں جلد چھل بھی گئی تھی۔ تاہم وہ زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔

"سوری یار! جو کچھ ہوا بالکل اچانک ہوا۔" اقبال بولا۔ "میں اپنی غلطی مانتا ہوں... مجھے سگار منہ میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔"

"مجھے بھی امید نہیں تھی کہ وہ اس حالت میں ایسا کام کرے گا۔ بڑا ڈھیٹ پن دکھایا اس نے۔ لگتا ہے کہ وہ ہماری توقع سے زیادہ سخت جان تھا۔" عمران نے کہا۔ میری نگاہوں میں سگار گرنے اور پھر ایک دم آگ بھڑک اٹھنے کے مناظر گھومنے لگے... مجید مٹھو کا پچکا ہوا سر اور پھر سرخی مائل مٹی کو مزید سرخ کرتا ہوا اس کا خون... مجھے جھرجھری سی آگئی۔ اس کے ساتھ ہی یہ خوف دامن گیر ہوا کہ میں، عمران اور اقبال کے ساتھ ایک نہایت سنگین واقعے میں ملوث ہو چکا ہوں۔ اگر پولیس تفتیش میں یہ حادثہ... حادثہ نہ رہتا، قتل بن جاتا تو پھر میں بھی ملزمان کی فہرست میں آتا تھا۔

عمران کے اپنے چہرے پر بھی قدرے پریشانی کے آثار تھے لیکن جب اس نے مجھے پریشان دیکھا تو ایک دم اس نے اپنا مخصوص موڈ بحال کر لیا اور مسکرا کر بولا۔ "آج بہت خاص دن ہے۔ بڑے بڑے اہم تاریخی واقعات ہو رہے ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے جل کر پوچھا۔

"اقبال کی پتلون کا دیکھتے ہی دیکھتے نیکر بن جانا کوئی معمولی واقعہ ہے؟ اور پھر دیکھو، یہ کیسی انہونی ہوئی ہے کہ تم جیسے ڈرپوک شخص نے بھی آج ہیر شیر والا کام کر دیا۔ بروقت تیر چلا کر مجید کے ہاتھ سے پستول چھڑا دیا۔ اس کے بعد جو دھڑا دھڑ انکشاف ہوئے ہیں ہم پر... وہ بھی کوئی معمولی نہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اب اگر پولیس پر بھی دھڑا دھڑ کچھ انکشافات ہو گئے تو پھر کیا ہوگا؟ تم نے مجید کو قریباً ڈیڑھ گھنٹا رسیوں سے باندھے رکھا ہے۔ اگر اس کے جسم پر رسی کے نشان مل گئے تو اس سارے واقعے کا رخ ہی بدل جائے گا اور پھر وہ لوگ جو نیچے کسی بستی سے موقعے کی طرف آرہے تھے، وہ پتا نہیں کون تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی بندہ پہلے الٹی ہوئی گاڑی کو دیکھ گیا ہو اور پھر نیچے سے بستی والوں کو لے کر اوپر آرہا ہو۔ ایسے میں یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ہماری گاڑی اور اس کا نمبر بھی دیکھ لیا ہو..."

عمران نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے دور سے تمہاری تصویریں بھی اتار لی ہوں... اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خفیہ پولیس ہی کا کوئی بندہ ہو... اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے پھرتی دکھائی ہو اور ہماری اس مہران کے نیچے سگنل چھوڑنے والی کوئی ڈیوائس بھی لگا دی ہو... یار! ایک تو تم سب سے پہلے وہ بات سوچنے لگتے ہو جو سب سے بعد

www.pkdigest.com

میں اور سب سے بُرے حالات میں سوچنی چاہیے۔ بالکل پُرسکون رہو... کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ سے اور اپنی پولیس کی طرف سے پُرامید رہو۔ ہماری پولیس تفتیش کرتے ہوئے غور و فکر کے علاوہ اور سب کچھ کرتی ہے... اور غور و فکر کے بغیر سوچنے سے کچھ بھی ملنے والا نہیں۔"

"یارو! اب کچھ غور و فکر میری ٹانگوں پر بھی کر لو۔ تھوڑی تھوڑی جلن شروع ہو گئی ہے۔"

"ان کا انتظام بھی ابھی ہو جاتا ہے۔" عمران نے اطمینان سے جواب دیا۔

اب شہر کی آبادی شروع ہو گئی تھی۔ عمران نے ایک ٹکّا شاپ کے سامنے گاڑی روک دی۔

"کیا میری ٹانگوں کو مزید روسٹ کرانا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"نہیں... وہ سامنے گارمنٹس کی دکان ہے، وہاں سے تمہارے لیے پینٹ لیتے ہیں اور ساتھ ہی میڈیکل اسٹور ہے، وہاں سے دوا مل جائے گی۔ ایک دم فائیو اسٹار کام ہو جائے گا۔"

ہم گاڑی میں بیٹھے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد عمران جینز کی ایک پتلون لے کر واپس آ گیا۔ ساتھ میں وہ "ڈرمازین" مرہم بھی لایا تھا۔ مرہم فوری طور پر اقبال کی ٹانگوں پر لگایا گیا اور اس نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی پتلون بھی پہن لی۔ عمران گاڑی کو سیدھا ایک ہوٹل لے گیا۔ یہاں تین بیڈ کا ایک کمرا بک کرانے اور شفٹ ہونے میں ہمیں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ہوٹل کی کھڑکی سے دریائے جہلم کے پل کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔

ہم نے ٹی وی کھولا تو نیوز چینل پر تھوڑی ہی دیر بعد کار حادثے کی پٹی چلنی شروع ہو گئی۔ خبر کچھ اس طرح دی جا رہی تھی۔ برانچ روڈ پر کار کھائی میں گر گئی۔ گیس سلنڈر پھٹنے سے آگ لگ گئی۔ جانی نقصان کا اندازہ لگایا جا رہا ہے۔

چند منٹ بعد یہ خبر دی جانے لگی۔ کار سوار شخص موقع پر ہلاک۔ آگ حادثے کے کافی دیر بعد لگی، عینی شاہدین کا بیان... موقعے پر گوشت سے بھرے ہوئے تین بڑے شاپر بھی ملے ہیں۔

"بند کرو جگر اس کو... خوامخواہ کی ٹینشن ہے....."

عمران نے کہا۔ میں نے ٹی وی آف کر دیا۔ عمران، اقبال کے لیے کھانے والی دوا لایا تھا، اس کے علاوہ ایک انجکشن بھی تھا۔ اس نے اقبال کو انجکشن دیا۔ جلد ہی اسے تکلیف میں افاقہ محسوس ہونے لگا۔ وہ دونوں یوں صورت حال پر تبصرہ کرنے میں مصروف ہو گئے جیسے کوئی خاص واقعہ رونما ہی نہیں ہوا۔ پتا نہیں وہ کس مٹی کے بنے ہوئے تھے۔

مجھے آج پھر سکون بخش گولیوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پانی کے ساتھ دو گولیاں اکٹھی نگل لیں اور اپنا دھیان دو گھنٹے پہلے رونما ہونے والے واقعات سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ ٹی وی کی خبروں سے امید تو پیدا ہو گئی تھی کہ شاید اس حادثے کو اتفاقیہ ہی سمجھا جائے گا۔ یہ ایک بالکل ویران سڑک کے کنارے ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ عمران نے بڑی ہوشیاری سے موقعے پر سے ساری شہادتیں ختم کر دی تھیں۔ تیسری حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اپنے تعاقب کے دوران میں مجید مٹھو کسی ساتھی سے رابطہ قائم نہیں کر سکا تھا۔

جلد ہی میں سو گیا۔ اگلی صبح کافی دیر سے آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی ذہن میں رات والے واقعات کی تشویش نے آ گھیرا۔ دل پر ایک دم بہت سارا بوجھ پڑ گیا۔ اب کیا ہوگا؟ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میں، عمران اور اقبال کے ساتھ بتدریج ایک دلدل میں دھنستا چلا جا رہا ہوں۔

میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ دن کے ساڑھے دس ہو رہے تھے۔ سکون بخش گولیوں کا خمار ابھی تک حواس پر موجود تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کمرے میں کوئی چوتھا شخص بھی موجود ہے۔ میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حسب معمول عمران اور اقبال ناشتا کر چکے تھے بلکہ وہ چوتھا شخص بھی کر چکا تھا جو ان کے ساتھ ہوٹل کے اس کمرے میں موجود تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک گیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جسے ہم نے کل شام لکڑی کی ورکشاپ سے مجید مٹھو کے ہمراہ نکلتے دیکھا تھا۔

مجھے جاگتے دیکھ کر عمران نے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں بھی لڑکے کا جائزہ لیتے ہوئے، عمران کے پیچھے ہوٹل کی بالکونی میں آ گیا۔ نیچے سڑک پر جہلم کا ٹریفک رواں دواں تھا۔ عمران مدھم آواز میں بولا۔ "تم نے پہچان لیا ہوگا، یہ وہی فیاض ہے جس کے بارے میں کل رات مجید مٹھو نے بتایا تھا۔ یہ قادرے کی بہن کو پسند کرتا ہے۔"

"لیکن یہ یہاں کیسے پہنچا؟"

"میں سویرے اسے ورکشاپ سے نکال کر یہاں لایا ہوں۔ اس کے سامنے مجید مٹھو وغیرہ کی کوئی بات نہیں کرنی۔ میں نے اسے یہی بتایا ہے کہ ہم خفیہ پولیس کے بندے ہیں اور اس کی مدد کرنا چاہ رہے ہیں۔ پہلے تو وہ بہت ڈرا ہوا تھا،

پر اب نارمل ہے۔"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کرنا چاہ رہے ہو۔ ہم اس معاملے میں بُری طرح پھنستے جا رہے ہیں۔"

"بس سوچ کا فرق ہے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ ہم پھنس رہے ہیں لیکن میں سمجھ رہا ہوں کہ ہم پھنس نہیں رہے بلکہ کسی پھنسے ہوئے کو نکال رہے ہیں۔ اس کی مدد کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں سکون محسوس کر رہا ہوں اور تمہارے چہرے پر ساڑھے دس بجے ہی بارہ بج گئے ہیں۔"

"کس پھنسے ہوئے کو نکال رہے ہو؟"

"اس فیاض کو۔ یار! یہ بڑا دکھی بندہ ہے۔ اس کو پیار کا روگ لگا ہوا ہے اور تم... تو خود اسی کشتی کے سوار ہو۔ ایک عاشق کو تو دوسرے عاشق کا درد سمجھنا چاہیے۔ تم اس تکلیف کو محسوس نہیں کرو گے تو کیا ہم جیسے کریں گے جنہوں نے کبھی اس "گلی" میں قدم ہی نہیں رکھا۔" اس نے عجیب لہجے میں کہا اور مسکرانے لگا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور اندر لے گیا۔ فیاض صوفے پر کندھے جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے خوبرو چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا قد لمبا تھا۔ وہ شلوار قمیص اور پشاوری چپل پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ہاتھ میں وہی کھردرا پن محسوس ہوا جو محنت مشقت کرنے والے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

میرے جاگنے سے پہلے شاید وہ لوگ کنول کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اب یہ گفتگو پھر وہیں سے شروع ہوئی۔ عمران نے فیاض سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہاں، کیا کہہ رہے ہو تم؟"

وہ بوجھل آواز میں بولا۔ "مجھے تو لگتا ہے سر جی... وہ بہت بدل گئی ہے۔ شاید وہ اب میرا ساتھ دینا ہی نہیں چاہتی۔"

"وہ بدلی نہیں، اسے بدلا گیا ہے۔ بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ ہم نے اس بارے میں کافی کچھ پتا کیا ہے۔ بس یہ سمجھو کہ اس کا بھائی قادرا اور والدہ کچھ بُرے لوگوں کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں کچھ بتا نہیں سکتی اس لیے بے وفائی کا الزام اپنے سر پر لے رہی ہے۔ آہستہ آہستہ ساری باتیں تم پر کھل جائیں گی۔ تم فی الحال ان باتوں کو چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ کہ اپنے پھوپی زاد قادرے کے بارے میں تمہیں کیا پتا ہے؟"

وہ کچھ دیر تک تذبذب میں رہا پھر مرعوب لہجے میں بولا۔ "سر جی! مجھے تو بس یہی پتا ہے کہ قادر بھائی کا اٹھنا بیٹھنا کچھ خراب لڑکوں میں تھا۔ انہوں نے اپنے محلے کی ایک لڑکی کو سڑک سے اٹھایا۔ قادر بھائی بھی اس معاملے میں پھنس گیا۔ جن لڑکوں کا اصل قصور تھا، وہ تو امیر گھروں کے تھے۔ ان کے گھر والوں نے انہیں دائیں بائیں کر دیا۔ اب اس واردات کا بہت سارا بوجھ قادر بھائی پر آ رہا ہے۔ وہ پولیس سے بچنے کے لیے کہیں چھپا ہوا ہے۔ پولیس اس کے گھر والوں کو تنگ کرتی رہتی ہے۔ پھوپی بہت پریشان ہے۔"

"اچھا، مجید مٹھو سے تمہاری ملاقات کیسے ہوئی تھی؟"

"میں ان دنوں بڑا پریشان تھا جی۔ مر جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ بچوں کے ایک پارک میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ مجید صاحب میرے پاس آ بیٹھے۔ انہوں نے مجھ سے ہمدردی کی باتیں کیں۔ میری کہانی سنی اور مجھے مشورہ دیا کہ میں اپنے حالات اچھے کرنے کے لیے کویت چلا جاؤں۔ انہوں نے اس سلسلے میں میری مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میرے پاس کوئی ہنر ہے؟ میں نے بتایا کہ ہنر تو کوئی نہیں۔ ایف اے کیا ہوا ہے، اب اپنے محلے میں ایک جنرل اسٹور چلاتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں تین چار ہفتے لگا کر تھوڑی سی کارپینٹری سیکھ لوں۔ اس کے بعد وہ مجھے ورک ویزے پر باہر بھیج دیں گے۔ جو تھوڑے بہت پیسے میرے پاس تھے، وہ میں نے انہیں دے دیے۔ انہوں نے کہا کہ باقی پیسے میں باہر جانے کے بعد بھیج دوں۔ مجھے مجید صاحب کے بارے میں زیادہ پتا نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان کو مجھ سے ہمدردی ہے۔"

فیاض "ہمدردی ہے" کے لفظ استعمال کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ابھی تک مجید مٹھو کے المناک انجام سے بے خبر ہے۔ نہیں جانتا کہ وہ کل رات اپنی ہی چالاکی کی آگ میں جل کر بھسم ہو چکا ہے۔

عمران نے فیاض سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں مجید مٹھو سے کبھی ملا نہیں لیکن جہاں تک مجھے پتا ہے، اس کی شہرت ایک غنڈے کی ہے۔ ایسے لوگ بلاوجہ کسی سے ہمدردی نہیں جتاتے۔ تمہاری بات سننے کے بعد مجھے سو فیصد یقین ہے کہ مجید بھی ان لوگوں کے ساتھ ملا ہوا ہے جنہوں نے قادرا اور اس کے گھر والوں کو اپنے چکر میں پھنسایا ہوا ہے۔ یہ لوگ صرف کنول کو شادی پر مجبور کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ہر ہتھکنڈا استعمال کر رہے ہیں۔ تمہیں اگر باہر بھیجا جا رہا ہے تو اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے کہ وہ تمہیں کنول اور قادرا وغیرہ سے دور کرنا چاہتے ہیں۔"

www.pkdigest.com

فیاض کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے عمران کی باتوں پر یقین آنا شروع ہو گیا ہے۔ اس یقین کے بعد اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی بے تابی کروٹیں لینے لگی تھی۔

”تم کب جا رہے ہو کویت؟“ اقبال نے پوچھا۔

”اگلے ہفتے جی... پاسپورٹ بننے گیا ہوا ہے۔ میڈیکل بھی مجید صاحب نے کروا دیا تھا۔ اب تھوڑا سا کام باقی رہ گیا تھا... لیکن... لیکن۔“ وہ ہکلا کر رہ گیا۔

”کہو کہو۔“ عمران نے اسے حوصلہ دیا۔ ”تم ہم پر پورا اعتماد کر سکتے ہو۔ پورا اعتماد کرو گے تب ہی ہم تمہاری مدد کر سکیں گے۔“

”جو کچھ آپ بتا رہے ہیں جی... اس کے بعد تو میں باہر جانے کا نہیں سوچوں گا۔ میں... ایک بار پھر کنول سے ملنا چاہتا ہوں... اور پھوپی جان سے بھی۔“

”تمہیں ضرور ملنا چاہیے... بلکہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اس کے علاوہ تمہیں قادرے سے بھی ملاقات کرنی چاہیے۔“

”مگر قادر بھائی کا تو مجھے پتا ہی نہیں کہ وہ کہاں ہیں؟“ فیاض نے کہا۔

”گھبراؤ مت، اس کو بھی ڈھونڈ لیں گے۔“ عمران نے فیاض کا شانہ تھپکا۔

عمران کے اس انداز نے مجھے اس دن کی یاد دلا دی جب سیٹھ کے کارندوں نے مجھے مارا تھا اور میں بُری طرح ٹوٹ پھوٹ کر ریلوے لائن پر سر رکھنے کا سوچ رہا تھا۔ تب بھی عمران ایسے ہی ایک پُرخلوص غم خوار کے روپ میں میرے سامنے آیا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر جو تھپکی دی تھی، اس نے میرے اندر زندگی کی توانائی پیدا کی تھی۔ آج ویسی ہی تھپکی وہ فیاض کو دے رہا تھا۔

☆☆☆

ہم نے اگلے چوبیس گھنٹے جہلم کے اسی ہوٹل میں گزارے۔ مجید مٹھو کا موبائل فون ابھی تک عمران کے پاس تھا لیکن اس نے اسے آف کر دیا تھا۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے ضائع کر دے مگر ابھی تک اس نے میری بات نہیں مانی تھی۔ اقبال کو اپنی جلی ہوئی ٹانگوں کے سبب چلنے پھرنے میں تکلیف ہو رہی تھی تاہم وہ اسے برداشت کر رہا تھا۔ فیاض ہمارے ساتھ ہی تھا۔ وہ اس سازش سے کافی حد تک آگاہ ہو چکا تھا جو کنول کے گھر والوں کے ارد گرد بُنی جا رہی تھی اور جس سے خود فیاض بھی بُری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ باتیں اس کی سمجھ میں آنے لگیں۔

ہم اگلے روز جہلم سے لاہور روانہ ہوئے... اور قریباً چار گھنٹے کے سفر کے بعد راوی روڈ پر عمران کے گھر پہنچ گئے۔ یہاں عمران کا ساتھی آصف موجود تھا۔ وہ تیس پینتیس کے پیٹے میں تھا اور درمیانے قد کا خوش باش سا شخص تھا۔ میں اسے عمران کے ساتھ سرکس میں بھی دیکھ چکا تھا۔ ہماری غیر موجودگی میں اس نے قادرے کی دیکھ بھال کی تھی۔ اس نے بتایا کہ قادرا رات کو روتا گڑگڑاتا رہتا ہے۔ کل سے اسے تیز بخار بھی ہے۔ بہرحال، گھر واپس پہنچتے ہی عمران نے آصف کو فارغ کر دیا اور وہ اپنی موٹر سائیکل پر چلا گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی عمران نے فیاض کو بتا دیا تھا کہ وہ اس کی ملاقات ایک جانے پہچانے شخص سے کرانے والا ہے۔ اسے دیکھ کر فیاض کو خوشی ہو گی۔ فیاض کے چہرے پر تجسس نظر آ رہا تھا۔

عمران نے اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں قادرے کو رکھا گیا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی قادر کی نظر سب سے پہلے اپنے ماموں زاد فیاض پر پڑی۔ قادر مجسم حیرت بن گیا۔ کچھ یہی کیفیت فیاض کی بھی ہوئی۔ وہ بھی قادر اور بھی عمران کا چہرہ تکتا تھا۔ پھر قادر بھاگ کر آگے آیا اور فیاض سے لپٹ گیا۔ وہ بلند آواز میں رونے لگا۔ فیاض کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ جب سے قادر پولیس کے ڈر سے روپوش ہوا ہے، آج پہلی بار فیاض اور وہ مل رہے ہیں۔

قادرا ابھی تک اسی لباس میں تھا جس میں ہم اسے یہاں چھوڑ کر گئے تھے۔ دو دن پہلے میں نے طیش میں آ کر اس سے جو مار پیٹ کی تھی، اس کے آثار ابھی تک دو گہرے نیلوں کی صورت میں اس کے سرخ و سپید چہرے پر موجود تھے۔ ”قادر بھائی! تم کیسے ہو؟ ہم سب تمہارے لیے بڑے پریشان تھے۔“ فیاض نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟“

”یہ سارے سوال جواب بعد میں ہو جائیں گے۔“ عمران نے تیزی سے کہا۔ ”فی الحال تمہیں اپنے گھر میں ایک فون کرنا ہے اور گھر والوں سے دو چار باتیں کرنی ہیں۔“ عمران کے لہجے میں تحکم تھا۔

”کیا کہنا ہے؟“ قادرا ڈرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ابھی بتاتا ہوں تمہیں۔“ عمران نے کہا پھر وہ فیاض سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”چلو یار! تم ذرا دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

فیاض اپنے پھوپی زاد قادر پر ایک پریشان نظر ڈالتا ہوا

باہر چلا گیا۔ قادر کی حالت دیکھ کر یقیناً فیاض جان گیا تھا کہ اسے یہاں زبردستی رکھا گیا ہے اور اس سے مار پیٹ بھی ہوئی ہے۔

اس کے جانے کے بعد عمران نے جیب سے قادر والا سیل فون نکالا۔ یہی فون تھا جس پر دو دن پیشتر قادر کی بہن کنول کا فون آیا تھا اور بعد میں اسی فون سے اقبال نے سیٹھ سراج کی آواز کی کامیاب نقل کرتے ہوئے صدیقی سے بھی بات کی تھی۔ بعدازاں عمران نے یہ فون آف کر کے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

فون کو آن کرنے کے بعد عمران نے کہا۔ ”ہاں قادر بیٹا... فون پر کال کر کے تم نے اپنی بہن یا امی جان کو یہ بتانا ہے کہ...“ بات کرتے کرتے عمران ایک دم رک گیا اور پُرسوچ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے اسے رکتے دیکھ کر پوچھا۔

”ایک منٹ، میرے ساتھ آؤ۔“ اس نے کہا۔

ہم دونوں کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر کے برآمدے میں آ گئے۔ ”کیا مسئلہ ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”یار جی! قادرے کے ساتھ کوئی بھی بھلائی کرنے سے پہلے تم سے اجازت لینا ضروری ہے۔ اگر تم اسے معاف کر دو گے تو میں بھی کر سکوں گا۔ ورنہ پھر بھاڑ میں جائے یہ سب کچھ۔“

”تو تم اسے چھوڑنا چاہ رہے ہو؟“

”چھوڑیں گے... تو اس کی بہن زبردستی کی شادی سے بچے گی نا۔ لیکن جو کچھ بھی ہے، آخری فیصلہ تمہارا ہوتا ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ قادر کے سامنے آنے کے بعد سے میں نے اس پر جی بھر کر اپنی بھڑاس نکالی تھی۔ اسے بُری طرح زدوکوب کیا تھا۔ گالیاں دی تھیں، ذلیل کیا تھا۔ وہ معافی تلافی کرتا رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ دہائی بھی دیتا رہا تھا کہ وہ واجی اور اپنے تیسرے ساتھی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اور مجھے لگ رہا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہم اس کے موبائل فون کے ذریعے واجی اور شکیل وغیرہ کے نمبروں پر کال ملانے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن وہ دونوں اپنی سم بدل چکے تھے۔ اب اس صورتِ حال میں قادرے کو مزید بند رکھنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے میں اسے اپنے کیے کی کافی سزا مل چکی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا۔ اس کے گھر والے شدید معاشی بدحالی کا شکار تھے اور اس سارے چکر میں اس کی بہن کی زندگی بھی برباد ہو رہی تھی۔

اگر بات صرف قادرے کی ہوتی تو شاید میرے دل میں اس کے لیے اتنی جلدی نرم گوشہ پیدا نہ ہوتا مگر یہاں ایک بے گناہ لڑکی کی زندگی اور عزت کا سوال بھی تھا۔ اسے بھائی کے جرم کی بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں جب میں کنول اور فیاض کے بارے میں سوچتا تھا تو مجھے اپنا اور ثروت کا دکھ یاد آ جاتا تھا۔ شاید ٹھیک ہی کہا تھا عمران نے... اگر ایک دل فگار دوسرے دل فگار کے درد کو نہیں سمجھے گا تو اور کون سمجھے گا۔ وہیں کھڑے کھڑے ایک دم میرا دل آنسوؤں سے بھر گیا۔ میں نے سوچا، میں ایک بے گناہ لڑکی کو برباد ہونے سے بچاؤں... شاید اس کے صلے میں قدرت مجھ پر اور ثروت پر بھی رحم کر دے۔

کچھ ہی دیر بعد میں اور عمران ایک بار پھر کمرے میں قادرے کے پاس تھے۔ وہ سکڑا سمٹا صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کی پرچھائیاں تھیں۔ عمران نے موبائل فون اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”تم نے ترس نہیں کھایا تھا لیکن ہم تم پر ترس کھا رہے ہیں۔ تیری بہن کو بچانا چاہ رہے ہیں جو تیرے کرتوتوں کی سزا زبردستی کی شادی کی شکل میں بھگتنے والی ہے... تم بھی سب کچھ جانتے ہو مگر بے غیرت بنے ہوئے ہو۔ اپنی جان چھڑانے کے عوض اپنی بے قصور بہن کو دوزخ میں دھکیل رہے ہو... دھکیل رہے ہو یا نہیں؟“

قادرے کے چہرے پر بزدلی اور خوف کی زردی چھائی رہی اور اس کا سر جھکا رہا۔ ندامت کے آنسو اس کی گدلی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔

”چل فون لگا اپنی والدہ کو اور ان کو بتا کہ فیاض ان سے ملنے آ رہا ہے۔ وہ ان کے لیے اچھی خبر لا رہا ہے۔ وہ ہر صورت اسے ملنے دیں۔“

”فیاض کو کیا کہنا ہے ان سے؟“ قادر نے دبی آواز میں پوچھا۔

”سوال کرے گا تو تجھے تاؤ آ جائے گا۔ جس طرح کہہ رہا ہوں اسی طرح کر۔ باقی باتیں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ چل شاباش!“

قادرے نے عمران کی ہدایت کے مطابق اپنے گھر کال ملائی۔ اس کی بہن کنول نے ہی کال اٹینڈ کی۔ ”بھائی! آپ کہاں تھے؟ اتنی کالیں کی ہیں کہ انگلیاں دکھنے لگی ہیں۔ آپ نے فون بند کیوں کیا ہوا تھا؟“

”چارجر نہیں مل رہا تھا۔ ابھی ملا ہے۔“ قادر نے بہانہ بنایا۔

"آپ کو پتا چلا ہے کچھ مجید صاحب کے بارے میں؟" کنول نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"کیوں... کیا ہوا؟" قادرے نے چونک کر پوچھا۔

"آپ کو واقعی اب تک پتا نہیں؟" کنول کی آواز بھرا گئی۔ قادرے نے نفی میں جواب دیا۔

وہ کراہ کر بولی۔ "جہلم کے قریب مجید صاحب کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ موقعے پر ہی ختم ہو گئے ہیں۔ ابھی... کچھ دیر پہلے... صدیقی صاحب آئے ہوئے تھے، انہوں نے بتایا ہے۔"

"او گاڈ!" قادرے نے سر تھام لیا۔ پھر ڈری ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھا... عمران نے جھلائے ہوئے انداز میں اشارہ کیا کہ وہ یہ باتیں چھوڑے اور وہ بات کرے جس کے لیے فون کیا ہے۔

اظہارِ حیرت اور اظہارِ افسوس کے چند جملوں کے بعد قادرے نے بہن کو بتایا کہ فیاض ایک بہت خاص کام کے لیے ان کے پاس آ رہا ہے اور اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔

"لیکن وہ کیوں آ رہا ہے؟" کنول جز بز ہوئی۔

"بس ایک اچھی خبر لا رہا ہے ہم سب کے لیے۔ باقی باتیں بعد میں بتاؤں گا۔" اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ رابطہ منقطع کرنے کے بعد وہ متعجب نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔ غالباً وہ عمران کے منہ سے اس بات کی تصدیق چاہتا تھا کہ مجید مٹھو واقعی راہیٔ ملک عدم ہو چکا ہے لیکن عمران نے اس کی تصدیق یا تردید نہیں کی اور کمرے سے نکل آیا۔ اس گفتگو کے دوران میں قادر، عمران کی ہدایت پر کنول سے یہ بھی پوچھ چکا تھا کہ صدیقی صاحب تو گھر میں نہیں ہیں یا انہیں آنا تو نہیں ہے؟ کنول نے ان سوالوں کا جواب نفی میں دیا تھا۔

شام کے سات بج چکے تھے۔ عمران، کنول کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ کافی جلدی میں نظر آتا تھا۔ پتا نہیں کہ اس کے ذہن میں کیا تھا مگر جو کچھ بھی تھا، وہ اسے جلد سے جلد نمٹا لینا چاہتا تھا۔ اقبال تو اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے پر قائل کر لیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی، اب میں اس کی باتوں سے جلدی قائل ہونے لگا تھا۔ اس کے علاوہ اس بھاگ دوڑ میں مجھے ذاتی دلچسپی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جتنی دیر عمران کے ساتھ مصروفِ عمل رہتا، میرا دھیان اپنے جانکاہ دکھ کی طرف سے ہٹا رہتا تھا۔

قادرے کا گھر رشید پارک کے علاقے میں تھا۔ یہ پانچ چھ مرلے کا مکان تھا۔ متوسط آبادی تھی۔ قادرے نے بتایا تھا کہ یہ کرائے کا گھر ہے۔ گلی اتنی بڑی نہیں تھی کہ گاڑی پارک کی جا سکتی۔ ہم نے گاڑی گلی سے باہر ہی کھڑی کی۔ فیاض نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے سہمی ہوئی نسوانی آواز میں پوچھا گیا۔ "کون؟"

"میں فیاض ہوں پھوپی جی۔"

چند سیکنڈ بعد ایک پریشان چہرے والی چالیس پینتالیس سالہ عورت نے دروازہ کھول دیا... فیاض نے اسے سلام کیا جس کا جواب سپاٹ لہجے میں دیا گیا۔ فیاض نے کہا۔ "پھوپی جی! ذرا بیٹھک کا دروازہ کھول دیں۔ میرے ساتھ دو مہمان بھی ہیں۔"

ادھیڑ عمر عورت پہلے ہی متذبذب تھی۔ مہمانوں کا سن کر مزید متذبذب ہو گئی۔ اس نے سرتاپا ہمارا جائزہ لیا۔ پھر الجھی الجھی سی اندر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد گلی میں کھلنے والے ایک دوسرے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ یقیناً یہ بیٹھک کا دروازہ تھا۔ دروازہ کھلا اور ہم اندر چلے گئے۔

اسی دوران میں موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ قادرے والا فون تھا۔ عمران نے مجھے تھمایا تھا اور میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ فون اسکرین پر صدیقی صاحب کے الفاظ چمک رہے تھے۔ عمران نے بھی نام پڑھا۔ پھر اشارے سے مجھے کہا کہ میں کال ریسیو کروں مگر خاموش رہوں۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے صدیقی کی پریشان آواز آئی۔ "کیا بات ہے قادر! ہیلو... کہاں ہو تم... ہیلو۔ میں دس منٹ سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہوں۔ بیل دے رہا ہوں۔ ہیلو... ہیلو۔" میں نے فون بند کر دیا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" عمران نے سرگوشی میں پوچھا۔

"لگتا ہے کہ وہ مجید مٹھو کے گھر کے باہر کھڑا ہے۔ اس کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ قادر وہاں گھر کے تہ خانے میں ہے۔"

عمران نے کہا۔ "ہمیں یہاں زیادہ وقت نہیں لگانا چاہیے۔ اگر ہو سکے تو..."

عمران کی بات منہ ہی میں رہ گئی۔ ادھیڑ عمر عورت دھم سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینا آ رہا تھا اور سانس تیز چل رہی تھی۔ "پھوپی جان!" فیاض پکارا اور اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ادھیڑ عمر عورت کو سنبھالا۔ پھر اس نے آواز دی۔ "کنول... کنول۔"

ایک لڑکی چلاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ فیاض کے ساتھ مل کر ادھیڑ عمر عورت کو سنبھالنے لگی۔ ہم نے بھی مدد کی اور عورت کو سنگل صوفے سے اٹھا کر بڑے صوفے پر لٹا دیا۔

لڑکی پانی لے آئی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے ماں کو پانی پلایا۔ پھر اسے زبان کے نیچے رکھنے والی گولی دی۔ لڑکی جو یقیناً کنول تھی، شاید عام حالات میں ہمارے سامنے نہ آتی مگر شدید پریشانی نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ اچھی شکل صورت کی تھی۔ کانوں میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں اور ناک میں چھوٹا سا کوکا چمک رہا تھا۔ ماں کی حالت ذرا سنبھل گئی تو اس نے سر پر دوپٹا لے لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔

فیاض نے صوفے پر ایک طرف دو تکیے رکھ کر کنول کی والدہ کو نیم دراز کر دیا۔ کنول نے اسے مزید دوا دی۔ عورت کراہتے ہوئے بولی۔ "فیاض! ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو... تمہیں خدا رسول کا واسطہ ہے۔ کیوں ہم سب کی جان لینے پر تلے ہوئے ہو؟ چھوڑ دو ہماری جان۔" وہ باقاعدہ رونے لگی۔

عمران نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ "خالہ جان! یہ آپ نہیں، آپ کی مجبوریاں بول رہی ہیں... اور ہمیں پتا ہے کہ آپ کی مجبوریاں کیا ہیں۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"آ... آپ لوگ کون ہیں؟" کنول نے پوچھا۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

"ہم بھی اپنے بھائی کا دوست سمجھ سکتی ہو لیکن وہ دوست نہیں جنہوں نے اسے تباہ کرنے کی کوشش کی بلکہ وہ جو اسے تباہی سے بچانا چاہتے ہیں۔ دوبارہ زندگی کی طرف لانا چاہتے ہیں۔" عمران نے کہا۔

"آپ... کچھ نہ کریں بھائی جان!" کنول نے پھر جھکی نظروں کے ساتھ کہا۔ "ہم اپنے طور پر کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آٹھ دس دن تک قادر بھائی گھر پہنچ جائیں گے۔" بات کرتے ہوئے وہ بے چارگی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس خستہ تھا اور کندھے سے قمیص کی سلائی ادھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کندھے کو بار بار دوپٹے سے ڈھانپنے کی کوشش کرتی تھی۔ گھر کی حالت سے بھی غربت جھلک رہی تھی۔

عمران نے کہا۔ "میری بہن! ٹھیک ہے کہ آپ دونوں قادر کو بچانے کی کوشش کرتی رہی ہیں لیکن وہ جس طرح کی کوشش تھی، اس کے بارے میں ہم اچھی طرح جان چکے ہیں... اور آپ دونوں کے لیے خوش خبری یہ ہے کہ اب کسی طرح کی کوشش کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ وہ مجبوری اب ختم ہو گئی ہے جس کی وجہ سے آپ دونوں کو بار بار ابرار صدیقی سے ملنا پڑ رہا تھا اور اس کی ہر ہاں میں ہاں ملانا پڑ رہی تھی۔"

ابرار صدیقی کے نام نے ماں بیٹی کے چہرے متغیر کر دیے۔ "پ... پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" کنول ہکلائی۔

"تمہیں پتا ہے میری بہن۔" عمران نے کہا۔ "اور آپ دونوں کے لیے خوش خبری یہ ہے کہ قادر کے لیے اب کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

قادر کی والدہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ عمران نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اور اگر دیکھا جائے تو قادر کے لیے کبھی کوئی بڑا خطرہ تھا ہی نہیں۔ بے شک اس نے جرم کیا ہے مگر کچھ لوگوں نے اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے اس جرم کا سارا بوجھ قادر پر ڈالا ہے۔ قادر کو اور آپ دونوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے کچھ سوچے سمجھے جھوٹ بولے گئے ہیں۔"

"جھوٹ بولے گئے ہیں؟" کنول کی والدہ حیران تھیں۔

"آپ کو بتایا گیا ہے کہ جس لڑکی کو اٹھایا گیا تھا، اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ وہ جل گئی ہے اور اسپتال میں خطرناک حالت میں پڑی ہے۔ اس نے بیان دیا ہے کہ اس سے زیادتی ہوئی ہے اور اس کا بڑا مجرم قادر ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری باتیں بس ایک ڈرامے کا حصہ ہیں اور ڈراما یہی ہے کہ آپ لوگوں کو اتنا دہشت زدہ کر دیا جائے کہ آپ ہر جائز ناجائز بات ماننے پر مجبور ہو جائیں۔ قادر بالکل خیریت سے ہے اور ہمارے پاس ہے۔ اب آپ لوگوں کو تھوڑی سی ہمت کرنا ہو گی اور ان لوگوں کے چنگل سے نکلنا ہو گا۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ... وہ لڑکی اسپتال میں نہیں ہے... اور اس کا بیان؟" کنول نے حیران لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں ہے۔ یہ سب سیٹھ سراج کی چالبازی ہے۔ وہ بس ایڈووکیٹ صدیقی کے لیے راستہ صاف کر رہا ہے۔"

"پر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟" کنول کے خوبرو چہرے پر الجھن تھی۔

اب عمران اسے کیا بتاتا اور اگر بتاتا بھی تو کنول اور اس کی ماں کی سمجھ میں کیا آتا تھا۔ درحقیقت تو یہ ٹیکسلا یا مردان کے کھنڈر سے نکلی ہوئی کسی "نادر شے" کا شاخسانہ تھا۔ وہ شے جو غالباً کسی گندھارا مورتی کی شکل میں تھی اور ایڈووکیٹ ابرار صدیقی کے پاس تھی۔ اس گندھارا پیس آف آرٹ کو حاصل کرنے کے لیے سیٹھ سراج وغیرہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ اس ایڑی چوٹی کے زور میں کنول کا کومل بدن اور اس کا شباب بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ بے چاری بے خبری میں

www.pkdigest.com

ایک ایسے کھیل کا حصہ بن گئی تھی جو نادر اشیا کی نہایت منافع بخش نقل و حمل سے متعلق تھا۔ اسے رشوت کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا اور وہ لاعلم تھی۔

میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع ہو کر کہاں پہنچی ہے۔ سیٹھ سراج کو تھوڑا سا سبق سکھانے کے لیے عمران نے سرراہ اس کی گاڑی کو ٹکر لگوائی تھی۔ اس ٹکر کے نتیجے میں گاڑی کے اندر رکھی ہوئی کچھ بوریاں پھٹ گئی تھیں اور ان میں سے چاولوں کے ساتھ مٹی برآمد ہوئی تھی۔ اس مٹی کے ڈانڈے بہت دور جاملتے تھے۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ عمران کے تیز رفتار ذہن نے رات کو ہی بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ وہ کنول، اس کی والدہ اور قادر کو فوری طور پر لاہور سے ملتان بھجوانے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس کے لیے وہ کافی حد تک انتظام بھی کر چکا تھا۔ صرف دس پندرہ منٹ کے اندر وہ ماں بیٹی کو پوری طرح قائل کر چکا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے اور وہ حالات کی اس حیران کن تبدیلی پر ششدر نظر آتی تھیں۔ فیاض کی کیفیت بھی اس سے ملتی جلتی تھی۔ اب ساری صورتِ حال اس کی سمجھ میں بھی بڑی اچھی طرح آرہی تھی۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ مجید مٹھو جوائے بیرونِ ملک بھجوانے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا، اس کی اصل وجہ کیا تھی۔ اس نے یہ ساری بات اپنی پھوپی اور پھوپی زاد کنول کو بتائی۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر کنول اور اس کی والدہ گھر کو تالا لگا کر ہمارے ساتھ روانہ ہو رہی تھیں۔ گھر میں کوئی ایسا قیمتی سامان تھا ہی نہیں جسے وہاں سے سمیٹا جاتا۔ بس ایک دو گہنے اور تھوڑی سی نقدی تھی۔ یہ چیزیں انہوں نے ساتھ لے لیں۔ ہم واپس راوی روڈ پر پہنچے۔ وہاں سے قادر کو گاڑی میں بٹھایا گیا۔ قادر نے ماں اور بہن کے گلے لگ کر آنسو بہائے۔ تب اس نے اچانک میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور رو رو کر معافی مانگی۔ میں جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میں نے دل میں سوچا، میں معافی دینے یا نہ دینے والا کون ہوتا ہوں؟ معافی تو وہ دیں جن کے والدین کی جان اس جرم نے لے لی۔ جن کا گھر اجڑا... جو دربدر ہوئے۔ قادر کے لیے دل میں ایک نرم گوشہ ہونے کے باوجود میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ عمران ان چاروں کو لے کر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ ان چاروں میں قادر، کنول، ان کی والدہ اور ماموں زاد فیاض شامل تھے۔ ان کو لاہور اسٹیشن سے ملتان جانے والی ایکسپریس ٹرین میں سوار ہونا تھا۔ ملتان میں انہیں عمران کے دوست نے محفوظ ٹھکانے تک پہنچانا تھا۔

وقتِ رخصت میں نے کنول کی آنکھوں میں امید کی خوب صورت کرنیں دیکھیں۔ کچھ ایسی ہی کرنیں فیاض کی آنکھوں میں بھی تھیں۔

میں بستر پر لیٹا رہا اور اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ آج قادر اور اس کے گھر والوں کا ملاپ دیکھ کر مجھے اپنے بچھڑے ہوئے بھی شدت سے یاد آنے لگے تھے... پتا نہیں کہ کتنا وقت گزر چکا تھا ان سے ملے ہوئے؟ اب تو میں دنوں کی گنتی بھی بھول چکا تھا۔ کھڑکی میں سے جھانکنے والے چاند نے میری اداسی کچھ اور بڑھا دی۔ مجھے لگا کہ ایک زمانہ بیت گیا ہے اپنی والدہ کی گود میں سر رکھے ہوئے... اور اپنی بہن کا ماتھا چومے ہوئے اور اپنے بھائی کو گلے سے لگائے ہوئے۔

میری آنکھوں میں نمی جاگنے لگی۔ میں خود کو ملامت کرنے لگا۔ آخر کیوں میں اپنے گھر والوں کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا؟ اگر میں اپنے محلے میں نہیں جانا چاہتا تھا، اپنی جان پہچان والوں سے نہیں ملنا چاہتا تھا تو یہ اور بات تھی مگر اپنے گھر والوں سے ملنے کا کوئی راستہ تو مجھے نکالنا چاہیے تھا۔ میں دیر تک اس بارے میں غور کرتا رہا... پھر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو اقبال میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اس نے ہی مجھے ہلا کر جگایا تھا...

"کیا بات ہے؟" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یار! عمران ابھی تک نہیں آیا... اس کا فون بھی بند ہے۔"

میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ "اتنی دیر کیوں کر دی؟" میں نے کہا۔

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ بارہ بجے تک اسے آجانا چاہیے تھا۔ گیارہ بجے ٹرین چلنی تھی۔"

"لیکن ہماری ٹرینیں لیٹ بھی تو گھنٹوں اور دنوں کے حساب سے ہوتی ہیں۔"

"بھئی فون تو کر دیتا۔" اقبال نے کہا اور ایک بار پھر اسے کال کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا۔

"جیلانی یا کسی اور یار دوست کو کر کے دیکھو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"کیا ہے لیکن کسی کو پتا نہیں۔" اقبال بولا اور ایک بار پھر کسی کو کال ملانے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے اٹھ کر چائے تیار کی اور اقبال کے ساتھ مل کر عمران کا انتظار کرنے لگا۔ یہ گھر بارونق علاقے میں تھا۔ سارا

دن گلی محلے اور بازار کا شور سنائی دیتا رہتا تھا لیکن اب اس گھر کے اردگرد زندگی سوئی پڑی تھی۔ اذانیں ابھی نہیں ہوئی تھیں۔ "کوئی بات نہیں یار! کہیں رک گیا ہوگا۔" میں نے اقبال کو تسلی دی۔

"میں اس لیے پریشان ہوں کہ وہ ایسی غیر ذمے داری دکھاتا نہیں۔ اسے کہیں رکنا ہوتا تو کسی بھی طرح فون پر اطلاع ضرور دیتا۔"

"ہو سکتا ہے کہ آناً فاناً کوئی کام پڑ گیا ہو۔ وہ خدائی فوجدار تو ہے ہی... کسی کا مسئلہ حل کرنے میں لگ گیا ہوگا... پچھلے ہفتے بھی تو ہم لنچ پر اس کا انتظار کرتے رہے تھے اور وہ چاچے نذیر کو لے کر اسپتال پہنچا ہوا تھا۔"

ہم باتیں کرتے رہے اور ساتھ ساتھ کسی ایسی آواز یا آہٹ کے منتظر رہے جو عمران کی آمد کی نوید دیتی۔ بازار سے کوئی گاڑی گزرتی تو ہمارے کان کھڑے ہو جاتے لیکن جلد ہی اندازہ ہوتا کہ یہ عمران کی گاڑی کی آواز نہیں ہے۔

دن چڑھ گیا تھا لیکن عمران کی واپسی نہیں ہوئی۔ اقبال کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ ایک تو وہ اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے تکلیف میں تھا، دوسرے عمران کی پریشانی اسے شدید متاثر کر رہی تھی۔ اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ بازار کے شیر فروش غلام نبی کا ملازم لڑکا ایک ٹرے میں ہم تینوں کا بھاری بھرکم ناشتا لیے کھڑا تھا۔ روزانہ یہی لڑکا ناشتا لے کر آتا تھا۔ نہاری، نان، حلوہ اور زبردست قسم کی لسی۔

میں ناشتا لے کر اندر آگیا اور ٹرے میز پر رکھ دی۔ دس بج گئے مگر ہم دونوں میں سے کسی نے ناشتے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ پریشانی بڑھ رہی تھی۔ عمران جس قسم کے روز و شب گزار رہا تھا، وہ میرے سامنے تھے۔ اس کی دوستیاں بہت تھیں تو دشمنیاں بھی بہت تھیں۔

ساڑھے دس بجے کے قریب جیلانی آگیا۔ اس نے کہا۔ "ریلوے اسٹیشن سے ہو کر آرہا ہوں۔ ملتان جانے والی ٹرین صرف پندرہ بیس منٹ کی تاخیر سے سوا گیارہ بجے روانہ ہو گئی تھی۔"

"کہیں اور بھی پتا کیا ہے؟" اقبال نے پوچھا۔

"میو اسپتال اور گنگا رام کی ایمرجنسی دیکھ آیا ہوں۔ سرفراز سے کہا ہے کہ وہ آس پاس کے دو تین تھانوں میں پتا کرلے۔ مگر لگتا نہیں کہ اس سے کوئی فائدہ ہوگا۔ اگر ہیرو بھائی نے رابطہ کرنا ہوتا تو وہ کہیں سے بھی کر سکتے تھے۔ یا تو وہ کہیں بری طرح پھنس گئے ہیں یا جان بوجھ کر رابطہ کرنا نہیں چاہ رہے۔"

"کہیں آزاد ہونے کے بعد اس قادر لبے نے ہی کوئی چکر نہ چلا دیا ہو؟" جیلانی نے کہا۔

"لگتا تو نہیں ایسے۔" اقبال نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ تو بس اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا۔ سیٹھ سراج وغیرہ کا اصل چہرہ بھی اس نے دیکھ لیا ہے۔ وہ ان سے کہیں دور چلا جانا چاہتا ہے۔"

اگلے تین چار گھنٹے بھی شدید پریشانی میں گزرے۔ کہیں سے عمران کا فون آیا اور نہ اس کی گاڑی کا کوئی سراغ ملا۔ قادر کا موبائل فون بھی عمران ہی کے پاس تھا۔ اس نمبر پر بھی اقبال اور جیلانی نے بہت سی کالیں کیں مگر جواب ندارد۔ اسی دوران میں سرکس سے اسسٹنٹ منیجر عباس کا فون آگیا۔ اسے عمران کی گمشدگی کی اطلاع ہو چکی تھی اور وہ بھی از حد پریشان تھا۔ اپنے طور پر وہ بھی عمران کو ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔

سرکس سے فون آیا تو میرا دھیان شاہین کی طرف چلا گیا۔ وہ عمران کی گرل فرینڈ تھی۔ کم از کم عمران کہتا تو یہی تھا۔ وہ اکثر سرکس میں اور پھر فون پر بھی اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔ وہ اسے اپنے ہونے والے بچوں کی ماں کہتا تھا۔ اس نے بچوں کے نام اور پیشے وغیرہ بھی منتخب کر رکھے تھے۔ اس حوالے سے شاہین کے ساتھ اس کی دلچسپ نوک جھوک ہوتی تھی۔ میں نے اقبال سے کہا۔ "یار! کہیں وہ شاہین کے پاس ہی نہ چلا گیا ہو۔"

"نہیں یار! اس کے بارے میں وہ اتنا سنجیدہ نہیں کہ رات گزارنے اس کے پاس چلا جائے۔"

"مگر شاہین کا بھی تو کوئی فون نہیں آیا۔ اگر سرکس میں اس کے گم ہونے کا پتا چل گیا ہے تو شاہین کو بھی معلوم ہو گیا ہوگا۔"

"لیکن ضروری نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عباس نے جان بوجھ کر یہ خبر شاہین سے چھپائی ہو۔ وہ بڑی جلدی رونا دھونا شروع کر دیتی ہے۔"

پتا نہیں کیوں مجھے چند ہی گھنٹوں کے اندر اپنے اردگرد ایک خلا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ عمران کی شخصیت اتنی سحر انگیز تھی کہ اس کی غیر موجودگی کو نظر انداز کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ حواس پر چھا جاتا تھا۔ دل و دماغ میں سرایت کر جاتا تھا۔ میں سوچنے لگا، ایک دن وہ تھا کہ ایک میڈیکل اسٹور کے سامنے وہ مجھے سرراہ ملا تھا۔ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا لیکن وہ میرے مردہ جسم کے ساتھ زندگی

بن کر چمٹ گیا تھا۔ میں دو تین روز اس کوشش میں رہا تھا کہ موقع ملتے ہی اس کے پاس سے کہیں کھسک جاؤں لیکن آج یہ صورتِ حال تھی کہ اس کی غیر موجودگی مجھے اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اپنی تمام تر پریشانیوں کے ساتھ میں ایک دم اکیلا رہ گیا ہوں۔ کسی کی خوب صورت مسکراہٹ، کسی کی چوڑی چھاتی اور مضبوط بازوؤں نے میرے اردگرد حفاظت کا جو حصار سا بنا رکھا تھا، وہ ایک دم ٹوٹ گیا ہے۔ میں اسے دوبارہ دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

شام کے سات بجے تھے۔ جیلانی اور سرفراز، عمران کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے... گھر میں اقبال اور میں تھے... کال بیل ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا اور چونک گیا۔ سامنے سلیم کھڑا تھا۔ یہ عمران کا وہی پرانا دوست تھا جس نے ایک رات ہمیں میڈم کی لال کوٹھی سے بروقت نکالا تھا اور ایک بڑی مصیبت سے بچایا تھا۔ بعد میں وہ یہاں عمران سے ملنے بھی آیا تھا۔ آج کافی دنوں بعد میں دوبارہ اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔ ”السلام علیکم!“ اس نے کہا اور لنگڑاتا ہوا تیزی سے اندر آ گیا۔

”خیریت تو ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے۔“ اس نے ترت جواب دیا۔ ”اقبال کہاں ہے؟“ میں نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کوئی اور تو نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”فی الحال تو نہیں۔“

ہم دونوں کمرے میں اقبال کے پاس آ گئے۔ اقبال نے اپنی زخمی ٹانگوں کی وجہ سے نیکر پہن رکھی تھی اور کسی کو فون کر رہا تھا۔ سلیم کو اور اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر وہ بھی چونک گیا۔ سلیم نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ”اقبال بھائی! اچھی خبر نہیں ہے۔ ہیرو بھائی کو میڈم کے گارڈز نے پکڑ لیا ہے اور کوٹھی لے گئے ہیں۔ میڈم کو بہت کچھ پتا چل گیا ہے۔“

یہ دھماکا خیز اطلاع تھی۔ اندیشے تو ہمارے ذہنوں میں بہت سے تھے لیکن یہ تو بدترین اندیشہ تھا جو حقیقت کا روپ دھار رہا تھا۔

”تمہیں کیسے پتا؟“ اقبال نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”میں خود دیکھ کر آ رہا ہوں۔ یہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے اقبال بھائی... عمران بھائی کی گاڑی بھی لال کوٹھی میں ہے۔ گاڑی کی رجسٹریشن بک میرے اندازے کے مطابق گاڑی کے اندر سے نہیں ملی لیکن رجسٹریشن آفس سے تو ایڈریس کا پتا چل سکتا ہے۔ اگر رجسٹریشن میں یہاں کا ایڈریس ہی لکھا ہے تو میڈم کے بندے کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ہیرو بھائی کے بعد اب آپ دونوں بھی سخت خطرے میں ہیں۔ آپ دونوں کو فوراً یہاں سے نکلنا ہو گا۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

”لیکن... یہ سب ہوا کیسے؟“

”میں نے کہا ہے نا بھائی! یہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں۔ آپ بس فوراً یہاں سے نکلیں۔ میں خود کو سخت خطرے میں ڈال کر صرف آپ کی خاطر یہاں آیا ہوں۔“

”ہم کہاں جا سکتے ہیں؟“

”کہیں بھی... لیکن یہاں سے تو فوراً نکلنا ہو گا۔“

”کیسے جائیں گے؟“ اقبال نے پوچھا۔

”میں ایک دوست کی سوزوکی وین لایا ہوں۔ بازار کے کونے پر کھڑی ہے۔“

سلیم کے تاثرات گواہ تھے کہ وہ واقعی پریشان ہے اور جو کہہ رہا ہے خلوص سے کہہ رہا ہے۔ ہم دونوں نے آپس میں مختصر مشورہ کیا اور سلیم کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے... اقبال نے پتلون پہنی اور کچھ ضروری اشیا ایک شولڈر بیگ میں رکھیں۔ ان میں کولٹ پسٹل اور اس کی قریباً پانچ درجن گولیاں بھی تھیں۔

سلیم نے کہا۔ ”اپنے باقی ساتھیوں کو بھی اطلاع دے دو کہ ان میں سے کوئی بھی اب یہاں نہیں آئے۔ وقتی طور پر یہ سارے لوگ اپنے ٹھکانوں سے اِدھر اُدھر ہو جائیں۔“

اقبال نے جیلانی کا نمبر ملایا اور اسے مختصر الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اسی دوران میں سلیم سوزوکی وین کو بالکل گھر کے دروازے کے پاس لے آیا۔ یہ اقبال کے لیے بہتر تھا۔ اپنی زخمی ٹانگوں کے ساتھ چلنا اس کے لیے کافی دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

چند ہی سیکنڈ بعد ہم گھر کو تالا لگا کے سوزوکی وین میں سوار ہو رہے تھے۔ میں سلیم کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ اقبال پچھلی نشست پر چلا گیا۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ بازار کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ دکانوں پر رش تھا۔ ٹی وی چل رہے تھے، قہقہے گونج رہے تھے۔ ایک تھڑے پر چاچا نذیر، میاں اکبر اور ان کے دیگر عمر رسیدہ ہم جولی چائے پینے اور گپیں لگانے میں مصروف تھے۔ زندگی اپنی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ اس کا موسم عموماً ایک ہی رہتا ہے۔ تاہم دیکھنے والی آنکھ کے لیے یہ موسم بدلتے رہتے ہیں۔ اس تبدیلی کا تعلق انسان کے اپنے اندر کے موسم سے ہوتا ہے۔ ہمارے

www.pkdigest.com

اندر دکھ، پریشانی اور کسی حد تک خوف کا موسم تھا اور اس کیفیت کی وجہ سے ہمارے اردگرد موجود زندگی کی کیفیت بھی بدل گئی تھی۔

ڈبل ڈور وین سست روی سے چلتی بازار سے گزری اور پھر بڑی سڑک پر آ گئی۔ بڑی سڑک پر آتے ہی جیسے سلیم کی شدید پریشانی ماند پڑنا شروع ہو گئی۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اب تم دونوں کم از کم فوری مصیبت سے تو بچ گئے ہو۔ اب کسی بازار کے چائے خانے میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر سوچ لو کہ اب کہاں جانا ہے۔“

”عمران... ٹھیک تو ہے نا...؟“ میں نے اندرونی بے تابی کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

”تابش بھائی! میں آپ لوگوں کو جھوٹی تسلی دینا نہیں چاہتا۔ انہوں نے عمران بھائی سے مار پیٹ کی ہے لیکن... یہ تو شروعات ہے۔ آگے کیا ہو گا، اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میڈم بہت زیادہ غصے میں نظر آتی ہے۔“

گاڑی ایک ٹریفک سگنل پر رکی۔ یہ مینارِ پاکستان کا علاقہ تھا۔ منٹو پارک کی طرف جانے والی سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ ایک شخص دائیں طرف سے گاڑی کے قریب آیا۔ میں سمجھا کہ وہ مانگنے والا ہے یا پھر راستہ پوچھنے والا۔ اچانک اس نے گاڑی کا سائیڈ کا دروازہ کھولا اور اقبال کے برابر میں بیٹھ گیا۔ عین اسی لمحے بائیں طرف والے دروازے پر بھی ایک شخص نمودار ہوا۔ اس نے ادھ کھلی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر لاک ہٹایا اور دروازہ کھول کر اقبال کی بائیں طرف بیٹھ گیا۔

یہ اتنی تیزی اور صفائی سے ہوا کہ بھری پُری سڑک کے باوجود کسی کو کسی طرح کا شک نہیں ہوا۔ دیکھنے والوں کو بالکل یہی لگا ہو گا کہ اندر آنے والے ہمارے شناسا ہیں اور ہم نے شاید انہیں سرِراہ لفٹ دی ہے۔ پہلے داخل ہونے والے شخص نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔ ”میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔ خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔“

اس کی آواز میں موجود سفاکی گواہ تھی کہ وہ صرف دھمکا نہیں رہا۔ میرے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے ہاتھ بڑھا کر میری سائیڈ والے دروازے کو لاک کر دیا اور احتیاطاً اپنا ہاتھ لاک کے اوپر ہی رکھا تاکہ میں اچانک باہر نکلنے کی کوشش نہ کروں۔ اس کے پاس سے الکحل اور سگریٹ کی ملی جلی بو آ رہی تھی۔ میرے جسم کے ہر مسام سے پسینا پھوٹ پڑا۔ منطقی طور پر پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اس سے پہلے عمران پر ہاتھ ڈال چکے ہیں۔

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، سلیم کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ ”خبردار سلیمے!“ دائیں طرف والا شخص پھنکارا۔ ”اب کوئی چالاکی دکھائی تو یہیں پر ڈھیر کر دوں گا اور پستول پر سائیلنسر چڑھا ہے، کسی کو آواز تک نہیں آئے گی... تیرا کھوپڑا ٹوٹے گی۔“

بولنے والے کی آواز میں ایسی درندگی تھی کہ سلیم بے ساختہ اثبات میں سر ہلانے پر مجبور ہو گیا۔

”چل، اشارہ کھل گیا ہے۔ بس چپ چاپ سیدھا چلتا جا... جہاں مڑنا ہو گا، تمہیں بتا دیں گے۔“

اب اس بات میں شبہ کم ہی رہ گیا تھا کہ یہ میڈم نادیہ یا صفورا کے پالتو غنڈے تھے۔ ممکن تھا کہ کسی شک کی بنا پر انہوں نے سلیم کا پیچھا کیا ہو اور یہاں تک پہنچ گئے ہوں... کچھ ہی دیر بعد یہ ”پیچھے“ والی بات درست معلوم ہونے لگی۔ ایک ٹویوٹا جیپ مسلسل ہمارے پیچھے آ رہی تھی۔ ہماری وین میں گھسنے والے دونوں افراد نے جیپ والوں کو ہاتھ سے چند اشارے بھی کیے۔ ہماری گاڑی میں گھسنے والے دونوں افراد صورتوں سے ہی بدمعاش نظر آتے تھے۔ وہ دونوں یقیناً اس جیپ سے ہی اترے تھے۔ دونوں نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ایک کے ہاتھ میں لمبی نال کا پستول تھا جس کی ایک جھلک میں دیکھ چکا تھا۔ یہ لمبی نال دراصل پستول کا سائیلنسر تھا۔ دوسرے شخص نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ سر پر گرم ٹوپی تھی۔ مجھے شک پڑ رہا تھا کہ اس کی چادر کے نیچے کوئی چھوٹے بیرل والی رائفل ہے۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔

ایک جگہ سلیم نے گاڑی آہستہ کر دی۔ یوں لگتا تھا کہ گھبراہٹ کی وجہ سے اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا یا اس قسم کا کوئی اور کام ہو جائے گا۔ وہ کانپتی آواز میں گرم چادر والے کو مخاطب کر کے بولا۔ ”میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں بختیار صاحب!“

”بکواس بند کرو۔“ عقب سے دہاڑتی ہوئی آواز آئی۔ ”چپ چاپ گاڑی چلاتے رہو۔ اب جو بات ہو گی، کوٹھی پہنچ کر ہی ہو گی۔“

”لیکن میں نے...“

”چپ ہو جا۔“ گرم چادر والا چنگھاڑا۔ ”نہیں تو ابھی گردن توڑ دوں گا تیری۔“ میں نے بولنے والے کی آواز اور لب و لہجے سے اندازہ لگایا کہ یہ ان گارڈز میں سے ایک ہے

جن سے چھوٹی میڈم کی کوٹھی میں عمران اور اقبال کی مار اماری ہوئی تھی۔ بعدازاں عمران نے ان بٹے کٹے گارڈز کو دو باتھ رومز میں بند کر دیا تھا۔

عقب میں بیٹھا ہوا چادر پوش ڈرائیونگ کے سلسلے میں سلیم کو ہدایات دیتا رہا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم شاہراہِ قائداعظم پر آ گئے ہیں اور ائرپورٹ کی طرف جا رہے ہیں۔ ائرپورٹ کی طرف جانے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ہمیں لال کوٹھیوں میں لے جایا جا رہا ہے۔

میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ ہمیں کسی پولیس ناکے پر روک لیا جائے اور پولیس والوں کو علم ہو جائے کہ اس گاڑی میں کیا صورتِ حال ہے۔ لیکن یہ تو تب ہوتا، جب پولیس اہلکار سرسری جائزہ لینے کے بجائے غور و فکر کرتے... اور عمران نے صرف تین دن پہلے کہا تھا کہ ہماری پولیس غور و فکر کرنے کے علاوہ اور سب کچھ کرتی ہے۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہم دو ناکوں پر سے گزرے اور خیر خیریت سے گزر گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ "خیر خیریت" میڈم کے کارندوں کے نقطۂ نظر سے تھی۔

یہ بڑا کٹھن سفر تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں پھانسی کا سزاوار ہوں اور پھانسی پانے کے لیے تختۂ دار کی طرف جا رہا ہوں۔ وہاں کیا ہو گا؟ وہ لوگ کس طرح پیش آئیں گے؟ کیا وہ جان چکے ہیں کہ ہم اس سے پہلے ایک دفعہ لال کوٹھی میں گھسے تھے؟ کیا انہیں معلوم ہے کہ مجید مٹھو کی موت میں ہمارا ہاتھ ہے؟ اس طرح کے اَن گنت سوالات تھے جو ذہن میں اودھم مچا رہے تھے اور گاڑی بھاگتی جا رہی تھی۔ گاڑی کے اندر تناؤ اور خاموشی کی ایک ایسی کیفیت تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں کل رات اپنے گھر والوں سے ملنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ مجھے آج یا پھر کل اس پروگرام پر عمل کرنا تھا۔ والدہ، فرح اور عاطف کو گھر سے باہر کہیں بلانا تھا اور ان سے ملاقات کرنی تھی لیکن اب وہ ملاقات ایک دور دراز کا خیال محسوس ہوتی تھی۔ ایک بعید از قیاس سوچ۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں جن راستوں پر چل کر لال کوٹھیوں کی طرف جا رہا ہوں، ان راستوں کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔ نہ ان در و دیوار کو، نہ ان لوگوں کو، نہ اس شہر کی گہما گہمی کو۔ مجھے شاید گولی مار دی جائے گی اور لال کوٹھی کے اندر ہی کسی باغیچے وغیرہ میں گاڑ دیا جائے گا۔

پھر عمران کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے ایک دن کہا تھا۔ "یار! ایک تو تم وہ بات سب سے پہلے سوچنے لگتے ہو جو سب سے آخر میں سوچنی چاہیے۔ تمہارے ذہن میں ہر طرح کے اندیشے بجلی کی رفتار سے داخل ہوتے ہیں۔"

کیا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا؟ میں خوف پیدا کرنے والے خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس طرح تکلیف دہ خیالات سے چھٹکارا کہاں ملتا ہے۔ جلد ہی دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی رہائشی علاقے میں داخل ہوئیں اور پھر لال کوٹھیوں کے اندر چلی گئیں۔ اقبال تو شاید پہلے بھی اس طرح کے حالات سے گزرتا رہا تھا مگر میری حالت بُری تھی۔ لگتا تھا کہ دل سینے کے بجائے کنپٹیوں میں دھڑک رہا ہے اور پورے جسم میں سے خون نچڑ گیا ہے۔

میرے لیے سب سے تکلیف دہ خیال یہ تھا کہ اگر یہاں لال کوٹھیوں میں میری ملاقات سیٹھ سراج یا اس کے کسی ایسے کارندے سے ہو گئی جو مجھے جانتا ہوا تو پھر کیا ہو گا؟ ایسی صورت میں، میں براہِ راست اس سارے معاملے میں ملوث ہوتا تھا۔ میرے ملوث ہونے کے بعد میرے اور میرے گھر والوں کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا... اور یہی وہ خوف تھا جو پہلے دن سے آج تک ہر گھڑی میرا دامن گیر رہا تھا۔

گاڑی چھوٹی میڈم یعنی نادیہ کی کوٹھی میں داخل ہوئی اور پورچ میں پہنچ کر رک گئی۔ اس کے پیچھے ٹویوٹا جیپ رک گئی۔ گاڑی رکتے ہی میڈم کے گارڈز نے سلیم کو کھینچ کر [illegible] میں سے نکال لیا اور بُری طرح مارنا شروع کر دیا۔ وہ زمین پر گر پڑا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ منت بھی کر رہا تھا۔ اس کا کوٹ پھٹ گیا اور منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ لوگ اسے کھینچتے ہوئے وہاں سے لے گئے۔ ہم دم بخود کھڑے تھے۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا... عمران کی موجودگی میں میرے اندر جو خاص قسم کی توانائی پیدا ہو جاتی تھی، اس کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

بہر طور خیریت ہی گزری۔ فوری طور پر ہمارے ساتھ مار پیٹ نہیں کی گئی۔ ہمیں کوٹھی کے مہمان خانے میں لے جایا گیا۔ اس عمارت کے داخلی دروازے پر "انیکسی" کے الفاظ لکھے تھے۔ پہلے ہمیں ایک چوکور کمرے میں بٹھایا گیا۔ گرم چادر والا خطرناک صورت گارڈ مسلسل ہمارے ساتھ رہا۔ اس نے چادر کے نیچے سے روسی ساخت کی چھوٹے بیرل والی رائفل نکال لی تھی۔ ایک گارڈ کمرے سے باہر بھی چوکس حالت میں موجود تھا۔ عمارت کے کسی قریبی کمرے سے رونے چلانے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں ہمارے رونگٹے کھڑے کر رہی تھیں۔ بلاشبہ یہ سلیم کی آوازیں

تھیں۔ اسے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

گرم چادر والے گارڈ نے سفاک لہجے میں کہا۔ "انتظار کی تکلیف کے لیے تم دونوں سے معافی چاہتے ہیں۔ تمہارے یار سلیم صاحب کو چھینٹی لگ رہی ہے۔ پانچ دس منٹ میں وہ فارغ ہو جاتے ہیں تو پھر تمہاری باری آتی ہے۔"

میرے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ گارڈ بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میرے تاثرات نوٹ کرنے کے بعد بولا۔ "اگر سلیم صاحب والی عزت افزائی سے بچنا چاہتے ہو تو کچھ چھپا کر نہ رکھنا۔ بس یہی ایک قیمتی مشورہ ہے جو میں تمہیں دے سکتا ہوں۔"

میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ میری نگاہیں عمران کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی سلامتی اور زندگی کے حوالے سے میری بے قراری انتہا کو پہنچنے لگی۔ اسی دوران میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر میں نے دو گارڈز کے ساتھ ایک عورت کو آتے دیکھا۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں اسے یہاں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یقیناً اقبال کی بھی یہی کیفیت رہی ہو گی۔ یہ ہٹی کٹی عورت زلیخا تھی۔ وہی جس سے ہماری ملاقات ہڑپہ کے ایک مکان میں ہوئی تھی۔ اس دھند آلود سرد رات میں ہم پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ زلیخا کے گھر کے ایک کمرے میں ایک کنواں نما گڑھا ہے۔ زلیخا کے ساتھ سراج کا ناجائز تعلق بھی ثابت ہوا تھا۔ بعدازاں زلیخا اور اس کے خاوند چھیدے نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہماری آمد کے بارے میں اپنی زبان بالکل بند رکھیں گے مگر اب اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ اپنی زبان بند نہیں رکھ سکے۔

زلیخا نے چادر کی اوٹ سے ہمیں دیکھا۔ وہ آج بھی زرق برق کپڑے پہنے ہوئے تھی اور کانوں میں جگمگاتے جھمکے تھے۔ وہ بولی۔ "ہاں جی، یہی ہیں وہ دونوں۔ یہ اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم خفیہ پولیس کے بندے ہیں۔"

"یہ کون سی خفیہ پولیس ہے بھئی جس کا پتا خفیہ پولیس کو بھی نہیں؟" گارڈ نے اقبال کی ٹانگ پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے پوچھا۔

اقبال کی ٹانگ پہلے ہی زخمی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔

زلیخا سے ہماری شناخت پریڈ کرانے کے بعد اسے واپس بھیج دیا گیا۔ اس دوران میں کسی قریبی کمرے سے بلند ہونے والی آہ و بکا ختم ہو گئی۔ شاید سلیم کی خلاصی ہو گئی تھی یا پھر وہ ویسے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔

گرم چادر والے گارڈ نے ایک بار پھر بغور میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ غالباً اسے میرے چہرے پر کوئی ایسی بات نظر آئی جس نے اسے باور کرا دیا کہ مجھ سے پوچھ گچھ نسبتاً آسان ثابت ہو گی۔ اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اٹھنے میں دیر کی تو دو افراد نے مجھے بازوؤں سے تھام لیا اور دروازے کی طرف لے جانے لگے۔

اقبال نے پکار کر کہا۔ "دیکھو، اسے کچھ پتا نہیں۔ جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھو۔ یہ بس ہمارے ساتھ تھا... ہمارے کسی کام میں شامل نہیں تھا۔"

گارڈ بولا۔ "تم ذرا چھری کے نیچے سانس لو۔ تم سے بھی پورے سوال جواب کریں گے۔"

وہ مجھے پکڑ کر ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔ یہاں کھڑکیوں پر لوہے کی گرلیں تھیں اور دروازہ شیشم کی مضبوط لکڑی کا تھا۔ میرا رہا سہا خون بھی نچڑ گیا۔ چھت سے نائیلون کی ایک رسی لٹک رہی تھی۔ یہ یقیناً مطلوبہ معلومات کے لیے مطلوبہ شخص کو سیدھا یا الٹا لٹکانے کے لیے تھی۔ ایک تختہ نظر آ رہا تھا جس پر کسی شخص کو لٹایا جا سکتا تھا اور اس کی کلائیوں اور ٹخنوں وغیرہ کو "اسٹریپس" سے باندھا بھی جا سکتا تھا۔ پانی کا ایک بڑا ٹب بھی پڑا تھا جس کا مقصد فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ عمران کا دوست سلیم تھوڑی دیر پہلے یہیں موجود تھا۔ فرش پر لہو کے تازہ قطرے تھے۔ سلیم کی گرگابی اور اس کی ٹوٹی ہوئی گھڑی بھی وہیں فرش پر پڑی تھی۔ غالباً ان اشیا کو میری اعصاب شکنی کے لیے قصداً وہاں پڑا رہنے دیا گیا تھا اور مجھے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ میرے اعصاب واقعی ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ قرب و جوار میری نگاہوں میں گھوم رہے تھے اور محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی بھی وقت بے ہوشی کے اندھیرے میں کھو جاؤں گا... ہاں، میں وہی تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے ہاتھ سے اپنے جسم پر گولی چلائی تھی لیکن تب کی اور اب کی کیفیت میں بہت فرق تھا۔

اچانک میری آنکھوں کے سامنے چمک سی لہرا گئی۔ میں نے دیکھا کہ میڈم نادیہ ہوشربا چال چلتی میری طرف آ رہی ہے۔ وہ ایک سیاہ ٹیکر اور دو بڑے بڑے پھولوں والی سفید شرٹ میں تھی۔ شرٹ پر ایک رائل بنگال ٹائیگر کی شبیہ پرنٹ تھی۔ یہ ٹائیگر نادیہ کے جسم سے لپٹا نظر آتا تھا۔ نادیہ کی آنکھوں میں نشہ تیر رہا تھا۔ اپنی اونچی ایڑی پر

www.pkdigest.com

ٹھک ٹھک کرتی، وہ میرے عین سامنے کھڑی ہوئی تو کسی قیمتی پرفیوم کی مہک میرے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ وہ گرم چادر والے گارڈ کو ڈانٹتے ہوئے بولی۔ ''اوئے بختیار! کیا کرنے لگے ہو اس کے ساتھ۔ اس کو مارنا ہے؟ اس کا چہرہ نہیں دیکھ رہے تم۔ یہ اور ٹائپ کا ہے۔ پیار سے ہی سب کچھ بتا دے گا۔ کھول دو اسے۔''

میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ میڈم نے سمجھا کہ مجھے باندھا گیا ہے۔ گارڈ بختیار بولا۔ ''ابھی ہم نے اسے باندھا ہی نہیں ہے جی۔''

''ٹھیک ہے۔ اسے ایک مہمان کی طرح ڈرائنگ روم میں لاؤ۔ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی لے کر آؤ۔''

''اور وہ دوسرا میڈم؟'' بختیار کا اشارہ یقیناً اقبال کی طرف تھا۔

''دیکھو... گدھے گھوڑے کو ایک لاٹھی سے نہیں ہانکا کرتے۔ وہ خرانٹ ہے۔ اس سے دوسری طرح نمٹیں گے۔''

چند ہی سیکنڈ بعد میں اس ٹارچر روم سے نکل کر ایک سجے سجائے شان دار ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ میرے پاؤں دبیز قالین میں دھنس رہے تھے۔ دروازوں، کھڑکیوں پر نیلے رنگ کے مخملی پردے لہراتے تھے... اور دیواروں پر نایاب پینٹنگز لگی ہوئی تھیں۔ تاہم ان پینٹنگز کا رنگ ڈھنگ وہی تھا جو ہم پہلے دیکھ چکے تھے۔ عریانی، رنگینی اور فحاشی۔ کہنے کو تو یہ آرٹ تھا لیکن ایسی ہی چیزیں آرٹ کے نام پر بدنما دھبا ہوتی ہیں۔

میڈم نادیہ ہاتھ میں شیری کا گلاس لیے آئی اور بے تکلفی سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر مجھ سے تین چار فٹ کی دوری پر بیٹھ گئی۔ آڈیو سسٹم پر بہت مدھم آواز میں انگلش میوزک بج رہا تھا۔ وہ عجیب انداز میں براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اچانک بولی۔ ''اس رات تم اچانک میرے گھر میں آئے اور پھر اچانک بھاگ بھی گئے... ایسا کیوں کیا تم نے؟''

مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ زبان منہ کے اندر چمڑے کا سوکھا ہوا سخت ٹکڑا بن گئی تھی۔ میری حالت دیکھ کر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور شیری کے دو بڑے گھونٹ بھر کر بولی۔ ''اچھا چھوڑو اس نازک ٹاپک کو۔ ہم اور بات کرتے ہیں... تم یہ بتاؤ کہ...'' یکایک اسے رکنا پڑا۔ اس کے بیش قیمت موبائل فون کی تیل ہونے لگی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''ہاں ہاں۔ میں نے آواز پہچان لی ہے سراج... کیسے ہو؟... ہاں، میں بھی فائن ہوں۔ کب آ رہے ہو تم؟... نہیں

نہیں... ابھی تو ضرورت نہیں۔ صبح آ جاؤ... دس بجے کے بعد آرام سے آ جانا... اوکے... بائے۔''

اس نے کال منقطع کر دی۔ تو وہی ہونے والا تھا جس کا اندیشہ میری جان مسلسل کھا رہا تھا۔ چند گھنٹے بعد یہاں سیٹھ سراج سے ملاقات ہونے والی تھی۔ دو ملازماؤں نے چائے اور اس کے بہت سے لوازمات لا کر سامنے خوب صورت میز پر سجا دیے۔ میڈم نادیہ بڑی نرمی سے بولی۔

''دیکھو مسٹر تابش! اس ساری اسٹوری میں مجھے کچھ باتیں تو پہلے سے معلوم ہیں۔ یہ باتیں تم سے سن کر میں تمہارا اور اپنا ٹائم ضائع نہیں کروں گی۔ تم مجھے صرف وہ باتیں بتاؤ جو مجھے اب تک معلوم نہیں ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ جزیرے پہنچنے سے پہلے کیا ہوا؟ اور مثلاً یہ کہ یہاں میرے گھر سے بھاگنے کے بعد کہانی میں کیا ٹرن آئے۔ اور مثلاً یہ کہ... خیر چھوڑو۔ پہلے تو یہی بتا دو کہ تم لوگ سراج کے پیچھے لگے کیسے؟ وہ تو بڑا خرانٹ بندہ ہے۔ اس نے کہاں تمہیں گنجائش دی کہ تم اس کہانی میں گھس بیٹھے؟''

''دیکھیں میڈم! میں سچ کہتا ہوں۔ میرا اس سارے معاملے سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں تو...''

''مسٹر تابش!'' میڈم نادیہ نے انگلی اٹھا کر مجھے روکا۔ ''تمہاری حیثیت میرے گیسٹ کی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تمہارا اسٹیٹس برقرار رہے۔ اس لیے ایک بار پھر بتا رہی ہوں... مجھے وضاحت نہیں چاہیے، بس اپنے سوال کا جواب چاہیے اور سوال یہ ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی سیٹھ سراج جیسے سیانے کوے کے پیچھے کیونکر لگ گئے؟'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ کل سویرے سیٹھ سراج کے یہاں پہنچنے کے بعد میرے بارے میں بہت سی باتیں میڈم نادیہ کو معلوم ہو جانی ہیں۔ تو کیوں نا میں خود ہی اپنے بارے میں بتا کر میڈم نادیہ کا اعتماد حاصل کروں۔ مجھے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ سیٹھ سراج نے اقبال کو بھی یقیناً پہچان لینا ہے۔ یہ اقبال ہی تھا جس نے سرِ راہ سیٹھ سراج کی وین سے گاڑی ٹکرائی تھی اور پھر سیٹھ کی تسکی بخش ٹھکائی بھی کر دی تھی۔ تو پھر جب یہ سب کچھ سامنے آنے ہی والا تھا تو پھر بہتر تھا کہ میں اپنی زبان سے بتا دوں۔

میڈم نادیہ کا صوفے پر بیٹھنے کا انداز تو بہ شکن تھا۔ وہ مخمور نظروں سے میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرنے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

بدمعاش

آصف ملک

ایک زمانہ تھا جب ہر محلے میں کسی نہ کسی بدمعاش کا راج ہوا کرتا تھا... اس کی اجازت کے بغیر پتا بھی نہیں کھڑکتا تھا... وقت بدلا تو بدمعاشوں کی سرگرمیاں بھی بدلتی چلی گئیں... کچھ ایسے ہی دور کی یاد تازہ کرتی منفرد انداز کی تحریر... جو آپ کو بھی بیتے دنوں کی یاد دلا دے گی

نیکی و بدی کے درمیان حائل فاصلے کو عبور کرتی سبق آموز کہانی

انیسویں صدی کے آغاز میں سالٹ لیک سٹی ایک چھوٹا سا خوابیدہ اور گرد آلود شہر تھا۔ وسیع و عریض میدان میں قائم اس شہر کو شمال سے جنوب کو ملانے والی شاہراہ کے ایک اہم مستقر کی حیثیت حاصل تھی۔ سرِ شام یہاں جنوب اور شمال سے قافلے اترنا شروع ہو جاتے اور سرِ شام ہی خوابیدہ شہر بیدار ہونا شروع ہو جاتا۔ اس کے شراب خانے، ہوٹل اور جوئے خانے زندگی سے معمور ہو جاتے۔ گلیوں میں چہل پہل شروع ہو جاتی۔ اور گاہکوں کی تلاش میں پیشہ ور عورتیں بن سنور کر نکل پڑتیں۔ مگر تمام تر رونق کے باوجود یہ ایک پُرامن شہر تھا اور یہاں قرب و جوار کے شہروں کی طرح مار کٹائی اور لوٹ مار کی وارداتیں روز مرہ کا معمول نہیں تھی۔ کئی ہفتوں بعد کوئی واردات ہوتی تو اس کا ہفتوں تک چرچا بھی رہتا تھا... یہاں کے پولیس والے چین کی بانسری بجاتے تھے۔ خبروں کی قلت کی وجہ سے معمولی سی بات بھی خبر بن

جاتی تھی۔ خبر کی اصل اہمیت اس فرد کی وجہ سے ہوتی جس سے خبر وابستہ ہوتی۔ شہر کا سب سے اہم فرد اسے مانا جاتا... جو سب سے زیادہ خبروں میں رہتا تھا۔ اس لحاظ سے اہم ترین فرد ہوگارڈ تھا۔ سام ہوگارڈ شہر کا سب سے بڑا بدمعاش تھا۔ اس کی سرکردگی میں شراب اور جوئے کا ایک اڈا کام کرتا تھا۔ شہر میں اور بھی بدمعاش تھے لیکن وہ سب ہوگارڈ سے دبتے تھے۔ کوئی اس کے مدمقابل آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ جو ایسی جرأت کرتا، اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ کم سے کم اہلِ شہر کو کوئی ایسا فرد یاد نہیں تھا جس نے ہوگارڈ کے سامنے آنے کی جرأت کی ہو اور صحیح سلامت واپس چلا گیا ہو۔ ہوگارڈ ایسے کسی شخص پر رحم کھانے کا قائل نہیں تھا۔

ہوگارڈ ایک طویل قامت اور مضبوط جسامت کا شخص تھا۔ اس کا قد کوئی چھ فٹ چار انچ اور وزن ڈھائی سو پاؤنڈ سے کم نہیں تھا۔ اوپر سے اس کی مہیب ناک مونچھیں اور چڑھی

www.pkdigest.com

ہوئی سرخ آنکھیں کسی کا دل دہلانے کے لیے کافی تھیں۔ اس کے ہاتھ کسی بیلچے سے کم نہیں تھے۔ اوپر سے اس کے پاس چمڑے کی ایک خطرناک بیلٹ تھی جس کی ایک ہی ضرب حریف کو چھٹی کا دودھ یاد دلانے کے لیے کافی سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس وقت آتشیں اسلحے کا رواج کم تھا۔ بندوق ہوتی تھی لیکن لوگ لڑائی جھگڑوں میں اس کے مقابلے میں چاقو اور تلوار زیادہ پسند کرتے تھے۔

ہوگارڈ کے پاس آتشیں اسلحے کی کمی نہیں تھی۔ اس کے پاس کئی رائفلیں اور پستول تھے مگر ذاتی طور پر وہ ہاتھ پاؤں کی لڑائی پسند کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جو مزہ اپنے ہاتھ سے کسی کا بازو توڑنے میں آتا ہے، وہ مزہ کسی کو دس گز دور سے گولی مارنے میں کہاں... ہوگارڈ سب سے بڑا بدمعاش تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ باقی اس سے کسی طرح کم تھے۔ جب کوئی اس کے سامنے آتا تو فتح ہوگارڈ کی ہوتی تھی۔ ہر فتح کے بعد اس کی دھاک پہلے سے زیادہ بیٹھ جاتی۔ لوگوں نے رفتہ رفتہ تسلیم کرلیا تھا کہ وہی سب سے بڑا بدمعاش ہے۔ یہ ایک ٹائٹل تھا جو اس کی صلاحیتوں کے اعتراف میں اسے دیا گیا تھا۔

روز اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی خبر شراب اور جوئے خانوں میں زیر گردش رہتی۔ عام طور سے یہ خبر اس کی گوشمالی کے بارے میں ہوتی تھی۔ ہوگارڈ کی بعض لڑائیاں تو اتنی مشہور تھیں کہ مدتوں لوگ ان کا ذکر کرتے اور بعض افراد تو اس سے روزی تک کماتے تھے۔ وہ اس طرح کہ شراب خانوں میں وہ باقاعدہ ایکٹ کرکے اور ڈائیلاگ کے ساتھ بتاتے کہ ہوگارڈ نے اپنے کس حریف کی کس طرح درگت بنائی تھی۔ ان اداکاروں کو شراب خانوں کے مالکان نے رکھا ہوا تھا کیونکہ ان کے ایکٹ کی وجہ سے زیادہ لوگ آتے تھے اور ان کی سیل زیادہ ہوتی تھی۔

ہوگارڈ کی سب سے مشہور لڑائی لاسٹر کے ساتھ تھی۔ لاسٹر بھی ایک بڑا بدمعاش تھا۔ وہ ہوگارڈ کے سامنے آنے سے پہلے شہر کا تسلیم شدہ سب سے بڑا بدمعاش تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بدمعاشی سب تسلیم کریں اور اس بنا پر وہ بلاوجہ بھی دوسروں کو تنگ کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ جب ہوگارڈ نے اپنا شراب خانہ کھولا تو وہ اس کے مدمقابل آنے لگا۔ شروع میں ہوگارڈ برداشت کرتا رہا۔ جب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہوگیا تو ایک دن وہ لاسٹر کے اڈے پر پہنچ گیا۔

لاسٹر کی دہشت ایسی تھی کہ کوئی اس کے سامنے آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے اڈے پر پہنچ جانا تو بہت ہی بڑی بات تھی۔ یہی نہیں بلکہ ہوگارڈ نے اسے جاتے ہی چیلنج کردیا۔ ''اگر تم مجھے شکست دے دو تو میں اپنا شراب خانہ تمہارے حوالے کردوں گا۔ اگر تم مجھ سے ہار گئے تو تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم کبھی میرے سامنے نہیں آؤ گے۔''

لاسٹر نے غصے اور جوش میں آکر اس کا چیلنج قبول کرلیا۔ جسامت اور مضبوطی میں وہ کسی طرح ہوگارڈ سے کم نہیں تھا۔ بس ایک فرق تھا کہ ہوگارڈ چوبیس برس کا جوان تھا اور لاسٹر پچاس برس کا بوڑھا۔ انہوں نے لڑائی کے لیے باقاعدہ قواعد وضوابط طے کیے اور ایک مجمعے کے سامنے ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔ ایک جج بھی تھا جو فیصلہ کرتا کہ فاؤل کس کا ہے۔ مقابلہ کسی ایک کے مرنے یا شکست تسلیم کرنے تک جاری رہتا۔ مقابلے میں صرف ہاتھ پیر اور لکڑی کی چیز استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ دھات کا کوئی ہتھیار یا آتشیں اسلحہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان دونوں نے ڈنڈوں کا انتخاب کیا۔

لڑائی کا آغاز بڑے دھواں دھار انداز میں ہوا اور دونوں نے ایک دوسرے کو لہولہان کردیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دونوں برابر کی چوٹ دے رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہوگارڈ کا پلڑا بھاری ہوتا چلا گیا۔ لاسٹر کے زخموں نے اسے کمزور کردیا۔ اس کے برعکس ہوگارڈ کے زخموں نے اس [illegible] غصے کی طاقت بھی بھردی [illegible] کے طویل مقابلے کا انجام لاسٹر کی شکست پر ہوا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ جج نے ہوگارڈ کو فاتح قرار دے دیا۔ یوں اس شہر سے لاسٹر کی حکمرانی کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی جگہ ہوگارڈ نے لے لی۔

اس کے بعد لاسٹر کا رتبہ کم ہوتا چلا گیا اور پھر ایک دن کسی نے لاسٹر کو قتل کردیا تو اس کا باب ہی ختم ہوگیا۔ اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ ہوگارڈ اس کی جگہ سنبھال لے گا اور جو لاسٹر کرتا تھا، وہی کرے گا۔ یعنی دوسروں کو تنگ کرتا اور ان کی آمدنیوں میں سے اپنا حصہ وصول کرتا۔ لاسٹر کے چیلوں کو بھی اس کی توقع تھی اور وہ اس کے ساتھ ملنے کو تیار بھی تھے مگر ہوگارڈ نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے کام میں مگن رہا اور اس نے لاسٹر کے چیلوں کو بھگا دیا۔ وہ دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کا قائل نہیں تھا بلکہ اس نے اپنے لڑکے خود تیار کیے تھے اور خود ان کی تربیت کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود مخالفوں پر زیادہ حاوی ہوجاتے تھے۔

اس پر دوسرے چھوٹے موٹے بدمعاشوں نے سکون کا سانس لیا تھا مگر ساتھ ہی کچھ دماغوں میں کیڑا کلبلانے لگا

کہ وہ بگ باس بن جائیں۔ جب وہ اس کی کوشش کرتے تو سب سے پہلے ہوگارڈ ان کے سامنے آکھڑا ہوتا۔ جو اس سے کتراتا تھا، اس کی عزت ویسے ہی مٹی میں مل جاتی تھی اور جو اس سے لڑتے تھے، ان کی عزت کے ساتھ ساتھ ساکھ بھی مٹی میں مل جاتی۔ ہوگارڈ نے کبھی بگ باس بننے کی کوشش نہیں کی لیکن بدمعاشی کے اونچے درجے تک جو راستہ جاتا تھا، اس پر ہوگارڈ براجمان تھا۔ اس سے نمٹے بغیر آگے جانا ممکن نہیں تھا۔

چالیس سال کی عمر میں ہوگارڈ ایک ایسا نام بن چکا تھا جس سے شہر کا بچہ بچہ واقف تھا اور وہ اسے پسند بھی کرتے تھے۔ وہ واحد بدمعاش تھا جو کسی گلی سے گزرتا تو لوگ اسے خوف سے نہیں بلکہ عزت سے سلام کرتے تھے۔ اس نے کمایا تھا لیکن دوسروں سے چھین کر نہیں بلکہ اپنے زور بازو پر... اس وجہ سے بدمعاشوں میں بھی اس کی عزت تھی مگر اس کے کچھ مخالف بھی تھے جو اس بات پر کڑھتے تھے کہ ایک بدمعاش شہر کا سب سے مقبول آدمی ہے۔ یہ وہ امرا تھے جن کے پاس دولت تھی لیکن عام آدمی کی نظر میں ان کی کوئی عزت نہیں تھی۔

اسی شہر سے ایک نوجوان کوئی بیس برس پہلے اعلیٰ تعلیم کے لیے واشنگٹن گیا جو ان دنوں ملک کا سب سے بڑا شہر بھی تھا اور نیویارک کو بھی یہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ڈینس ہوور نامی اس نوجوان نے واشنگٹن یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہیں پڑھانا [illegible] بیس برس گزر گئے تھے اور ڈینس اب پروفیسر ڈینس ہوور کے نام سے مشہور تھا۔ سالٹ لیک سٹی سے جانے کے بعد برسوں اس کا اپنے شہر میں آنا نہیں ہوا۔ اس نے شادی کرلی اور اس کے بچے بھی واشنگٹن میں پیدا ہوئے۔ اس کے دو بیٹے اور دو ہی بیٹیاں تھیں۔ ان دنوں اس سے سالٹ لیک سٹی کے ایک امیر آدمی کینٹ ایرکسن نے رابطہ کیا اور کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ اپنے شہر کے نوجوانوں کے لیے ایک اعلیٰ درس گاہ بناؤں۔ اس کے لیے مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔''

ڈینس یہ سن کر پُرجوش ہوگیا کہ اس کے آبائی شہر میں ایک اعلیٰ تعلیمی درس گاہ قائم ہوسکتی ہے۔ یہ خیال اسے کئی بار آیا تھا لیکن اس مقصد کے لیے درکار وسائل کا سوچ کر وہ کوئی قدم نہیں اٹھا پاتا تھا۔ جب ایرکسن نامی اس کروڑپتی نے اس سے رابطہ کیا تو اسے اپنا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آیا۔ اس نے فوراً ہامی بھرلی۔ ایرکسن اسے اس تعلیمی ادارے کا سربراہ بنانا چاہتا تھا تاکہ اس کی سرکردگی میں کام ہو تو یہ ادارہ ایک مثال بن جائے۔ ڈینس ایک مشہور ماہر تعلیم تھا اور اس حیثیت

امید

''کیا یہ وہی کہانی نہیں جسے میں نے تین سال پہلے ناقابل اشاعت قرار دیا تھا؟'' ایڈیٹر نے خفگی سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' مصنف نے خلوص سے اعتراف کیا۔

''تو پھر آپ اسے دوبارہ کیوں لے آئے؟'' ایڈیٹر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''میں نے سوچا شاید تین سال میں آپ کو کچھ عقل آگئی ہو۔'' مصنف نے اپنا مسودہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

سے اسے کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا تھا۔ ایرکسن نے نہ صرف کالج کے لیے زمین عطیہ کی بلکہ اس کی تعمیر اور دوسرے اخراجات کے لیے ایک بڑی رقم بھی مختص کی۔ اس نے ڈینس سے کہا کہ وہ پورے ملک سے قابل اساتذہ جمع کرے۔

اتفاق سے یہ کالج ہوگارڈ کے شراب خانے کے پاس ہی تھا۔ اس سے پہلے سالٹ لیک سٹی میں کوئی کالج نہیں تھا اس لیے مقامی لوگوں میں اس بارے میں بڑا جوش وخروش پایا جارہا تھا۔ جب ڈینس اپنی فیملی کے ساتھ واپس آیا تو شہریوں نے اس کے اعزاز میں ایک استقبالیہ دیا۔ ڈینس کی رہائش کے لیے کالج کے پاس ہی ایک شان دار بنگلا مختص کیا گیا۔ کالج کے سربراہ کی حیثیت سے اسے بہترین تنخواہ دی جارہی تھی۔

کالج کی تعمیر اور تکمیل کے لیے ایک سال کا وقت مقرر تھا۔ پروفیسر نے اپنے طور پر پہلے ہی کلاسز شروع کردیں۔ وہ مقامی طلبا کو جو کالج میں پڑھنا چاہتے تھے، ابھی سے تیار کررہا تھا۔ صبح اور شام کو اس کی رہائش گاہ پر طلبا پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ جب ایرکسن نے کالج کا منصوبہ شروع کیا تو کسی نے اس پر خاص توجہ نہیں دی لیکن جب وہ پروفیسر کو اس کالج کا پرنسپل بناکر لایا تو یک دم ہی سب کی توجہ اس طرف ہوگئی کیونکہ ڈینس کا شمار شہر کے ان فرزندوں میں ہوتا تھا جنہوں نے اس شہر کا نام روشن کیا تھا۔

پروفیسر ڈینس کے آنے سے شہر میں اس کے چرچے ہوگئے تھے۔ جہاں چار لوگ جمع ہوتے وہاں پروفیسر اور کالج کا تذکرہ لازمی ہوتا۔ یہ تذکرے شراب خانوں اور جوئے خانوں میں بھی چلتے تھے کیونکہ یہ دونوں مقامات شہریوں کے لیے لازمی تھے........ ہر مرد شام کو کسی نہ کسی شراب خانے کا رخ ضرور کرتا۔ لوگ اس بارے میں اتنے پُرجوش تھے کہ انہوں نے کالج کے قیام سے پہلے ازخود کالج کی ترقی کے لیے تجاویز دینا شروع کردیں۔ لوگوں کو احساس تھا کہ اگر انہوں نے اپنے شہر کو ترقی دینا ہے تو یہاں اعلیٰ تعلیم کا مرکز قائم کرنا ضروری ہے کیونکہ جب تک اعلیٰ تعلیم یافتہ نسل تیار نہیں

www.pkdigest.com

ہوتی، نہ یہاں صنعتیں لگ سکتی تھیں، نہ یہاں زراعت اور دوسرے کاروبار ترقی کرسکتے تھے۔ اس سے پہلے بھی کئی افراد نے کالج بنانے کی کوشش کی لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر وہ کامیاب نہیں ہوسکے۔ ان میں سے کوئی بھی کالج کے لیے ریاست کی شرائط پوری نہیں کرسکا تھا۔ ایرکسن کے منصوبے میں شروع میں کسی نے اسی وجہ سے دلچسپی نہیں لی تھی کہ انہیں یقین نہیں تھا کہ کالج کا منصوبہ کامیابی حاصل کرسکے گا۔ اس کی بڑی وجہ کسی بڑی علمی شخصیت کی عدم دلچسپی تھی۔

جب پروفیسر ڈینس کالج کا پرنسپل اور ادارے کا سربراہ بننے کے لیے راضی ہوا تو صورت حال ہی بدل گئی۔ لوگ اب مکمل طور پر پرامید تھے کہ کالج ضرور بنے گا اور اسے سرکاری الحاق بھی مل جائے گا۔ یہ پہلا موقع تھا جب عام لوگ کسی تعلیمی ادارے کے بارے میں بحث کرتے پائے گئے ورنہ اس سے پہلے ان کا موضوع روزمرہ کے واقعات ہوتے تھے اور ان میں سے بھی اکثر جرائم کے بارے میں ہوتے تھے۔ شہر میں ہزاروں نہیں تو سیکڑوں ایسے ذہین طلبا تھے جو اسکول کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے لیے اس شہر میں کوئی کالج نہیں تھا اور وہ بے چارے عام سے کاموں میں لگ جاتے تھے۔ حالانکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے اپنے اور معاشرے کے لیے کہیں مفید ثابت ہوسکتے تھے۔

ہوگارڈ کو شروع میں پروفیسر کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا لیکن جیسے جیسے اس کا نام متواتر سننے میں آنے لگا، ہوگارڈ کی دلچسپی بھی اس بارے میں بڑھنے لگی۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی... پروفیسر کی آمد سے پہلے اس کی شخصیت سب سے زیادہ موضوعِ بحث بنی تھی۔ لوگ اس کے اور اس کے کارناموں کے بارے میں بات کرتے تھے لیکن اب اس کا تذکرہ کم ہوتا تھا۔ ہوگارڈ اگرچہ ان باتوں کی پروا کرنے والا شخص نہیں تھا، وہ اپنے حال میں مست رہتا تھا۔ دوسرے اس کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اس کی اسے اتنی پروا نہیں تھی۔ مگر انہی دنوں اتفاق سے اس نے ایک شراب خانے میں کچھ افراد کو پروفیسر کے بارے میں بات کرتے سنا تو وہ ان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

ان میں سے کچھ لوگ پروفیسر کی تعریف کررہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس شہر کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں پروفیسر ڈینس جیسے لوگ بستے ہیں۔ درحقیقت ایسے لوگ ہی شہروں کی پہچان ہوتے ہیں۔ اس گروپ میں شامل چند دوسرے افراد ان کے مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹھیک ہے کہ علم کے بغیر ترقی نہیں ہوتی اور پروفیسر ڈینس جیسے لوگ شہروں کی پہچان ہوتے ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی شہروں کو اور بہت سے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جن سے شہر ترقی کرتے ہیں یا محفوظ رہتے ہیں۔ جب مخالفت کرنے والوں سے مثال مانگی گئی تو ان میں سے ایک نے ہوگارڈ کی مثال دی۔

''ہوگارڈ کہنے کو ایک بدمعاش ہے اور اسے لوگ اچھا نہیں سمجھتے لیکن سچ کہو تو وہ اس شہر کا ایک حصہ ہے۔''

''اگر ہوگارڈ کو شہر سے نکال دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' ایک نے دلیل دی۔

''کیسے نہیں پڑے گا؟'' ہوگارڈ کی حمایت کرنے والے نے کہا۔ ''کیا تم لوگ بھول گئے ہو کہ ہوگارڈ سے پہلے اس شہر میں کیا ہوتا تھا اور لوگوں کو بدمعاش کس طرح دباتے تھے؟ کیا اب کوئی اس کی جرأت کرسکتا ہے؟ نہیں... کیونکہ یہاں ہوگارڈ موجود ہے۔ کیا تمہارا پروفیسر کسی بدمعاش کو روک سکتا ہے؟''

''وہ بدمعاش کو نہیں روک سکتا لیکن اس شہر کو تعلیم دے سکتا ہے جس کے بعد یہاں کسی بدمعاش کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔'' ہوگارڈ کا حامی ہنسا۔ ''کیا نیویارک میں بدمعاش نہیں ہوتے یا واشنگٹن میں بدمعاش نہیں ہوتے؟ وہ تو ترقی یافتہ شہر ہیں۔ وہاں پر تعلیم [illegible] وہاں لوگ [illegible] اعلیٰ تعلیم کے ادارے بھی [illegible] وہاں سالٹ لیک سٹی سے کہیں زیادہ بدمعاش اور کہیں زیادہ جرائم ہوتے ہیں۔''

ہوگارڈ اس بحث سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اگر بحث کرنے والوں کو پتا چل جاتا کہ وہ وہیں موجود ہے تو وہ یقیناً چپ ہوجاتے اس لیے ہوگارڈ اپنی جگہ مزید دبک گیا اور ان کی باتیں سنتا رہا پھر بحث اچانک ہی تلخی کے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ کچھ دیر میں دونوں پارٹیاں آپس میں گتھم گتھا ہوگئیں۔ اس موقع پر ہوگارڈ سے غلطی ہوئی اور اس نے دونوں پارٹیوں کو الگ کرنے کے لیے دخل اندازی کی تو اس کے حامی اور مخالف دونوں غلط فہمی کا شکار ہوگئے۔ ہوگارڈ کی وجہ سے جھگڑا مزید نہیں بڑھا لیکن دونوں پارٹیاں دل میں غلط خیال رکھ کر روانہ ہوگئیں۔ ہوگارڈ کی مخالفت کرنے والے سمجھے کہ ہوگارڈ نے ان کو دبایا ہے اور اس کی حمایت کرنے والے سمجھ رہے تھے کہ اس نے ان کی مدد کی ہے۔

ہوگارڈ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اگلے دن تک یہ واقعہ سارے شہر میں مشہور ہوچکا ہوگا اور اس معاملے پر رائے عامہ دو حصوں میں بٹ جائے گی۔ جب جھگڑے والے واقعے کا

چرچا ہوا تو فطری طور پر لوگ آپس میں اس کی حمایت اور مخالفت میں بات کرنے لگے۔ اس بحث میں کچھ ایسا تاثر نمایاں ہونے لگا جیسے ہوگارڈ شہرت کے حوالے سے پروفیسر ڈینس کو اپنا مخالف سمجھنے لگا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کے حامی بات کرتے تو ان کا لہجہ دھمکی آمیز ہوجاتا جبکہ ہوگارڈ کے مخالفوں کا انداز اسے الزام دینے والا ہوجاتا۔

پروفیسر ڈینس کے حامی اکثریت میں تھے لیکن ہوگارڈ کے حامی عام طور سے ان کو دبا دیا کرتے تھے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا کہ کئی بار پروفیسر کے حامی دبنے کو تیار نہیں ہوتے... ان پر جھگڑا ہوجاتا اور ہاتھاپائی کی نوبت بھی آجاتی۔ لوگ زخمی ہوتے اور بعض اسپتال پہنچ جاتے۔ ہوگارڈ کو ان جھگڑوں کی اطلاع ذرا دیر سے ملتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ لوگوں کو اس فضول جھگڑے سے کس طرح روکے۔ وہ فرداً فرداً سب کے پاس جاکر ان کو منع نہیں کرسکتا تھا۔ شہر میں ایسے شراب خانوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی جہاں لوگ باقاعدگی سے محفلیں جماتے تھے۔ وہ باری باری ہر جگہ جا بھی نہیں سکتا تھا اور نہ اس کا ایسا مزاج تھا۔ وہ لوگوں میں بہت کم گھلتا ملتا تھا البتہ ایک کام وہ کرسکتا تھا۔ اس نے اپنے شراب خانے اور جوئے خانے میں اس موضوع پر بات کرنے پر پابندی لگادی تھی۔ اس کے آدمیوں نے آنے والوں پر واضح کردیا تھا کہ اگر انہوں نے اس موضوع پر کوئی بات کی تو ان کو اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے گا، بے شک وہ ہوگارڈ کی حمایت میں کیوں نہ بات کریں۔

اصولاً تو ہوگارڈ کے اس اقدام کے بعد اس پر سے شک ختم ہوجانا چاہیے تھا لیکن اس کے مخالفوں نے اس کی یہ تاویل نکالی کہ ہوگارڈ اپنے شراب خانے کو فساد سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنے حامیوں کو روکنے کے لیے کچھ نہیں کررہا۔ اس طرح اس نے اپنی پوزیشن محفوظ کرلی تھی۔ ہوگارڈ کو یہ سب سن کر غصہ تو آیا لیکن مسئلہ وہی تھا۔ یہاں بھی وہ کس کس کو روکتا؟ جس طرح وہ اپنے

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/350
اور تلوار ٹوٹ گئی -/350
معظم علی -/325
انسان اور دیوتا -/280
اندھیری رات کے مسافر -/325
گمشدہ قافلے -/350
خاک اور خون -/350
پاکستان سے دیارِ حرم تک -/160
ثقافت کی تلاش -/150
داستانِ مجاہد -/200
کلیسا اور آگ -/300
آخری چٹان -/325
قیصر و کسریٰ -/380
پردیسی درخت -/325
قافلۂ حجاز -/350
سو سال بعد -/150
یوسف بن تاشفین -/325
محمد بن قاسم -/300
سفید جزیرہ -/225
پورس کے ہاتھی -/180
شاہین -/325

Buy online:
www.anarkalimall.com
www.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781
022-2780128
051-35539609
021-2765086
042-37220879
041-2627568

www.pkdigest.com

حامیوں کو اس مسئلے پر بات کرنے سے نہیں روک سکتا تھا اسی طرح وہ اپنے مخالفوں کی زبان بھی بند نہیں کر سکتا تھا۔ انسان چند انسانوں سے لڑ سکتا ہے لیکن خلقِ خدا سے تو نہیں لڑ سکتا... اس نے اپنے آدمیوں کو بھی منع کر دیا کہ وہ اس موضوع پر کسی سے بات نہ کریں۔ اگر کوئی ان کو الجھانا بھی چاہے تو جھگڑا کرنے کے بجائے کنی کترا جائیں۔

ممکن ہے بات یہیں تک محدود رہتی... لوگوں کا جوش و خروش خود ہی ٹھنڈا پڑ جاتا۔ ظاہر ہے عام آدمی کب تک ایسی باتوں پر توجہ دے سکتا ہے لیکن اس کے بعد پے در پے ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے اس آگ کو ہوا ملتی رہی اور بات بڑھتی چلی گئی۔ ان دنوں کالج کی عمارت کا ڈھانچا تقریباً مکمل ہو گیا تھا اور اس کی تکمیل میں صرف چار مہینے باقی رہ گئے تھے۔

اگست کی ایک رات اچانک ہی کالج کی عمارت میں آگ بھڑک اٹھی۔ جب تک لوگ بیدار ہوتے اور آگ بجھانے والے پہنچتے عمارت کا بیشتر حصہ آگ کی نذر ہو گیا۔ جب آگ بجھائی گئی اور عمارت کا معائنہ ہوا تو یہ بات سامنے آئی کہ عمارت کو جان بوجھ کر آگ لگائی گئی۔ وہاں تیل کے خالی پیپے اور مشعلیں ملی تھیں۔ پہلے عمارت کو تیل سے تر کیا گیا، اس کے بعد اس کے اندر جلتی مشعلیں پھینک کر آگ لگا دی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ پوری عمارت بیک وقت شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی اور آگ اتنی تیزی سے پھیلی کہ کسی امدادی کارروائی سے پہلے اس نے سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیا۔

یہ ایک اشتعال انگیز کارروائی تھی۔ شہریوں نے شیرف کے پاس جا کر آگ لگانے والوں کا سراغ لگانے اور ان کو سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ اس وقت بہت کم لوگوں کا دھیان ہوگارڈ کی طرف گیا تھا کیونکہ اس کے بارے میں سب جانتے تھے کہ وہ پیٹھ پیچھے کسی کارروائی کا قائل نہیں اور کالج کی عمارت کو آگ لگانا تو بہت گھٹیا حرکت تھی جس کی توقع ہوگارڈ جیسے آدمی سے محال تھی مگر رفتہ رفتہ سرگوشیوں میں یہ بات پھیلنے لگی کہ کالج کی عمارت کو آگ اصل میں ہوگارڈ کے آدمیوں نے اس کے اشارے پر لگائی تھی۔

شروع میں لوگوں نے اس بات پر یقین نہیں کیا لیکن جب قطرہ قطرہ مسلسل پتھر پر بھی ٹپکتا رہے تو اس میں سوراخ نہ بھی ہو تو نشان ضرور پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح لوگوں نے ہوگارڈ پر الزام کا یقین تو نہیں کیا لیکن ان کے ذہنوں میں شک ضرور سر اٹھانے لگا۔ آخر کسی نے تو یہ کام کیا تھا اور سب جانتے تھے کہ ہوگارڈ اور پروفیسر کے درمیان ایک بلاواسطہ مخاصمت جاری ہے۔ وہ کبھی براہِ راست آپس میں ملوث نہیں ہوئے تھے لیکن اس حادثے کے پیچھے پروفیسر کے مخالفین ہی ہو سکتے تھے۔

جب ہوگارڈ کے علم میں اپنی ذات پر لگا الزام آیا تو وہ غصے سے بھڑک اٹھا اور اس نے اپنے اس آدمی کو زوردار تھپڑ مارا جس نے اس سے یہ بات کہی تھی۔ اس نے خون تھوکتے ہوئے فریاد کی۔ ”میرا کیا قصور ہے جناب؟“

”تم نے کسی کے منہ سے ایسی بات سنی کیسے؟“ ہوگارڈ گرجا۔ ”تم نے اس کا منہ کیوں نہیں توڑ دیا؟“

”آپ نے خود ہی تو ہمیں سختی سے منع کر رکھا ہے کہ ہمیں اس معاملے میں کسی سے نہیں الجھنا۔“ مضروب نے اسے یاد دلایا۔ ”ورنہ دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا کہ بولنے والے کا منہ توڑ دوں۔“

ہوگارڈ نے ارادہ تو کیا تھا کہ وہ مصالحانہ پالیسی ترک کر دے اور اپنے خلاف بکواس کرنے والوں کو اچھی طرح سبق سکھائے مگر پھر کچھ سوچ کر وہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی کہ وہ اس پروپیگنڈے کا توڑ کریں اور دوسروں سے بحث کیے بغیر اس کے حق میں دلائل دے کر بات کریں۔ اس کے آدمیوں نے ایسا کرنے کی کوشش کی مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ زبان کے بجائے ہاتھ سے بات کرنے والے لوگ تھے۔ اس لیے جب وہ پروفیسر کے حامیوں سے بات کرنے کی کوشش کرتے تو وہ ان کی زبان دانی کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔ اس ناکامی کے بعد گالیاں چلتیں اور مار کٹائی کی نوبت آجاتی۔ اس معاملے میں ہوگارڈ کے آدمیوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ دو تین بار انہوں نے دو ڈھائی درجن افراد کی طبیعت سے مرمت لگائی تو لوگوں نے ان سے مباحثہ کرنا چھوڑ دیا۔

اس بات کا ہوگارڈ کی شہرت پر منفی اثر پڑنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے لوگوں کی خاص پروا نہیں مگر جب وہ لوگوں کا سامنا کرتا اور ان کی نظروں میں عزت کے بجائے غصہ اور استہزا پاتا تو اسے جھنجلاہٹ ہونے لگتی۔ اس کا دل کرتا کہ وہ اس طرح خود کو دیکھنے والوں کا سر توڑ دے۔ یہ اور بات تھی کہ سر توڑنے سے اسے اس کا کھویا ہوا وقار نہیں مل سکتا تھا۔ یہی سوچ کر وہ صبر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ اس کے وہ دشمن جو اس سے دب کر رہتے تھے اور سامنا ہونے پر ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ جاتی تھیں، اب اسے دیکھ کر..... مسکراتے۔ ان کی مسکراہٹ طنز کے زہر میں بجھی ہوتی تھی۔ ایک بار ہوگارڈ نے تلملا کر اپنے ایک مخالف بدمعاش کا گریبان پکڑ لیا تو اس

نے مسکراہٹ سے بھی زیادہ طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میرا گریبان کیوں پکڑ رہے ہو، اس چھوٹے سے شخص کا گریبان پکڑو جو اس سارے فساد کے پیچھے ہے۔“

یہ طعنہ سن کر ہوگارڈ کے ہاتھ سے اپنے اس دشمن کا گریبان چھوٹ گیا اور وہ ہونٹ کاٹتا ہوا اس جگہ سے نکل گیا۔ اب وہ کسی کا سامنا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جس سے ملتا وہ اسے اپنے لیے اس کی آنکھوں میں استہزا، طنز یا ہمدردی نظر آتی اور اسے ان تینوں چیزوں سے نفرت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اس سے پہلے کی طرح پیش آئیں۔ اس کے ہمدرد افسردہ تھے تو دشمن شاداں..... جس شخص پر وہ فتح حاصل نہیں کر سکے تھے وہ ایک معمولی سے شخص کے ہاتھوں ذلیل ہو رہا تھا۔ شخص بھی وہ جس کا آج تک ہوگارڈ سے سامنا ہی نہیں ہوا تھا۔

ابھی کالج کی عمارت میں آتش زدگی کا واقعہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا اور اس کی دبی راکھ سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ ایرکسن کے لیے یہ بہت بڑا نقصان تھا لیکن اس نے پھر سے کالج کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ لوگوں کا اور خاص طور سے پروفیسر ڈینس کے حامیوں کا شک ہوگارڈ پر تھا کہ اسی نے کالج کو آگ لگوائی ہے لیکن اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ خالی پیپے اور مشعلوں پر کسی کا نام نہیں لکھا تھا۔

ایرکسن نے کالج کی عمارت کی تعمیر اور دوسرے اخراجات کے لیے ایک بڑی رقم عطیہ کی تھی لیکن یہ رقم اس نے کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے حوالے کرنے کے بجائے اپنے پاس ہی رکھی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کوئی اس رقم میں.... خورد برد نہ کر جائے۔ ایرکسن ایک مقامی لینڈ لارڈ تھا اور اس کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین تھی۔ اس نے شہر کے پاس ایک بڑی حویلی بنا رکھی تھی اور اسی میں رہتا تھا۔ یہ کالج وہ اپنے مرحوم بیٹے کی یاد میں بنوا رہا تھا جو صرف بارہ سال کی عمر میں گھوڑے سے گر کر مر گیا تھا۔ ایرکسن کی خواہش تھی کہ کالج کو اس کے بیٹے کارٹ ایرکسن کے نام سے موسوم کیا جائے لیکن اس کا فیصلہ بورڈ آف ٹرسٹیز نے کرنا تھا جس میں شہر کے نامی گرامی معززین شامل تھے۔

ایرکسن نے کالج کی رقم اور اپنی دوسری دولت بھی ایک تجوری میں رکھی ہوئی تھی۔ اس کی حفاظت کے لیے اس نے چار ماہر نشانے بازوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان میں سے دو ہمہ وقت حویلی میں موجود رہا کرتے لیکن ایک رات کچھ افراد سب کی نظروں میں دھول جھونک کر حویلی میں داخل ہوئے اور انہوں نے پہرے پر مامور نشانے بازوں کو باندھ کر تجوری کو ڈائنامیٹ سے اڑا دیا اور اس میں موجود کم و بیش دس لاکھ ڈالرز کی رقم لے کر فرار ہو گئے۔ اس میں سے پانچ لاکھ ڈالرز کالج کے لیے تھے۔ جب دھماکے کی آواز پر ایرکسن اپنے کمرے سے بھاگتا ہوا تجوری والے کمرے میں آیا تو ڈاکو رقم سمیٹ کر جا چکے تھے۔ حویلی کے صحن میں ان کے گھوڑے بالکل تیار کھڑے تھے۔ وہ ان پر سوار ہوئے اور فرار ہو گئے۔ حویلی کے محافظ ایک جگہ بندھے ملے جبکہ باقی نوکر ڈر کے مارے اپنے کمروں سے نکلے ہی نہیں تھے۔ محافظوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ ڈاکو اندر کیسے آئے۔ ایرکسن کو بس اتنا معلوم ہوا کہ چار ڈھاٹا پوش ڈاکو اس کی دولت لوٹ کر فرار ہو گئے۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا کیونکہ یہ کالج کی عمارت میں آتش زدگی ہونے والے نقصان سے بھی بڑا نقصان تھا۔

دوسری طرف بورڈ آف ٹرسٹیز کو اس معاملے میں تشویش لاحق ہو گئی کیونکہ لوٹی جانے والی رقم کالج کی ملکیت تھی اور اصولی طور پر ایرکسن کا اب اس رقم پر کوئی حق نہیں تھا اور اس کے پاس یہ کالج کی امانت تھی کیونکہ رقم اس کی تحویل سے چوری ہوئی تھی اس لیے وہی اسے ادا کرنے کا پابند تھا۔ لیکن ایرکسن نے اس رقم کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ...... کالج کے لیے جو رقم مختص تھی، وہ اس نے نکال دی تھی۔ اب وہ اس مقصد کے لیے مزید کوئی رقم ادا کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اس پر ایک نیا جھگڑا شروع ہو گیا۔ ٹرسٹیز نے معاملے کو عدالت تک لے جانے کی دھمکی دی اور ایرکسن کے انکار کے بعد وہ یہ کیس عدالت میں لے گئے۔ پہلے ڈکیتی لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی تو اب یہ کیس سب کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایرکسن نے جب دیکھا کہ فضا اس کے خلاف ہوتی جا رہی ہے تو اس نے اچانک ہی پولیس کو بیان دیا کہ اس کے گھر ڈاکا مارنے والے وہی لوگ تھے جنہوں نے کالج کی عمارت کو آگ لگائی تھی اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ کالج نہ بننے پائے۔ شہر سے شائع ہونے والے ایک ہفت روزہ اخبار نے اداریہ لکھا کہ اصل میں یہ اشارہ ہوگارڈ کی طرف ہے کہ وہی اس ڈکیتی میں ملوث ہے۔

ہوگارڈ اس نئے مسئلے سے بے حد پریشان تھا۔ شیرف نے اسے پوچھ گچھ کے لیے اپنے دفتر میں طلب کر لیا اور اس بات کی بھی شہرت ہو گئی بلکہ یہ افواہ گردش کرنے لگی کہ شیرف نے ہوگارڈ کو دو دن کی مہلت دی ہے کہ وہ ڈکیتی کی رقم اور چاروں ڈاکو پولیس کے حوالے کر دے ورنہ اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ شیرف نے اگرچہ اس بات کی تردید کی لیکن اس پر

www.pkdigest.com

کم ہی لوگوں نے یقین کیا۔ اس زمانے میں اخبارات اور رسائل کم تھے اس لیے لوگ ایک دوسرے کی باتوں سے ہی گمراہ ہو جاتے تھے۔

عدالت میں ایرکسن کے وکیل نے مقدمے کو طول دینے کی پالیسی اختیار کی۔ سب سے پہلے اس نے بورڈ آف ٹرسٹیز کی حیثیت کو چیلنج کر دیا کیونکہ کالج ٹرسٹ ریاست میں رجسٹرڈ نہیں تھا اور قانونی لحاظ سے کسی بھی ٹرسٹ کا عدالت میں آنے کے لیے رجسٹرڈ ہونا لازمی تھا۔ اس پر بورڈ آف ٹرسٹیز نے سب سے پہلے ٹرسٹ کو رجسٹرڈ کرایا۔ اس میں بھی ایک مہینا لگ گیا۔ اس کے بعد وکیل نے اعتراض کیا کہ رقم صرف زبانی طور پر ٹرسٹ کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں ابھی کوئی تحریری معاہدہ طے نہیں پایا تھا اس لیے رقم ابھی ٹرسٹ کی ملکیت نہیں بنی تھی۔ اس لیے ٹرسٹ کے اراکین کا دعویٰ درست نہیں تھا۔ اس نقطے پر عدالت نے فیصلہ ایرکسن کے حق میں دے دیا۔

ایرکسن خوش تھا اس لیے جب مصالحتی کمیٹی بیٹھی اور اس نے ایرکسن اور ٹرسٹ کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی تو ایرکسن مان گیا اور وہ کالج اور ٹرسٹ کو دوبارہ رقم عطیہ کرنے کے لیے بھی تیار ہو گیا مگر اس کی شرط یہ تھی کہ ٹرسٹ کالج کا نام اس کے بیٹے کارٹ کے نام پر رکھے۔ پروفیسر ڈینس تو اس شرط کو ماننے کے لیے تیار تھا لیکن ٹرسٹ کے دوسرے اراکین نے انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کالج کا نام کسی عام شخصیت کے نام پر رکھا گیا تو شاید گورنر اسے چارٹر آف ڈیمانڈ دینے سے انکار کر دے اور اگر اس نے انکار کر دیا تو یہ معاملہ ایک سال کے لیے آگے چلا جائے گا۔ اس انکار پر ایرکسن نے عطیہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ جب تک اس کی شرط نہیں مانی جائے گی، وہ عطیہ نہیں دے گا۔

دونوں طرف سے یہ معاملہ انا کی جنگ بن گیا تھا اور بے چارہ پروفیسر جو اپنے شہر کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرنے کے جذبے سے سرشار واپس آیا تھا، پریشان ہو گیا۔ اس نے ایک سال کی محنت سے متعدد طلبا کو تیار کر دیا تھا جو اس کالج کا اولین گریجویٹ بیچ بن سکتے تھے۔ اگر کالج کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ جاتا تو اس کی ساری محنت رائگاں جاتی اور یہ نوجوان بھی اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتے۔ پروفیسر ڈینس، ایرکسن سے ملا اور اس سے ذاتی طور پر درخواست کی کہ وہ کالج کے لیے اپنی حمایت جاری رکھے مگر اس نے مزید حمایت سے انکار کر دیا۔

جب ٹرسٹ اراکین نے کالج کا نام ایرکسن کے بیٹے کے نام پر رکھنے سے انکار کیا تو اس نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے وہ قطعۂ زمین واپس لے لیا جس پر کالج کی تعمیر جاری تھی اور اتفاق سے یہ زمین بھی ابھی تک ٹرسٹ کی ملکیت میں نہیں آئی تھی۔ ایرکسن نے چالاکی سے اسے اپنے نام ہی رکھا تھا۔ اب وہ اسے بھی واپس لینا چاہتا تھا۔ کالج ٹرسٹ کے لیے یہ ایک اور بڑا دھچکا تھا۔ اس موقعے پر ایسا لگ رہا تھا کہ کالج کی تعمیر ممکن نہیں۔ معاملہ ایک بار پھر عدالت میں گیا اور اس بار بھی فیصلہ ایرکسن کے حق میں ہو گیا۔ عدالت نے نہ صرف اس زمین کو ایرکسن کی ملکیت قرار دیا بلکہ اس پر تعمیر کی جانے والی عمارت کو بھی ایرکسن کی ملکیت قرار دے دیا۔ گویا ٹرسٹ کے ہاتھ میں اب کچھ نہیں رہا تھا اور ان حالات میں کالج کی تعمیر ناممکن ہو گئی تھی۔ ایک آخری کوشش کے طور پر ریاستی کورٹ میں اپیل کی گئی لیکن وہاں سے بھی اپیل خارج کر دی گئی۔

ہوگارڈ کے حامی اس بات پر خوش تھے اور انہوں نے پروفیسر کے حامیوں سے کہا کہ یہ کام اگر ہوگارڈ کر رہا ہوتا تو ایرکسن کی مجال نہیں تھی کہ وہ اس میں ٹانگ اڑاتا۔ پروفیسر کے حامی افسردہ تھے کہ ان کے شہر میں اب کالج نہیں بنے گا اور یہاں کے لوگ طویل عرصے تک اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جائیں گے۔ انہیں شک تھا کہ کالج نہ بننے اور دوسرے واقعات کے پیچھے ہوگارڈ کا ہاتھ ہے اور وہ بھی شاید ایرکسن سے مل گیا ہے۔ ایرکسن بہر حال دولت مند شخص تھا اور ہوگارڈ دولت کے لیے ہی کام کرتا تھا۔ اگرچہ آج تک ثابت نہیں ہوا تھا کہ اس نے لڑائی جھگڑوں سے ہٹ کر کوئی جرم کیا ہو مگر لوگوں کو یقین تھا کہ اس کی کمائی کا ذریعہ جرائم ہی ہیں۔

ایرکسن نے پروفیسر سے کہا کہ اب وہ ایک نجی کالج بنانا چاہتا ہے اور اس کے لیے بطور پرنسپل پروفیسر کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مگر پروفیسر ایک ایسے کالج کا پرنسپل نہیں بننا چاہتا تھا جس میں اصول و قواعد کی حکمرانی کے بجائے ہر چیز ایک فردِ واحد کی خواہشات پر منحصر ہو اس لیے اس نے ایرکسن کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ منتقم مزاج ایرکسن نے جواب میں اسے وہ کوٹھی خالی کرنے کا حکم دے دیا جس میں وہ رہائش پذیر تھا۔ یہ کوٹھی بھی ایرکسن کی ملکیت تھی۔ ایرکسن نے صرف حکم نہیں دیا تھا بلکہ اسی روز اس کے ملازمین کوٹھی خالی کرانے پہنچ گئے۔ پروفیسر نے درخواست کی کہ اسے کچھ دن کی مہلت دی جائے مگر ایرکسن کے آدمیوں نے اس سے بدتمیزی کی اور اس کا سامان نکال کر گھر سے باہر

پھینکنے لگے۔ ان کا انداز بدمعاشوں والا تھا اور وہ جان بوجھ کر پروفیسر کی اہانت کرنے کے ساتھ اس کے سامان کو بھی نقصان پہنچا رہے تھے۔

یہ خبر شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی اور لوگ وہاں جمع ہونے لگے لیکن کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ ان مسلح بدمعاشوں کا ہاتھ روکے۔ ایرکسن سے ویسے ہی سب دبتے تھے۔ اس سے الجھنے سے جو نقصان ہوتا، اس کا سب کو پتا تھا اس لیے کسی نے اس معاملے میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے بھی نہیں جو ہوگارڈ اور پروفیسر والے معاملے پر لڑے مرے جا رہے تھے۔ پروفیسر کے وہ حامی بھی اس وقت خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ جب ایرکسن کے بدمعاش پروفیسر کا سامان باہر پھینک رہے تھے اور وہ بے چارہ بیوی بچوں سمیت حیران پریشان ایک طرف کھڑا تھا، اچانک ہی ہوگارڈ وہاں آ گیا۔ اس نے ایک نظر صورتِ حال کو دیکھا اور گرج کر بولا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

کسی نے اسے آگے بڑھ کر بتایا۔ "پروفیسر ڈینس کو ایرکسن کے حکم پر کوٹھی سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔" ہوگارڈ حیران ہوا کہ ٹھیک ہے کوٹھی ایرکسن کی ہے لیکن یہ کون سا طریقہ ہے کہ شریف آدمی کو بے عزت کیا جائے اور اس کی ملکیت کو نقصان پہنچایا جائے۔ اس نے اردگرد دیکھا سب لوگ تماشائی بنے دیکھ رہے تھے اور کسی نے ایرکسن کے ملازموں کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہوگارڈ آگے بڑھا اور اس نے ایرکسن کے آدمیوں سے کہا۔

"رک جاؤ۔"

ہوگارڈ جیسا آدمی جب کسی سے کہتا کہ رک جاؤ تو اس کی عافیت اسی میں ہوتی کہ رک جائے۔ اس کے باوجود ایرکسن کے ملازم ذرا ہچکچائے لیکن انہوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس پر ہوگارڈ آگے آیا اور اس نے سامنے آنے والے پہلے ملازم کے منہ پر ایک زوردار گھونسا رسید کیا۔ اس کے بعد ایرکسن کے ملازم رک گئے۔ ان کے سرغنہ کولٹ نے کہا۔

"مسٹر ہوگارڈ! تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔ یہ ہمارا اور پروفیسر کا معاملہ ہے۔"

"تم لوگ ایک شریف آدمی کے ساتھ بدمعاشی دکھا رہے ہو اور کہتے ہو کہ یہ تمہارا آپس کا معاملہ ہے؟ تم لوگوں نے اس کا سارا سامان تباہ کر دیا ہے، اسے ذہنی اذیت دی ہے۔"

کولٹ اور اس کے ساتھی دیکھ رہے تھے کہ ہوگارڈ کا غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جب ہوگارڈ کا غصہ بڑھتا ہے تو کسی کی مرمت کیے بغیر نہیں اترتا۔ اس لیے وہ اس سے نہیں الجھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پروفیسر کا سامان نکالنا بند کر دیا۔ ہوگارڈ نے انہیں حکم دیا۔

"سارا سامان جس طرح اٹھایا تھا بالکل اسی طرح لے جا کر واپس کوٹھی میں رکھو اور تم لوگوں نے جس جس چیز کو نقصان پہنچایا ہے، اس کا ہرجانہ بھی دو۔"

ایرکسن کے ملازم کچھ دیر پریشان کھڑے رہے لیکن جب ہوگارڈ نے اپنی چمڑے کی بیلٹ اتاری تو وہ سب پھرتی سے حرکت میں آئے اور انہوں نے سارا سامان واپس اٹھا کر اندر رکھنا شروع کر دیا۔ ہوگارڈ نگرانی کے لیے ان کے سر پر سوار تھا۔ جب سارا سامان رکھ دیا گیا تو ہوگارڈ نے چند مقامی افراد کو بلایا اور ان سے کہا کہ پروفیسر کی جس جس چیز کو نقصان ہوا ہے، اس کی مکمل فہرست بنائیں۔

ہوگارڈ کے سامنے آنے کے بعد پروفیسر کے حامیوں کو بھی جوش آ گیا۔ انہوں نے پروفیسر کی ان چیزوں کی فہرست بنائی جنہیں ایرکسن کے آدمیوں نے نقصان پہنچایا تھا۔ اس دوران میں ہوگارڈ نے ایرکسن کے ملازمین کو اپنی جگہ سے ہلنے بھی نہیں دیا۔ جب فہرست بن گئی تو اس نے اس کی ایک نقل کولٹ کو پکڑائی اور بولا۔ "ایرکسن سے کہنا کہ پروفیسر کا یہ نقصان پورا کرے اور یہ کوٹھی بے شک اس کی ہے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی معزز شخص کو اس طرح ذلیل کرے۔ وہ کل آئے اور مسٹر ڈینس کا نقصان پورا کر کے ان سے کوٹھی خالی کرنے کی بات کرے۔ اب دفع ہو جاؤ... اور تم میں سے کوئی اب اس گھر کے سامنے دوبارہ نظر نہیں آئے۔"

کولٹ اور اس کے ساتھی فہرست لے کر خاموشی سے وہاں سے چلے گئے۔ پروفیسر جو اب تک ایک طرف کھڑا تھا، ہوگارڈ کے پاس آیا۔ "مسٹر ہوگارڈ! میں تمہارا شکر گزار ہوں ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ اس وقت میں سامان اٹھا کر کہاں جاؤں گا۔ آج رات میرے بیوی بچے باہر سوتے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ ایک گھٹیا شخص نے تم جیسے معزز آدمی سے ایسا سلوک کیا۔" ہوگارڈ نے کہا۔ "لیکن مجھے امید ہے کہ اب وہ تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔"

پروفیسر ڈینس اسے اندر لے گیا اور گھر میں واپس آنے پر خوش پروفیسر کی بیوی نے جلدی سے ہوگارڈ کے لیے کافی بنائی۔ پروفیسر نے ہوگارڈ سے کہا۔ "جب میں لوگوں سے سنتا تھا کہ وہ میرے اور تمہارے لیے آپس میں لڑے جاتے ہیں تو مجھے ہنسی آتی تھی۔ میں نے بھی اس بات پر

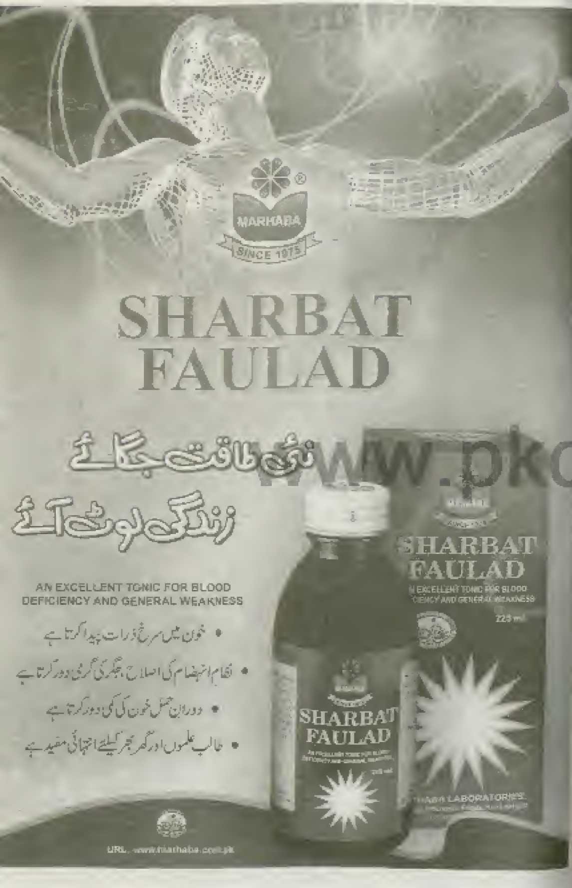

غور نہیں کیا کہ کون مجھ سے کتنا زیادہ مقبول ہے اور لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا۔''

''میں بھی ایسا ہی آدمی ہوں۔'' ہوگارڈ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے ان احمقوں پر غصہ آتا تھا جو میرا اور تمہارا موازنہ کرتے تھے۔ میں ایک بدمعاش ہوں اور تم ایک استاد۔''

''لیکن آج تم نے یہ ثابت کر دیا کہ تم ایک اچھے انسان بھی ہو۔ آدمی کا پیشہ کیا ہے؟ اس سے قطع نظر اگر وہ اچھا انسان ہے تو اس کی یہی خوبی یاد رکھی جاتی ہے۔''

''اب تم کیا کرو گے؟'' ہوگارڈ نے پوچھا۔

پروفیسر نے سرد آہ بھری۔ ''میں واشنگٹن یونیورسٹی کی نوکری چھوڑ کر صرف اس لیے یہاں آیا تھا کہ میرے شہر کے نوجوان بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں... مگر افسوس کہ میں ناکام رہا۔''

ہوگارڈ نے اسے تعجب سے دیکھا۔ ''تم اتنی سی بات سے دل برداشتہ ہو کر واپس جا رہے ہو؟''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ کالج بنانے کے لیے بہت سارے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔'' پروفیسر نے بے بسی سے کہا۔

''سب بکواس... کوئی بھی کام وسائل سے نہیں ہوتا، ہمت اور جذبے سے ہوتا ہے۔ اس شہر میں دو سو افراد ایسے ہیں جو آرام سے اپنے خرچ سے کالج بنا سکتے ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک کو یہ خیال آیا اور اس نے بھی یہ کام صرف ذاتی شہرت اور اپنے مرے ہوئے بیٹے کا نام زندہ رکھنے کے لیے کیا۔ اس کے فیصلے کے پیچھے حوصلہ اور جذبہ نہیں تھا۔ وہ اس کام کو رقم میں تول رہا تھا اور جب اس کے پاس اس کام کے لیے مختص رقم ختم ہوئی تو اس کا حوصلہ بھی ختم ہو گیا۔''

پروفیسر ڈینس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ بڑے کام دولت سے نہیں بلکہ جذبے اور حوصلے سے ہوتے ہیں۔''

ہوگارڈ نے خالی مگ میز پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ''اتنی اچھی کافی پلانے پر میم کو میری طرف سے شکریہ کہہ دینا اور تمہیں کوئی مشکل ہو تو میرے پاس بلاتکلف آ جانا۔''

پروفیسر نے شکریہ ادا کر کے اسے یقین دلایا کہ اسے مدد کی ضرورت ہوگی تو وہ اس کے پاس ضرور آئے گا۔

اگلے روز ایرکسن، پروفیسر سے ملنے آیا۔ اس کا انداز سرد تھا لیکن اس نے نہ صرف پروفیسر کا نقصان پورا کیا بلکہ اس نے پروفیسر کو اپنی کوٹھی خالی کرنے کے لیے ایک مہینے کی مہلت بھی دے دی۔ پروفیسر نے اس سے کہا۔ ''اگر میں کوٹھی خالی کرنے کے بجائے تم سے کرائے پر لے لوں تو تم مجھے کرائے پر دو گے؟''

ایرکسن نے انکار کر دیا۔ پروفیسر نے کوئی دوسرا مکان تلاش کرنے کی کوشش شروع کی۔ لوگوں کو یہ خبر سن کر خوشی ہوئی کہ پروفیسر یہاں سے نہیں جا رہا مگر کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جب وہ یہاں سے نہیں جا رہا تھا تو وہ یہاں کیا کرے گا؟ کیونکہ کالج تو اب نہیں بن رہا۔ لوگ منتظر تھے کہ پروفیسر کے فیصلے کی وجہ سامنے آئے۔ دوسری طرف کوئی مالک مکان پروفیسر کو مکان دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے پس پشت اصل میں ایرکسن کا دباؤ تھا۔ اس نے ان لوگوں کو منع کر دیا تھا جن کے مکان پروفیسر نے لینے کی کوشش کی تھی۔

کوٹھی خالی کرنے کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ جب کہیں سے بات نہیں بنی تو پروفیسر نے ہوگارڈ سے مدد طلب کی۔ اس نے اسے بتایا کہ کوئی مالک مکان اسے مکان دینے کے لیے تیار نہیں... جبکہ وہ انہیں منہ مانگا کرایہ دینے کو تیار ہے۔ ہوگارڈ سمجھ گیا۔

''اس کے پیچھے ایرکسن کا ہاتھ ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ کوئی تمہیں مکان دے۔''

پروفیسر کو تعجب ہوا۔ ''مگر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟''

''پروفیسر! سیدھی سی بات ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ تم یہاں رہو۔ اسے خطرہ ہے کہ تم یہاں رہے تو کسی نہ کسی طرح کالج کھول لو گے اور یہ اسے برداشت نہیں۔''

پروفیسر پریشان ہو گیا۔ ''تب میں کیا کروں؟''

ہوگارڈ مسکرایا۔ ''پروفیسر! ایک بات بتاؤ۔ تمہارے نزدیک اصل اہمیت کس چیز کی ہے... عمارت، چیزوں اور دولت کی ہے یا طلبا کی جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''

پروفیسر نے بلاتامل جواب دیا۔ ''طلبا کی۔''

''تو تم انہیں اگر زمین پر بٹھا کر ایک بلیک بورڈ اور چاک کی مدد سے تعلیم دو گے، تب بھی وہ تمہارے پاس ہی آئیں گے۔''

''ہاں لیکن انہیں بٹھانے کے لیے زمین بھی تو ہو۔''

ہوگارڈ نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ''زمین میں دوں گا۔ اس پر عمارت یا کالج بنانا تمہاری اور اس شہر کے لوگوں کی ذمے داری ہوگی۔''

پروفیسر خوش ہو گیا۔ ''تم زمین دو گے؟''

''ہاں، شہر کے ساتھ کوئی دس ایکڑ زمین ہے جو میری ملکیت ہے۔ میں وہ زمین تمہیں کالج قائم کرنے کے لیے

دے رہا ہوں۔"

"اور میری رہائش..."

"پروفیسر! تم بڑے مکان تلاش کر رہے ہو جو سارے کے سارے بڑے لوگوں کی ملکیت ہیں اور بڑے لوگ ایرکسن سے ڈرتے ہیں۔ تم کوئی چھوٹا مکان تلاش کرو۔"

پروفیسر ڈینس نے ایسا ہی کیا اور اسے دوسرے دن ایک چھوٹا سا لیکن معقول مکان مل گیا اور وہ ایک مہینے کی مہلت پوری ہونے سے پہلے ہی اس میں منتقل ہو گیا۔ اس دوران میں ہوگارڈ نے اپنی زمین اس کے حوالے کر دی تھی۔ ہوگارڈ نے صرف زمین ہی حوالے نہیں کی بلکہ کاغذات بھی اس شرط پر پروفیسر کے نام منتقل کر دیے کہ وہ اس زمین کو صرف کالج بنانے کے لیے استعمال کرے گا۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ یہ زمین ہوگارڈ کی ملکیت ہے اور اس نے پروفیسر کو بھی یہ راز افشا کرنے سے منع کر دیا تھا۔

زمین کا قبضہ لے کر پروفیسر نے ذاتی رقم سے اس پر لکڑی کے دو کمرے بنوانے شروع کیے۔ اس دوران میں وہ کھلی جگہ پر کلاسز لیتا رہا۔ اس کے پاس پڑھنے والے طلبا کی تعداد چالیس سے زیادہ ہو گئی تھی جن میں سات لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ پروفیسر نے ان کے لیے گریجویشن کا نصاب تیار کر لیا تھا اور وہ انہیں اس کے مطابق پڑھا رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ طلبا جلد از جلد اس کا نصاب مکمل کر لیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اگلے بیچ کی تیاری بھی شروع کر دی۔ وہ طلبا کو تعلیم دینے کے عوض ان سے معمولی سی فیس لے رہا تھا۔ یہ فیس لینا اس کی مجبوری بھی تھی کیونکہ اسے اپنا گھر چلانے کے لیے پیسوں کی ضرورت بھی تھی۔

پروفیسر نے ان طلبا کی فیس معاف کر دی تھی جو کچھ نہیں دے سکتے تھے لیکن ذہین تھے اور پڑھنے کا شوق رکھتے تھے۔ شہر کے لوگ حیران تھے کہ وہ طلبا کو زمین پر بٹھا کر پڑھا رہا ہے اور اس طرح کالج بنانا چاہتا ہے... یہ کس طرح ممکن تھا؟ لوگ اجتماعات میں اور اُمرا اپنی محفلوں میں پروفیسر کا مذاق اڑاتے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے بھلا تعلیمی ادارے اس طرح قائم ہوتے ہیں کہ ان کی عمارت تک نہ ہو۔ جب ایرکسن کو پتا چلا کہ پروفیسر طلبا کو زمین پر بٹھا کر پڑھا رہا ہے تو اس نے یقین سے کہا۔

"جھک مارنے دو اسے۔ یہ ایک دن ناکام ہو کر چلا جائے گا۔"

لیکن پروفیسر اور اس کے طلبا سب کی باتوں سے بے نیاز اپنے کام میں لگے رہے۔ پروفیسر کے اس کالج کی شہرت پھیلنے لگی اور لوگ دور دور سے اسے دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ وہ طلبا کو زمین پر بیٹھے پڑھتے دیکھتے تو انہیں یقین نہیں آتا۔ شہر کے اسکولوں کے پاس بھی اچھی عمارتیں تھیں۔ لیکن یہاں کالج کے لیے ابھی کمرے تیار ہو رہے تھے۔ انہی دنوں ایک بوڑھا وہاں آیا۔ اس نے پروفیسر سے کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارا کالج چل جائے گا؟"

پروفیسر نے جواب دیا۔ "میرا کالج چل رہا ہے کیونکہ مجھے عمارتوں یا فرنیچر کو نہیں بلکہ انسانوں کو پڑھانا ہے اور وہ میرے پاس ہیں۔"

بوڑھا اس کی بات سن کر متاثر ہوا۔ اس نے کہا۔ "اگر میں تمہارے لیے کچھ کرنا چاہوں تو کیا کر سکتا ہوں؟"

"اگر تم میرے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو تو تمہیں خود سوچنا چاہیے کہ تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

بوڑھے نے سوچا اور کہا۔ "میرے پاس شیشم کی بہت ساری لکڑی ہے۔ اگر تم عمارت کے لیے فرنیچر بناؤ گے تو تمہارے کام آئے گی۔"

چند دن بعد وہ بوڑھا وہاں بہت ساری لکڑی ڈلوا گیا۔ کمرے تیار تھے، ان میں کلاسز بھی شروع ہو سکیں لیکن طلبا کو ابھی [illegible] بیٹھنا پڑتا تھا۔ لکڑی آنے کے بعد ایک بڑھئی نے پروفیسر [illegible] کی۔ وہ فرنیچر بنا سکتا ہے۔ پروفیسر نے اسے بتایا کہ اس کے پاس اسے دینے کے لیے [illegible] ہے لیکن بڑھئی نے مفت میں یہ کام کرنے کی پیش کش کی۔

پہلے بیچ میں طلبا کی تعداد چالیس تھی لیکن دوسرا بیچ دیکھتے ہی دیکھتے سو طلبا تک چلا گیا اور ان کے لیے یہ دو کمرے کم پڑنے لگے۔ اس لیے طلبا نے ہی امدادِ باہمی کے تحت دو بڑے کمرے اور بنائے۔ بڑھئی جو پہلے کمروں کا فرنیچر بنا چکا تھا اس نے ان دو کمروں کا فرنیچر بھی بنانے کی پیش کش کر دی۔ اس کے ساتھ دو بڑھئی اور آ گئے۔ انہوں نے ان کمروں کے لیے فرنیچر بنا دیا۔ اگرچہ یہ کوئی خاص کام نہیں تھا لیکن اب طلبا کو کھلی جگہ اور زمین پر بیٹھ کر نہیں پڑھنا پڑتا تھا۔ وہ کمروں میں کرسی اور میز پر بیٹھ کر پڑھتے تھے لیکن ابھی بھی یہ سوچنا محال تھا کہ اسے کالج کا درجہ ملے گا یا نہیں۔ پروفیسر تمام باتیں ذہن سے نکال کر صرف تعلیم دینے میں مگن تھا۔ انہی دنوں اس سے دو اساتذہ نے رابطہ کیا۔ وہ بھی یہاں کچھ وقت طلبا کو پڑھانا چاہتے تھے۔ پروفیسر نے ان سے کہا۔

"ہمیں اساتذہ کی ضرورت ہے لیکن ہم تمہیں زیادہ معاوضہ نہیں دے سکتے کیونکہ ابھی ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں۔"

اساتذہ نے آمادگی ظاہر کر دی کہ انہیں پڑھانے کا جتنا بھی معاوضہ دیا جائے گا، وہ قبول کر لیں گے۔ یوں کالج میں دو استاد اور بڑھ گئے۔ اس طرح کلاسز لینے میں آسانی ہو گئی۔ وہ انتظامی امور کی طرف توجہ بھی توجہ دینے لگا۔ پہلے بیچ کا یہ دوسرا سال تھا اور فیسوں کی مد میں کچھ رقم آئی تو پروفیسر نے سب سے پہلے ایک ایڈمنسٹریشن بلاک بنایا۔ بلاک تو صرف نام تھا اصل میں یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جو مشکل سے دس بائی بارہ فٹ کا تھا اور سارا دفتری کام یہیں ہوتا تھا۔

فی الحال پروفیسر طلبا کو صرف آرٹس کے مضامین پڑھا رہا تھا کیونکہ دوسرے مضامین کے لیے نہ تو استاد تھے، نہ کلاسز کی جگہ اور نہ ہی دوسرے وسائل تھے... جیسے لیب وغیرہ۔ اس دوران میں اسے کچھ عطیات ملے۔ ایرکسن نے جو بورڈ آف ٹرسٹیز بنایا تھا، اس کے پاس کالج فنڈ کی کچھ رقم موجود تھی۔ پروفیسر نے کوشش کی کہ وہ رقم اسے مل جائے لیکن بورڈ آف ٹرسٹیز کے اراکین اس رقم کو دبا کر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ پروفیسر مایوس ہو گیا کیونکہ یہ رقم مل جاتی تو اس کے بہت سارے مسائل حل ہو جاتے۔

دوسرے سال کے اختتام تک طلبا کی تعداد پونے دو سو ہو گئی۔ اس میں کوئی چالیس لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ پروفیسر ان کے تعلیمی معیار سے مطمئن تھا۔ اس نے ایک لیکچر کے دوران طلبا سے کہا۔ "تمہارا تعلیمی معیار کسی طرح بھی دوا[illegible] یونیورسٹی کے طلبا سے کم نہیں ہے جو ساری سہولتوں کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ مجھے تم لوگوں پر فخر ہے۔ اگر کبھی یہ کالج بنا تو اس کے اصل معمار تم لوگ ہو گے۔"

پروفیسر کو ان طلبا پر فخر تھا جو انتہائی مشکل حالات میں پڑھ رہے تھے اور ان میں سے کوئی ایک بھی حالات سے گھبرا کر اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔ انہوں نے سخت موسموں کی پروا کیے بغیر کھلی جگہ بیٹھ کر بھی پڑھا تھا۔ اب حالات کسی قدر بہتر تھے لیکن کالج کے مالی وسائل کا مسئلہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ شہر کے اُمرا کو کالج کی پروا نہیں تھی اور عام لوگ بھی تماشا دیکھ رہے تھے۔ کچھ مخیر افراد نے مدد کی لیکن وہ ناکافی تھی۔ ضرورت اس سے کہیں زیادہ کی تھی۔

پروفیسر نے ٹاؤن کونسل میں مدد کی درخواست کی لیکن وہاں سے اس کی درخواست یہ کہہ کر مسترد کر دی گئی کہ اس کا کالج ابھی رجسٹرڈ نہیں اور کونسل کے قوانین کے مطابق کسی بھی غیر رجسٹرڈ تعلیمی ادارے کو مدد نہیں دی جا سکتی۔ پروفیسر کے لیے یہ جواب مایوس کن تھا۔ وہ اس شہر میں ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ قائم کرنے کے لیے نہایت مشکل حالات سے گزر رہا تھا۔ واشنگٹن میں اس کی شاندار تنخواہ تھی، اس کے پاس بڑا مکان تھا اور اس میں ساری سہولتیں تھیں۔ اب گزشتہ ڈیڑھ برس سے اس کے بیوی بچے ایک چھوٹے سے مکان میں تنگی ترشی سے رہ رہے تھے۔ اس کی تنخواہ بھی اتنی نہیں تھی کہ وہ انہیں پہلے کی طرح سہولیات دے سکتا۔ پھر بھی وہ پوری استقامت سے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس کی بیوی اور کسی بچے نے ایک بار بھی اس سے شکایت نہیں کی۔ اس کے باوجود اسے ان کا احساس تھا۔

دوسری طرف وہ جن لوگوں کے لیے یہ ساری کوشش کر رہا تھا، انہیں پروا نہیں تھی۔ وہ ایسے تماشا دیکھ رہے تھے جیسے ساحل پر کھڑے تماشائی ڈوبتے بحری جہاز کو دیکھتے ہیں اور انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ جہاز پر سوار لوگوں پر کیا گزر رہی ہے۔

سب سے مایوس کن بات اس وقت ہوئی جب گورنر کی جانب سے کالج کو چارٹر آف ڈیمانڈ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ گویا اس نے تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا کہ اس کالج کی کوئی افادیت ہے۔ پروفیسر اپنے علاقے کے سینیٹر اور کانگریس مین سے ملا۔ انہوں نے اسے یقین دلایا کہ کالج کو چارٹر آف ڈیمانڈ دے دیا جائے گا مگر گورنر نے ان کی سفارش ماننے سے انکار کر دیا۔ اب پروفیسر کے پاس صرف ایک سال تھا۔ اگر گورنر اب بھی کالج کو چارٹر آف ڈیمانڈ دینے سے انکار کرتا تو پہلا بیچ ڈگری سے محروم رہ جاتا اور اس کے کالج کا مستقبل ہمیشہ کے لیے تاریکیوں میں ڈوب جاتا۔

ایک طرف صورتِ حال مایوس کن تھی۔ دوسری طرف شہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے متمنی نوجوانوں کی تعداد مستقل بڑھ رہی تھی اور تیسرے بیچ کے لیے ڈھائی سو طلبا نے داخلے کی درخواست دی تھی۔ اتنی بڑی تعداد میں طلبا کے لیے سہولیات نہیں تھیں۔ کلاسز کے لیے کمرے بڑھ کر چھ ہو چکے تھے اس کے باوجود ایک تہائی طلبا کھلی جگہ بیٹھ کر کلاس لیتے تھے جبکہ تیسرے بیچ کو مکمل طور پر کھلی جگہ میں بیٹھ کر پڑھنا پڑتا۔ اس کے باوجود پروفیسر نے فیصلہ کیا کہ وہ کسی طالب علم کو مایوس نہیں کرے گا۔ اس نے ان ڈھائی سو نوجوانوں کو داخلہ دے دیا۔ فیسوں سے کچھ رقم آئی تو اس نے مزید دو استاد رکھ لیے۔ ان کے علاوہ تین استاد طلبا کو رضاکارانہ پڑھا رہے تھے۔ اسی سال کل تین سو کتب کی مدد سے کالج کی لائبریری قائم کی گئی۔ یہ ساری کتابیں عطیے میں آئی تھیں۔

پروفیسر، اس کے ساتھی اور طلبا نہایت نامساعد حالات میں صرف اپنے عزم و حوصلے سے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے

ہوئے تھے۔ تیسرا بیچ آیا تو پروفیسر نے ایک بار پھر گورنر کو کالج کی منظوری دینے کی درخواست دے دی۔ اس نے ساری تفصیل بھی دی کہ اس وقت کتنے طالب علم کالج کا حصہ ہیں اور ساتھ ہی اس نے گزشتہ دو بیچ کے نتائج بھی ساتھ دیے۔ تمام بیچ کے تمام طلبا نے اپنے امتحانات پاس کیے تھے، کوئی ایک بھی فیل نہیں ہوا تھا مگر گورنر کو ان چیزوں سے زیادہ اس بات سے دلچسپی تھی کہ کالج کی عمارت کتنی بڑی ہے اور اس میں طلبا کو پڑھانے کے لیے ضروری سہولیات موجود ہیں یا نہیں... کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے پاس وسائل کتنے ہیں۔ ظاہر ہے ان سب باتوں کا جواب نفی میں تھا اس لیے پروفیسر کو بتا دیا گیا کہ اس بار بھی اس کے کالج کو چارٹر آف ڈیمانڈ ملنا مشکل ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ کالج کو چارٹر آف ڈیمانڈ ملے تو سب سے پہلے کالج کے لیے ایک مناسب پختہ عمارت بنوائے اور پھر کالج کو باقاعدہ ایک ٹرسٹ کی شکل دے، تب ہی اسے چارٹر آف ڈیمانڈ دیا جائے گا۔

مگر پروفیسر کے پاس اتنے وسائل کہاں تھے کہ گورنر کی شرائط پوری کرسکتا۔ یہ خبر ان طلبا کے لیے ایک مایوس کن تھی جو پچھلے تین سال سے جان مار رہے تھے اور اس امید میں تھے کہ انہیں ڈگری مل جائے گی تو معاشرے میں ان کا ایک مقام ہو جائے گا اور وہ بہتر روزگار حاصل کرسکیں گے۔ پروفیسر نے انہیں بتایا کہ اس بار بھی کالج کی منظوری مشکل ہے اور شاید ان لوگوں کو ڈگری کے لیے ایک طویل عرصے تک انتظار کرنا پڑے۔ طلبا مایوس ضرور ہوئے لیکن تعلیم کے معاملے میں ان کے جوش و جذبے میں کوئی کمی نہیں آئی اور نہ ہی نئے داخلہ لینے والوں پر اس کا کوئی اثر پڑا۔

پروفیسر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کالج کے لیے شہریوں میں پہلے جیسا جوش کیوں نہیں رہا؟ کیا ان کا جوش و خروش صرف اس لیے تھا کہ ایک دولت مند شخص اپنے مرحوم بیٹے کے لیے شہر میں ایک کالج قائم کر رہا ہے؟ ان کو کالج کی اصل اہمیت کا نہ اندازہ تھا اور نہ ہی ضرورت تھی۔ کیا ان لوگوں کے لیے وہ جان مار رہا تھا؟ اور اپنے اہل خانہ کے ہمراہ تنگ دستی میں زندگی گزار رہا تھا... لیکن جب وہ طلبا کو دیکھتا تو اسے لگتا کہ اس کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی ہے۔ یہ لوگ نہ سہی ان کی آنے والی نسلیں اس کی خدمات کا اعتراف کریں گی۔ کبھی کبھی وہ مصائب سے گھبرا جاتا اور اس کا دل چاہتا کہ سب کچھ چھوڑ کر چلا جائے... پر جب ان طلبا کو دیکھتا تو اس کا ارادہ بدل جاتا۔

دوسری طرف یہ حقیقت بھی تھی کہ وہ کب تک ان حالات میں طلبا کو تعلیم دے سکتا تھا؟ سہولتوں کے معاملے میں صورت حال پہلے سے بہتر ہو رہی تھی۔ طلبا کی تعداد بڑھنے سے فیسوں کی مد میں اضافہ ہوا تھا جس سے تنخواہ اور بعض جاری اخراجات جیسے تیسے پورے ہو رہے تھے۔ لوگوں کے عطیات سے عمارت اور دوسری سہولتوں میں بھی بہتری آرہی تھی لیکن یہ سب ناکافی تھا۔ اصل اہمیت کالج کی رجسٹریشن کی تھی۔ اگر کالج رجسٹرڈ نہ ہوتا تو یہاں تعلیم حاصل کرنے والے ڈگری نہ حاصل کرپاتے اور ان کی ساری محنت ضائع جاتی۔

انہی دنوں ایرکسن کے سابقہ محافظ ایک ڈکیتی کے دوران پکڑے گئے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں ایرکسن نے اپنے گھر میں محافظ رکھا تھا اور جب پولیس نے ان سے تفتیش کی تو انہوں نے نہ صرف ایرکسن کے گھر میں ہونے والی ڈکیتی کا اقرار کیا بلکہ یہ انکشاف بھی کیا کہ کالج کی زیر تعمیر عمارت کو انہوں نے ہی آگ لگائی تھی۔ اصل میں ایرکسن کے متکبرانہ اور ہتک آمیز رویے نے ان لوگوں کو مشتعل کردیا تھا اور انہوں نے اس سے انتقام لینے کے لیے یہ سب کیا تھا۔ ڈکیتی کی رقم وہ عیاشی میں اڑا چکے تھے اور اب ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے بینک میں ڈاکا مارنے کی کوشش کی اور پکڑے گئے۔ ان لوگوں کے پکڑے جانے اور مذکورہ وارداتوں کے اقرار کے بعد ہوگارڈ پر سے یہ الزام ختم ہوگیا اور جو لوگ اس پر شک کرتے رہے تھے انہیں شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ ہوگارڈ کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ لوگوں کی نظر میں اس کی عزت پھر سے بحال ہوگئی تھی کیونکہ جب یہ واقعات ہوئے تھے، اس نے باہر نکلنا کم کردیا تھا اور زیادہ تر شراب خانے کے اوپر بنے اپنے ایک کمرے تک محدود رہا کرتا تھا۔

ہوگارڈ نے جب پروفیسر کو زمین دی، اس کے بعد وہ اس سے پھر نہیں ملا۔ دو تین بار پروفیسر نے اس سے ایسے ہی ملاقات کی کوشش کی لیکن اس نے ملنے سے انکار کردیا۔ اس نے پروفیسر کو پیغام بھیجا کہ اس جیسے عالی مقام شخص کا کسی بدمعاش سے ملنا مناسب نہیں ہے لیکن ہوگارڈ کو اس کے اور کالج کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔

جب ہوگارڈ پر سے الزامات ختم ہوگئے اور اس نے پھر سے باہر نکلنا شروع کیا تو اس کے رویے میں تبدیلی آگئی۔ اس سے پہلے اس نے اپنی طاقت کو کبھی کمائی کے لیے استعمال نہیں کیا تھا مگر اب اس نے اچانک ہی دوسرے بدمعاشوں اور غیر قانونی کام کرنے والوں سے بھتا اور اپنا حصہ لینا شروع کردیا۔ اس کا آغاز اس نے ایک حریف کے شراب خانے

سے کیا اور اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں چڑھ دوڑا۔ زبردست لڑائی کے بعد اس کے حریف نے شکست تسلیم کرلی اور اسے ماہانہ رقم دینے کی ہامی بھرلی۔ ہوگارڈ نے اسی طرح دوسرے بدمعاشوں کے ساتھ سلوک کیا تو باقی خود ہی اس کے پاس آگئے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اسے اپنی آمدنی میں سے ہر ماہ حصہ دیں گے۔

مگر اس کے اس طرز عمل نے اس کے دشمنوں کی تعداد میں اچانک ہی اضافہ کردیا۔ پہلے اس کے دشمن بھی اس سے ناخوش نہیں تھے کیونکہ وہ ان کے ذاتی معاملات اور کاروبار میں دخل نہیں دیتا تھا مگر جب اس نے ان کی آمدنی میں سے زبردستی حصہ لینا شروع کیا تو وہ انہیں کھٹکنے لگا اور وہ سب اب اس کے جانی دشمن ہوگئے۔ چھوٹے بدمعاش ہوگارڈ کے خلاف متحد ہونے پر غور کرنے لگے کیونکہ اتنے عرصے سے وہ اپنی آمدنی بلا شرکت غیرے استعمال کر رہے تھے اور اب ان کو حصہ دینا پڑ رہا تھا مگر سب ہوگارڈ سے ڈرتے تھے اور اکیلے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے اس لیے انہوں نے مل کر ہوگارڈ سے نمٹنے کا فیصلہ کیا۔

ہوگارڈ کو اپنے خلاف ہونے والی سازشوں کا علم تھا مگر وہ مطمئن تھا کہ [illegible] عناصر کی سازشوں سے نمٹ سکتا ہے لیکن وہ ایک بات فراموش کر بیٹھا تھا کہ جب موت وار کرتی ہے تو ہاتھ [illegible] ہو تو اس کے وار سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ ایک دن ہوگارڈ رات کے وقت شہر کا گشت لگا کر اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ واپس شراب خانے کی طرف آرہا تھا کہ گھات میں بیٹھے نامعلوم افراد نے اس پر فائرنگ کردی۔ فائرنگ اتنی اچانک تھی کہ ہوگارڈ اور اس کے ساتھیوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور وہ موقعے پر ہلاک ہوگئے۔ جب اس کی اطلاع ہوگارڈ کے ساتھیوں کو ہوئی تو انہوں نے قاتلوں کا پیچھا کیا اور ان کو ان کے اڈوں میں گھس گھس کر مارا۔ جب تک پولیس حرکت میں آئی اور امن و امان بحال کراتی، دو درجن افراد قتل ہوچکے تھے۔ یہ سارے شہر کے چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔ ہوگارڈ اکیلا نہیں مرا تھا۔ اگلے روز دو درجن جنازے اٹھے لیکن سوائے ہوگارڈ کے جنازے کے کسی کے ساتھ ایک درجن افراد بھی نہیں تھے۔ ہوگارڈ کے جنازے میں سیکڑوں افراد تھے اور سب سے حیرت انگیز بات پروفیسر ڈینس ہوور کی موجودگی تھی۔

☆☆☆

آج کالج کا افتتاح تھا۔ گورنر ایک خصوصی تقریب میں کالج کو چارٹر آف ڈیمانڈ دینے آیا تھا اور ساتھ ہی وہ کالج سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کرنے والے پہلے بیچ کو ڈگریاں بھی دیتا۔ سرخ پتھروں سے بنی شاندار عمارت کے سامنے وسیع سبزہ زار پر طلبا، ان کے اہل خانہ اور سیکڑوں معززین شہر موجود تھے۔ اسٹیج پر موجود پروفیسر ڈینس یہ سب دیکھ رہا تھا۔ گورنر نے کالج کو چارٹر آف ڈیمانڈ پیش کیا اور اس کے بعد طلبا کو ان کی ڈگریاں دی گئیں۔ آخر میں کالج کے نام کی سنگی تختی کو عمارت کے سامنے والے حصے میں ایک چبوترے پر نصب کرنے کا مرحلہ آیا۔ یہ تختی بھی گورنر کو نصب کرنی تھی۔

گورنر نے سب کے سامنے سنگی تختی نصب کی اور پھر ہاتھ جھاڑ کر کہا۔ ”یہ کالج اس عظیم فرزند شہر کے نام سے موسوم ہوا ہے جس پر شہر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے اور جس کی کوششوں سے آج اس شہر میں پہلے کالج کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اب یہاں کے کسی ذہین طالب علم کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کہیں اور نہیں جانا پڑے گا...“

پروفیسر ڈینس بے دھیانی میں سن رہا تھا۔ اصل میں اس کا دھیان کہیں اور تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گورنر پٹی پٹائی تقریر کر رہا ہے جس میں وہ صرف نام بدل دیتا ہے اور یہی تقریر ہر ایسے ہی موقعے پر کی جاتی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں ہوگارڈ [illegible] کی۔ آج سے سال بھر پہلے جب وہ مایوسی کی انتہا پر پہنچ جانے کے بعد کالج ختم کرکے واپس واشنگٹن جانے کا فیصلہ کرچکا تھا تو اس نے مناسب سمجھا کہ ہوگارڈ کی زمین اسے واپس کردے۔ ویسے بھی شرط کے مطابق اسے اس زمین پر کالج قائم کرنا تھا اور وہ کالج نہیں بنا سکا تھا اس لیے اسے زمین واپس کرنی ہی تھی۔ اس نے جب کاغذات ہوگارڈ کے سامنے رکھے تو اس نے حیرت سے کہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”تمہاری زمین کے کاغذات!“ پروفیسر نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ ”میں چونکہ تمہاری شرط کے مطابق اس پر کالج قائم نہیں کرسکا، اس لیے واپس کر رہا ہوں۔“

ہوگارڈ نے کہا۔ ”لیکن کالج تو قائم ہے اور وہاں تعلیم بھی دی جارہی ہے۔“

پروفیسر نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”اس تعلیم کا کیا فائدہ جس میں محنت کرنے والے نوجوان کو ڈگری نہ ملے۔ گورنر نے چارٹر آف ڈیمانڈ دینے سے انکار کردیا ہے۔“

”مگر کیوں انکار کیا ہے؟“

”اس کی شرط ہے کہ کالج کی عمارت بنائی جائے، پورا اسٹاف رکھا جائے اور باقاعدہ بورڈ آف ٹرسٹیز بنایا جائے،

www.pkdigest.com

تب وہ چارٹر آف ڈیمانڈ دے گا۔ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں کہ اس کی شرائط پوری کر سکیں۔ اس شہر کے لوگوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ یہاں کالج قائم ہوتا ہے یا نہیں۔"

ہوگارڈ نے سر ہلایا۔ "یہ تو ہے۔ لوگ نادان ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ نئی نسل کے لیے اعلیٰ تعلیم کس قدر ضروری ہے۔"

"میں اب مایوس ہو گیا ہوں۔" پروفیسر نے سرد آہ بھری۔ "اس لیے میں واپس واشنگٹن جا رہا ہوں۔"

"پروفیسر! اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" ہوگارڈ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ کتنی رقم ہوگی تو گورنر کی شرائط پوری ہو سکتی ہیں۔"

"بہت بڑی رقم چاہیے۔"

"پروفیسر! میں پوچھ رہا ہوں کتنی رقم چاہیے؟" اس نے سرد لہجے میں کہا تو پروفیسر چونک گیا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"کم سے کم تین لاکھ ڈالرز۔"

ہوگارڈ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے چبتے لہجے میں کہا۔ "پروفیسر! تم واپس نہیں جاؤ گے۔ کالج ضرور بنے گا۔"

"مگر اس کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟"

ہوگارڈ نے اٹھ کر اپنے کمرے میں موجود الماری کھولی اور اس میں سے سونے کے سکوں سے بھری نصف درجن تھیلیاں نکالیں اور پروفیسر کے سامنے رکھ دیں۔ "اس میں سونے کے ایک ہزار سکے ہیں۔ ان کی مالیت تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار ڈالرز کے مساوی ہے۔ تم اس سے کام شروع کرو۔"

پروفیسر دنگ رہ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک بدمعاش اسے کالج کی تعمیر کے لیے اتنی بڑی رقم دے گا۔ "تم یہ سونا مجھے دے رہے ہو؟"

ہوگارڈ نے سر ہلایا۔ "ہاں... اور باقی کی ایک لاکھ اسی ہزار ڈالرز کی رقم تمہیں آنے والے چھ سات مہینے میں مل جائے گی۔"

پروفیسر گڑبڑا گیا۔ "لیکن..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں پروفیسر... تم یہ سونا لو اور جا کر اپنا کام شروع کرو۔"

جب پروفیسر اس کے شراب خانے سے نکلا تو اسے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے لیکن سونے کے وزنی سکے اسے احساس دلا رہے تھے کہ یہ خواب نہیں ہے۔ اس نے ایک ہفتے بعد ہی کالج کی عمارت کی تعمیر شروع کرا دی۔ نقشہ وہی تھا جو ایریکسن نے بنوایا تھا۔ کالج کی عمارت کی تعمیر شروع ہوتے ہی پروفیسر ڈینس ہوور نے ان معززین شہر کو لے کر کالج کا بورڈ آف ٹرسٹیز بنا دیا جنہوں نے کبھی نہ کبھی اس کالج کی تعمیر میں کوئی مدد کی تھی۔ ان میں لکڑی فراہم کرنے والا لکڑ ہارا اور فرنیچر بنانے والے بڑھئی بھی شامل تھے۔ لوگ حیران تھے کہ وہ کن لوگوں کو بورڈ آف ٹرسٹیز میں لے رہا ہے لیکن پروفیسر نے کسی کی پروا نہیں کی۔ وہ اُمرا جو اس بورڈ میں جگہ نہیں حاصل کر سکے تھے، وہ تلملا کر رہ گئے۔

ہوگارڈ نے اپنا وعدہ نبھایا۔ اس نے پروفیسر کو رقم کی فراہمی جاری رکھی اور اسی کی خواہش پر پروفیسر نے اس امر کو پوشیدہ رکھا کہ کالج کی تعمیر کے لیے اسے بھاری وسائل کون فراہم کر رہا ہے۔ اس نے بورڈ آف ٹرسٹیز سے بھی اس بات کو پوشیدہ رکھا۔ چھ مہینے کے اندر ہوگارڈ نے پروفیسر کو بقیہ ایک لاکھ اسی ہزار ڈالرز کی رقم فراہم کر دی۔ اس نے جس روز پروفیسر کو چالیس ہزار ڈالرز کی آخری رقم دی، اس سے اگلے دن ہی وہ مارا گیا۔

پروفیسر یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہوگارڈ اسے رقم فراہم کرنے کے لیے شہر کے جرائم پیشہ افراد سے بھتا لے رہا تھا لیکن یہ بہت عجیب بات تھی کہ قتل والے دن وہ ان لوگوں کو بتانے نکلا تھا کہ اب اسے ان کی رقم کی ضرورت نہیں ہے اور اس نے بھتا لینا چھوڑ دیا ہے... اور جب وہ بتا کر واپس آ رہا تھا تو اسے مار دیا گیا لیکن مرنے سے پہلے اس نے وہ کام پورا کر دیا تھا جس کا پروفیسر سے وعدہ کیا تھا۔

اچانک کالج کے نائب پرنسپل نے پروفیسر کو ٹہوکا دیا تو وہ چونکا۔ سب گورنر کی تقریر کے خاتمے پر تالیاں بجا رہے تھے۔ وہ بھی تالی بجانے لگا۔ ذرا دیر میں سبزہ زار پر منعقد ہونے والی تقریب ختم ہو گئی اور لوگ تتر بتر ہو گئے۔ پروفیسر ڈینس کالج کے نام کی سنگی تختی کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں ہوگارڈ سے معذرت کی۔

"میرے دوست! مجھے معاف کر دینا لیکن مجھے ان نوجوانوں کا مستقبل سب سے زیادہ عزیز ہے۔ مادرِ علمی ہمیشہ ماں جیسی عزت چاہتی ہے اور کوئی بری ماں پر فخر نہیں کرتا۔ اسی طرح میرے بچے کس طرح اس مادرِ علمی پر فخر کریں گے جو ایک بدمعاش کے پیسے سے قائم ہوئی ہو..."

پروفیسر نے شرمندہ نظروں سے سنگی تختی کی طرف دیکھا جس پر نام تو سام ہوگارڈ کا ہونا چاہیے تھا لیکن اس پر ہوور کالج آف سالٹ لیک سٹی لکھا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے شاندار دفتر کی طرف بڑھ گیا۔ ایک طرف لان پر کالج سے ڈگری حاصل کرنے والا پہلا بیچ جشن منا رہا تھا۔

❋

اصل سرمایہ

محمد عفان آزاد

توازن، اعتدال اور میانہ روی کی روش انسان کو بلند مقام تک پہنچا دیتی ہے...... کچھ لوگ بے صبری اور مرضی کو درست گردانتے ہوتے ہر شے کو لمحوں میں پا لینے کی جستجو میں منزل کو اپنے سے دور کر دیتے ہیں — عجلت اور اعتدال پسندی کے رجحانات کو اجاگر کرتی نصیحت آموز تحریر۔

امید و مایوسی استقلال و ہمت سے ہم آہنگ... سنگین حالات و حقائق کی ترجمان تحریر

میکس پال نے ناشتے کے بعد گرین ٹی کا کپ اٹھایا اور اخبار سنبھالا تھا کہ اس کا پوتا شیف پال وہاں آ گیا۔ وہ ناخوش اور آزردہ لگ رہا تھا۔ وہ میکس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے خاموشی سے ٹانگیں ہلانا شروع کر دیا۔ میکس نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ شیف کسی بات پر ناخوش ہے۔ جب وہ ناخوش ہوتا تھا تو اسی طرح بیٹھ کر ٹانگیں ہلانا شروع کر دیا کرتا تھا۔ وہ ایک... پُرجوش اور متحرک جوان تھا اور اس کا بیشتر وقت کمپیوٹر کے سامنے گزرتا تھا۔ وہ کمپیوٹر کے شعبے میں کچھ خاص کرنا چاہتا تھا جبکہ اس کا باپ اور میکس کا بیٹا ایلکس پال چاہتا تھا کہ وہ بزنس میں اس کے ساتھ شامل ہو جائے مگر شیف اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے طور پر کچھ کرنا چاہتا ہے۔

اصولی طور پر میکس، شیف کا حامی تھا اور اس کے خیال میں ہر انسان کو اپنی مرضی سے کیریئر بنانے کا حق ہوتا ہے۔ لیکن وہ ریٹائرڈ ہو چکا تھا۔ اب کاروبار اس کے بیٹے کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس میں ایک حد سے زیادہ دخل نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے پہلے بھی ایک بار الیکس کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ شیف کو اس کی مرضی سے کیریئر منتخب کرنے دے لیکن الیکس اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ شیف کو وہی کرنا ہوگا جو.... وہ کہے گا۔ شیف اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کمپیوٹر کو اپنا کیریئر بنائے گا۔ یہ سن کر الیکس نے حقارت سے کہا۔

"تم اس شعبے میں کیا کرو گے ... کمپیوٹر میں اب مزید کیا ترقی ہونا باقی رہ گئی ہے؟"

"پاپا! کمپیوٹر کے شعبے میں اتنی گنجائش ہے کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔" شیف نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر الیکس سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دراصل الیکس ایک ایسے تعلیمی ادارے سے پڑھا تھا جہاں طلبا کا ایک خاص ذہن بنا دیا جاتا ہے اور وہ پھر ساری عمر اسی ذہنی ساخت کے ساتھ گزارتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ الیکس اس ادارے میں جانے سے پہلے کچھ ایسی ہی ذہنیت کا مالک تھا۔ اس ادارے نے صرف اس کے خیالات کو پختہ کیا تھا مگر اسے یہاں بھیجنا میکس کی غلطی نہیں تھی بلکہ الیکس نے خود اس تعلیمی ادارے کا انتخاب کیا تھا۔ میکس نے کبھی الیکس پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس وہ اپنے بیٹے پر اپنی مرضی مسلط کرنا چاہ رہا تھا۔

پال ٹریڈرز فرم میکس نے قائم کی تھی۔ جب اس نے آغاز کیا تو اقتصادی حالات اچھے نہیں تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا دور تھا اور مغربی دنیا ایک بڑی تباہی سے سنبھلی نہیں تھی۔ پال خود فوج سے آیا تھا، جنگ کے بعد بیشتر فوجی فارغ کر دیے گئے تھے۔ فوج سے فارغ ہونے کے بعد میکس نے فلاڈلفیا میں ایک چھوٹے سے اسٹور سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ پھر دن رات محنت کرتا وہ اسے اس مقام تک لے آیا کہ پہلے اس کی دو شاخیں بنیں اور پھر چار... اور آج پورے ملک میں پال ٹریڈرز کے کوئی سولہ سو چھپن اسٹورز تھے۔ ان اسٹورز کی سالانہ سیل بائیس ارب ڈالرز کے لگ بھگ تھی۔

ساٹھ سال کی عمر میں میکس نے اپنا یہ سارا کاروبار اپنے پچیس سالہ بیٹے الیکس کو سونپ دیا جس نے حال ہی میں تعلیم مکمل کی تھی اور اس میں نئے آئیڈیے اس طرح بھرے ہوئے تھے کہ وہ ان کے جوش سے اُبل پڑ رہا تھا۔ میکس نے محسوس کیا کہ اگر الیکس نے اس کی ماتحتی میں کام کیا تو یہ ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اس لیے اس نے ریٹائرمنٹ کا فیصلہ کیا اور پال ٹریڈرز کو مکمل طور پر مالکانہ حقوق کے ساتھ الیکس کو سونپ دیا۔ اس فیصلے کے پس پشت دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ الیکس اپنی سوچ سے اختلاف برداشت نہیں کرتا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ الیکس میں خود سے کوئی نیا کام کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس لیے میکس نے بہتر سمجھا کہ اس کے راستے سے ہٹ جائے۔ ویسے بھی وہ مسلسل تیس برس تک کام کر کے تھک گیا تھا اور اب آرام کرنا چاہتا تھا۔

میکس نے تیس برسوں میں اپنے چین اسٹورز کی تعداد ایک سے ساڑھے تیرہ سو اسٹورز تک پہنچا دی تھی لیکن الیکس نے آنے والے بیس برسوں میں اس تعداد کو سولہ سو تک پہنچا دیا۔ اگرچہ اس نے کاروبار کو فروغ دیا تھا لیکن اس رفتار سے نہیں دے سکا تھا جس رفتار سے میکس نے اسے ترقی دی تھی۔ کبھی کبھی وہ میکس سے بحث کرتا کہ اس نے کس طرح یہ کاروبار چلایا... کیا اسے مشکلات پیش نہیں آئی تھیں؟ اب الیکس کو اس سے زیادہ مشکلات پیش آرہی تھیں لیکن میکس نے کبھی جواب میں اسے اپنا طرزِ کاروبار نہیں سمجھایا۔ وہ جانتا تھا کہ الیکس سمجھے گا نہیں اور وہی کرے گا جو اس کے ذہن میں ہے۔ اس لیے اسے سمجھانا بیکار تھا۔ ویسے بھی وہ اس جھنجٹ سے جان چھڑا چکا تھا اور دوبارہ اس میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن اور خوش تھا۔

جن دنوں الیکس پال ٹریڈرز کا مالک بنا تھا، انہی دنوں اس کے گھر شیف پیدا ہوا۔ جس طرح وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اسی طرح شیف بھی اس کا اکلوتا بیٹا ہی رہا۔ اس کے ہاں پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی یا اس نے مزید کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ اور اس کی بیوی دونوں کو بزنس کی زیادہ فکر رہا کرتی تھی۔ الیکس نے اپنی بیوی زرونیا کو بھی بزنس پارٹنر بنا لیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد میکس نے دو کام کیے۔ ایک تو دنیا کی سیاحت اور دوسرے کتابیں پڑھنا۔ کاروبار کے انتہائی مصروف دنوں میں جب اسے سونے اور کھانے کا وقت بھی مشکل سے ملتا تھا، وہ کتابیں اور دنیا بھر کے سیاحتی بروشرز جمع کرتا تھا۔ اس نے ہزاروں کتابیں اور سیکڑوں بروشرز جمع کر لیے تھے۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ صرف وقت کی کمی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد یہ کمی بھی نہیں رہی۔ اب وہ سال میں چھ مہینے کتابیں پڑھتا اور چھ مہینے دنیا کی سیاحت پر نکل پڑتا۔ لیکن یہ کوئی طے شدہ فارمولا نہیں تھا۔ وہ اس وقت

تک مطالعہ کرتا تھا جب تک اس کا دل کہیں جانے کے لیے نہیں مچل جاتا... اور جب وہ ایک بار گھر سے نکل جاتا تو اس وقت آتا جب اسے کتابوں کی یاد آتی۔ بعد میں ان کتابوں کے ساتھ پوتے کی یاد بھی شامل ہوگئی تھی۔ شروع میں شیف اس سے اتنا مانوس نہیں تھا لیکن رفتہ رفتہ دونوں دادا پوتے میں اچھی دوستی ہوگئی۔

ان تیس برسوں میں اس نے تقریباً ساری دنیا دیکھ لی تھی اور ہزاروں کتابیں پڑھ لی تھیں لیکن اس نے یہ جان لیا تھا کہ کتابوں کی دنیا حقیقی دنیا سے کہیں بڑی ہے۔ اس دنیا کی سیاحت کے لیے عمرِ خضر بھی ناکافی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اب وہ بہت کم کہیں جاتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت گھر میں کتابوں اور شیف کے ساتھ گزرتا۔ شیف اس کا پوتا ہی نہیں، دوست بھی تھا۔ وہ اس سے ہر بات کرتا تھا اور اپنی ہر مشکل اسے ہی بتاتا۔ کبھی کبھی دونوں دادا پوتے ایک ساتھ تفریح کے لیے نکل جاتے۔ شیف کو کتابوں سے اتنا شغف نہیں تھا لیکن اسے اپنے دادا کی زندگی سے بہت دلچسپی تھی۔ کبھی وہ دونوں فرصت سے بیٹھتے تو شیف اس سے فرمائش کر کے اس کی زندگی کا کوئی ورق سنا کرتا۔

جب میکس کے گھر الیکس پیدا ہوا تھا تو وہ بہت خوش تھا [illegible] باپ کے تجربات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ میکس نے اسے بتانے کی کوشش بھی کی تو اس نے اتنی بے توجہی سے سنا کہ میکس کا جوش و ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ جلد اس نے جان لیا کہ اس کا بیٹا ایک مختلف مزاج کا شخص ہے۔ اسے انسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی... اور وہ ہمہ وقت اس سوچ میں گم رہتا کہ دنیا سے کچھ حاصل کر لے۔ اس کی دنیا میں انسانوں کا خیال کم اور دولت کا خیال زیادہ بسا رہتا تھا۔

پھر شیف دنیا میں آیا تو میکس بہت سال تک اس کے قریب نہیں ہوا۔ وہ اسے پیار کرتا تھا اور اس کے لیے چیزیں لاتا تھا لیکن اس نے کبھی پوتے کو ذہنی قربت نہیں دی۔ پھر جب شیف پانچ چھ سال کا ہوا تو وہ خود اس کے قریب ہونے لگا۔ اس نے خود سے دادا کی زندگی میں دخل اندازی شروع کی اور خود اس سے اپنا حصہ حاصل کر لیا۔ میکس کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اس کا پوتا اس کے ماضی کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ وہ متجسس تھا کہ میکس نے جوانی میں کیا کیا۔ اس نے دنیا میں کیا کیا دیکھا ہے؟ وہ اس سے سوال کرتا۔ اس سے کہانیاں سنانے پر اصرار کرتا اور جب تک میکس اسے کچھ

کتے

اہلِ مغرب کو تو کتوں کے ساتھ اس درجہ رغبت ہے کہ اگر شوہر اور کتے میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کا موقع آجائے تو بیوی کتے کو ترجیح دیتی ہے جبکہ ہمارے ہاں اس قسم کی صورتِ حال میں بہرحال شوہر کو غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ امریکا میں ایک بی بی نے جو ہمسائے میں رہتی تھی، اپنے شوہر سے طلاق لے لی کیونکہ وہ آتے جاتے کتے کو جھڑکتا تھا۔ یہ بی بی طلاق کے بعد بہت خوش تھی۔ کہتی تھی اس روز سے سکھ کی نیند سوتی ہوں کیونکہ "ٹونی" سوتے میں خراٹے تو نہیں لیتا!

[illegible] کی تصنیف [illegible] سے انتخاب

سنا نہیں دیتا، وہ اس کی جان نہیں چھوڑتا۔

میکس جب شیف کی عادات کو سمجھ گیا تو اس نے جان لیا کہ شیف ان جیسی عادات کا حامل ہے۔ وہ ویسا ہی تھا......

...... جیسا وہ اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا تھا لیکن بیٹا ویسا نہیں نکلا۔ اس نے پوتے سے اس کی امید نہیں رکھی تھی لیکن پوتا اس جیسا نکل آیا۔ اسے تعجب ہوتا کہ جیسا انسان چاہتا ہے ویسا نہیں ہوتا اور جب اسے توقع نہیں ہوتی تو ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ شیف اس کی طرح کچھ نیا کرنا چاہتا تھا۔ اسے تنگ بندھی چیزوں سے نفرت تھی۔ اس نے گریجویشن کے بعد مزید پڑھنے سے انکار کر دیا جبکہ الیکس اسے بزنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ شیف نے انکار کر دیا کہ اب وہ کسی تعلیمی ادارے میں نہیں جائے گا۔ الیکس نے باپ سے بات کی۔

"ڈیڈی! آپ اسے سمجھائیں۔"

"برخوردار! میں اسے کیا سمجھاؤں؟" میکس نے آرام کرسی پر جھولتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ وہ یونیورسٹی میں جا کر پڑھے۔"

"اگر وہ نہیں پڑھنا چاہ رہا تو اس میں مسئلہ کیا ہے؟"

"ڈیڈی! میرے بعد یہ بزنس اس نے سنبھالنا ہے اور اس کے پاس اتنی تعلیم ہونی چاہیے کہ...."

"بزنس سنبھالنے کے لیے تعلیم اتنی ضروری نہیں ہے۔ میں صرف ہائی اسکول گریجویٹ ہوں اور میں نے ہی یہ بزنس قائم کیا تھا۔" میکس نے بیٹے کی بات کاٹ کر کہا۔ "جب میں نے اس کاروبار کو تمہارے حوالے کیا تو یہ تقریباً اتنا ہی بڑا تھا جتنا بڑا اب ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے سوائے اسے چلانے کے اور کچھ نہیں کیا ہے۔"

الیکس اس کی بات پر بھنا گیا۔ "ڈیڈی! اب دور بدل

www.pkdigest.com

گیا ہے۔ جدید بزنس پڑھے بغیر کسی کا آج کے دور میں کامیاب ہونا بہت مشکل ہے۔"

"یہ غلط ہے... کیونکہ آج کے دور میں بھی بے شمار کم تعلیم یافتہ لوگ بزنس میں کامیاب ہو رہے ہیں۔ میں تمہیں دس لوگوں کی مثالیں دے سکتا ہوں اور ان میں سے اکثر نوجوان ہیں۔"

"وہ کوئی نیا کام کرتے ہیں۔" ایلکس ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"تو شیف کو بھی کوئی نیا کام کرنے دو۔"

"جب اتنا بڑا بزنس موجود ہے تو اسے کوئی نیا کام کرنے اور اس میں سرمایہ ضائع کرنے کا رسک لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

میکس نے حیرت سے بیٹے کو دیکھا۔ "تمہارے نزدیک بیٹے کی خواہش سے زیادہ سرمائے کی اہمیت ہے؟"

ایلکس کھسیا گیا۔ "یہ بات نہیں ہے ڈیڈی..."

میکس نے بیٹے کی بات کاٹ کر کہا۔ "جہاں تک میں سمجھتا ہوں اگر شیف نے کچھ کیا تو بھی وہ تم سے یا مجھ سے مدد نہیں مانگے گا بلکہ اپنی الگ راہ بنائے گا۔"

ایلکس نے کوشش کی لیکن وہ میکس کو اپنی بات سمجھانے میں ناکام رہا۔ اصل میں وہ خود میکس یا شیف کی بات سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ میکس نے صاف انکار کر دیا۔ "جب میں زندگی کے کسی معاملے میں تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالتا تو شیف پر کیسے ڈال سکتا ہوں؟"

"وہ آپ کی بات سنتا ہے۔"

"اگر وہ میری بات سنتا ہے تو کیا میں اسے بلیک میل کروں؟" میکس نے ناگواری سے کہا۔ "اور یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف میری کوئی بات مان لے گا۔"

ایلکس کو انکار کرنے کے باوجود میکس نے شیف سے بات کی۔ وہ اسے ڈنر پر اپنے ساتھ لے گیا اور ڈنر کرنے کے بعد وہ ایک بار میں گئے۔ وہاں میکس نے شیف سے بات کی۔ "تمہارا باپ چاہتا ہے کہ تم مزید تعلیم حاصل کرو۔"

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے مزید نہیں پڑھنا۔" شیف نے حتمی لہجے میں کہا۔

"یہی میں نے تمہارے باپ سے کہا تھا۔" میکس نے سر ہلایا۔ "کیا تمہارے خیال میں تعلیم بیکار چیز ہوتی ہے؟"

"نہیں دادا جان... لیکن میں وہ نہیں پڑھنا چاہ رہا جو پاپا چاہتے ہیں۔ ابھی میں ایک کام کر رہا ہوں۔ جب وہ کسی انجام تک پہنچ جائے گا تو میں فیصلہ کروں گا کہ مجھے مزید کیا پڑھنا ہے۔"

میکس خوش ہو گیا۔ "مجھے یقین ہے...... تم کوئی اچھا فیصلہ کرو گے۔"

"یعنی آپ کو میرے مزید تعلیم حاصل نہ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

"مجھے اعتراض پہلے بھی نہیں تھا لیکن یہ بتا کر تم نے مجھے بالکل مطمئن کر دیا ہے کہ تعلیم تمہارے نزدیک ایک اہم چیز ہے۔ بیٹا! زندگی میں تعلیم کی اپنی ایک اہمیت ہے... اس سے قطع نظر کہ آپ اسے دنیاوی فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔"

"لیکن پاپا میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔" شیف دبے لہجے میں بولا۔ "کیا آپ انہیں سمجھا نہیں سکتے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں؟"

"برخوردار! بات یہ ہے کہ میں اس کا باپ ہوں اور میں نے آج تک اسے کسی مسئلے پر نہیں سمجھایا۔ جب اس نے تمہیں سمجھانے کے لیے کہا تو میں نے یہی دلیل دی۔ اب اگر میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا تو وہ یہی مطالبہ تمہارے لیے کرے گا اور میں مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

شیف نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے! میں خود پاپا کو دیکھ لوں [illegible]

[illegible]

[illegible] سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔"

شیف نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کاش، یہ بات پاپا بھی سمجھ لیں۔ وہ سب سے زیادہ اہمیت اس بزنس کو دیتے ہیں۔"

"یہ اس کی فطرت ہے جسے ہم تبدیل نہیں کر سکتے۔" میکس نے تبصرہ کیا۔ "اس لیے بہتر ہے کہ اس سے الجھے بغیر اپنا کام کرتے رہو۔"

"میں کوشش کروں گا۔"

☆☆☆

شیف جس طرح آ کر بیٹھا تھا اور پھر چپ سادھ لی تھی، اس سے میکس نے اندازہ لگایا کہ معاملہ زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے۔ اسے اپنے بیٹے کی فطرت کا اندازہ تھا۔ وہ اپنی بات منوانے کے لیے انتہا تک جا سکتا تھا اور اسے اس بات کی پروا نہیں ہوگی کہ اس کے سامنے اس کا اکلوتا بیٹا ہے۔ یقیناً اس نے شیف سے کوئی بات کی تھی۔ جب شیف کچھ دیر نہیں بولا تو میکس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

"کیا بات ہے برخوردار؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "پاپا نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے ان کی بات نہیں مانی تو وہ مجھے یہ بزنس نہیں دیں گے۔"

میکس حیران ہوا۔ "اس نے تمہیں عاق کرنے کی دھمکی دی ہے؟"

شیف نے سر ہلایا۔ "انہوں نے صرف دھمکی ہی نہیں دی ہے بلکہ مجھے کل تک کی مہلت بھی دی ہے۔ اگر کل تک میں نے یونیورسٹی میں داخلے کے لیے اپلائی نہیں کیا تو وہ ایسا ہی کریں گے۔"

"کیا ایلکس کا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ کیا تمہاری ماں نے اسے نہیں سمجھایا؟"

"وہ بھی پاپا کی ہم نوا ہیں۔" شیف نے بتایا۔ "ان کی تجویز پر پاپا نے میرا جیب خرچ بھی بند کر دیا ہے۔"

اس بار میکس کو سچ مچ غصہ آ گیا۔ "ان دونوں کا ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"دادا جان! میں آپ کو یہ سب اس لیے نہیں بتا رہا کہ آپ ان سے یہ فیصلہ تبدیل کرائیں۔ میں آپ کو صرف آگاہ کر رہا ہوں۔" شیف نے رسانیت سے کہا۔

"لیکن میں ان سے بات ضرور کروں گا۔" میکس جوش میں کھڑا ہو گیا۔ "میں ان کا فیصلہ تبدیل نہیں کراؤں گا [illegible]

[illegible]

شیف بھی کھڑا ہو گیا۔ "دوسرے یہ کہ مجھے آپ سے بھی مدد نہیں چاہیے۔"

میکس نے محبت سے اپنے پوتے کو دیکھا۔ "کیوں میرے بچے...؟ میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔"

شیف اس سے لپٹ گیا۔ "دادا جان! میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ کسی دادا نے اپنے پوتے کو بہت کم دیا ہوگا جو آپ نے مجھے دیا ہے اور مجھے بس اسی چیز کی ضرورت ہے۔"

"شیف! مجھے یقین ہے کہ تم جو کرو گے اس میں کامیاب رہو گے... لیکن ایک بات یاد رکھنا جب تمہیں دنیا کا ہر دروازہ بند ملے تو ایک دروازہ تمہارے لیے پھر بھی کھلا ہوگا اور وہ تمہارے دادا کا دروازہ ہوگا۔"

شیف مسکرایا۔ "دادا جان! میں مدد لینے کو برا نہیں سمجھتا لیکن پہلے میں خود کو آزمانا چاہتا ہوں۔ اگر میں ناکام رہا تو میں آپ کے پاس آنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کروں گا۔"

"تم کہیں اور جا رہے ہو؟" میکس پریشان ہو گیا۔

"ہاں، میں اپنے ایک دوست کے پاس جا رہا ہوں۔ در حقیقت ہم دونوں مل کر کام کر رہے ہیں۔ میں آپ سے رابطے میں رہوں گا۔"

"کیا ایلکس نے تمہیں اس گھر سے جانے کو کہا ہے؟"

"نہیں لیکن میں یہاں رہوں گا تو ان سے سامنا ہو گا۔ میں پریشان ہوتا رہوں گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔" شیف نے کہا۔ "کم سے کم اس وقت تک یہاں سے دور رہوں جب تک میں اپنا کام مکمل نہیں کر لیتا... گڈ بائے دادا جان۔"

"گڈ بائے میری جان!" میکس نے اسے جاتے دیکھا۔ اسے فخر تھا کہ وہ شیف جیسے پوتے کا دادا ہے پھر اسے ایلکس کا خیال آیا تو اسے غصہ آنے لگا۔

☆☆☆

ایلکس اور اس کی بیوی زونیا اپنے دفتر میں موجود تھے۔ ان کے سامنے گزشتہ دو مہینے کی سیل کا گراف تھا جس میں اس دوران میں روزانہ سیل کی بنیاد پر ایک فیصد کی آئی تھی۔ اگرچہ ایک فیصد دیکھنے میں تو کوئی بہت زیادہ نہیں ہوتا لیکن بڑے کاروبار کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دونوں کا تشویش کے مارے برا حال تھا۔ پچھلے دو سالوں میں ان کی سیل میں مجموعی طور پر سات فیصد کی آئی تھی۔ انہیں اپنے ستر سے زائد اسٹورز بند کرنا پڑے تھے اور کوئی دو ہزار ملازمین فارغ کر دیے تھے۔ اگرچہ کاروبار میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا [illegible] ان کی حالت زیادہ بری تھی اور اپنے حریف اسٹورز کے مقابلے میں ان کی سیل میں نمایاں کمی آئی تھی۔ ایلکس جھنجلایا ہوا تھا۔

"یہ سب ناقص منیجمنٹ کی وجہ سے ہے۔"

"اب ہم کیا کریں؟ اپنے بیس فیصد ہائر اسٹاف کو ہم پہلے ہی فارغ کر چکے ہیں۔" زونیا نے کہا۔

"میں نے ٹھیک کیا... یہ اتنی بڑی بڑی تنخواہیں لے رہے تھے اور ان کی پرفارمنس صفر تھی۔"

"مگر اب کیا کریں؟ سیل اسی طرح گرتی رہی تو ہمیں مزید اسٹورز بند کرنا ہوں گے اور مزید ملازمین کو فارغ کرنا ہوگا۔"

ایلکس نے تھکے تھکے انداز میں کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ "مجھے بھی لگ رہا ہے ایسا ہی کرنا ہوگا۔ ہماری تیس فیصد برانچز خسارے میں جا رہی ہیں۔ ہمیں جلد ان کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ ورنہ ہم مجموعی طور پر خسارے میں چلے جائیں گے۔"

"ابھی بھی ہم مجموعی طور پر خسارے سے زیادہ دور نہیں ہیں۔" زونیا نے اسے یاد دلایا۔ ایلکس نے سر تھام لیا۔

"اوپر سے صاحبزادے نے تنگ کر رکھا ہے۔ پتا نہیں

www.pkdigest.com

کیا چاہتا ہے؟"

"تم فکر مت کرو جب جیب خالی ہوگی تو دماغ سے سارے خیالات نکل جائیں گے۔" زونیا اس معاملے میں شوہر سے بالکل متفق تھی۔ اسی کے مشورے پر ایلکس نے شیف کا جیب خرچ بند کیا تھا۔

"وہ بہت ضدی لڑکا ہے۔" ایلکس نے تشویش سے کہا۔

"اسے تمہارے باپ نے بگاڑ رکھا ہے۔" زونیا نے ناگواری سے کہا۔ "انہی کی وجہ سے وہ اتنا سر چڑھ رہا ہے۔"

"نہیں... ڈیڈی اس کے اور میرے معاملے میں دخل نہیں دیتے۔"

"لیکن تم دیکھ لینا، اس معاملے میں وہ ضرور دخل دیں گے۔" زونیا نے یقین سے کہا۔

"وہ کیا کر سکتے ہیں؟ وہ میرا فیصلہ تو تبدیل نہیں کرا سکتے۔" ایلکس کسی قدر غرور سے بولا۔ "اب یہ سارا بزنس میرا ہے، ڈیڈی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ابھی وہ اس بارے میں بات کر رہے تھے کہ ایلکس کی سیکریٹری نے اسے میکس پال کے آنے کی اطلاع دی۔ دونوں میاں بیوی نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے ذہن میں ایک ہی بات آئی تھی کہ میکس ان سے شیف کے سلسلے میں بات کرنے آیا ہے اور وہ اتنا بے تاب تھا کہ اس نے ان کے گھر آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور یہاں دفتر میں چلا آیا۔ "انہیں بھیج دو۔" ایلکس نے سیکریٹری سے کہا اور انٹرکام رکھ کر بولا۔ "تمہارا اندازہ درست نکلا۔ میرا خیال ہے ڈیڈی خود بات کرنے آ گئے ہیں۔"

"ذرا سنبھل کر بات کرنا... شیف کے معاملے میں ان کی کوئی بات ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔" ایلکس نے سر ہلایا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور میکس اندر آیا۔ اس نے باری باری دونوں سے ہاتھ ملایا۔ جب وہ تینوں بیٹھ گئے تو ایلکس نے محتاط انداز میں پوچھا۔ "جی ڈیڈی! آج آپ کئی سال بعد یہاں آئے ہیں... کوئی خاص وجہ؟"

"تمہارا کیا خیال ہے، میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" میکس مسکرایا۔

"آپ یقیناً اس نالائق لڑکے کی حمایت کرنے آئے ہیں۔" ایلکس سے پہلے زونیا بول اٹھی۔ اس پر ایلکس نے اسے گھورا اور بولا۔

"ڈیڈی! آپ بتائیں؟"

"میں کسی کی حمایت کرنے نہیں آیا۔ میں تو آج بزنس کی پوزیشن معلوم کرنے آیا ہوں۔" میکس نے خلاف توقع کہا۔

"بزنس کی پوزیشن!" ایلکس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "لیکن کیوں ڈیڈی؟"

"اب آپ کا اس بزنس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" زونیا نے اسے یاد دلایا۔

"یہ درست ہے، میرا اس بزنس سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن میں جب چاہے بزنس کی پوزیشن چیک کر سکتا ہوں۔ یہ بات اس معاہدے میں شامل تھی جس کے تحت میں نے کاروبار کی ملکیت تمہارے حوالے کی تھی۔" میکس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر لہرایا۔ "شاید تم نے اسے اس وقت غور سے نہیں دیکھا تھا۔"

ایلکس نے زونیا کی طرف دیکھا اور بولا۔ "لیکن ڈیڈی! جب آپ بزنس میرے حوالے کر چکے ہیں تو اس بات سے کیا فائدہ؟"

"کچھ نہیں، میں تو بس یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں نے جو تمہارے سپرد کیا تھا تم نے اسے کہاں تک پہنچایا ہے۔ یقیناً تم اس سے زیادہ ہی میرے پوتے کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتے ہوگے۔" میکس کا لہجہ سرد ہو گیا۔

"جی ڈیڈی!" ایلکس نے کھسیا کر کہا۔ "اور بزنس ٹھیک چل رہا ہے... [illegible]"

"افسوس برخوردار! تم سچ نہیں بول رہے۔ جب میں ایک شرط کے تحت بزنس تمہارے حوالے کر سکتا ہوں تو اس شرط پر عمل بھی کروا سکتا ہوں۔" میکس نے نرمی سے کہا۔ "پچھلے تین سال میں بزنس خسارے میں جا رہا ہے۔ پانچ فیصد سے زیادہ اسٹورز بند ہو چکے ہیں اور اس سال کے آخر تک مزید دس فیصد اسٹورز بند ہو جائیں گے۔ ساتھ ہی فرم مجموعی طور پر خسارے میں چلی جائے گی۔ ہمارے ایک لاکھ ستر ہزار ملازمین میں سے پچیس ہزار ملازمتوں سے فارغ ہو جائیں گے۔ تم سمجھ رہے ہو؟ فرم دیوالیہ ہونے کی طرف جا رہی ہے۔"

ایلکس نے ہونٹ پر زبان پھیری۔ "ڈیڈی! حالات ہی خراب ہیں۔"

"مجھے مزید بے وقوف مت بناؤ... دوسرے چین اسٹورز بھی ہیں، وہ بھی انہی حالات میں کام کر رہے ہیں۔ وہ نہ تو اسٹورز بند کر رہے ہیں اور نہ ہی ملازمین کو ملازمتوں سے نکال رہے ہیں۔ وہ عقل مندی سے ان حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں۔" میکس کا لہجہ برہم ہوتا جا رہا تھا۔

"مقابلہ تو ہم بھی کر رہے ہیں۔"

www.pkdigest.com

"تم مقابلہ نہیں کر رہے... احمقانہ انداز میں بزنس کو ڈبو رہے ہو۔"

زونیا متوقع نظروں سے شوہر کو دیکھ رہی تھی کہ ابھی وہ اسٹینڈ لے گا اور باپ کو جواب دے گا۔ آخر ایلکس سنبھل گیا۔ "ڈیڈی! معذرت کے ساتھ... اب یہ بزنس میرا ہے اور میں جیسے چاہوں اسے چلاؤں۔"

ایلکس اور زونیا کا خیال تھا کہ میکس مزید برہم ہو جائے گا لیکن خلاف توقع وہ مسکرانے لگا۔ "میرے بیٹے! میں تمہاری زبان سے یہی کہلوانا چاہ رہا تھا۔ ورنہ مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے کہ تم اس بزنس کو کس طرح چلاتے ہو... اور چلاتے ہو یا اسے ڈبو دیتے ہو۔ میں نے اپنا دور گزار لیا۔ اب تمہارا وقت ہے۔ تم اسے جیسے چاہو گزارو۔"

ایلکس اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "تو ڈیڈی! اس کا مقصد؟"

"مقصد بہت صاف ہے۔ جیسے تمہیں اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت گوارا نہیں ہے... کہ تم برا کرو یا بھلا، اسی طرح دوسرے بھی اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتے۔ برخوردار! یہ دنیا ایک رِنگ ہے اور یہاں سب اپنی اپنی لڑائی خود لڑنا چاہتے ہیں۔"

"آپ چاہتے ہیں کہ میں شیف کو کچھ نہ کہوں اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دوں؟" ایلکس کا لہجہ تند ہو گیا۔

"میں تمہیں اس معاملے میں مجبور نہیں کر رہا لیکن جو تم چاہتے ہو، شیف اس کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"جب وہ گھر سے نکل کر دھکے کھائے گا تو اسے خود عقل آ جائے گی۔" زونیا نے مداخلت کی۔

"وہ ایلکس نہیں ہے... شیف ہے۔" میکس نے فخر سے کہا۔ "میرا پوتا مجھ پر گیا ہے۔ تم جانتے ہو، میں نے یہ کاروبار کس طرح شروع کیا؟"

"ہاں، آپ نے بہت چھوٹے پیمانے پر یہ کام شروع کیا تھا اور پھر افسانوی انداز میں ترقی کرتے چلے گئے۔" ایلکس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ "آپ نے بہت محنت کی اور بہت دولت مند بن گئے۔"

"یہ درست ہے لیکن اس سے پہلے مجھے ایک موقع اور ملا تھا... دولت مند بننے کا۔"

ایلکس چونکا۔ "اس سے پہلے... لیکن آپ نے کبھی مجھے بتایا نہیں۔"

"برخوردار! تم نے میری باتوں میں دلچسپی ہی کب لی؟" میکس نے ملامت سے کہا۔

"ڈیڈی! آپ کو یہ موقع کب ملا تھا؟"

"جب میں دوسری جنگِ عظیم کے آخر میں جرمنی میں تھا۔ ہمارے دستے برلن کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے لیکن روسی ہم سے پہلے برلن پہنچ گئے۔ اس وقت میں ایک اسپیشل یونٹ میں تھا اور ہمارے یونٹ کا کام جرمنوں کے چھپے ہتھیاروں اور ان کے ریسرچ ورک کو قبضے میں لینا تھا۔ ایک دن میرے یونٹ کو اوپر سے آرڈر آیا کہ برلن کے شمال میں ایک جرمن قصبے میں خفیہ بنکر کی تلاشی لینی ہے۔ میں اپنے دستے کا کمانڈر تھا۔ حکم ملتے ہی میں اپنے دو درجن ساتھیوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔"

میکس نے کہانی سناتے ہوئے ایلکس دیکھا تو اسے زونیا کے چہرے پر بیزاری نظر آئی لیکن ایلکس کسی قدر دلچسپی سے سن رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ میکس نے اس کہانی میں کسی متوقع دولت کا ذکر کیا تھا اور ایلکس کو دنیا میں سب سے زیادہ اسی چیز سے دلچسپی تھی۔ میکس نے بات جاری رکھی۔

"تین گھنٹے کے مشکل سفر کے بعد جب ہم اس قصبے تک پہنچے تو وہاں سوائے مکانوں کے ملبے کے اور کچھ نہیں تھا۔ راستہ بھی ملبے کے ڈھیر سے بھرا ہوا تھا اور اسی وجہ سے ہمیں وہاں پہنچنے میں وقت لگ گیا تھا۔"

ایلکس کو اس کی کہانی کی مشکلات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ "ڈیڈی! آپ کسی دولت کا ذکر کر رہے تھے۔" اس نے یاد دلایا۔

"صبر برخوردار! میں اسی طرف آ رہا ہوں۔" میکس نے نرمی سے کہا۔ "جب ہم قصبے میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی ذی روح نہیں تھا۔ پورا قصبہ انسانوں سے خالی تھا اور صرف مکانات کا ملبا پڑا تھا۔ اس ملبے میں لاشیں بھی نہیں تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پہلے قصبے کے لوگوں کو یہاں سے نکالا گیا اور اس کے بعد بمباری کر کے اس پورے قصبے کو پیوندِ خاک کر دیا گیا۔ وہاں ہمیں کوئی کچھ بتانے والا نہیں تھا اور نہ ہی اوپر سے آنے والے آرڈر میں واضح تھا کہ وہ خفیہ بنکر کہاں تھا جس کی ہمیں تلاشی لینا تھی۔ میں نے اوپر والوں سے رابطہ کیا تو انہوں نے کہا کہ بنکر اسی قصبے میں ہے اور اسے تلاش کرنا بھی ہماری ذمے داری ہے۔ جب تک بنکر نہیں مل جاتا ہمیں وہیں رہنا تھا۔

"میں نے اپنے آدمیوں کو پورے قصبے میں پھیل کر بنکر تلاش کرنے کا حکم دیا۔ چونکہ اس کام میں غیر معینہ وقت لگ سکتا تھا اس لیے میں نے وہاں کیمپ لگانے کا فیصلہ بھی کیا۔ ہم نے ایک کسی قدر سلامت رہ جانے والی ہال نما عمارت کے اندر کیمپ

لگایا کیونکہ ان دنوں بارشیں ہو رہی تھیں اور باہر ہر طرف کیچڑ تھا۔ میرے ساتھی سارا دن بنکر تلاش کرتے رہے لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جہاں زیرِ زمین خفیہ بنکر تھا اس کی اوپر کی عمارت بھی بمباری کر کے تباہ کر دی گئی تھی اور شاید اس کا مقصد بنکر کو مزید چھپانا تھا۔ اسی وجہ سے قصبے کی ساری آبادی کو بھی وہاں سے منتقل کر دیا گیا تھا۔"

اب ایلکس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہونے لگا۔ اس نے کہا۔ "ڈیڈی! آپ بتا رہے تھے کہ آپ کو ایک چانس ملا تھا، دولت حاصل کرنے کا۔"

"تو برخوردار میں تمہیں اور کیا بتا رہا ہوں؟ اب میں تمہیں براہِ راست بتا دوں کہ مجھے دولت مل گئی تھی تو اس کے بعد تمہارے سوالات شروع ہو جائیں گے کہ وہ دولت کیسے اور کیونکر ملی... تو میں پہلے ہی تمہیں تفصیل سے بتا رہا ہوں تاکہ ہر بات واضح ہو جائے۔"

"اوکے ڈیڈی... لیکن بات ذرا مختصر کریں کیونکہ کچھ دیر بعد بورڈ آف ایگزیکٹوز کی میٹنگ ہے۔" ایلکس نے التجا کی۔

"بس دس منٹ اور۔" میکس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے بھی ایک جگہ جانا ہے۔ بہرحال، میرے آدمی سارا دن لگے رہے۔ ہمارے پاس ایسے آلات تو تھے جن سے زیرِ زمین تہ خانوں کا پتا چلایا جا سکتا تھا لیکن یہ آلات بہت زیادہ گہرائی میں چھپے تہ خانوں کا سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔ میں نے ہیڈ کوارٹر رپورٹ بھیجی اور درخواست کی کہ زیادہ بہتر آلات اور کچھ بلڈوزر بھی مہیا کیے جائیں تاکہ ہم ملبا ہٹا کر کام کر سکیں۔ دو دن بعد آلات اور بلڈوزر آ گئے اور میرے آدمی ان کی مدد سے خفیہ بنکر تلاش کرنے لگے لیکن وہ مل کر نہیں دے رہا تھا۔ میرے آدمی صبح ہوتے ہی کام میں لگ جاتے اور رات ہونے تک کام جاری رہتا۔"

"پھر بنکر کیوں نہیں مل رہا تھا؟" زونیا بولی۔

میکس مسکرایا۔ "کیونکہ ہم بنکر کے اوپر بیٹھے تھے۔ وہی عمارت جہاں ہم نے کیمپ لگایا تھا۔ اصل میں بنکر اسی کے نیچے تھا۔ ہم سارے قصبے میں اس بنکر کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ میرے آدمیوں نے درجنوں مکانوں کا ملبا صاف کر دیا تھا لیکن بنکر نہیں ملا۔ ملتا بھی کیسے... اسے اس جگہ تلاش کرنے کا ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔"

"پھر وہ ملا کیسے؟" ایلکس بےصبری سے بولا۔

"اتفاق سے... اس روز میرے سارے ساتھی کام پر لگے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس ورک فورس محدود تھی اور مجھ سمیت سب کو کام کرنا پڑتا تھا مگر اس دن مجھے بخار تھا اور میں آرام کر رہا تھا۔ جب میں لیٹے لیٹے تنگ آ گیا تو میرے دل میں نہ جانے کیا آئی... میں نے سوچا کہ اس عمارت کی تلاشی بھی لینی چاہیے۔ اب تک ہم نے اس کے اندرونی حصے نہیں دیکھے تھے۔ بس اس کا بیرونی ہال کیمپ کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ میں نے ایک بڑی ٹارچ اٹھائی اور عمارت کے اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ یہ حصہ جزوی طور پر گر گیا تھا اور اسی وجہ سے ہم اس طرف جانے سے کتراتے تھے کہ کہیں ملبا ہم پر ہی نہ آن گرے۔

"میں ایک طویل راہداری میں آ نکلا۔ میرا خیال تھا کہ یہ شاید قصبے کے ٹاؤن ہال کی عمارت تھی لیکن جب میں اندر آیا تو مجھے اپنا خیال غلط معلوم ہونے لگا... کیونکہ اندر ایک کمرے میں کچھ عجیب طرح کی مشینری نصب تھی جیسے یہاں کچھ بنایا جاتا رہا ہے۔ وہاں کچھ پرزے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ یہ مجھے کسی جنگی مشین کا حصہ لگے۔ ممکن تھا کہ یہ ہٹلر کا کوئی خفیہ اسلحہ سازی کا کارخانہ رہا ہو کیونکہ جنگ سے پہلے اس نے اپنی ساری جنگی تنصیبات اور اسلحہ سازی کے مراکز خفیہ مقامات پر منتقل کر دیے تھے تاکہ اتحادی انہیں نشانہ نہ بنا سکیں۔

"میں اس کمرے سے آگے بڑھا تو مجھے فرش میں ایک بڑا سا گڑھا نظر آیا۔ یہ راہداری کے آخری سرے پر تھا اور [illegible] ویسی ہی عمارت تھی جیسی اوپر تھی۔ ویسی ہی راہداری... اور اس کے دائیں بائیں کمرے تھے۔ سب سے اہم بات کہ وہ حال ہی میں بنی تھی۔ یعنی جنگ کے آخری دنوں میں بنی تھی۔ میں نے ایک کمرا کھولا تو اس میں بہت سارے لکڑی کے بند بکس رکھے تھے۔ ان میں بعد میں یورپ بھر سے جمع کی جانے والی نادر و نایاب تصاویر نکلی تھیں۔ راہداری کے دوسرے کمروں میں اسی طرح پیٹیوں میں قیمتی نوادرات بھرے تھے اور یہ سب نازیوں نے یورپ بھر سے جمع کیے تھے اور جب انہیں اپنی شکست کے آثار نظر آنے لگے تو انہوں نے ان نوادرات کو ایسے ہی خفیہ بنکر بنا کر پورے جرمنی میں چھپا دیا۔ یہاں وہ یہ کام صحیح طریقے سے نہیں کر سکے تھے۔ اسی وجہ سے بنکر سامنے رہ گیا۔

"جب ان کے بمبار طیاروں نے اس قصبے کو نشانہ بنایا تو غلطی سے یہ عمارت بھی نشانہ بن گئی۔ اس کے بعد جرمنوں کو اپنی غلطی درست کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یوں یہ عمارت ایسے ہی رہ گئی۔ اس قصبے کے مکینوں کو یقیناً موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا لیکن یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ان سب کو اسی

جگہ مارا گیا ہوگا اور ان کی لاشیں یہیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ میں کمرے دیکھتا پھر رہا تھا کہ ایک کمرا کھولتے ہی بدبو کا اتنا زبردست جھونکا آیا کہ میں نے بےاختیار الٹی کر دی۔ حالانکہ میں فوجی تھا اور انسانی لاشوں کی بدبو میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اس کے باوجود مجھ سے وہ بدبو برداشت نہیں ہوئی۔ تم لوگ سوچ سکتے ہو کہ وہاں کیا حالت ہوگی۔

"لیکن مجھے تجسس ہو رہا تھا کہ اندر کیا ہے۔ میں اوپر آیا اور ایک گیس ماسک پہنا اور دوبارہ نیچے آیا۔ اس ماسک سے بدبو کسی قدر کم ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کئی فٹ کی اونچائی تک لاشیں بھری ہوئی تھیں۔ سامنے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا اور وہاں بھی بےشمار لاشیں تھیں۔ یہ عام لوگ تھے کیونکہ ان میں بوڑھے، بچے، عورتیں اور نوجوان بھی تھے۔ انہوں نے عام لباس پہن رکھے تھے اور انہیں اس جگہ بند کر کے مارا گیا تھا۔ یہاں ہوا کی آمد و رفت... کا کوئی انتظام نہیں تھا اور جب اتنے سارے لوگوں کو اس جگہ بند کیا گیا ہوگا تو وہ کچھ ہی دیر میں دم گھٹ جانے سے مر گئے ہوں گے۔ یہ کام یقیناً ان کے ہم وطنوں نے کیا تھا۔"

زونیا اور ایلکس اب اس کی کہانی میں دلچسپی لے رہے تھے۔ زونیا نے بےساختہ کہا۔ "لیکن کیوں... کیوں مارا گیا انہیں؟"

[illegible] خفیہ بنکر کے بارے میں [illegible] تھیں۔ ان سے ہی اس بنکر کی تعمیر میں کام لیا گیا اور جب کام مکمل ہو گیا تو انہیں اسی جگہ بند کر کے مار دیا گیا۔ انہیں مارنے کا مقصد ایک تو اس بنکر کو خفیہ رکھنا تھا، دوسرے اس بات کو پوشیدہ رکھنا تھا کہ ان لوگوں کو مار دیا گیا ہے۔ جرمن ایسا تاثر دینا چاہتے تھے کہ قصبے کے باسی بمباری میں اس کی تباہی کے بعد یہاں سے کہیں اور چلے گئے تھے۔ اس طرح یہ راز ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتا۔ لیکن قدرت ان مظلوموں کی موت کا راز فاش کرنا چاہتی تھی اس لیے بمباری کے دوران ایک بم اس عمارت پر اس طرح گرا کہ اس نے تہ خانے کی چھت بھی پھاڑ دی۔

"میں اس کمرے سے گزر کر سامنے نظر آنے والی راہداری میں داخل ہوا تو وہاں بھی لاشوں کا انبار تھا اور میں ان گل سڑ جانے والی لاشوں پر ہی چل رہا تھا۔ میں آج سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ میں کس طرح لاشوں پر چل رہا تھا۔ شاید وہ وقت ہی ایسا تھا کہ انسان اس وقت وہ کچھ کر گزرا جس کا اب سوچ بھی نہیں سکتا۔ بدبو اس قدر تھی کہ گیس ماسک کے باوجود میرا دم گھٹ رہا تھا لیکن میں ایک جنون کے عالم میں آگے بڑھ رہا تھا۔ راہداری کے آخری سرے پر ایک کمرا تھا۔ اس طویل راہداری میں لاشیں ہی لاشیں تھیں۔

"مجھے لگا کہ اس کمرے میں کوئی خاص چیز ہے۔ میں بڑی مشکل سے وہاں تک پہنچا تھا۔ یقیناً میرا دماغ خراب تھا جو میں وہاں تک آ گیا تھا۔ کوئی صحیح الدماغ آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔ کئی بار میں پھسل کر گر پڑا اور میرا جسم گلی لاشوں سے نکلی رطوبتوں سے بھر گیا۔ اگر اس وقت ایک جنون طاری نہ ہوتا تو شاید میں اس گندگی کے احساس سے مر جاتا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو زور زور سے ہنس رہا تھا یا شاید رو رہا تھا۔ میری ذہنی کیفیت نارمل نہیں تھی لیکن میں نے وہاں جو دیکھا، اس نے مجھے ایسا جھٹکا دیا کہ میں ہوش میں آ گیا۔" یہ کہتے کہتے میکس چپ ہو کر جیسے ماضی میں کھو گیا۔

"آپ نے کیا دیکھا تھا؟" ایلکس بےچینی سے بولا۔ اسے باپ کا چپ ہونا گراں گزر رہا تھا۔ اس کی بات پر میکس چونکا۔

"وہاں دولت تھی... بےپناہ دولت... اتنی کہ میں ارب پتی ہونے کے باوجود اس دولت کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ وہاں ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں سونے کی اینٹوں کے انبار لگے تھے۔ بڑے بڑے بکسوں میں نایاب ترین ہیرے جواہرات بھرے تھے۔ اتنی دولت جسے دیکھ کر آدمی پاگل ہو جائے۔"

ایلکس اور زونیا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "اتنی دولت تھی وہاں!"

"ہاں... کئی سو ٹن سونا اور کئی من ہیرے جواہرات تھے۔ اگر میں اپنا بیگ ان جواہرات سے بھر لیتا تو وطن واپس آنے کے بعد مجھے شاید کام کرنے کی ضرورت باقی نہ رہتی۔"

ایلکس نے بےیقینی سے اسے دیکھا۔ "تو کیا آپ نے ایسا نہیں کیا؟"

"نہیں، میں نے ایسا نہیں کیا... اس وقت وہ دولت مجھے دنیا کی مکروہ ترین چیز لگ رہی تھی۔ ان لاشوں سے اٹھتی گندی رطوبتوں سے بھی زیادہ غلیظ جس سے میرا جسم لتھڑ گیا تھا۔ لیکن یہ سونا اور جواہرات مجھے ان لاشوں سے بھی زیادہ متعفن لگ رہے تھے۔ میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

"لیکن کیوں؟" ایلکس بےساختہ چیخ اٹھا۔

میکس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم سمجھے نہیں... یہ دولت گندی تھی... اس کی خاطر کئی سو معصوم افراد کو انتہائی بےرحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا... اور جنہوں نے یہ کام کیا تھا وہ بھی نہیں رہے تھے لیکن یہ دولت باقی رہ گئی تھی۔ میرے بیٹے! دولت ایسی چیز ہے جس کے پیچھے انسان دوسروں کو قتل کرتا

ہے اور پھر خود فنا ہو جاتا ہے لیکن یہ باقی رہتی ہے۔"

ایلکس باپ کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ زونیا کی آنکھوں میں بھی شک تھا۔ اس نے پوچھا۔ "آپ نے سچ مچ وہاں سے کچھ نہیں اٹھایا تھا؟"

"اگر میں نے وہاں سے کچھ لیا ہوتا تو کم سے کم تم لوگوں سے مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور مزید یہ کہ میں ایک معمولی سے اسٹور سے آغاز نہیں کرتا بلکہ شروع میں ہی کوئی بڑا کام کر لیتا۔"

"پھر آپ نے اس دولت کا کیا کیا؟"

"کچھ بھی نہیں... میں وہاں سے نکل آیا اور پھر میں نے ڈائنامیٹ کی مدد سے عمارت کے اس حصے کو گرا دیا۔ میں نے کہا کہ یہ جگہ مشکوک ہو گئی ہے اس لیے اس کا گرا دینا بہتر ہے تاکہ کسی کو نقصان نہ ہو۔ میری بات تسلیم کر لی گئی۔"

"لیکن بنکر تو ملا نہیں۔" ایلکس نے اعتراض کیا۔ "کیا اوپر والوں نے اعتراض نہیں کیا؟"

"ان دنوں جرمنی میں جا بجا ایسے بنکرز کی تلاش... جاری تھی اور ان میں سے بہت سارے کبھی بھی نہیں ملے۔ اس بنکر کو بھی ایک ایسا ہی جھوٹ سمجھ لیا گیا۔ بنکرز کے بارے میں معلومات عام طور سے پکڑے جانے والے جرمن قیدیوں یا ریکارڈ سے ملتی تھی۔ دونوں ماخذ مشکوک ہوتے تھے۔ اس لیے بہت باریک بینی سے چھان بین نہیں کی جاتی تھی اور عام طور سے بنکرز کی تلاش میں جانے والے یونٹوں کی رپورٹ مان لی جاتی تھی۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس عمارت کو منہدم کرنے کے بعد اس بات کا کوئی امکان نہیں رہا تھا کہ وہ بنکر کبھی دریافت ہو سکے گا۔"

"لیکن پھر اس جگہ کا کیا ہوا؟" زونیا بے چینی سے بولی۔

"کچھ بھی نہیں... میں آج سے تین سال پہلے وہاں گیا تو اس قصبے کی جگہ ایک چھوٹا سا لیکن جدید شہر تعمیر ہو چکا ہے۔"

"تو لوگوں کو وہ بنکر مل گیا؟" ایلکس بولا۔

"ہو سکتا ہے مل گیا ہو اور دولت بھی مل گئی ہو لیکن یہ بات کبھی منظر عام پر نہیں آئی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بنکر ابھی تک نہیں ملا۔ وہ اس مردہ قصبے میں دب کر رہ گیا اور اب اس کے اوپر ایک نیا شہر تعمیر ہو چکا ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے... دولت انسانوں کے ساتھ دفن ہو جاتی ہے لیکن اس کے کسی کام نہیں آتی۔"

"ڈیڈی! دولت بیکار چیز نہیں ہے۔" ایلکس بولا۔

"ہاں اگر آدمی اپنے زور بازو سے کمائے، ورنہ حرام کی دولت تو حرام میں جاتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر میں اس وقت بے ایمانی کرتا اور اس دولت کا کچھ حصہ ہی لے آتا تو کیا آج میں اس مقام پر اور اتنا ہی عزت دار ہوتا؟"

لیکن زونیا اور ایلکس نے اس کی بات نہیں سنی۔ انہیں تو یہ دکھ کھائے جا رہا تھا کہ میکس نے اتنی بڑی دولت ٹھکرا دی۔ اگر وہ یہ دولت حاصل کر لیتا تو آج وہ اس دنیا کا نہ سہی لیکن امریکا کے امیر ترین افراد میں ضرور شامل ہوتا۔ میکس نے سرد آہ بھری اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ایلکس اور زونیا سمجھنے والے لوگوں میں سے نہیں۔ وہ دولت سے پیار کرتے تھے اور دولت کی فطرت میں بے وفائی ہے۔ آج کسی کی اور کل کسی کی۔ اگر وہ انسانوں سے پیار کرتے تو دولت خود بہ خود ان کی طرف کھنچی۔ میکس نے اسی طرح ترقی کی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو ترجیح دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دل و جان سے اس کے لیے کام کرتے تھے۔ اسے بھی کاروبار میں کئی بار نشیب و فراز کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس نے کسی ایک ملازم کو بھی فارغ نہیں کیا۔ اس نے اپنے منافع میں کمی گوارا کر لی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ ایک بار اچھا ملازم چلا جائے تو پھر نہیں ملتا۔

اس نے یہ کہانی شیف کو بھی سنائی تھی اور اس کا ردعمل اپنے ماں باپ سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے دادا کے گلے لگ کر کہا تھا۔ "مجھے فخر ہے کہ آپ میرے دادا ہیں۔"

اس وقت اس نے جان لیا کہ شیف کبھی ناکام نہیں ہوگا کیونکہ وہ انسانوں کی اہمیت جان گیا تھا۔ اس کے باپ نے غلطی کی تھی، وہ انسانوں کے بجائے بے جان چیزوں کو اہمیت دیتا تھا اور آج بھی وہ یہی کام کر رہا تھا۔ ایسے لوگوں کا انجام بالآخر ناکامی ہوتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ اس بات کے آٹھ مہینے بعد ایلکس اس کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میکس نے اس سے سوال کیا۔

"کیا اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے؟"

ایلکس نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ "ڈیڈی! مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ہم دیوالیہ ہونے والے ہیں۔"

"ہم نہیں... تم۔" ایلکس نے اسے ٹوکا۔ "یہ بزنس مکمل طور پر تمہارا ہے... اس میں میرا یا شیف کا کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ ہمارا کوئی عمل دخل ہے۔"

"جی ڈیڈی! یہ بزنس میرا ہے۔" ایلکس نے اعتراف کیا۔ "اگر میں نے دیوالیہ ہونے کی درخواست نہیں دی تو قرض خواہ مجھے عدالت میں کھینچ لیں گے۔"

"دیوالیہ قرار دیا جانا اتنا آسان نہیں ہے۔" میکس نے کہا۔ "بے شک تمہیں خسارہ ہو رہا ہے لیکن تمہاری پوزیشن

مضبوط ہے۔"

ایلکس پریشانی سے بولا۔ "ڈیڈی! اگر مجھے دیوالیہ قرار نہیں دیا گیا تو جو میرے پاس ہے وہ سب بھی چھن جائے گا۔"

میکس نے افسوس سے اپنے اس بزدل بیٹے کو دیکھا جو اپنی جمع پونجی بچانے کے لیے خود کو دیوالیہ قرار دلوانا چاہتا تھا اور اسے کوئی پروا نہیں تھی کہ اتنی بڑی فرم سے وابستہ لاکھوں لوگوں کا روزگار ختم ہو جائے گا۔

"تم بہت جلد ہمت ہار رہے ہو۔"

"ہاں، اگر میں نے ایسا نہیں کیا تو اپنا سب ہار جاؤں گا۔"

میکس سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ "ایلکس! تم دیوالیہ ہونے کے بجائے یہ فرم میرے حوالے کر دو۔"

ایلکس نے تعجب سے اسے دیکھا۔ "آپ کیا کریں گے؟"

"میں اسے بچانے کی کوشش کروں گا۔"

"وہ تو آپ اب بھی کر سکتے ہیں۔"

میکس نے نفی میں سر ہلایا۔ "بزنس کا ایک ہی مالک ہوتا ہے۔ جس بزنس کے دو مالک ہوں، اسے ڈوبنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔"

"تب آپ کیا چاہتے ہیں؟" ایلکس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"بزنس میرے حوالے کر دو اور لاتعلق ہو جاؤ۔"

ایلکس سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا اور سرد آہ بھر کر بولا۔ "مجھے منظور ہے ڈیڈی!"

☆☆☆

میکس دفتر میں تھا۔ اس عمر میں اگرچہ اتنی محنت اس کے لیے دشوار ہو رہی تھی لیکن یہ فرم اس کے پوتے کی امانت تھی اور وہ اسے برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے ہمت کر کے میدان عمل میں اتر آیا تھا۔ اس نے بعض پرانے مخلص ساتھیوں کو پھر سے بلائے اور ان کے ساتھ مل کر فرم کو بچانے کی کوشش میں لگ گیا۔ اس نے ڈاؤن سائزنگ نہ کرنے کا اعلان کیا اور ملازمین سے اپیل کی کہ وہ بچت کرنے کے منصوبوں پر اس کا ساتھ دیں تاکہ فرم کا خسارہ ختم کیا جا سکے۔ ملازمین نے اس کی اپیل کا مثبت جواب دیا۔ بچت کے منصوبوں سے جاری اخراجات میں لاکھوں ڈالرز روزانہ کی کمی آئی۔ پھر اس نے صارفین کے لیے ڈسکاؤنٹ پیکیجز دیے۔ اس سے گرتی سیل کو خاطر خواہ سہارا ملا۔ مجموعی طور پر صورت حال بہتر ہوئی تھی لیکن ابھی بھی اسے ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی جس سے کاروبار کو سہارا دیا جا سکے۔ وہ اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ اپنی ساری جمع پونجی بھی فرم میں لگا چکا تھا۔

میکس اپنے دو افسران کے ساتھ ایک معاملے میں مشورہ کر رہا تھا کہ اسے شیف کی آمد کی اطلاع ملی۔ اس نے افسران سے معذرت کی کہ وہ انہیں پھر بلائے گا۔ شیف درمیان میں اس سے ملنے آتا رہا تھا لیکن اس بار وہ پورے دو مہینے بعد آیا تھا۔ وہ اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ شیف اندر آیا تو میکس نے کھڑے ہو کر اسے گلے لگا لیا۔

"تمہیں خیال نہیں ہے کہ تمہارا ایک دادا بھی ہے جو تمہیں دیکھ کر جیتا ہے۔" میکس نے شکوہ کیا تو شیف ہنسنے لگا۔

"پتا ہے لیکن میں چاہتا تھا کہ اس بار کامیابی کے ساتھ آپ سے ملاقات کروں۔"

شیف کے چہرے کے تاثرات سے وہ جان گیا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر واپس آیا ہے۔ میکس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "اب بولو۔"

"دادا جان! آپ نے توبو گیم ڈاٹ کام کا نام سنا ہے؟"

میکس نے سر ہلایا۔ "ہاں، آج کل اس کا نام بہت سننے میں آ رہا ہے۔ کوئی گیمز اور سوشل قسم کی ویب سائٹ ہے۔"

"یہ میں نے بنائی ہے۔" شیف نے فخر سے کہا۔

میکس نے اسے تعجب سے دیکھا۔ "تم نے؟"

"جی دادا جان! میرا دوست بھی ہمت ہار گیا تھا لیکن میں کام کرتا رہا۔ آج اس کے ساری دنیا میں چالیس لاکھ ممبرز ہیں اور کل ہی مجھے ایک بڑی انٹرنیٹ کمپنی نے اس سائٹ کی بولی دی ہے۔ آپ جان سکتے ہیں کہ اس نے کیا بولی دی ہوگی؟"

"نہیں۔" میکس نے اعتراف کیا۔ "مجھے ان چیزوں کے بارے میں اتنا پتا نہیں ہے۔"

"مجھے بارہ سو ملین ڈالرز کی پیش کش ہوئی ہے۔" شیف نے کہا۔ "میں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بزنس ڈیل آپ کریں کیونکہ آپ یہ کام بہت اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ آپ بہتر قیمت لے سکتے ہیں۔"

"اور تم کیا کرو گے برخوردار؟"

شیف مسکرایا۔ "میں نے آپ سے مزید تعلیم کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے، آئی ٹی میں... اور اب جا کر پڑھوں گا۔" شیف کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک فائل میکس کے سامنے رکھ دی۔ "اس میں سب ہے دادا جان! مجھے امید ہے کہ اس رقم سے پال ٹریڈرز کو بہت مدد ملے گی۔"

میکس نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔ اپنے باپ کے برعکس شیف کامیابی کا راز جان گیا تھا۔

www.pkdigest.com

دسویں قسط

اسماقادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے..... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی افسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

اسے اپنے اردگرد موجود ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ یہ چکراتے ہوئے در و دیوار پوری قوت سے آ کر اس سے ٹکرائیں گے اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیں گے۔ موجودہ منظر نے اس کی ساری ہستی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ آفتاب کی اپنی زندگی میں آمد سے قبل وہ خوشی کے وجود سے ناواقف تھی۔ زندگی اس کے نزدیک ایک جلتے بلتے صحرا میں ننگے پیر سفر کرنے کے سوا کچھ نہیں تھی لیکن ابھی وہ جس لمحے میں موجود تھی، وہ تو ساری عمر کے دکھوں سے بڑھ کر تکلیف دہ تھا۔ آج اس نے اپنی زندگی کا سب سے کریہہ منظر دیکھا تھا۔ اس منظر نے اسے بہت کچھ یاد دلا دیا تھا۔

حویلی میں فریدہ کی وہ پہلی صبح... جب وہ اس سے ملنے اس کمرے تک آئی تھی اور حیران ہو رہی تھی کہ کیا بہزاد شاہ بھی کسی لائق ہے؟ آج اس پر سارے اسرار کھل گئے تھے۔ فریدہ کی تلخ اور زہر میں ڈوبی ہوئی باتوں کا مفہوم بھی اس لمحے اسے بہت اچھی طرح سمجھ آ گیا تھا۔ چند سیکنڈوں کے اندر وہ آگہی کے کرب ناک عذاب سے گزری تھی۔ اسے لگا کہ مزید ایک سیکنڈ بھی وہاں رکی تو اذیت سے مر جائے گی۔ چنانچہ وہ اپنے جسم کی تمام تر طاقتیں مجتمع کرتی ہوئی پلٹی اور دیوانہ وار دوڑ پڑی۔ بالائی منزل سے نچلی منزل کی طرف جانے والی سیڑھیاں اس نے اتنی برق رفتاری سے طے کیں جیسے کسی پہاڑی ڈھلوان سے لڑھک رہی ہو۔ سیڑھیاں طے کر کے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی تو رانی نے اسے دیکھ لیا۔ وہ برآمدے میں اسی کے انتظار میں ٹہل رہی تھی۔

"کیا گل ہے بی بی! سب خیر تو ہے؟" رانی گھبرا کر اس کی طرف لپکی۔ ساتھ ہی اس نے کشور کے عقب میں بھی نظر دوڑائی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کوئی نہ کوئی اس کے تعاقب میں ہوگا لیکن برآمدہ ہنوز سنسان پڑا تھا۔ اسے کچھ نہیں آیا کہ پھر کشور کی یہ حالت کیوں ہے؟

رانی کو زیادہ غور و خوض کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ کشور اس کے وجود کو سراسر نظرانداز کرتی ہوئی وحشت زدہ انداز میں بغیر رکے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ رانی نے کمرے میں داخل ہونے سے قبل گردن موڑ کر یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ کوئی پیچھے تو نہیں آ رہا اور پھر مطمئن ہو جانے پر کمرے میں داخل ہو گئی۔ کشور اپنے بستر پر گری لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ رانی نے احتیاطاً پہلے دروازے کی کنڈی چڑھائی پھر کشور کے قریب آئی۔

"کسی ٹھیک تو ہو بی بی! کیا کسی نے دیکھ لیا ہے؟" پریشانی کے عالم میں اس نے کشور سے پوچھا لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ بستر پر گری کشور بری طرح کپکپا رہی ہے اور کوئی جواب دینے کے قابل نہیں ہے۔ اس نے جلدی سے اسے ایک کھیس اوڑھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔ کافی دیر بعد کشور کی حالت ذرا سنبھلی۔

"کیا ہوا تھا بی بی! آپ کس چیز سے ڈر گئی تھیں؟" اسے سنبھلا ہوا دیکھ کر رانی نے اپنا سوال دہرایا۔

"کسی سے نہیں۔ تم بتی بجھا دو، مجھے نیند آ رہی ہے۔" کشور نے روکھے سے لہجے میں جواب دے کر اپنی آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ حیران پریشان رانی نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور ٹیوب لائٹ بند کر کے نائٹ بلب روشن کر دیا۔ بلب روشن کرنے کے بعد اس نے کشور کے سرہانے پڑا موبائل اٹھا کر الماری میں اس کی مخصوص جگہ پر رکھا اور الماری کو تالا لگا دیا۔ کشور پلکوں کی درز سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اپنی وفادار ملازمہ کی اس قدر خیال داری پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس حویلی میں جہاں ہر پل سازشیں جنم لیتی رہتی تھیں، خدمت گزاروں کی فوج جبراً بھرتی کی جاتی تھی... انسانی حقوق اور انسانیت کی پامالی معمولی باتیں تھیں، وہاں رانی جیسی ملازمہ کا میسر آ جانا بہت بڑی نعمت تھی۔

www.pkdigest.com

"یہ نائٹ بلب بھی بند کر دے رانی!" آنکھوں پر بازو رکھے رکھے ہی اس نے حکم دیا جس کی فوراً تعمیل کی گئی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا ہو گیا لیکن وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ اندھیرے میں کچھ دیر قبل دیکھے گئے منظر سے فرار حاصل ہو جائے گا، اپنی کوشش میں بُری طرح ناکام رہی۔ اندھیرا تو اس منظر کو اور بھی واضح کر کے دکھا رہا تھا۔ اس منظر کے پس منظر میں اسے اپنی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"میں شرمندہ ہوں کہ میرے اباجی نے تمہارے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا لیکن میں شرمندہ ہونے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔" فریدہ سے پہلی ملاقات کے موقعے پر جب اسے یہ علم ہوا تھا کہ چودھری افتخار نے پناہ کے لیے اپنے پاس آنے والی فریدہ اور اس کے محبوب قربان کو دھوکا دے کر فریدہ کی شادی زبردستی بہزاد شاہ سے کروا دی ہے، اس وقت اس نے یہ بات فریدہ سے کہی تھی۔ جواب میں فریدہ نے کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں، تب ہی تو تمہیں تمہارے باپ کا وہ روپ نہیں دکھایا جسے دیکھنے کے بعد تم شرم سے زندہ زمین میں دفن ہونے کی خواہش کرنے لگو گی۔" واقعی اس نے جو منظر دیکھا

تھا، اسے دیکھ کر دل یہ چاہا تھا کہ زمین شق ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ ان کے خاندان کے مرد رنگین مزاج اور عیش پرست ہیں، یہ حقیقت جاننے کے باوجود اس کے لیے اپنے باپ کا وہ مکروہ روپ دیکھنا بے حد کٹھن ثابت ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ ایک بُرا آدمی ہے لیکن یہ خبر نہیں تھی کہ وہ اتنا بُرا باپ ہے کہ اسے اپنے رشتوں کے تقدس کا بھی احساس نہیں۔ وہ اپنے ذہنی معذور بیٹے کی بیوی کو بہو کی نظر سے دیکھنے کے بجائے اپنی داشتہ بنا بیٹھا تھا۔ وہ اپنے دل میں اس کے لیے اتنی شدید نفرت محسوس کر رہی تھی کہ اس کے مقابل کھڑی ہو کر بھی اس نفرت کا اظہار کر سکتی تھی۔

☆☆☆

"کدھر مری رہتی ہو تم دونوں؟ کچھ ہوش رہتا ہے تمہیں حویلی کا یا نہیں؟" بڑی اور چھوٹی دونوں چودھرائنیں صبح کی اس پہلی گھڑی میں چودھری کی عدالت میں موجود تھیں اور وہ ان پر برس رہا تھا۔

"ایسا کیا ہو گیا چودھری صاحب! حویلی میں تو سب چنگا بھلا چل رہا ہے۔ فیر بھی اگر کوئی گل ہے تو مینوں دسو۔"

"میں نے منع نہیں کیا تھا کہ کوئی بہزاد کی ووہٹی سے تعلق نہیں رکھے گا؟ وہ میرے دشمن کی بہن ہے۔ میں اس کی ناک نیچی کرنے کے لیے اس کی بہن کو بہزاد سے ویاہ کر لایا ہوں، پر یہاں تو اس سے دوستیاں گھڑی جا رہی ہیں۔ کیوں جاتی ہے بھلا کشور اس سے ملنے اوپر؟ تم اسے روکتی کیوں نہیں ہو؟" چودھری کا روئے سخن بڑی چودھرائن کی طرف تھا کیونکہ کشور کی ماں سے زیادہ بڑی چودھرائن ہی حویلی کی کرتا دھرتا تھی۔

"میں تو اسے بہت واری سمجھا چکی ہوں چودھری صاحب! پر آپ کی یہ دھی بڑی اتھری ہے۔ میرے روکنے پر بولی کہ میں اپنے بھرا سے ملنے جاتی ہوں۔ میں نے تو ناہید سے کہا تھا کہ سنبھال کر رکھ اپنی دھی کو ورنہ یہ کوئی نہ کوئی گل کھلا کر رہے گی، پر اسے دھی کی ویران زندگی کا بڑا خیال رہتا ہے۔ میرے سمجھانے پر بھی اس کے ساتھ زیادہ روک ٹوک نہیں کرتی ہے۔" بڑی چودھرائن نے فوراً توپوں کا رخ سوکن کی طرف کر دیا۔

"یہ گل نہیں ہے چودھری صاحب! میں تو بس اس لیے نہیں روکتی کشور کو اوپر جانے سے کہ وہ وچارے بہزاد چودھری کی محبت میں جاتی ہے۔ کشور کو روکنے کا سوچوں تو دل میں خوف خدا آتا ہے۔ فیر یہ بھی سوچتی ہوں کہ میرے روکنے ٹوکنے پر کل کو کوئی یہ الزام لگا دے گا کہ میں سگے سوتیلے کا فرق

کرتی ہوں۔ کشور اور بہزاد شاہ سگے بھائی بہن نہیں اس لیے کشور کو اس سے ملنے نہیں دیتی۔" چھوٹی چودھرائن ناہید بے شک بڑی چودھرائن سے دبتی تھی لیکن خود کو پھنستا دیکھ کر اشارے کنایے میں ہی سہی، سوکن کو رگیدنے سے باز نہ رہ سکی۔ اس کی اس حرکت پر بڑی چودھرائن کوئی جوابی حملہ کرتی، اس سے قبل ہی کمرے کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی اور پھر ایک ملازمہ پریشان اور گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"کیا گل ہے؟" اس دخل اندازی پر چودھری نے غصے سے پوچھا۔

"منشی اللہ رکھا آپ سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے، چودھری صاحب سے ملنا ضروری ہے۔" ملازمہ نے خوف زدہ سے لہجے میں بتایا تو چودھری کچھ سوچتا ہوا ملاقاتی کمرے کی طرف چلا گیا۔ ویسے وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ منشی کیا اطلاع لے کر آیا ہوگا؟ اسے اتنی جلدی کی امید نہیں تھی۔

"ہاں بھئی منشی! بول کیا خبر لایا ہے جسے سنانے کے لیے اتنا بے تاب ہو رہا ہے؟" ملاقاتی کمرے میں پہنچ کر اس نے اطمینان سے منشی سے پوچھا اور خود اپنے مخصوص تخت پر بیٹھ کر حقے کی نے تھام لی۔

"خبر بڑی بُری ہے چودھری صاحب! ابھی ابھی بالا وہ خبر لے کر آیا ہے۔ میں اسے بلواتا ہوں، وہ آپ ہی سب کچھ بتائے گا۔" منشی کے لہجے میں واضح ہچکچاہٹ تھی۔ بالے کا ذکر سن کر چودھری پہلے سے بھی زیادہ مطمئن ہو گیا۔ بالا کمرے میں آیا تو اس کا فق چہرہ دیکھ کر وہ تھوڑا سا ٹھٹکا۔

"کیا گل ہے؟ یہ تیرے بوتھے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟ جس کام کے لیے گیا تھا اس میں کوئی گڑبڑ کر دی کیا؟" اس نے تیز لہجے میں بالے سے پوچھا۔

"نہ چودھری صاحب! وہ کام تو میں نے وڈی چنگی طرح کر دیا ہے۔ ادھر سے آپ کو جلد اپنی مرضی کی خبر مل جائے گی، پر ابھی جو میں خبر لایا ہوں، وہ بڑی بُری ہے۔"

"اب بک بھی دے کہ کیا ہو گیا ہے؟ بُری خبر، بُری خبر کہہ کر جب سے دونوں مجھے ہولانے کی کوشش کر رہے ہو۔" بالے کا جواب سن کر چودھری کا ضبط جواب دے گیا اور وہ بُری طرح دہاڑا۔

"میرا تو آپ کو معلوم ہی ہے سرکار کہ رات میں ڈیرے پر نہیں تھا۔ دو بندوں کو ادھر چھوڑ کر میں آپ کا حکم پورا کرنے گیا ہوا تھا۔ کام ہونے کے بعد میں ڈیرے پر پہنچا تو

وہاں عجیب حال تھا۔ جن دو بندوں کو میں ڈیرے پر چھوڑ کر گیا تھا، وہ پانی کا پائپ لگائے تہ خانے کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ لگ گیا۔ آگ بجھی تو میں نے ان دونوں سے تفصیل پوچھی۔ انہوں نے بتایا کہ کوئی بندہ ڈیرے میں چپکے سے گھس آیا تھا۔ اس نے کتوں کو بھی ٹھکانے لگا دیا اور ان دونوں کو بھی بے ہوش کر ڈالا۔ وہ ہوش میں آئے تو بندہ غائب تھا اور نیچے تہ خانے میں آگ لگی ہوئی تھی۔"

"کیا بکواس ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کس مائی کے لال میں اتنی جرأت ہے کہ چودھری افتخار کے ڈیرے میں گھس کر یہ سب کر سکے؟" چودھری یہ خبر سن کر بھڑک اٹھا۔

"معلوم نہیں چودھری صاحب! دونوں بندوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس آدمی کی شکل نہیں دیکھی مگر یہ اندازہ ضرور ہے کہ وہ ادھر پیر آباد کا رہنے والا نہیں تھا۔ وہ تو یہ تک کہہ رہے تھے کہ وہ بندہ آدمی کے بجائے کوئی بھوت لگ رہا تھا جو پوری کوشش کے باوجود ان کے قابو میں ہی نہیں آیا۔"

"ان بدحراموں کی تو میں کھال کھنچوا دوں گا۔ پڑے ہوں گے نشہ کر کے اس لیے کچھ خبر نہیں ہوئی اور اب بہانہ بنا رہے ہیں کہ کوئی بھوت تھا۔ بھوتوں کو بھلا کیا ضرورت پڑی ہے ڈیرے میں گھس کر آگ لگانے کی۔ وہ یقیناً میرا کوئی دشمن تھا جو ان بندوں کی غفلت کی وجہ سے ہاتھ دکھا گیا ہے۔ ان حرام خوروں سے تو میں اچھی طرح حساب لوں گا۔ پہلے میں ڈیرے پر جا کے دیکھوں کہ وہاں کیا حشر مچا ہے۔" غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ چودھری اپنے تخت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ تینوں ایک شاندار لینڈ کروزر میں بیٹھے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے۔ لینڈ کروزر کے طاقتور انجن نے بہت تیزی سے انہیں ان کی منزل تک پہنچا دیا۔ چودھری زمین پر زور زور سے پیر مار کر چلتا ہوا ڈیرے میں داخل ہوا۔ سامنے ہی اس کے چہیتے کتوں کی لاشیں موجود تھیں۔ ان لاشوں کے قریب شریف اور اس کا ساتھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چودھری کے کچھ دوسرے کارندے بھی ڈیرے پر موجود تھے۔ ان سب کے چہرے ستے ہوئے تھے لیکن شریف اور اس کے ساتھی کی حالت پتلی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ رات جو کچھ پیش آیا ہے، اس کی ذمے داری انہی کے سر ڈالی جائے گی۔ وہ محافظ ہو کر ڈیرے کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے تھے اور چودھری کے نزدیک یہ ناکامی نمک حرامی کے زمرے میں آتی تھی۔ اس لیے وہ دونوں خوف زدہ تھے کہ جانے ان کا کیا انجام ہو؟ اگر انہیں اپنے پیچھے اپنے بیوی بچوں کی زندگی کا خوف نہ ہوتا تو وہ ہوش میں آنے کے بعد ایک لمحہ بھی یہاں رکنے کے بجائے گاؤں سے فرار ہو جانے میں ہی عافیت سمجھتے۔ اپنے گھر والوں کا لرزہ خیز انجام سوچ کر وہ اپنی ذات کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے لیکن بہر حال، انجام سے خوف زدہ تو تھے۔ چودھری کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ کسی پالتو جانور کی طرح لپک کر اس کے قریب آئے اور اس کی ٹانگوں میں اپنے سر رکھ دیے۔

"صورت گم کرو ان نمک حراموں کی۔" چودھری نے دونوں کے سروں پر باری باری پیر سے زوردار ٹھوکر لگائی اور اس طرف بڑھ گیا جہاں تہ خانے کا راستہ تھا۔ منشی اور بالا دونوں اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی ان کے نتھنوں سے وہ مخصوص بو ٹکرائی جو کسی جگہ لگنے والی آگ کو بجھائے جانے کے بعد آتی ہے۔ آگ بجھے کافی دیر ہو چکی تھی چنانچہ اندر دھواں تو نہیں بھرا ہوا تھا لیکن بہر حال، گھٹن ضرور محسوس ہو رہی تھی۔ چودھری نے سب سے پہلے اپنے مخصوص کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کا دروازہ لکڑی کا تھا اور اس کا بیشتر حصہ جل چکا تھا۔ چودھری نے چوکھٹ پر کھڑے ہو کر لمحہ بھر کے لیے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں موجود ہر شے کو آگ کے شعلوں نے چاٹ لیا تھا۔ وہاں اگر کچھ خاک [illegible] تھا تو [illegible] ایک سیاہ ڈھانچے کی صورت میں موجود تھا۔ بڑی چاہت سے سجائے گئے کمرے کی یہ حالت دیکھ کر اسے دھچکا تو ضرور لگا لیکن اس سے بھی زیادہ اسے تجوری میں موجود اپنے خزانے کی فکر تھی۔ دو تین لمبے ڈگ بھر کر اس نے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اس خلا تک پہنچ گیا جس میں اس کی خفیہ تجوری موجود تھی۔ تجوری پوری کھلی ہوئی تھی۔ اس میں رکھے کاغذات جل کر خاک ہو چکے تھے۔ سونے کا ڈھیر بھی متاثر ہوا تھا لیکن بہر حال موجود تھا۔

"اسے کسی صندوقچی میں ڈال کر محفوظ جگہ پر رکھواؤ۔" اس نے سونے کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بنا کسی کو مخاطب کیے حکم صادر کیا۔

"بہتر سرکار!" منشی کو معلوم تھا کہ یہ حکم اس کے لیے ہے اس لیے فوراً مستعدی سے جواب دیا۔

چودھری پلٹ کر کمرے سے باہر نکلا۔ آگ بڑے خوفناک طریقے سے لگی تھی لیکن بہر حال بچت ہو گئی تھی کہ آگ کے شعلوں نے اس کمرے کے سوا تہ خانے کے کسی اور حصے کو لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پھر اس کے کارندوں کے لیے آگ بجھانا کسی طور ممکن نہ ہو پاتا۔ کمرے سے نکلنے کے بعد وہ تہ خانے میں مزید نہیں رکا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کھلے حصے میں آ گیا۔ بالا اس کے پیچھے پیچھے تھا جبکہ منشی حکم کی پیروی کے لیے وہیں رک گیا تھا۔ کھلے حصے میں پہنچ کر چودھری نے اپنا موبائل نکال کر ایس پی کا نمبر ڈائل کیا۔

"میں آپ کو ہی فون کرنے والا تھا چودھری صاحب... لیکن لگتا ہے آپ کو میرے فون سے پہلے ہی خبر مل گئی ہے۔" کال ریسیو کرتے ہی تارڑ نے بولنا شروع کر دیا۔

"کیسی خبر؟" چودھری لمحہ بھر کے لیے چونکا۔

"اوہ! اس کا مطلب ہے آپ کو نہیں معلوم۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میرے پاس ہیلتھ یونٹ سے ڈاکٹر کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اقبال باجوہ کا شوفر اور ملازم اسے لے کر ہیلتھ یونٹ آئے تھے۔ باجوہ کا چیک اپ کرتے ہی ڈاکٹر کو اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے اور موت کی وجہ ہارٹ فیل ہے۔" ایس پی نے مختصراً ساری بات بتائی۔

"اوہو... یہ تو صبح صبح دوسری بُری خبر سننے کو مل گئی۔" چودھری نے تبصرہ کیا۔

"دوسری بُری خبر! اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" ایس پی چونکا۔

"ادھر میرے ڈیرے کے تہ خانے میں کسی نے آگ لگا دی ہے۔ میرا خاص کمرا جل کر خاک ہو گیا ہے۔ رات جانے کون آدمی ڈیرے میں گھس آیا تھا۔ اس نے پہلے میرے کتوں کو گولی ماری، پھر میرے بندوں کو بے ہوش کر کے تہ خانے میں آگ لگا دی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ساتھ میں کچھ لے بھی گیا ہو لیکن ابھی میں اندازہ نہیں لگا سکا۔ آپ کو اسی لیے کال کی تھی کہ یہاں آ کر ذرا اس واقعے کی چھان بین تو کریں۔" چودھری نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"یہ تو بڑی بُری خبر سنائی آپ نے۔ ایسا کون ساجی دار دشمن پیدا ہو گیا آپ کا جس نے ڈیرے میں گھس کر یہ کارروائی کرنے کی ہمت کی؟ بہر حال، آپ پریشان نہ ہوں۔ میں پیر آباد پہنچ رہا ہوں۔ باجوہ والا معاملہ بھی دیکھ لوں گا اور ڈیرے کا بھی چکر لگا لوں گا۔" ایس پی نے چودھری کو تسلی دے کر فون بند کر دیا۔ فون سے فارغ ہو کر چودھری بالے کی طرف متوجہ ہوا۔

"کام تمام ہو گیا ہے باجوہ کا۔ ایس پی بتا رہا تھا کہ موت ہارٹ فیل سے ہوئی ہے، یعنی کسی کو شک نہیں ہوگا کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ تو بتا... تجھے تو کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی؟" چودھری کے چہرے پر چھائی سختی ذرا کم ہو گئی تھی۔

"کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی سرکار! میں آپ کا پیغام لے کر باجوہ صاحب کے پاس گیا۔ پروگرام کے مطابق میں کافی رات گئے وہاں پہنچا تھا۔ جب انہیں پیغام پہنچا کر فارغ ہوا تو اور بھی دیر ہو گئی تھی۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ باجوہ صاحب کا نوکر میرا یار ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ رات یہیں رک جا۔ میں رک گیا اور اپنے یار کے ساتھ ساتھ لگا رہا۔ اس نے باجوہ صاحب کے لیے دودھ گرم کر کے گلاس میں نکالا تو میں نے بہانے سے اس کی توجہ ہٹا دی اور موقعے کا فائدہ اٹھا کر دودھ میں آپ کی دی ہوئی دوا ملا دی۔ اگر رات موقع نہ ملتا تو میں سویرے چائے میں دوا ملا سکتا تھا، پر قسمت اچھی تھی کہ رات میں ہی کام ہو گیا اور میں منہ اندھیرے اذانوں سے بھی پہلے وہاں سے لوٹ آیا۔ ڈیرے پہنچا تو یہاں الگ مصیبت کھڑی تھی، پر میرے پہنچنے سے یہ فیدہ (فائدہ) ہوا کہ آگ بجھانے میں آسانی ہو گئی۔" بالے نے اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کی۔

"یہ مسئلہ تو حل کرنا ہی پڑے گا کہ یہاں میری ناک کے نیچے آ کر کارروائی ڈالنے کی حرکت کس نے کی؟ اتنا کھلا چیلنج کرنے والے دشمن کو میں ہرگز معاف نہیں کروں گا۔" مونچھ کو تاؤ دیتے ہوئے چودھری غرایا۔

"یہ کام دو ہی بندے کر سکتے ہیں چودھری صاحب! ایک چودھری بختیار، دوسرا اے سی شہریار۔ یہ دو ہی بندے ہیں جن کی دُم پر آپ نے پاؤں رکھا ہوا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی بلبلا کر حملہ کرنے کی غلطی کر سکتا ہے۔" بالے نے چودھری کی توجہ اس کے دشمنوں کی طرف مبذول کروائی تو چودھری سوچ میں پڑ گیا۔

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ سارا اے سی کا کیا دھرا ہے۔ وہ اپنی تصویروں کی تلاش میں آیا ہوگا۔ اب جانے تصویریں لے گیا یا نہیں جلا کر راکھ کر دیں، یہ ہمارا بڑا نقصان ہوا۔ ساری محنت ہی ضائع ہو گئی۔ دوبارہ اس اے سی کے بچے کو اس طرح گھیرنا بڑا مشکل ہوگا۔" اس کا مزاج باجوہ کی موت کی خبر سن کر ذرا سا بحال ہوا تھا، ایک بار پھر برہم ہونے لگا۔ پہلے کشور کا اسے فریدہ کے کمرے میں دیکھ لینا، پھر ڈیرے میں آگ لگنا اور اب اتنی منصوبہ بندی کے بعد حاصل ہونے والی تصویروں کا ہاتھ سے نکل جانے کا خیال... اسے تو برہم ہونا ہی تھا۔

"میں حویلی واپس جا رہا ہوں۔ وہاں سے باجوہ کے بنگلے پر جاؤں گا۔ تو ادھر ہی رک اور شریف اور کریمے کی نمک حرامی کا مزہ چکھا۔ کھال ادھیڑ ڈالنا سالوں کی، پر جان نہ نکلے

www.pkdigest.com

دیتا۔ ایس پی اِدھر آئے گا تو ان سے ملنے کی بات بھی کرے گا۔ ویسے تو اپنا ہی بندہ ہے، پر پھر بھی ہشیار رہنا ضروری ہے۔ بندوں کو زخمی دیکھے گا تو ہم رات آگ لگا کر جانے والے کے سر الزام رکھ دیں گے، پر بیان دینے کے لیے اُن خبیثوں کا زندہ رہنا ضروری ہے۔'' بالے کے لیے احکامات جاری کرنے کے بعد وہ آف موڈ کے ساتھ ڈیرے سے روانہ ہو گیا۔ ہمیشہ اپنی شرائط پر، کامیابی کے نشے سے سرشار زندگی گزارنے کے عادی اس شخص کے لیے متواتر ناکامیوں کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ شہریار کی شرمناک تصویروں کے حصول کے بعد جو امید بندھی تھی، وہ بھی ڈیرے پر لگنے والی آگ میں جل کر خاک ہو گئی تھی۔ وہ جو یہ گمان کیے بیٹھا تھا کہ اور بہت سے کام نکالنے کے ساتھ ساتھ شہریار سے ماہانہ تو کا بچا بھی حاصل کر لے گا... خود کو لگنے والی اس چوٹ پر اندر تک بلبلا کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

''رات بالا چودھری صاحب کا پیغام لے کر آیا تھا۔ صاحب نے اس سے ملاقات کی تو اس وقت چنگے بھلے تھے۔ فیر میں نے روزانہ کی طرح انہیں سونے سے پہلے دودھ کا گلاس لے جا کر دیا، تب بھی مجھے وہ بالکل ٹھیک نظر آئے۔ آرام سے بیٹھے ٹی وی پر کوئی انگریزی فلم دیکھ رہے تھے۔ میرے سامنے انہوں نے دودھ پیا۔ میں خالی گلاس لے کر باہر نکلا، تب بھی ان کو دیکھ کر ایسا کوئی خیال نہیں آیا کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ وہ تو سویرے جب میں نے بالے کو ناشتا کروا کر اِدھر سے روانہ کیا تو صاحب نے گھنٹی بجائی۔ میں حیران سا گھنٹی کی آواز سن کر ان کے کمرے کی طرف لپکا۔ صاحب اتنے سویرے نہ تو کبھی اٹھتے تھے اور نہ ہی مجھے بلاتے تھے۔ میں کمرے میں پہنچا تو صاحب کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ بالکل بے دم سے پڑے تھے۔ میں نے جلدی سے ڈرائیور کو جا کر جگایا۔ ہم دونوں نے مل کر صاحب کو گاڑی میں ڈالا کہ اسپتال لے جائیں، پر اندازہ ہم دونوں کو ہی ہو گیا تھا کہ صاحب ختم ہو گئے ہیں۔ اُدھر اسپتال میں ڈاکٹر صاحب نے بھی تصدیق کر دی اور بولے کہ صاحب کا دل بند ہو گیا ہے۔'' اقبال باجوہ کا ملازم سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ ساری تفصیل سنا رہا تھا۔ تفصیل سننے والوں میں ایس پی، ڈی ایس پی اور مقامی تھانے دار سمیت شہریار بھی شامل تھا۔ چودھری کے ڈیرے پر رات اس نے جو کارروائی کی تھی، اس کے بعد اسے سونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اپنے معمول کے مطابق صبح جب وہ ایکسرسائز میں مصروف تھا، اس وقت اس کے پاس ایس پی کی کال آئی اور اس نے اقبال باجوہ کی موت کی اطلاع دی۔ اطلاع سن کر فوراً پیر آباد کے لیے روانہ ہونے کے بجائے اس نے اپنے معمولات نمٹائے اور پھر مقررہ وقت پر دفتر پہنچ کر اسٹاف کو چند ضروری ہدایتیں دیں پھر ڈرائیور کے ساتھ پیر آباد کے لیے روانہ ہوا۔

اقبال باجوہ کا رہائشی بنگلا گاؤں سے کافی ہٹ کر جنگل کے قریب تھا۔ وہ بنگلے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ لاش ابھی کچھ دیر قبل ہی مرکزِ صحت سے بنگلے پر پہنچائی گئی ہے۔ موت طبعی تھی اس لیے پوسٹ مارٹم وغیرہ کا تو جھنجھٹ نہیں تھا لیکن ڈیڈ باڈی کو تیرہ چودہ گھنٹے کی مسافت پر واقع باجوہ کے آبائی گاؤں پہنچانا تھا۔ چنانچہ غسل دینے اور کفنانے کے بعد جب لاش کو تابوت میں منتقل کیا جا رہا تھا تو ڈاکٹر نے چند ایسے انتظامات کر دیے کہ لاش جلد خراب نہ ہو۔ شہریار کے وہاں پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی اقبال باجوہ کی ڈیڈ باڈی اس کے آبائی گاؤں روانہ کر دی گئی۔

ڈیڈ باڈی کی روانگی کے بعد ایس پی صاحب کی نگرانی میں باجوہ کے ملازم کا بیان لیا جا رہا تھا اور اس وقت شہریار بھی موجود تھا۔ ملازم کے بیان سے یہ ظاہر ہونے کے بعد کہ بالا رات چودھری کا کوئی پیغام لے کر آیا تھا اور صبح تک بنگلے پر ہی رکا تھا وہ چونک پڑا۔

''بالا چودھری صاحب کا کیا پیغام لے کر آیا تھا باجوہ صاحب کے پاس؟'' اس نے ملازم سے پوچھا۔

''کوئی ایسی خاص بات تو نہیں تھی۔ چودھری صاحب نے آج رات کے کھانے کی دعوت کہلوائی تھی۔ اکثر ہی وہ بلاتے رہتے تھے صاحب کو۔ ہر پندرہ وی دن میں ان کا فون آ جاتا تھا صاحب کے پاس کہ فلاں وقت کا کھانا میرے ساتھ کھانا۔ کل بنگلے کا فون خراب تھا، شاید اس لیے انہوں نے بالے سے کہلوا دیا۔ وہ کہیں اور بھی کام سے گیا ہوا تھا اس لیے اِدھر پہنچنے میں دیر ہو گئی اور میرے کہنے پر رات اِدھر ہی ٹھہر گیا۔'' ملازم نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ بظاہر یہ ایک سیدھی سادی صورتِ حال تھی جس میں کسی قسم کا شک کرنا مناسب نہیں تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ موت کی وجہ قطعی طبعی تھی پھر بھی وہ اپنے اندر کھٹک سی محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو باجوہ تو خود چودھری کا ہی ساتھی تھا اس لیے اس سے اسے نقصان پہنچنے کے امکانات بہت کم تھے لیکن چودھری کی سانپ جیسی فطرت کو سمجھنے کے بعد وہ اس سے کوئی اچھی امید نہیں رکھتا تھا۔ سانپ ڈسنے پر آتا ہے تو بھلا کب دیکھتا ہے کہ سامنے

تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا

آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟

سید محمد علی قادری

آپ کیلئے کون سا سال، مہینہ، دن بہتر رہے گا؟ محبت، دولت اور دیگر معاملات میں کب کامیابی ملے گی؟

معروف ماہرِ فلکیات سید محمد علی قادری سے راہنمائی حاصل کریں۔

اس کے علاوہ قادری صاحب آپکے دنیاوی مسائل کا حل قرآنی آیات اور اسماء الحسنیٰ سے پیش کرتے ہیں۔

☆ میری شادی کب ہوگی؟ اپنوں میں ہوگی یا غیروں میں؟ (صبا، لاہور)

● اپنوں میں زیادہ ہے، دسمبر 2014 تک امکان ہے۔

☆ قادری صاحب یہ سال میرے لیے کیسا رہے گا؟ (توقیر ناصر، سرگودھا)

● بیٹا یہ سال آپ کے لیے بہت اچھا ہے، اللہ آپ کو کامیابی عطا فرمائے (آمین)

☆ میرے لیے باہر جانا زیادہ بہتر ہے یا پاکستان میں ملازمت کرنا؟ (عباس آفریدی، پشاور)

● باہر جانا زیادہ بہتر ہے، یورپ جائیں تو کامیابی کے زیادہ چانس ہیں۔

☆ قادری صاحب! میں ایک لڑکے کو بہت پسند کرتی تھی، وہ بھی مجھ پر جان دیتا تھا، مگر میرے والدین غیر برادری ہونے کی وجہ سے انکاری تھے، آپ نے اس کے لیے مجھے ایک لوحِ مبارک اور سعد پتھر ارسال کیا تھا اور ایک وظیفہ بھی پڑھنے کے لیے دیا تھا، اللہ کا شکر ہے امی اور دوسرے لوگ تو اب راضی ہو گئے ہیں، ابو البتہ خاموش ہیں، اب بتائیں قادری صاحب! لوح کا کیا کرنا ہے اور وظیفہ پڑھنا ہے یا نہیں؟ (سونیا اقبال، سیالکوٹ)

● بیٹا! آپ کے ابو بھی انشاء اللہ تعالیٰ مان جائیں گے آپ یہ وظیفہ 31 دن مزید پڑھیں پھر فون پر رابطہ قائم کیجیے گا۔

☆ قادری صاحب! میرے شوہر سعودیہ میں ہوتے ہیں، 10 سال سے وہاں ہیں مگر میرے کاغذات نہیں بن رہے تھے کوئی نہ کوئی رکاوٹ آئے جا رہی تھی، کسی نے آپ کا بتایا تو آپ سے فون پر بات ہوئی تھی تو آپ نے ایک لوحِ مبارک اور ایک اسٹون دیا تھا، میرے مالک کا احسان ہے اب میں سعودیہ سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں، میرے دل سے آپ کے لیے بہت دعائیں نکلتی ہیں، لوح اور اسٹون کا اب کیا کرنا ہے؟ (فریدہ جمال، جدہ، سعودیہ عرب)

● بیٹی! اب دونوں چیزوں کو ٹھنڈا کر دیں، دو نفل شکرانے کے ادا کریں اور نماز کی پابندی کا خاص خیال رکھیں۔

☆ قادری صاحب! میری والدہ بہت بیمار تھیں، بہت علاج کروایا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا، آپ سے رابطہ کیا تو آپ نے لوحِ شفا عنایت فرمائی، اللہ کا شکر ہے اب کافی بہتر ہیں، لوح کا کیا کروں؟ (نائمہ وسیم، کراچی)

● بیٹی! وظیفہ ابھی 31 دن اور پڑھیں اور لوح کو اپنے پاس رکھیں، پھر 31 دن بعد فون پر رابطہ کیجیے گا۔

نوٹ: خط لکھتے وقت اپنا نام، اپنی والدہ کا نام، تاریخِ پیدائش اور وقتِ پیدائش ضرور لکھیں۔ براہِ راست جواب کے لیے جوابی لفافہ ساتھ بھیجیں۔

رابطے کے لیے:
A-911، سیکٹر 11-B، نارتھ کراچی، نزد ٹیلی فون ایکسچینج، کراچی۔ موبائل: 0333-2105914
E-mail: mashal_e_raah@yahoo.com / mashal_e_raah1@hotmail.com

www.pkdigest.com

دوست ہے یا دشمن... وہ تو بس ڈس لیتا ہے۔

"ملازم کا بیان مکمل ہو گیا ہے اگر آپ اس سے کوئی اور سوال نہ کرنا چاہتے ہوں تو میں اسے فارغ کر دوں؟" اسے سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر ایس پی نے اس سے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے مختصراً جواب دیا۔ فوراً ہی ایس پی کے حکم پر ملازم سمیت دیگر افراد بھی باہر نکل گئے۔ اب کمرے میں صرف وہ دونوں ہی موجود تھے۔

"چودھری صاحب نظر نہیں آ رہے یہاں؟ ورنہ باجوہ کے دوست کی حیثیت سے تو میں ان کی یہاں موجودگی کی امید کر رہا تھا۔" اس نے ایس پی سے پوچھا۔

"تھوڑی دیر پہلے تک وہ یہیں موجود تھے پر انہیں مجبوراً جانا پڑا۔ وہ بے چارے خود بڑی پریشانی میں ہیں۔ رات جانے ان کے کس دشمن نے ڈیرے میں گھس کر خانے میں آگ لگا دی۔ لاکھوں کا سامان جل گیا۔ خیر، مال کی تو چودھری صاحب کو فکر نہیں لیکن پریشان ہو گئے ہیں کہ کس دشمن نے اتنی جرأت کی؟" اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے ایس پی نے جواب دیا۔

"یہ تو واقعی تشویش کی بات ہے۔ آپ کے محکمے کے لوگوں نے انویسٹی گیشن کی اس معاملے کی؟" اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔

"ابتدائی تحقیق تو ہو چکی ہے۔ حملہ آور تنہا تھا اور موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ ہمیں موٹر سائیکل کے پہیوں کے جو نشانات ملے ہیں، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پیر آباد سے باہر کا آدمی تھا جو آیا اور اپنی کارروائی کر کے چلا گیا۔ اس کا اصل مقصد کیا تھا، یہ ابھی سمجھ نہیں آیا۔ ممکن ہے کسی نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہو یا پھر یہ کہ کوئی کسی خاص شے کی تلاش میں آیا ہو۔" ایس پی کا لہجہ معنی خیز تھا۔ اپنے آخری جملے سے اس نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ شہر یار کی ذات بھی شک کی زد میں آئی ہے لیکن شہر یار قطعی نروس نہیں ہوا اور بے پروائی سے بولا۔

"چودھری صاحب سے ان خاص چیزوں کی فہرست بنوا لیں جن کی تلاش میں ان کے خیال میں کوئی ڈیرے میں گھسنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ چیزوں کی تفصیل سامنے آئے گی تو مشکوک افراد کے نام بھی سامنے آ جائیں گے۔" اسے معلوم تھا کہ اس کے اس مشورے پر عمل ممکن نہیں۔ کم از کم چودھری یہ تو ہرگز بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے ڈیرے میں موجود اپنی خفیہ تجوری میں چند ایسی تصویریں رکھی ہوئی تھیں جن کے ذریعے وہ شہر یار کو بلیک میل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اس سچ کو تسلیم کیے بغیر شہر یار پر کوئی الزام عائد کرنا کسی طور ممکن نہیں تھا۔ کم از کم وہ لوگ اسے قانون کے شکنجے میں جکڑنے کی ہمت تو ہرگز بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"آپ تو یقیناً یہاں سے چودھری صاحب کے پاس ہی جائیں گے۔ میری طرف سے انہیں پیغام دیجیے گا کہ اگر میری مدد درکار ہو تو تکلف نہ کریں۔ میں فی الحال مزید یہاں رک نہیں سکتا ورنہ خود ان سے ملاقات کرتا۔ اپنے پیچھے کئی اہم کام چھوڑ کر آیا ہوں اس لیے جلد واپس جانا ضروری ہے۔" اس نے ایس پی کو اپنا پیغام دیا اور اس سے مصافحہ کیے بغیر باوقار انداز میں قدم اٹھاتا وہاں سے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

"آپ کو کیا ہو گیا ہے بی بی؟ رات سے ایسے ہی لیٹی ہیں۔ نہ کچھ بولتی ہیں، نہ کھاتی پیتی ہیں۔ اس طرح تو آپ بیمار پڑ جائیں گی۔" کشور کے سرہانے کھڑی رانی تشویش زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مخاطب تھی۔

"جی تو کرتا ہے مر جاؤں، پر موت پر بھی تو اختیار نہیں۔" آنکھوں پر بازو دھرے کشور نے رندھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"اللہ نہ کرے بی بی! مریں آپ کے دشمن۔ چنگی بولیں، کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے۔" رانی نے دہل کر اسے ٹوکا۔

"اس وقت تو سب سے اچھا یہی لگ رہا ہے کہ اپنی جان سے چلی جاؤں۔ گناہ کرنے والے گناہ کرتے نہیں شرماتے لیکن میں ایک گناہ کو ہوتے دیکھ کر اتنی شرمندہ ہوں کہ جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں۔" وہ ہنوز اسی کیفیت میں تھی۔

"آپ دل کی بہت نرم ہیں نا جی، اس لیے ذرا ذرا سی گل پر اتنی شرمندہ ہو جاتی ہیں... ورنہ اِدھر تو لوگ وڈے سے وڈا گناہ کر کے بھی اکڑ کر چلتے ہیں۔" وہ نہیں جانتی تھی کہ کشور کی اس حالت کی وجہ کیا ہے، بس یونہی ایک عمومی بات کر رہی تھی لیکن یہ بات کشور کو کوڑے کی طرح لگی اور چودھری کا چہرہ نظروں کے سامنے آ گیا۔ کتنے بڑے بڑے گناہوں کا بوجھ تھا اس کے سر پر لیکن وہ اس بوجھ کو محسوس کیے بغیر پوری ڈھٹائی سے جی رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اپنے باپ کے عہدے پر فائز اس ظالم اور بے حیا شخص کو کوئی کڑی سزا سنا ڈالے مگر یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

بے بسی سے تکیے پر اِدھر سے اُدھر سر پٹختے اسے یک دم ہی شہر یار کا خیال آیا۔ آفتاب کے مطابق وہ ایسا شخص تھا جو چودھری سے ٹکر لے سکتا تھا۔ اگر فریدہ ساتھ دیتی تو شہر یار کی مدد سے چودھری کے خلاف کارروائی کی جا سکتی تھی۔ شدید دکھ اور اذیت کے احساس سے دوچار وہ اس خیال کے آتے ہی بستر چھوڑ بیٹھی۔ اسے فوری طور پر فریدہ سے ملنا تھا اور اسے قائل کرنا تھا کہ وہ خود پر ظلم سہنے کے بجائے اس ظلم کے خلاف اٹھ کھڑی ہو۔ اسے امید تھی کہ رات والے واقعے کے بعد اسے فریدہ کو راضی کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔

"کہاں جا رہی ہیں بی بی؟ کوئی کام ہے تو مجھے حکم دیجیے۔" اسے بپھرے ہوئے موڈ کے ساتھ کمرے سے باہر کا رخ کرتے دیکھ کر رانی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ آج صبح سے ہی حویلی کی فضا میں اچھا خاصا کھنچاؤ تھا۔ ڈیرے پر آگ لگنے کی خبر حویلی میں بھی پہنچ گئی تھی۔ باجوہ کی موت کا بھی پتا چلا تھا اور یہ دونوں واقعات ایسے تھے جن سے حویلی کی فضا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی... لیکن رانی محسوس کر رہی تھی کہ ان وجوہات کے علاوہ بھی کوئی وجہ ایسی ہے جس کے سبب وڈی چودھرائن کا مزاج برہم ہے۔ چودھرائن ناہید بھی اسے کچھ پریشان سی لگی تھی۔ بڑی چودھرائن نے اسے حکم بھی دیا تھا کہ کشور کو میرے کمرے میں بھیجو لیکن اس نے کشور کی طبیعت خراب کا بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا تھا۔ کشور کی مزاج آشنا ہونے کے ناتے وہ جانتی تھی کہ اس وقت وہ جس کیفیت کا شکار ہے، بڑی چودھرائن کے حکم کی ہرگز بھی تعمیل نہیں کرے گی۔ بڑی چودھرائن کی منہ چڑھی ملازمائیں پھپھی اور شادو کشور کی مزاج پرسی کے بہانے آ کر اس بات کی تصدیق کر گئی تھیں کہ وہ واقعی بیمار ہے یا بہانہ بنایا گیا ہے۔ چودھرائن ناہید بھی وہاں آئی تھی لیکن کشور نے آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی اور اسے تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھنے کے بعد مایوس ہو کر واپس جانا پڑا۔

ان ساری باتوں سے رانی نے اندازہ لگایا تھا کہ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے کشور اپنے بزرگوں سے اور بزرگ اس سے ناراض ہیں۔ اپنے اسی اندازے کی بنیاد پر وہ کشور کو باغیانہ سی کیفیت میں کمرے سے باہر نکلتے دیکھ کر گھبرائی تھی اور اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ اس کی کسی بات پر دھیان دیے بغیر باہر نکل گئی اور برآمدہ پار کر کے سیدھے اوپری منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ پریشان سی رانی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

"رک جا کشور! تو اوپر نہیں جا سکتی۔" ابھی کشور نے پہلے قدمچے پر ہی پیر رکھا تھا کہ ایک رعب دار آواز فضا میں ابھری۔ کشور اس تحکمانہ آواز کو پہچان چکی تھی پھر بھی اس نے گردن گھما کر حکم دینے والی ہستی کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی چودھرائن تھی جو اس کی طرف پُرجلال نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں؟ کیوں نہیں جا سکتی میں اوپر؟" اس نے چودھرائن کی جلال بھری نظروں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تنک کر پوچھا۔

"یہ تیرے اباجی کا حکم ہے۔ میرے روکنے سے تو رکتی نہیں، کیا ان کی گل بھی نہیں مانے گی؟" وہ گویا اسے چیلنج کر رہی تھی کہ چودھری کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے بعد بھلا وہ کیسے حکم عدولی کی جرأت کر سکتی ہے؟

"کسی کا بھی حکم ہو... میں نہیں رکنے والی۔" کشور نے رکھائی سے کہتے ہوئے سیڑھی پر اپنا پیر رکھا۔ رات سے اب تک وہ خود کو سنبھال ہی نہیں پائی تھی ورنہ اس جرأت مندی کا مظاہرہ بقائمی ہوش و حواس کرنا ممکن نہیں تھا۔

"رب دا واسطہ بی بی! ضد نہ کریں۔ واپس اپنے کمرے میں چلیں۔" وفادار ملازمہ نے اس بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اس کے قریب جا کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس سے استدعا کی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ رانی کے ہاتھ سے چھڑوا لیا۔

"مت روک مجھے۔ اب میں کسی ظالم کے دباؤ میں آنے والی نہیں۔" وحشت زدہ سے انداز میں کہتے ہوئے اس نے ایک قدم اور بڑھایا۔

"مت ماری گئی ہے اس کڑی کی۔ لگتا ہے دماغ پر کوئی اثر ہو گیا ہے۔ کہاں ہے ناہید؟ اسے بلاؤ۔ کہو کہ آ کر آپ اپنی دھی کو سنبھالے۔" اس کی کھلم کھلا بغاوت نے بڑی چودھرائن کو چراغ پا کر دیا اور وہ زور سے چیخی۔ اس سے قبل کہ وہاں موجود ملازماؤں میں سے کوئی اس کے حکم کی تعمیل کے لیے جاتی، افتاں و خیزاں چودھرائن ناہید خود وہاں آ پہنچی۔

"کیا ہو گیا ہے میری دھی؟ کیوں اتنی ضد کر رہی ہے؟ تو نے سنا نہیں کہ تیرے اباجی نے تیرے اوپر جانے پر پابندی لگائی ہے۔ تو چل میرے ساتھ اپنے کمرے میں۔ میں تیرے اباجی سے گل کر کے تجھے بہزاد سے ملنے کی اجازت دلوا دوں گی۔ مجھے معلوم ہے تو اپنے بھرا سے وڈی محبت کرتی ہے۔ اس سے ملے بغیر نہیں رہ سکتی، پر اس وقت تھوڑا سا صبر کر لے۔" اپنے بھاری وجود کے ساتھ تیزی سے چل کر آنے اور پھر دو تین سیڑھیاں چڑھنے کی وجہ سے چودھرائن ناہید کا

www.pkdigest.com

سانس پھول رہا تھا لیکن پھر بھی وہ کشور کا بخار کی حدت سے جلتا ہاتھ تھامے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیا ہنگامہ ہو رہا ہے یہاں؟ کیوں تماشا لگا کر رکھا ہوا ہے؟" چودھرائن ناہید کو اپنی کوشش میں کامیابی ہوتی، اس سے پہلے ہی چودھری افتخار خود وہاں چلا آیا۔ ایک تو ڈیرے والے حادثے نے پہلے ہی موڈ آف کر رکھا تھا، اس پر سے حویلی کے زنان خانے میں قدم رکھتے ہی جو پہلا منظر دیکھنے کو ملا... اسے دیکھ کر مزاج اور بھی برہم ہو گیا۔ کشور کو سیڑھیوں پر کھڑے دیکھ کر صورتِ حال بھی اس کی سمجھ میں آگئی تھی چنانچہ اپنے مخصوص دبنگ اور بارعب لہجے میں بہ آوازِ بلند پوچھنے لگا۔

"کچھ نہیں چودھری صاحب! یہ کشور کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ بخار دماغ پر چڑھ گیا ہے اس لیے عجیب عجیب ضدیں کر رہی ہے۔ تسی فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" چودھرائن ناہید نے گھبرا کر بہانہ بنایا تاکہ بیٹی کو باپ کے عتاب سے بچا سکے مگر وہ خود اس وقت اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ ماں کی مصلحت پسندی کی پروا کیے بغیر زور سے چیخی۔

"کوئی دماغ خراب نہیں ہوا ہے میرا۔ مجھے بس اوپر جانا ہے۔"

"کیوں جانا ہے تجھے اوپر؟ جب ایک واری منع کر دیا تو تیری سمجھ میں نہیں آتا؟" چودھری نے اپنے لہجے کے جلال سے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

"ہاں نہیں آتا میری سمجھ میں۔ آپ بتائیں آپ کیوں جاتے ہیں اوپر؟" وہ بجائے دبنے کے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تو اس کی نظروں میں اتنے شرارے تھے جن کی چودھری جیسا بندہ بھی تاب نہ لا سکا اور بے اختیار نظریں چرا گیا۔ وہاں موجود دیگر لوگ البتہ کشور کی اس جرأت مندی پر دنگ رہ گئے تھے۔ رانی نے تو اپنے حلق سے نکلنے والی چیخ کو روکنے کے لیے باقاعدہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس جرأت مندی کے اظہار کے بعد کشور کو خوفناک انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔

"اس کا تو دماغ سچ مچ خراب ہو گیا ہے۔ لگتا ہے علاج کے لیے کسی وڈے ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔ تم لوگ اس کا سامان تیار کرواؤ۔ کل سویرے میں اسے لاہور بھجوا دوں گا۔ اُدھر رہ کر اس کا علاج ٹھیک طرح سے ہو جائے گا۔" دوسرے لوگوں کو باپ بیٹی کے درمیان چھڑی سرد جنگ کی وجہ معلوم نہیں تھی اس لیے وہ اس نرم سزا کو سن کر حیران رہ گئے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ چودھری جس جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے بیٹی کے سامنے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے، اس میں خود بھی اتنی تاب نہیں رہی کہ اس کا سامنا کر سکے اسی لیے علاج کے بہانے اسے شہر بھجوا کر اس کی نظروں سے بچنا چاہتا ہے۔

"آئیں بی بی! اپنے کمرے میں چلیں۔" چودھری بہ ظاہر پورے رعب کے ساتھ احکامات جاری کرنے کے بعد وہاں سے فوراً ہی ہٹ گیا تھا۔ رانی نے ساکت سی کھڑی کشور کا ہاتھ نرمی سے دباتے ہوئے اس سے دھیمے لہجے میں کہا تو وہ جیسے گہری نیند سے جاگی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی رانی کے سہارے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

"ماہ بانو بہن! تیار ہو نا؟" وہ اپنے دراز بالوں کی چٹیا گوندھنے کے بعد اپنے گرد چادر لپیٹ رہی تھی، جب اکرم خان نے اسے پکار کر پوچھا۔

"ہاں بھائی اکرم! تیار ہوں۔ ابھی باہر آتی ہوں۔" اس نے اکرم خان کو جواب دیا اور دیوار پر ایک کیل کی مدد سے ٹنگے دھندلے سے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر مسکرائی۔ نیلے پھولوں والی سیاہ چادر میں اس کا چہرہ اس دھندلے آئینے میں بھی چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا اور اسے یقین تھا کہ یہ چمک اس کے چہرے کے گرد ہالے کی طرح تنی اس چادر کی وجہ سے ہے جو بڑی شدت سے کسی کی یاد دلاتی ہے۔ اسے یہ چادر خرید کر دینے والا خود تو شاید اپنی اس مہربانی کو بھول بھی گیا ہو گا لیکن وہ ایک پل کے لیے بھی اسے بھلا نہیں پائی تھی۔ وہ بہانے بہانے سے اُسے یاد آتا تھا۔ اس کے بھجوائے گرم کپڑوں کی حدت میں، ہاتھ پیروں پر لگائے جانے والے لوشنز کی مہک میں، کتابوں کی سطروں میں، ہر ہر شے میں اس کی یاد بسی تھی۔ وہ یہاں نہیں تھا لیکن ہر پل، ہر دم یہیں کہیں تھا۔ وہ یہاں تھی لیکن ہر پل، ہر لمحہ یہاں سے بہت دور پنجاب کے اُس ضلع کے کوچوں میں بھٹکتی تھی جہاں وہ اسسٹنٹ کمشنر کی ذمے داریاں نبھاتا یقیناً اسے یاد کرنے کی فرصت بھی نہ پاتا ہو گا۔ اُس سے جدا ہوتے وقت اُس نے اپنے دل میں جو عجیب سی کیفیت محسوس کی تھی، کاندے کے تنہا شب و روز نے اس کی خوب وضاحت کر دی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ دیکھنے میں ذرا ذرا سا خود پسند اور مغرور نظر آنے والا اے سی اس کے دل میں بس چکا ہے اسی لیے ہر پل کسی سائے کی طرح ساتھ ساتھ محسوس ہوتا ہے۔ شہریار کے لیے اس کے دل میں وہ جذبہ بیدار ہو چکا تھا جو لوگوں کے ہجوم میں گھر کر بھی انسان

کو سب سے کٹ کر تنہا رہنے کا ہنر سکھا دیتا ہے لیکن یہ تنہائی ایسی ہوتی ہے کہ انسان اپنے من کی دنیا میں محفل سجائے بیٹھا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس محفل میں سوائے محبوب کے کسی اور کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس وقت آئینے کے سامنے کھڑی وہ یک دم ہی محبوب کی اس محفل میں پہنچ گئی تھی۔ دروازے پر آہٹ ابھری تو چونک کر اس طرف متوجہ ہوئی۔ اکرم خان کی ماں چوکھٹ پر کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"تیار ہوں ماں جی! آ رہی ہوں۔" اس نے بولتے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ باہر صحن میں اکرم خان منتظر کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی دو بیگ تیار رکھے تھے۔ ان میں سے ایک بیگ ماہ بانو کا تھا جبکہ دوسرے بیگ میں اکرم خان اور اس کی ماں کا سامان تھا۔ وہ لوگ اکرم خان کے ماموں زاد بھائی کی شادی میں شرکت کے لیے ہوشے جا رہے تھے۔

"آ جاؤ بہن! دیر سے نکلے تو مشکل ہو جائے گا۔ ہم تو عادی ہے ان راستوں کا پر تمہارے لیے یہ سفر تھوڑا مشکل رہے گا۔" اسے دیکھتے ہی اکرم خان دونوں بیگ کاندھے پر لٹکاتے ہوئے بولا۔ وہ ایک پروفیشنل پورٹر تھا جسے بڑا بھاری بھرکم سامان اپنے شانوں پر رکھ کر اِدھر سے اُدھر پہنچانے کی اچھی خاصی مشق تھی۔ ان دونوں بیگز کو تو اس نے یوں اٹھا لیا تھا، گویا گلاب کے پھول ہوں۔

"ہمیں تو یہ سارا راستہ ہاتھوں کی لکیروں کی طرح یاد ہے۔ اُدھر اسکردو سے ہوشے تک اتنے چکر لگائے ہیں کہ گنتی بھی یاد نہیں۔ آج کل سیاح لوگ کندو گورو دیکھنے بہت جاتا ہے۔ ہم ماں کی وجہ سے پہاڑوں پر نہیں جاتا لیکن اسکردو سے ہوشے تک سفر کرتا رہتا ہے۔" گاؤں کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے وہ خوش گوار موڈ میں ماہ بانو کو بتا رہا تھا۔

"پھر تو آپ کا ہوشے میں ماموں کے گھر بھی آنا جانا لگا رہتا ہو گا؟" ماہ بانو نے اس کی گفتگو میں دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں، ہر بار اُدھر جانے کا موقع نہیں ملتا۔ ہم ٹیم کے ساتھ جاتا ہے تو پھر اسی کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔" اکرم خان نے بتایا۔ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں کاندے نالا بہہ رہا تھا۔ بلند پہاڑوں سے بہہ کر آتے اس نالے کے پانی کا شور دور سے ہی سنائی دے گیا تھا۔ نالے میں تیزی سے بہتے پانی کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے پتھر بھی لڑھکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ نالا پار کرنے کے لیے جو پل بنایا گیا تھا، وہ محض دو شہتیروں پر مشتمل تھا۔ اس پل کے ذریعے اتنے پُرشور نالے کو پار کرنے کے خیال سے ماہ بانو کانپ گئی۔

"فکر نہ کرو بہن! ہم تمہیں سہارا دے کر پل پر سے لے جائے گا۔" اکرم خان نے اس کے خوف کو محسوس کرتے ہوئے اسے تسلی دی پھر بھی اس کا ڈر ختم نہیں ہوا۔

"پہلے اماں کو لے کر جاؤ۔" اس نے اکرم خان سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے اپنی ماں کا ہاتھ تھام لیا۔ پہاڑوں کی باسی اس بوڑھی عورت نے بنا جھجکے پھسلن زدہ شہتیروں پر مشتمل پل پر قدم رکھا اور اپنے جوان بیٹے کے سہارے نالے کے اس پار جا پہنچی۔ ماں کو اُس پار پہنچانے کے بعد اکرم خان واپس آیا۔ اس دوران ماہ بانو اپنے اندر کافی حوصلہ پیدا کر چکی تھی، چنانچہ اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو گئی لیکن پھر بھی خوف تو دل میں تھا ہی۔ اس نے اپنی زندگی میں پانی کا جو سب سے بڑا ذخیرہ دیکھا تھا، وہ پیر آباد کی نہر تھی۔ وہ نہر اچھی خاصی طویل اور گہری ضرور تھی لیکن اس کا پانی اتنا ہنگامہ پرور نہیں تھا کہ دیکھنے والا دور سے ہی ڈر جائے۔ زیرِ لب دعائیں مانگتے اس نے اکرم خان کے سہارے کاندے کا ہیبت ناک نالا پار کیا اور کنارے پر پہنچتے ہی ایک طویل اطمینان بھرا سانس لیا۔

"اچھا ہوا ہم نے تمہیں اس نالے کے بارے میں پہلے سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر ہم تمہیں یہ بتا دیتا کہ اس نالے میں گرنے کے بعد آدمی کا بچنا ممکن نہیں تو تم تو پل پر قدم ہی نہیں رکھتا۔ اس میں گرنے والا تو بس بہتا ہوا سیدھا نیچے شیوک میں ہی پہنچتا ہے۔ شیوک دریا کا نام تو سنا ہو گا تم نے؟" اکرم خان اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے اسے چھیڑنے لگا۔

"مجھے ابھی بتا دو کہ آگے تمہارے ہوشے کے راستے میں اور کتنے ایسے ندی نالے پڑتے ہیں تاکہ میں یہیں رک جاؤں۔ اس سے آگے میں اور کوئی ایسا خطرناک نالا پار کرنے کو تیار نہیں۔" ماہ بانو نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تو اکرم خان زور سے ہنس پڑا پھر اسے اطمینان دلاتے ہوئے بولا۔

"فکر نہ کرو ہمارا بہن! آگے ایسا کچھ نہیں ہے۔ یہاں سے آگے ہم ہوشے تک آرام سے جیپ میں سفر کرے گا۔" ماہ بانو نے دیکھا تو واقعی وہاں کچھ فاصلے پر چند جیپیں کھڑی ہوئی تھیں۔ اکرم خان اسے اور اپنی ماں کو لے کر ان میں سے ایک جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ جیپ ڈرائیور اس کا

www.pkdigest.com

آشنا تھا جس نے مقامی بولی میں اس سے دوستانہ لہجے میں بات کرتے ہوئے ان لوگوں کے جیپ میں بیٹھنے کی جگہ بنا دی۔ جیپ میں بہت سا سامان لدا ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے بیٹھنے کے لیے مشکل سے ہی جگہ بن سکی تھی۔

''پچھلی جیپ میں جو اکسی ڈیشن ٹیم بیٹھا ہے، یہ اس کا سامان ہے۔ یہ جیپ ڈرائیور ہمارا دوست ہے اس لیے ہمیں ساتھ لے جانے کے لیے راضی ہو گیا ہے ورنہ اِدھر سے ہوشے تک جانے کا جیپ والا بہت پیسا لیتا ہے۔'' اکرم خان نے جیپ میں موجود سامان اور غیر آرام دہ نشست کے لیے اس کے سامنے وضاحت پیش کی۔

''کوئی بات نہیں بھائی اکرم! آپ نے بتایا تھا کہ یہ صرف گھنٹے بھر کا راستہ ہے، تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک گھنٹا تو آسانی سے کٹ جائے گا۔'' اس نے اکرم خان کو شرمندگی سے بچانے کے لیے کہا۔ جیپ روانہ ہوئی تو وہ اردگرد کے مناظر کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔ کہیں درخت اور جھاڑیاں تھیں تو کہیں بڑی بڑی چٹانیں۔ ان کا کھیتوں کے ایک سلسلے کے قریب سے بھی گزر ہوا۔

''اس پل کے پار جانے کے بعد ایک چڑھائی آئے گی اور ہم ہوشے پہنچ جائیں گے۔'' اچھا خاصا طویل راستہ طے کرنے کے بعد جب اُن کی جیپ چٹانوں کی اوٹ میں سے گزر رہی تھی تو اکرم خان نے گہرائی میں موجود پل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرخوشی کے عالم میں بتایا۔ اس کے لہجے کی اس خوشی پر وہ ابھی غور کر ہی رہی تھی کہ جیپ نے پل طے کر لیا اور ایک زبردست چڑھائی پر چڑھنے لگی۔ چڑھائی اتنی زیادہ تھی کہ اسے لگتا تھا، جیپ سے نکل کر پیچھے جا گرے گی لیکن خیر گزری اور ماہر ڈرائیور نے انہیں بہ خیر و عافیت ہوشے پہنچا دیا۔ چند گلیوں پر مشتمل ہوشے گاؤں کا ایک کچا پکا سا مکان ان کی منزل تھا۔ اپنی اکڑ جانے والی ٹانگوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، وہ لوگ جیپ سے اتر کر جیسے ہی اس مکان میں داخل ہوئے ایک لڑکی سامنے آ گئی۔ لڑکی کی رنگت صاف تھی اور اس نے اپنے بالوں کو بے شمار مینڈھیوں کی صورت میں گوندھ رکھا تھا۔

''یہ گل مینا ہے، ہمارا ماموں زاد۔'' لڑکی پر نظر پڑتے ہی اکرم خان کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس نے ماہ بانو سے اس کا تعارف کروایا۔ یک دم اس پر منکشف ہو گیا کہ اکرم خان کی خوشی کا سبب یہی لڑکی گل مینا ہے۔ گل مینا پہلے اپنی پھوپی سے ملی پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ماہ بانو نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ گل مینا کے جسم سے ہلکی سی بُو اٹھ رہی تھی۔ یقیناً ہوشے کی روایت کے مطابق وہ بھی بہت کم کم ہی نہانے کی زحمت کرتی تھی۔ ماہ بانو کے نتھنوں نے اس بُو کو محسوس ضرور کیا لیکن ناگواری کے احساس کے بغیر... کیونکہ اس بُو کے مقابلے میں محبت کی وہ مہک زیادہ طاقتور تھی جسے کوئی محبت بھرا دل رکھنے والا ہی محسوس کر سکتا ہے۔ ماہ بانو نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ گل مینا کے چمن دل میں اکرم خان کی محبت کا پھول مہک رہا ہے۔

☆☆☆

ٹخنوں سے اونچے میلے چیکٹ گھاگھروں کے ساتھ، سر پر پھٹی پرانی سی اوڑھنیاں رکھے وہ دونوں عورتیں زمین پر اِدھر اُدھر نظر دوڑاتی آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان کے شانوں سے بڑے بڑے جھولے لٹک رہے تھے جن میں وہ راستے میں ملنے والے ہڈیوں اور کانچ کے ٹکڑوں کے علاوہ کاغذ کے پُرزے اور دیگر اسی طرح کی چیزیں ڈالتی جا رہی تھیں۔ ان کے چہروں کی سیاہ رنگت، پپڑی زدہ ہونٹ اور گندے الجھے ہوئے بال ان کے شانوں سے لٹکے جھولوں سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ لوگ اس حلیے میں گلیوں اور کچرا کنڈیوں سے کچرا چننے والی ان عورتوں کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان دونوں عورتوں کو بھی کئی ایک افراد نے دیکھا تھا لیکن سرسری سی نظر ڈال کر ایک معمول کا حصہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ کسی نے اگر گہری نظر ڈالی بھی تھی تو ان کے چہروں پر نہیں بلکہ ان نشیب و فراز پر جو سر پر رکھی اوڑھنیوں کے دونوں پلو شانوں سے پیچھے پڑے ہونے کی وجہ سے ہر ایک کو ہی دعوت نظارہ دے رہے تھے۔ جو ہوس پرست تھے، وہ اس نظارے سے بن مانگی نعمت کی طرح لطف اندوز ہونے کے ساتھ ہی ایک آدھ فحش جملہ پھینک کر آگے بڑھ جاتے مگر کوئی ان کے زیادہ قریب نہیں آتا تھا... کہ سب ہی کو معلوم تھا، یہ کچرا چننے والی عورتیں کس درجہ بدزبان اور مردمار ہوتی ہیں۔ کھلی تجوری بن کر سڑکوں پر پھرنے والی یہ عورتیں اتنی بے باکی سے گھوم کر اپنا کام کرتی ہی اس اعتماد کی بنیاد پر تھیں کہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی مائی کا لال ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کوئی جرأت کرتا تو وہ اس کی عزت کو کچرا کرنے میں لمحہ بھر بھی نہیں لگاتیں۔ چنانچہ من چلے دور سے چاہے جتنی آنکھیں سینکیں، قریب آنے کا رسک نہیں لیتے تھے۔ ان عورتوں کے گندے حلیے بھی مردوں کو ان سے دور رکھنے کا ایک سبب تھے۔

وہ دونوں بھی اپنی برادری کی دیگر عورتوں کی طرح اپنے کام میں منہمک بڑی بے نیازی سے قدم اٹھا رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی گمان نہیں کر سکتا تھا کہ جب وہ اپنی نظریں اردگرد دوڑاتی ہیں تو صرف زمین پر پڑے کچرے کو نہیں ٹٹولتیں بلکہ اپنے اطراف کا بے حد ماہرانہ اور پیشہ ورانہ جائزہ بھی لیتی ہیں۔ بظاہر بے نیازی سے لیکن حقیقت میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھاتی وہ دونوں اب ایک سرکاری اسکول کے مین گیٹ کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ ابھی انٹرول نہیں ہوا تھا لیکن اسکول کے گیٹ کے باہر ٹھیلے اور خوانچے والے جمع ہو گئے تھے۔ وہ دونوں اس منظر کو سرسری نظر سے دیکھتی ہوئی اسکول کے سامنے سے گزر کر دائیں جانب مڑ گئیں۔

اسکول کی دائیں جانب کی دیوار کے ساتھ اہلِ علاقہ نے کچرا کنڈی بنا رکھی تھی۔ وہ دونوں کسی معمول کی طرح اس کچرا کنڈی میں داخل ہو گئیں۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے کچرا چننے کا عمل جاری رکھا۔ پھر ان میں سے ایک کچرا چنتے چنتے اسکول کی دیوار کے بالکل قریب پہنچ گئی اور اپنے شانے پر لٹکا بڑا سا جھولا پھرتی سے اتار کر دیوار کی جڑ میں رکھ دیا۔ اس عمل سے فارغ ہوتے ہی اس نے ذرا فاصلے پر کچرا چنتی اپنی ساتھی کی طرف دیکھ کر وکٹری کا نشان بنایا اور پھر وہ دونوں جس انداز میں وہاں آئی تھیں، اسی انداز میں اس علاقے سے دور نکلتی چلی گئیں۔ اس علاقے سے بہت دور نکلنے کے بعد ایک گاڑی ڈرائیور سمیت ان کی منتظر تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی انہوں نے اپنے حلیے تبدیل کرنا شروع کر دیے۔ جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی، کچرا چننے والی عورتوں کے چولے میں سے دو مختلف لڑکیاں برآمد ہو رہی تھیں۔ ''را'' کی خصوصی ایجنٹس ارمیلا اور گیتا المعروف ندا اور حنا۔

☆☆☆

''ایک ہفتے میں دوسرا بم بلاسٹ... وہ بھی ایسا جس میں اسکول کے معصوم بچے مارے گئے۔ لوگ کیسے برداشت کر سکتے ہیں اس صورتِ حال کو؟ اوپر سے نیچے تک سب تل کر رہ گئے ہیں۔'' اپنی کیپ اتار کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے مختار مراد خود کلامی کے انداز میں بولا اور کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ بہت زیادہ اعصابی دباؤ اور تھکن کا شکار ہے۔

''اوپر والوں کو رہنے دیں۔ انہیں کسی حادثے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ دو چار جذباتی بیان دے کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ یہ ہم پولیس والے ہیں جو ایسے ہر موقعے پر گدھوں کی طرح کام بھی کرتے ہیں اور لوگوں کی باتیں بھی سنتے ہیں۔ آپ معلوم کر کے دیکھ لیں، وزیراعظم اور صدر میں سے کوئی رات کے اس پہر نہیں جاگ رہا ہو گا۔'' سجاد رانا نے تھکے تھکے انداز میں خود بھی ایک کرسی سنبھالتے ہوئے تلخ لہجے میں تبصرہ کیا جسے سن کر مختار مراد کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ دوڑی اور پل بھر میں معدوم ہو گئی۔

''آج تو تم اپنے کزن شہریار کے لہجے میں بات کر رہے ہو۔''

''ہر صحیح آدمی کو ان حالات میں اسی لہجے میں بات کرنی چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ شہریار غلط نہیں ہے، بس مصلحتاً ہی اسے ٹوکتا رہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ جذبات کا اظہار ہم جیسے لوگوں کو سوٹ نہیں کرتا لیکن ہیں تو بہرحال، ہم بھی انسان۔ آپ بتائیں، کیا آپ کا دل نہیں کانپا ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی سوختہ لاشیں اور بکھرے ہوئے عضو دیکھ کر؟ لیکن میڈیا والے ہم سے ایسا رویہ رکھتے ہیں جیسے یہ سب کچھ ہم نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہو۔ پولیس کیا کر رہی ہے؟ حادثے کا ذمے دار کون ہے؟ اس واقعے کے پیچھے کوئی جہادی تنظیم ہے یا پڑوسی ملک کے دہشت گرد؟ ہر سوال کا جواب آن دی اسپاٹ چاہیے ہوتا ہے انہیں۔ کیا پولیس کو الہام ہوتا ہے کہ حادثہ ہوتے ہی کھڑے کھڑے ان کے ہر سوال کا جواب دے دیں۔ اگر ہمیں کسی پر شک بھی ہے تو کیا میڈیا پر ایسی باتیں بتائی جا سکتی ہیں تاکہ ہمارے کچھ کرنے سے پہلے ہی مجرم ہوشیار ہو جائیں۔'' حادثے کی ہولناکی، دن بھر کی بھاگ دوڑ اور میڈیا کی مسلط کردہ اعصابی جنگ نے اسے اتنا اعصاب زدہ کر دیا تھا کہ اس وقت وہ کسی طرح اپنے مزاج کی برہمی کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

''پانی پیو تاکہ کچھ غصہ ٹھنڈا ہو۔'' مختار مراد نے گلاس میں پانی انڈیل کر اس کی طرف بڑھایا اور انٹرکام پر چائے اور اسنیکس کے لیے آرڈر دینے لگا۔ اسے سجاد رانا کی ذہنی کیفیت کا مکمل ادراک تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ایک ایسا شخص جس نے حال ہی میں اپنی نوجوان بیٹی کو کھویا تھا، معصوم بچوں کے کٹے پھٹے جسم دیکھ کر کس ذہنی و قلبی اذیت سے گزرا ہو گا۔ خود وہ بھی بری طرح ڈسٹرب ہوا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔

''سوری! میں کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔'' اس کے مشورے پر گلاس بھر پانی پینے کے بعد سجاد رانا ذرا ٹھنڈا ہوا تو شرمندگی سے بولا۔

''کوئی بات نہیں، کبھی نہ کبھی ہم میں سے ہر ایک پر یہ

www.pkdigest.com

وقت ضرور آتا ہے جب وہ اپنے عہدے اور فرائض سے ہٹ کر ایک عام انسان کی طرح ری ایکٹ کرنے لگتا ہے۔ تربیت اپنی جگہ لیکن اپنے جذبات کو یکسر ذات سے اکھاڑ پھینکنا بہرحال ممکن نہیں۔" مختار مراد نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے جواب دیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور ایک ملازم اجازت ملنے پر چائے اور اسنیکس سے بھری ہوئی ٹرالی لیے اندر داخل ہوا۔ ملازم کے ٹرالی پہنچا کر واپس چلے جانے تک کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ وہ واپس چلا گیا تو مختار مراد نے گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر جوڑا۔

"میں تمہاری کیفیت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ میڈیا والے بعض اوقات واقعی بہت زیادہ زیادتی کر جاتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم بھی آپے سے باہر ہو جائیں۔ جس طرح کی جذباتیت کا مظاہرہ تم ابھی میرے سامنے کر رہے تھے، اگر کسی نیوز چینل کے نمائندے کے سامنے کر دیتے تو اس کا انجام جانتے ہو؟ ہمارے ہاں پہلے ہی پولیس سے بڑھ کر ناقابلِ اعتماد کوئی ادارہ یا فرد نہیں۔ تم میڈیا کے خلاف کچھ الٹا سیدھا کہہ دیتے تو ہر طرف سے لوگ پنجے جھاڑ کر تمہارے پیچھے پڑ جاتے۔ پہلے ہی تمہاری پوزیشن کافی نازک چل رہی ہے۔ خواجہ سراؤں والے معاملے میں تمہارا نام سرِفہرست ہے۔ پولیس کسٹڈی میں جو خواجہ سرا مارا گیا، اس کے بارے میں ہی ہم ابھی تک میڈیا کے شکوک و شبہات دور نہیں کر سکے۔ ایسے حالات میں اگر تم نے میڈیا کے خلاف کچھ بول دیا تو وہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے کیا؟ وہ تو تمہارے اگلے پچھلے سارے کھاتے کھول کر بیٹھ جائیں گے۔" اس کا کہا ایک ایک لفظ اپنی جگہ درست اور مبنی برحقیقت تھا۔ سجاد رانا جسے پہلے ہی اپنی جذباتیت کا احساس ہو چکا تھا، کچھ اور بھی شرمندہ ہو گیا۔

"آپ جانتے تو ہیں انکل کہ میں شینا والا کیس ابھی تک حل نہ ہونے کی وجہ سے کتنا پریشان ہوں۔ ابھی تک اس معاملے میں کوئی حتمی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ اوپر سے ان بم دھماکوں نے الجھا کر رکھ دیا ہے۔ مارکیٹ والے بلاسٹ پر کتنا کام کیا میری ٹیم نے لیکن کیا معلوم ہوا؟ اتنی جدوجہد کے بعد صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ جس دکان میں بم رکھا گیا تھا، وہاں بلاسٹ سے پہلے دو لڑکیوں کو جاتے دیکھا گیا تھا جن میں سے ایک کے ہاتھ میں بھاری بیگ تھا۔ نہ لڑکیوں کو کوئی جانتا تھا اور نہ ہی کوئی ان کا حتمی حلیہ بتا سکا۔ خفیہ اداروں نے بھی کوئی ایسی بات نہیں بتائی جس سے کیس کو حل کرنے میں مدد ملے یا تفتیش کی گاڑی آگے بڑھائی جا سکے۔ اب آج والے بلاسٹ میں بھی دو مشکوک عورتوں کا ذکر سننے میں آیا ہے۔ بم اسکول کی جس دیوار کے ساتھ رکھا تھا، اس کے ساتھ کچرا گھر ہے اور بلاسٹ سے پہلے وہاں کچرا چننے والی دو عورتوں کو جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ پولیس کے مخبر آج سارا دن اُن لوگوں کے درمیان دونوں عورتوں کی بو سونگھتے ہوئے پھرتے رہے ہیں، کہیں سے کوئی کلیو نہیں ملا۔ بات ویسے بھی سمجھ آتی ہے۔ یقیناً کچرا چننے والی عورتوں کا گیٹ اپ دہشت گردوں نے کور کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب وہ عورتیں آرام سے اپنے کسی ٹھکانے پر بیٹھی ہوں گی اور ٹی وی پر خبریں دیکھ کر ہماری بے بسی اور اپنی کامیابی پر قہقہے لگا رہی ہوں گی۔" اپنے رویے کی وضاحت پیش کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر نہ چاہتے ہوئے بھی جذباتی ہو گیا۔

"ان معاملات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے، ایسے کام کرنے والا احتیاط سے کام تو لے گا۔ مجرم خود تو اپنے آپ کو تھالی میں سجا کر ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے خصوصی کیسز میں تو ویسے بھی حالات بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ اکثر تو سارے کلیوز بھی مل جاتے ہیں اور مجرم کی شناخت بھی ہو جاتی ہے لیکن مصلحتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے کچھ بھی سامنے نہیں لایا جا سکتا۔ تم نے تو ایک طویل وقت گزارا ہے ملازمت میں۔ تم خود یہ سارے حقائق جانتے ہو۔ میرے خیال میں تو مجھے تمہیں کچھ بھی سمجھانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے تھی۔" مختار مراد نے گفتگو کے دوران سامنے رکھی جانے والی سینڈوچز کی پلیٹ کی طرف اسے متوجہ نہ ہوتے دیکھ کر چائے کے برتن اپنی طرف کھسکائے۔

"آپ رہنے دیں۔ میں بناتا ہوں۔" اسے یک دم اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔ عہدے کے اعتبار سے بھی اور رشتے کے لحاظ سے بھی دونوں صورتوں میں مختار مراد اس کے لیے واجب الاحترام تھا۔ اگر تنہائی اور بے تکلفانہ ماحول درکار نہ ہوتا تو اس وقت ملازم یہ خدمت انجام دیتا لیکن ملازم کی عدم موجودگی میں تو اس کا ہی فرض بنتا تھا کہ وہ اس بات کا دھیان رکھے مگر وہ اپنی الجھن میں گھر کر کوتاہی کا مرتکب ہو گیا تھا۔ اب خیال آیا تو فوراً مستعد ہوا۔

"ساتھ میں کچھ کھا بھی لیجے تو اچھا ہوتا۔ چند گھنٹوں بعد صبح پھر بھاگ دوڑ شروع ہو جائے گی۔" جب وہ اپنی بنائی ہوئی چائے کی پیالی میں سے گھونٹ بھر رہا تھا تو مختار مراد نے اسے ٹوکا۔

"نہیں، کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہ رہا۔ چائے پی کر اب فوراً گھر کے لیے نکلوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ مریم ابھی تک جاگ رہی ہو گی اور پریشان ہو گی۔ شینا کے بعد اس کی ذہنی حالت بہت خراب ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر لے لیتی ہے۔ آج والا حادثہ اس کے علم میں آیا ہو گا تو بری طرح متاثر ہوئی ہو گی۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اسے لے کر ممی کی طرف شفٹ ہو جاؤں۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ میری عدم موجودگی میں وہ کسی اپنے کے ساتھ ہے۔"

"تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ میرے خیال میں تو تمہیں فوراً اپنے اس فیصلے پر عمل کر لینا چاہیے۔" مختار مراد نے اس کی بھرپور تائید کی۔

"میں ایسا ہی کروں گا۔ ابھی تو مریم کی فکر کی وجہ سے میں بہت سے معاملات ادھورے چھوڑ کر گھر واپس لوٹنے پر مجبور ہو جاتا ہوں لیکن اسے ممی کے پاس شفٹ کرنے کے بعد میں پوری یکسوئی سے شینا کے کیس کی نگرانی کر سکوں گا۔ اپنی بیٹی کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر مجھے کسی صورت چین نہیں آئے گا۔ مجرم کتنے ہی طاقتور اور پہنچ والے کیوں نہ ہوں، میں نے انہیں نیست و نابود کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ اس عہد کی راہ میں کوئی مصلحت اور مجبوری نہیں آ سکتی۔" اس نے اپنے عزائم کا اظہار کیا اور پیالی میں موجود آخری گھونٹ بھی اپنے حلق میں انڈیل کر کھڑا ہو گیا۔

مختار مراد خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اب تک جو حالات سامنے آئے تھے، ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ شینا کا قتل کسی عام مجرم کے ہاتھوں نہیں ہوا ہے۔ اس قتل کے ڈانڈے جن لوگوں سے جا کر مل رہے تھے، ان کے مقابل کھڑا ہونا آگ کے شعلوں میں کودنے کے مترادف تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اپنے ہی لوگ اس جنگ میں ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے لیکن وہ سجاد رانا کو روک بھی تو نہیں سکتا تھا۔ اولاد کی جدائی کے غم سے جلتا ہوا باپ کا سینہ کسی بھی مصلحت کا پانی چھڑک کر ٹھنڈا نہیں کیا جا سکتا، یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

☆☆☆

"کیسی ہیں ڈاکٹر ماریا... مزاج تو اچھا ہے آپ کا؟"

"جی ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں، آپ کا مسئلہ حل ہوا یا نہیں؟"

"اسی کے سلسلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ اصولاً تو مجھے کل ہی آپ کو فون کر لینا چاہیے تھا لیکن مصروفیت ہی کچھ ایسی رہی کہ موقع نہیں مل سکا۔ فاریسٹ آفیسر اقبال باجوہ کے انتقال کے بارے میں تو آپ کو علم ہے ہی۔ اس کی وجہ سے کل شیڈول سے ہٹ کر پیر آباد آنا پڑا پھر دوسرے بہت سے کام بھی دیکھنے تھے اس لیے آپ کو کال کرنے میں تاخیر ہو گئی۔" وہ دل سے ماریا کا احسان مند تھا اس لیے شکریہ ادا کرنے میں دیر ہو جانے پر اتنی وضاحت پیش کر رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں اے سی صاحب! مجھے اندازہ ہے کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں اس لیے آپ سے شکوہ کرنا ٹھیک نہیں۔ آپ کا کام ہو گیا ہے، اس کا اندازہ کل ڈیرے پر آگ لگنے کی اطلاع سن کر ہی ہو گیا تھا۔ خوب سبق سکھایا آپ نے چودھری افتخار کو۔ تلملایا ہوا پھر رہا ہے بے چارہ۔ میرے خیال سے تو کل کا دن آپ کے لیے بہت ہی خاص تھا۔ ایک طرف چودھری کو زک پہنچائی تو دوسرے اس کے اہم حلیف باجوہ سے بھی جان چھوٹ گئی۔ لگتا ہے قدرت بھی آپ کا ساتھ دے رہی ہے۔ میری طرف سے ان کامیابیوں پر مبارک باد قبول کریں۔"

"بہت بہت شکریہ لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے باجوہ کی موت کی خبر سن کر بالکل بھی خوشی نہیں ہوئی۔ میں کسی کی موت کو اپنی کامیابی تصور کر کے شادیانے بجانے والا آدمی نہیں ہوں۔ ہاں، البتہ اگر باجوہ کا جرم ثابت ہو جاتا اور اسے عدالت سے سزا ملتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔" شہریار نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

"یہ تو اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ آپ سرکاری آدمی ہیں اس لیے قانون کی برتری دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم جیسے عام لوگوں کے لیے یہی کافی ہوتا ہے کہ کسی بھی طرح سہی، بُرے آدمی سے نجات مل گئی۔ آپ کے بڑے اختیارات ہیں، کوشش کیجیے گا کہ باجوہ کی جگہ کوئی ایسا بندہ آ جائے جو چودھری کا پٹھو نہ بنے۔ ہے کوئی ایسا شخص آپ کی نظر میں؟"

"فی الحال تو نہیں لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میں خیال رکھوں گا کہ نیا فاریسٹ آفیسر کوئی ڈھنگ کا بندہ ہو۔" اس نے ڈاکٹر ماریا کو تسلی دی۔

"ایک نام میں بھی تجویز کر سکتی ہوں۔ عابد انصاری نام ہے ان صاحب کا۔ میں جس اسپتال میں جاب کرتی تھی، ایک بار وہ اپنے بچے کے آپریشن کے سلسلے میں وہاں کچھ عرصے داخل رہے تھے۔ ان دنوں میری ان سے کافی بات چیت ہوتی تھی۔ مردم شناسی کا دعویٰ تو نہیں لیکن چونکہ ڈاکٹر کی حیثیت سے دن میں بے شمار لوگوں سے ملنا پڑتا ہے، اس لیے کچھ نہ کچھ بندے کی پرکھ ہے مجھے۔ عابد انصاری صاحب کو

www.pkdigest.com

میں نے بہت اچھا آدمی پایا تھا۔ اپنی گفتگو سے بہت پڑھے لکھے، نفیس اور ایمان دار آدمی لگتے تھے۔ اگر ہو سکے تو آپ انھیں ضرور آزمائیے گا۔'' ڈاکٹر ماریا نے بے حد شائستہ لہجے میں اسے مشورے سے نوازا۔

''جی بالکل، میں دھیان رکھوں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کی والدہ کی کوئی اطلاع ملی؟ اس وقت آپ کا شکریہ ادا کرنے کے علاوہ میرے کال کرنے کا اہم مقصد ان کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔ چودھری کے ایک دو خاص بندے ہیں میری نظر میں۔ ان میں سے کسی کو اپنے آدمیوں سے اٹھوا کر اگر پوچھ گچھ کروں تو آپ کی والدہ کا پتا معلوم ہو سکتا ہے۔''

''نہیں نہیں، پلیز! ایسا کچھ مت کیجیے گا۔ اس طرح ممی کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ آپ چودھری کے آدمیوں میں سے کسی سے اگر اس سلسلے میں تفتیش کریں گے تو فوراً یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میں نے آپ کو ممی والے معاملے کی خبر دی ہے اور مجھے یہ بات پہلے ہی سمجھا دی گئی تھی کہ اگر میں نے کسی کو کچھ بتایا تو ممی کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ میں ممی کی زندگی کے لیے کوئی رسک لینے کو تیار نہیں۔ اس لیے پلیز! آپ کوئی بھی کارروائی کرنے سے گریز کریں۔ میری قسمت میں جب ہوگا، ممی مجھے مل جائیں گی۔ ابھی تو میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ زندہ ہیں اور فون پر کبھی کبھار مجھے ان کی آواز سنا دی جاتی ہے۔'' خوف زدہ سے لہجے میں اسے کوئی بھی قدم اٹھانے سے روکتے ہوئے ڈاکٹر ماریا نے اپنے انکار کی وجہ بیان کی۔

''لیکن اس طرح تو آپ نامعلوم مدت تک چودھری کے چنگل میں پھنسی رہیں گی اور وہ آپ کا جذباتی و جسمانی استحصال کرتا رہے گا۔ میری مانیں تو تھوڑی سی ہمت کریں اور مجھے کوشش کرنے دیں۔'' شہریار نے اسے سمجھایا۔

''بالکل نہیں... میری ممی اس دنیا میں میرا واحد رشتہ ہیں۔ میرے ساتھ چاہے کچھ بھی ہو جائے لیکن میں ان کے لیے ذرا سا بھی رسک لینا پسند نہیں کروں گی۔ اگر آپ نے زبردستی اپنی مرضی سے کچھ کرنے کی کوشش کی تو میرے تعاون سے محروم ہو جائیں گے۔ اپنی ممی کی حفاظت کے لیے میں آپ کا ساتھ چھوڑ کر چودھری افتخار کی صف میں بھی کھڑی ہو سکتی ہوں۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھیے گا۔'' ڈاکٹر ماریا کا لہجہ کچھ دھمکی آمیز ہو گیا لیکن شہریار نے برا نہیں مانا۔ وہ جانتا تھا کہ ماریا بہت خوف زدہ ہے اور کسی بھی صورت اسے اس کے ارادے سے باز رکھنا چاہتی ہے اس لیے اس طرح کی باتیں کر گئی ہے۔

''او کے ڈاکٹر ماریا... ریلیکس! آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی اجازت کے بغیر اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کروں گا۔'' اس نے ماریا کو تسلی دی۔

''تھینک یو اے سی صاحب! مجھے امید ہے کہ آپ میری باتوں کا برا نہیں منائیں گے۔ آپ میری پوزیشن سمجھ سکتے ہیں۔ میں درندوں کے نرغے میں پھنسی ایک تنہا لڑکی ہوں اور ایسی کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی جو مجھے ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار کر دے... لیکن آپ سے میرا وعدہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکا، آپ کی مدد کرتی رہوں گی۔'' اس کی تسلی پر مطمئن ہو کر وہ اپنے تعاون کی یقین دہانی کروانے لگی۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ میں بہرحال، ہر وقت آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ جب چاہیں مجھے فون کر سکتی ہیں۔'' اس نے ڈاکٹر ماریا کو جواب دیا اور ایک دو روایتی الوداعی جملے ادا کرتے ہوئے رابطہ منقطع کرنے کے بعد ایک گہرا سانس لیا۔ چودھری کے جرائم اور مظالم کی کئی داستانیں سامنے ہونے کے باوجود وہ ابھی تک کوئی ایسا ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے خلاف ٹھوس اقدامات اٹھا سکے۔ چودھری کا اثر رسوخ اور دہشت قدم قدم پر رکاوٹ بن کر سامنے آ جاتی تھی۔

☆☆☆

''آپ کا شک درست نکلا چودھری صاحب! آپ کے ڈیرے پر کارروائی کرنے والا شخص یقینی طور پر اے سی شہریار ہی تھا۔ میں نے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کی ہیں۔ اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ جس رات ڈیرے پر کارروائی ہوئی، اس رات اے سی نے اپنے بنگلے پر ایک موٹر سائیکل چوری چھپے منگوائی تھی اور صبح وہ بندہ جس کی موٹر سائیکل تھی، اسے بنگلے سے واپس لے گیا تھا۔ موٹر سائیکل کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پر طویل سفر کیا گیا ہے... وہ بھی کچے پکے، ٹیڑھے میڑھے راستوں پر۔''

''تو پھر آپ کارروائی کریں نا ایس پی صاحب! آپ کے پاس ثبوت ہے تو پھر آپ چاہیں تو اے سی کو گرفتار بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے ابھی تک ایف آئی آر میں کسی مشکوک بندے کا نام نہیں لکھوایا۔ آپ کہیں تو اب اے سی کا نام لے لیتا ہوں۔'' ایس پی تارڑ کی فراہم کردہ اطلاع سن کر چودھری

اپنی جگہ سے اچھل پڑا اور پُرجوش لہجے میں اسے مشورے سے نوازتے ہوئے خود بھی آگے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا چودھری صاحب! ہمارے سارے ذرائع ایسے نہیں ہوتے کہ ہم انھیں عدالتوں میں گواہ بنا کر کھڑا کر سکیں۔ بس آپ سمجھیں کہ یہ آف دی ریکارڈ معلومات ہیں جو میں نے آپ تک پہنچائی ہیں۔ اگر میں نے کسی طرح مخبری کرنے والے کو عدالت میں گواہی دینے پر مجبور بھی کر دیا تو بھی ہم اے سی کو نہیں گھیر سکیں گے۔ وہ کہہ دے گا کہ ہاں، میں نے اس رات اپنے بنگلے پر ایک موٹر سائیکل منگوائی تھی اور رات بھر اس پر ارد گرد کے علاقے میں گھومتا رہا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں چودھری افتخار کے ڈیرے پر آگ لگانے بھی جا پہنچا تھا۔ کیا وہاں کوئی ایسا ثبوت ملا ہے جس سے میری آمد ثابت ہو سکے؟ چودھری یا اس کے کسی بندے نے اپنی آنکھوں سے مجھے وہاں آتے دیکھا تھا؟ اگر دیکھا تھا تو پہلے ہی دن کیوں نہ بتا دیا؟''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کی تصدیق کے باوجود میں اس اے سی کے بچے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ کی دی ہوئی انفارمیشن آف دی ریکارڈ ہی رہے گی اور اس سے مجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔'' تارڑ کے انکار اور دلائل نے چودھری کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

''اب ایسی بھی بات نہیں ہے کہ آپ کو اس انفارمیشن سے کوئی فائدہ ہی حاصل نہ ہو۔ کم از کم آپ اے سی پر دباؤ تو ڈلوا ہی سکتے ہیں۔ فون کریں اس کے ایم این اے ماموں کو اور بتائیں کہ اس کا بھانجا یہاں کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے۔ ساتھ یہ احسان بھی جتا دیں کہ سب کچھ جانتے بوجھتے میں صرف آپ کے لحاظ میں آپ کے بھانجے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہا۔ لیاقت رانا خود اپنے بھانجے کو سمجھا لے گا کہ چودھری سے زیادہ پنگا نہ لو۔ مجھے یقین ہے کہ اے سی صاحب کم از کم اپنے ماموں کے علم میں تصویروں والی بات لانا پسند نہیں کریں گے کیونکہ اس میں انھیں ڈر ہوگا کہ جانے ماموں یقین کریں یا نہ کریں... الٹا اپنا کردار مشکوک ہو جائے۔'' تارڑ نے شاطرانہ انداز میں چودھری کو صلاح دی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''گل تو تہاڈی بالکل ٹھیک ہے ایس پی صاحب! چلیں تو فیر ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ دن تو وہ بلونگڑا آرام نال بیٹھے گا۔'' آخر اس نے تارڑ کا مشورہ قبول کر لیا۔

''آپ نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے چودھری صاحب! ان سیاست دانوں اور بیورو کریٹس سے ذرا مختلف انداز میں نمٹنا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کے معاملے میں ڈائریکٹ ایکشن سے زیادہ اس طرح کی چال بازیوں سے کام لینا مناسب رہتا ہے... کیونکہ صاف بات ہے کہ ہم انھیں آسانی سے اپنے راستے سے ہٹا نہیں سکتے، اس لیے بہتر ہے کہ تھوڑی نرمی، تھوڑی گرمی کے ساتھ معاملات چلاتے رہیں۔'' ایس پی نے اس کے فیصلے کو سراہتے ہوئے اسے مزید سمجھایا۔

''آپ کا مشورہ ہے تو ہم ماننے سے انکار کیسے کرتے، پر یاد رکھیے گا کہ جلد ایسا کوئی موقع دوبارہ آئے گا جب آپ کو ہماری طرف کی بات جاننے کے بعد اسے آف دی ریکارڈ رکھنا ہوگا۔'' چودھری نے معنی خیز لہجے میں کہا تو تارڑ الجھ گیا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا چودھری صاحب؟'' اس نے ناسمجھی کے انداز میں وضاحت چاہی۔

''گل یہ ہے ایس پی صاحب کہ وہ لڑکی ماہ بانو ابھی تک ہمارے دل میں پھانس بن کر چبھی ہوئی ہے۔ جب تک ہم اسے پا نہیں لیں گے، چین نہیں آئے گا... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ماہ بانو کا پتا اپنے اے سی صاحب کے سوا کسی کو معلوم ہی نہیں۔ میرے بندوں نے اس کے اسٹاف کو بڑا ٹٹولا۔ رشوت، دھونس، دھمکی سارے حربے آزما لیے، پر کہیں سے کچھ معلوم نہیں ہوا... جس کا مطلب ہے کہ کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ اب میرے پاس آخری حل یہی ہے کہ اے سی سے ماہ بانو کا پتا اگلواؤں۔ پہلے سوچا تھا کہ تصویروں والے معاملے میں اسے بلیک میل کر کے اور کاموں کے ساتھ یہ کام بھی نکلوا لوں گا، پر تصویریں تو نکل گئیں ہاتھ سے۔ اب میں ایسا سوچ رہا ہوں کہ یہ اپنے اے سی صاحب گڈی میں بیٹھ کر بہت اِدھر اُدھر دوڑیں لگاتے پھرتے ہیں۔ کسی دن موقع دیکھ کر انھیں اپنے کسی ٹھکانے پر پہنچا دوں۔ کچھ دن آرام بھی کر لیں گے اور ہمیں ماہ بانو کا پتا بھی بتا دیں گے۔ اب آپ بتائیں کہ یہ معاملہ آف دی ریکارڈ رہے گا کہ نہیں؟'' چودھری نے اپنا پورا منصوبہ ایس پی کے سامنے رکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''یہ ذرا خطرناک کام ہو جائے گا چودھری صاحب! بہرحال، آپ اتنا اطمینان تو رکھیں کہ میرا تعاون آپ ہی کے ساتھ ہوگا لیکن جلد بازی سے کام مت لیجیے گا۔ کچھ دن انتظار کریں، ہو سکتا ہے کسی اور ذریعے سے لڑکی کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ وہ اس کے ماں باپ... اور ایک بہن بھی تو ہے یہاں۔ ممکن ہے کسی روز لڑکی خود اپنے رشتے داروں سے رابطہ کرے۔ آپ ان لوگوں پر نظر رکھوائیں تو میرے خیال

www.pkdigest.com

میں آپ کا مقصد زیادہ آسانی سے پورا ہو جائے گا۔'' ایس پی کے مشورے نے چودھری کو یاد دلایا کہ وہ ایک عرصے سے ماہ بانو کے ماں باپ کو فراموش کیے بیٹھا ہے، وہ دونوں کیا کر رہے ہیں اور کیسے ان کا گزارہ ہو رہا ہے، کچھ معلوم ہی نہیں؟ اس نے فوراً ان معلومات کے حصول کے لیے منشی اللہ رکھا کو آواز دی۔

''حکم سرکار!'' منشی اس کی پکار پر فوراً بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا۔

''غیاثے اور نوراں کی کیا خبر ہے؟ زندہ ہیں کہ مر کھپ گئے ہیں؟''

''زندہ ہیں سرکار... پر مردوں جیسی حالت میں۔ نوراں تو اپنے پتر کی موت کے بعد حواسوں میں ہی نہیں رہی۔ سارا دن گاؤں میں ماری ماری پھرتی ہے۔ غیاثا اسے پکڑ پکڑ کر گھر لے جاتا ہے۔ اس کا اپنا حال بھی اچھا نہیں۔ ایک تو اکلوتے پتر کی موت کا غم، اس پر سے گھر والی کی حالت۔ سالا کسی کام جوگا نہیں رہا۔ سنا ہے اے سی کے دفتر سے اس کے گھر کے لیے مہینے کا راشن جاری ہو گیا ہے۔ اسی پر گزر بسر ہو رہی ہے۔'' منشی کی معلومات ہمیشہ اپ ٹو ڈیٹ ہوتی تھیں اسی لیے تو وہ چودھری کے اتنے قریب تھا۔ اس وقت بھی اس نے اس کے سوال کا بھرپور اور تفصیلی جواب فراہم کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے، تو جا۔'' چودھری نے اسے رخصت دی اور ایک بار پھر تارڑ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آپ نے سنا تارڑ صاحب! منشی کیا کہہ رہا تھا؟ ان باتوں کو سن کر تو مجھے نہیں لگتا کہ ان لوگوں کی نگرانی کروانے سے کچھ حاصل ہو گا۔ ویسے بھی ماہ بانو اپنے ماں پیو سے ناراض تھی، وہ ان سے رابطہ کیوں کرے گی؟''

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے دباؤ اور لالچ میں آ کر غیاث اور نوراں نے ماہ بانو کی اس سے شادی کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ ماہ بانو کو اپنے ماں باپ سے بدگمان کر گیا تھا۔ اس لیے اس بات کا امکان ذرا کم ہی تھا کہ وہ اپنے ماں باپ سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ اسے رابطہ کرنا ہوتا تو اپنی بڑی بہن اور بھائی کی موت کے موقعے پر کرتی لیکن جب وہ اتنے نازک مواقع پر خاموش رہی تھی تو اب کس لیے اُن سے رابطہ کر کے خود کو منظر پر لانے کا خطرہ مول لیتی؟

''اگر یہ معاملہ ہے تو پھر آپ جو مناسب سمجھیں وہ کریں لیکن ذرا ہاتھ پیر بچا کر صفائی کے ساتھ... اور ہاں، کچھ کرنے سے پہلے مجھے ضرور مطلع کر دیجیے گا۔ میں بھی کچھ انتظامات کر دوں گا۔ خصوصاً ڈی ایس پی منظور کو اس موقعے پر اِدھر اُدھر کرنا ہو گا۔ پچھلے دنوں بڑی چمچہ گیری کرتا رہا ہے وہ اے سی کی۔ یقیناً اے سی کو استعمال کر کے میری جگہ خود ایس پی بننے کے خواب دیکھ رہا ہو گا۔ بہرحال، میں نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں جو اسے اس کے مقصد میں کامیاب ہونے دوں۔ خواب ہی دیکھتا رہ جائے گا وہ ایس پی بننے کے۔'' تارڑ نے بھی اپنے اندر پلتی دشمنی کا اظہار کیا۔

''اگر زیادہ مسئلہ ہے تو مجھ سے کہیں، میں کام ہی تمام کروا دیتا ہوں آپ کے دشمن کا۔ ہمارے ہوتے ہمارے دوستوں کو کوئی پریشانی ہو، ہمیں ذرا اچھا نہیں لگتا۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ باجوہ کا کتنا ساتھ دیا ہم نے۔ ہمارے ہی تعاون کی وجہ سے وہ مشکوک ہونے کے باوجود سلاخوں سے باہر بیٹھا تھا۔ دیکھا جائے تو ہمارے کام کا بھی نہیں رہا تھا، پھر بھی ہم اس سے آخری دم تک دوستی نبھاتے رہے۔'' تارڑ کو پیش کش کرتے ہوئے چودھری نے ایک ایسا حوالہ دیا جو خود تارڑ کے لیے معمّا بنا ہوا تھا۔ باجوہ کی موت طبعی تھی اس کے باوجود جانے کیوں اس کے دل میں کھٹک سی تھی۔ شاید اس کی وجہ وہ ملاقات تھی جس میں اس نے چودھری سے باجوہ کے خدشات کو ڈسکس کیا تھا اور جواباً چودھری نے بہت عجیب و غریب رویہ اپنایا تھا پھر باجوہ کی موت والی رات اس کے بنگلے پر بابے کا ہونا بھی بڑا معنی خیز تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مرکزِ صحت میں موجود دونوں ڈاکٹرز نے موت کی وجہ ہارٹ فیل بتائی تھی۔ وہ ڈاکٹرز کے بیان پر مکمل اعتماد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ ڈاکٹرز کو خرید لینا چودھری کے لیے کوئی مشکل بات نہیں مگر ڈاکٹرز کے بیان کو چیلنج کر کے زبردستی باجوہ کا پوسٹ مارٹم کروانا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کی ایسی کوئی کوشش چودھری کو بھڑکا سکتی تھی۔ وہ چودھری کو بھڑکا کر اپنے لیے مصیبت نہیں مول لے سکتا تھا۔ اس لیے وقتی طور پر خاموش ہو گیا تھا مگر اس صورتِ حال میں اس کے لیے چودھری پر پہلے جیسا اعتماد کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے دل میں ڈر سا پیدا ہو گیا تھا کہ کسی روز وہ بھی باجوہ جیسے انجام سے دوچار ہو سکتا ہے... وہ بھی صرف اس وجہ سے کہ چودھری کو محسوس ہونے لگے کہ وہ اس کے لیے اب مفید نہیں رہا۔

''کیا ہوا ایس پی صاحب! کس سوچ میں پڑ گئے؟''

اسے غائب دماغ پا کر چودھری نے اسے ٹوکا۔

''کچھ نہیں، بس باجوہ کا خیال آ گیا تھا۔ اچھی سیٹنگ بنی ہوئی تھی اس کے ساتھ۔ اب نہ جانے اس کی جگہ جو نیا

یہاں آنے کے بعد اسے بھجوائے تھے۔

"ماہ بانو بہن! یہ کیا؟" اکرم خان اس کے عمل پر ششدر رہ گیا۔

"کچھ مت کہو بھائی اکرم!" اس نے اکرم خان کو زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ کے اشارے سے بھی منع کیا اور خود بوڑھے کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"اب ہم چلتے ہیں بابا! وقت پر برات لے کر آئیں گے۔" ساکت و صامت بیٹھے بوڑھے سے نرم لہجے میں یہ مختصر سی بات کہنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ اکرم خان کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی، البتہ بوڑھا نہ تو اپنی جگہ سے ہل سکا تھا اور نہ ہی اپنے سامنے دھرے نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھا سکا تھا۔

"تم نے اتنا بڑا رقم اس لالچی بڈھے کو دے دیا۔ یہ سب کرنے سے پہلے تمہیں ہمیں بتانا تو چاہیے تھا۔" واپسی کے راستے پر چلتے ہوئے اکرم خان اس سے الجھ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں بھائی اکرم! میرے پاس بھی تو وہ روپے یونہی رکھے تھے... اگر ان روپوں سے کوئی جھگڑا رک گیا اور کسی کو خوشیاں ملنے کی امید بندھ گئی تو میرا کیا گیا؟ تم پریشان مت ہو، نہ ہی کسی اور کو اس بارے میں کچھ بتانا۔ جو کچھ ہوا، وہ بس میرے اور تمہارے درمیان رہنا چاہیے۔" اپنے میزبانوں کے گھر میں داخل ہونے سے قبل ماہ بانو نے اکرم خان کو سمجھایا۔ اکرم خان نے اس کی بات کا مان رکھا اور کسی کو بھی اصل صورت حال بتائے بغیر دلہن کے باپ کے مان جانے کی نوید سنا دی۔ مقررہ وقت پر سفید پھندنوں والی سرخ ٹوپی پہنے دولہا کو لے کر برات دلہن کے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو اکرم خان کو ماہ بانو کی بات کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ اگر وہ سب کو اصل صورت حال بتا دیتا تو حالات میں کشیدگی ہوتی اور کسی کے چہرے پر وہ خوشی دیکھنے کو نہیں ملتی جو اب نظر آ رہی تھی۔ دلہن کے گھر پہنچنے کے بعد شادی کی مخصوص رسومات انجام دی گئیں۔ آخر میں کچھ خوش گلو نوجوانوں نے طربیہ گیت چھیڑ دیے۔ گیتوں کی لے اور تالیوں کے آہنگ کے ساتھ بہت سے لوگ رقص کرنے لگے۔ شاید اس طربیہ محفل میں چھڑے گیتوں کی آوازیں ہوشے کی گلیوں سے نکل کر اس کیمپنگ سائٹ تک بھی پہنچی تھیں جہاں موجود رنگ برنگے خیموں میں سفید پوش پہاڑوں کے عاشق فروکش تھے۔ ان میں سے کچھ من چلے گلے میں کیمرے لٹکائے ہوشے کی گلیوں میں اتر آئے اور خود بھی اس محفل کا حصہ بن گئے۔ یہاں کسی کو بھی ان کی آمد پر اعتراض نہیں تھا۔ خود ماہ بانو بھی مگن تھی لیکن جب تیسری بار اس نے اپنے چہرے پر فلیش کی چمک محسوس کی تو ناگواری کے احساس کے ساتھ اس حرکت کے مرتکب شخص کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔ اسے متوجہ دیکھ کر وہ غیر ملکی پوری ڈھٹائی کے ساتھ مسکرایا اور اپنے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی جانب ایک ہوائی بوسا اچھالا۔

ماہ بانو جو ابھی اس کے کچھ کچھ آشنا لگتے نقش و نگار میں الجھی ہوئی تھی، اس حرکت پر یک دم ہی اسے پہچان گئی۔ یہ وہی شخص تھا جس نے ہشام ہوٹل کے سامنے بھی یہی حرکت کی تھی۔ اس کی اس حرکت پر ماہ بانو کے ساتھ موجود شہریار چراغ پا ہو گیا تھا لیکن چونکہ یہ شخص چلتی جیپ میں سوار تھا، اس لیے شہریار اسے اس حرکت کا مزہ نہیں چکھا سکا تھا۔ اس روز ماہ بانو نے دل میں شکر ادا کیا تھا کہ اچھا ہوا وہ بدتمیز آدمی شہریار کے ہاتھ نہیں لگا ورنہ خوامخواہ کا جھگڑا کھڑا ہو جاتا... لیکن آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کاش شہریار یہاں موجود ہوتا اور اس شخص کا منہ توڑ ڈالتا۔ مگر شہریار یہاں کہاں تھا؟ وہ تو اس سے بہت دور بیٹھا اپنے فرائض منصبی نبھا رہا تھا۔ ماہ بانو کی حیثیت بھی اس کے نزدیک ایک فریضے کی سی تھی جسے محفوظ مقام پر پہنچانے کے بعد شاید وہ اسے بھول بھی گیا تھا۔ اسے ضرورت بھی کیا پڑی تھی اپنے سے اتنی کم تر اور بے حیثیت بانو کو یاد رکھنے کی؟ وہ تو کسی شہزادے کی طرح تھا جس کے ساتھ کوئی شہزادی ہی جچتی۔ ماہ بانو تو بس اسے اپنے دل کی دھڑکنوں میں بسا کر چپکے چپکے چاہنے کی ہی جرأت کر سکتی تھی۔ اس چاہت نے اسے روپہلے خوابوں کے بجائے نارسائی کے دکھ میں لپٹی اداسی عطا کی تھی۔ اس نے محبت کا بخشا یہ تحفہ بھی بڑے ظرف سے سینے سے لگا کر رکھا تھا لیکن یہ اداسی بھی کبھی اسے ساری دنیا سے کاٹ کر اپنی ذات میں تنہا ہو جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس بدتمیز غیر ملکی سیاح سمیت اس ساری خوشی بھری محفل کو فراموش کر بیٹھی اور خالی خالی نظروں سے اپنے اردگرد کے مناظر دیکھنے لگی۔ اس خود فراموشی کے عالم میں اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ کب دلہن کا باپ اس کے ساتھ آ کر کھڑا ہوا اور اس کی مٹھی میں کوئی شے دبا کر فوراً ہی اس سے دور بھی ہٹ گیا۔ وہ چونک کر اپنی مٹھی کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی مٹھی میں وہی نیلے نوٹ دبے ہوئے تھے جو چند گھنٹے قبل وہ کسی کی خوشیوں کو برقرار رکھنے کے لیے اس بوڑھے کی نذر کر کے آئی تھی۔ یقیناً بوڑھا ایک اجنبی لڑکی کے خلوص سے ہار گیا تھا اور احساس ہوتے ہی پہلی فرصت میں اپنی غلطی کی تلافی کروا دی تھی۔

☆☆☆

www.pkdigest.com

"بی بی! آپ کے لیے فون ہے۔" وہ ٹیرس پر رکھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر گم صم سی بیٹھی آسمان کی وسعتوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ رانی نے فون کی اطلاع دی تو اپنے خیالات سے چونکی اور کسل مندی سے اٹھ کر اندر کمرے میں رکھی اس تپائی کی طرف بڑھی جس پر ٹیلی فون سیٹ دھرا تھا۔

"ہیلو!" ریسیور اٹھا کر اس نے بے حد بے دلی سے کہا۔ اندازہ تھا کہ یہاں اس کے لیے آنے والی کال حویلی کے ہی کسی مکین کی طرف سے ہو سکتی ہے۔

"محبت کرنے والوں کے ساتھ ایسا سلوک تو نہیں کرتے۔ کچھ اندازہ ہے آپ کو کہ میں اس طرح اچانک آپ کی طرف خاموشی چھا جانے پر کتنا پریشان ہوں۔" دوسری طرف سے اس کی توقع کے بالکل برعکس جو آواز سنائی دی، اس نے اس کے جسم و جاں کو لرزا کر رکھ دیا۔

"آفتاب آپ! آپ کو یہاں کا نمبر کیسے ملا؟" بے پناہ حیرت سے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال تھا کہ آپ موبائل آف کر دیں گی اور اپنی شہر والی کوٹھی میں آ چھپیں گی تو مجھے آپ سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ملے گا؟" اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی جھنجلاہٹ تھی۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں آفتاب! ایسی کوئی بات نہیں ہے جیسا آپ گمان کر رہے ہیں۔ میں نے موبائل آف نہیں کیا، بس مجھے اسے چارج کرنے کا خیال نہیں رہا اور شاید بیٹری ڈاؤن ہونے کی وجہ سے وہ خود ہی آف ہو گیا۔" کشور نے وضاحت پیش کی۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آپ کو موبائل چارج کرنے جیسا اہم کام بھی یاد نہیں رہا؟ آپ تو مجھ سے بات کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھیں پھر یہ کیسا انقلاب آیا کہ آپ کو وہ شے ہی بھول گئی جو میرے آپ کے رابطے کا ذریعہ ہے؟" اس کے لہجے سے ہنوز ناراضی جھلک رہی تھی۔

"مجھ سے کچھ نہ پوچھیں۔ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔" بالآخر اس کے ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں اور وہ سسک پڑی۔ اس کے اس طرح رونے سے آفتاب اپنی ناراضی بھول کر پریشان ہو گیا۔

"کشور پلیز! اس طرح روئیں نہیں۔ مجھے بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟ دیکھیں، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ اس رات آپ میری فریدہ سے بات کروانے کا کہہ کر غائب ہی ہو گئیں اور میں انتظار کرتا رہا۔ میں نے خود رابطہ کرنے کی کوشش کی تو آپ کا موبائل بند جا رہا تھا۔ رانی بھی انڈسٹریل ہوم نہیں آئی کہ میں اس سے آپ کے بارے میں پوچھتا۔ پھر اس کے بھائی کی زبانی مجھے اطلاع ملی کہ آپ لاہور پہنچی ہوئی ہیں اور رانی آپ کے ساتھ ہے۔ میں سمجھا کہ آپ نے مجھ سے ملاقات کے لیے کوئی سبیل نکالی ہے۔ میں فوراً لاہور پہنچ گیا لیکن یہاں آ کر بھی آپ نے کوئی رابطہ نہیں کیا تو مجھے بہت برا لگا۔ میں نے آپ کی کوٹھی کا فون نمبر حاصل کیا اور آپ سے رابطے کی کوشش کرنے لگا۔ ہر بار کوئی ملازم فون اٹھاتا تھا اس لیے مجھے بنا بات کیے لائن کاٹنی پڑتی۔ اس بار فون پر رانی کی آواز سنائی دی تو میں نے اس سے آپ سے بات کروانے کے لیے کہا۔ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ اپنی پچھلی ناکامیوں پر میں اچھا خاصا جھنجلایا ہوا تھا اس لیے آپ کی آواز سنتے ہی کچھ تلخ ہو گیا... لیکن پلیز! آپ اس طرح روئیں تو نہیں۔ مجھے آپ کے رونے سے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ اپنے تلخ لہجے کی وضاحت پیش کرتے ہوئے اسے چپ کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں نے آپ کی باتوں کا برا نہیں مانا آفتاب! مجھے اندازہ ہے کہ آپ بہت پریشان رہے ہوں گے اور پریشانی میں آدمی کے منہ سے کچھ بھی الٹا سیدھا نکل سکتا ہے۔ آپ نے تو ایسا کچھ غلط کہا ہی نہیں۔" اسے شرمندہ پا کر کشور نے خود کو سنبھالا اور آہستگی سے بولی۔

"تو پھر وہ کیا بات ہے جس نے آپ کو اس قدر دکھی اور پریشان کر دیا ہے؟ کیا حویلی میں کچھ ہوا ہے؟" آفتاب نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"حویلی میں تو ہر روز کوئی نہ کوئی نیا ظلم و ستم ہوتا رہتا ہے اور یہ میری بدقسمتی... کہ میں وہاں پیدا ہوئی۔" اس کے لہجے میں تلخی اور دکھ دونوں ہی جھلک رہے تھے۔

"آپ مجھے کچھ بتائیں تو سہی کہ ایسا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے آپ اس قدر پریشان ہیں؟" آفتاب نے اصرار کیا۔

"نہیں بتا سکتی۔ بات ایسی ہے کہ زبان پر لاتے ہوئے میں شرم سے مرنے لگتی ہوں۔ رانی دن رات میرے ساتھ رہتی ہے، میں اسے بھی کچھ بتانے کی ہمت نہیں کر سکی۔" اس نے انکار کیا تو آفتاب سوچ میں پڑ گیا۔ کشور کی باتوں سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے جس کی وجہ سے وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہے۔ اس کا یہ ڈپریشن خود آفتاب کو تکلیف میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس مسئلے کا یہی حل تھا کہ کشور کی اس سے ملاقات ہو جاتی کیونکہ وہ جانتا تھا

کہ اس کا ساتھ کشور کو ایسی بے پایاں مسرت عطا کرتا ہے کہ اس کے آگے وہ سب کچھ بھول سکتی ہے۔

"آپ مجھے بتانا نہیں چاہتیں تو میں اصرار نہیں کروں گا لیکن آپ تکلیف میں ہوں، یہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ آپ کسی طرح مجھ سے ملاقات کی راہ نکالیں بلکہ ایسا کریں کہ کتابیں خریدنے کے بہانے لبرٹی تک آجائیں۔ میں وہاں بک شاپ پر آپ کا منتظر رہوں گا۔" اس نے پروگرام ترتیب دیا لیکن جواباً کشور خاموش رہی۔

"کیا بات ہے، آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟ کیا آپ مجھ سے ملنے کے لیے آنا نہیں چاہتیں؟" اس کی خاموشی کے باعث آفتاب نے پوچھا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ آپ سے ملنا تو میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے لیکن ہم آج نہیں ملیں گے۔ آپ کو ملاقات کے لیے تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا۔ میں خود فون کرکے آپ کو وقت کے بارے میں بتاؤں گی۔" کشور کا انداز کچھ پُراسرار تھا۔ آفتاب الجھ سا گیا تاہم کوئی اختلاف نہیں کیا۔

"چلیں جیسی آپ کی مرضی۔ میں یہاں اپنے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ بس دو دن اور ہوں یہاں... اگر ان دو دنوں میں آپ کا موڈ بن جائے تو مجھے بتا دیجیے گا۔" اس نے اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے لہجے سے ظاہر تھا کہ اسے کشور کا جواب سن کر کچھ اچھا نہیں لگا ہے۔ ظاہر ہے، وہ اپنے سارے کام چھوڑ کر اس کی خاطر دوڑا آیا تھا اور وہ بہانے بنا رہی تھی تو اس کا موڈ آف ہونا لازمی تھا۔ کشور نے اس کا انداز محسوس کر لیا پھر بھی زیادہ توجہ نہیں دی اور ریسیور کریڈل پر رکھ کر رانی کو آواز دینے لگی۔

"ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔" رانی آئی تو اس نے حکم دیا۔ اس حکم پر رانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ماسٹر صاحب سے ملنے جانا ہے بی بی؟" آفتاب کے فون کے بعد اُس کے اس حکم کو سن کر رانی یہی نتیجہ اخذ کر سکتی تھی۔

"نہیں... کہیں اور جانا ہے۔" اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختصر جواب دیا لیکن اس کے چہرے پر پھیلی مبہم سی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی جس کا مطلب نہ سمجھنے کے باوجود رانی اتنا اندازہ لگانے میں تو کامیاب ہو ہی گئی کہ بی بی اپنے پچھلے دنوں کی کیفیت سے باہر آرہی ہیں۔

☆☆☆

"گل مینا! یہ جو تمہارے گاؤں میں کیمپنگ سائٹ ہے وہاں چلیں؟ میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ قریب سے ان دیوانوں کو دیکھوں جو اچھی بھلی آرام کی زندگی چھوڑ کر اتنے مشکل مشکل پہاڑوں کو سر کرنے نکل پڑتے ہیں۔ سفرناموں میں ان لوگوں اور ان کی خیمہ گاہوں کے بارے میں بہت پڑھا ہے۔ آج ذرا قریب جا کر اپنی آنکھوں سے اس دنیا کا نظارہ کرنا چاہتی ہوں۔" شادی کا ہنگامہ کل رات گئے تک جاری رہا تھا، اس کے باوجود اگلی صبح وہ لوگ جلدی جاگ گئے تھے۔ اس نے لکڑی کے چولہے پر توا رکھے جلدی جلدی روٹیاں تھوپتی گل مینا سے اپنی خواہش بیان کی تو وہ تذبذب میں پڑ گئی۔

"ابھی تو بہت کام کرنا ہے۔ اتنا کام چھوڑ کر ہم کیسے جا سکتا ہے؟ ویسے بھی اُدھر کچھ نہیں رکھا۔ ہماری بستی کا بچہ لوگ گوروں کے اِدھر قدم رکھتے ہی ان سے سارا چاکلیٹ اور چیونگم وغیرہ نکلوا لیتا ہے۔ اُدھر کیمپ جائے گا تو ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔ مفت میں گورا لوگ تصویریں کھینچنے کے لیے پیچھے پڑ جائے گا۔" اپنی مصروفیت کے علاوہ گل مینا نے اپنے ساتھ نہ چلنے کی جو وجہ بتائی، اسے سن کر ماہ بانو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس طرح کے علاقوں کے باسی ولایتی چاکلیٹس اور اسی قسم کی دوسری اشیا ہتھیانے کے لیے سیاحوں کا پیچھا لے لیتے ہیں۔ گل مینا کی بات سن کر اس بات کی تصدیق ہوگئی۔ وہ بھی تو اسی ماحول کا حصہ تھی جہاں کے باسی اپنی غربت اور بھوک کے باوجود آئے دن یہاں سے گزرنے والے غیر ملکی سیاحوں کی عنایتوں کے باعث ولایتی مال کی لت میں مبتلا ہو چکے تھے۔

"ٹھیک ہے، تم اپنا کام کرو۔ میں خود چکر لگا کر آتی ہوں۔" وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گل مینا نے پیچھے سے آواز دے کر اس سے کچھ کہا بھی لیکن اس نے ان سنی کر دی۔ آزادی کے احساس کے ساتھ اس دھندلی سی صبح میں ہوشے کی گلیوں میں چلنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یہاں کا موسم اس کے لیے کچھ سخت ضرور تھا لیکن وہ اس خوف سے آزاد تھی کہ چودھری یا اس کا کوئی ہرکارہ اسے دیکھ لے گا۔ آزادی کی اس نعمت سے لطف اندوز ہوتی وہ گرم کپڑوں میں ملبوس ہوشے کی کیمپنگ سائٹ کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ یہاں دو تین خیمہ گاہیں تھیں۔ اتنی صبح کے وقت وہاں وہ رونق تو نظر نہیں آرہی تھی جس کا تذکرہ سفرناموں میں پڑھتی رہی تھی لیکن دھندلی سی صبح میں سر اٹھائے کھڑے رنگ برنگے خیموں کا نظارہ بھی بہت شان دار لگ رہا تھا۔ ایک خیمہ گاہ میں جھانکنے پر اسے متحرک پورٹر نظر آئے۔ وہ چند خیموں کو اکھاڑ

رہے تھے۔ شاید وہاں موجود کسی ٹیم کو بہت جلدی تھی اور وہ جلد سے جلد روانہ ہونے کے خواہش مند تھے۔ ماہ بانو اس خیمہ گاہ کو چھوڑ کر دوسری طرف بڑھ گئی۔ یہاں بالکل خاموشی تھی۔ خیمہ گاہ کے کھلے پھاٹک سے اندر داخل ہو کر پہلے تو وہ دیوار کے ساتھ ساتھ لگے پاپلر کے درختوں کے نیچے سے گزرتی وہاں موجود سورج مکھی کے پودوں کا جائزہ لیتی رہی پھر خیموں کے درمیان چلی آئی۔ یہاں چند ہی خیمے تھے اور ابھی ان خیموں میں زندگی کا تحرک نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید ان خیموں میں پہاڑوں سے اُتر کر آنے والے سیاح استراحت فرما رہے تھے جو واپسی کے سفر سے پہلے اپنی تھوڑی سی تھکن اتار لینا چاہتے تھے۔ اس سوئی ہوئی خیمہ گاہ کی خاموشی سے لطف اندوز ہوتی وہ ایک بڑے سے خیمے کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ یک دم ہی کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد نے اسے اتنی بُری طرح بوکھلاہٹ میں مبتلا کیا کہ وہ چیخ تک نہیں سکی۔ لمحہ بھر کے توقف کے بعد ذرا سنبھلی تو خیمے میں موجود روشنی میں اس نے اس امریکی کو دیکھا جسے پہلے وہ بشام موٹیل کے باہر اور کل رات بھی ہوشے میں بھی دیکھ چکی تھی۔

"تم بڑی خوب صورت لڑکی ہو۔ پہلی بار تمہیں دیکھا تھا، تب ہی دل تمہیں پانے کے لیے مچل گیا تھا لیکن اس وقت ایک تو تم کسی اور کے ساتھ تھیں، دوسرے میرے پاس بھی وقت نہیں تھا اس لیے صبر کرنا پڑا۔ تمہیں شاید میری دلچسپی کا اندازہ ہوگیا تھا جب ہی کل رات مجھے گاؤں میں دیکھنے کے بعد آج صبح صبح خود ہی مجھے ڈھونڈتی ہوئی آگئی ہو... لیکن دیکھو، میرے پاس بس ایک ڈیڑھ گھنٹا ہی ہے۔ پھر ہم لوگ واپس چلے جائیں گے۔ تم مجھے اس وقت میں خوش کر دو۔ میں تمہیں اس ریٹ سے بھی زیادہ دوں گا جتنے تم رات بھر کے لیے چارج کرتی ہو۔" وہ بہت رواں اور صاف اردو میں بات کر رہا تھا۔ ایک امریکی گورے کو اتنی صاف اردو میں بات کرتے دیکھ کر حیرت زدہ سی رہ جانے والی ماہ بانو کو اس کی کی بات کا مفہوم سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ جب بات سمجھ آئی تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔ اس نے ابھی تک گورے کی گرفت میں موجود اپنی کلائی کو جھٹکا دے کر چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔

"ناراض کیوں ہو رہی ہو؟ اگر تمہیں میری آفر قبول نہیں تو تم اپنی مرضی کا ریٹ بتا دو۔" وہ اسے جو سمجھ رہا تھا، اسی حساب سے بات کر رہا تھا۔ شاید بشام میں اسے شہریار کے ساتھ دیکھنے کے بعد یہاں ہوشے میں مقامی لباس میں مقامی لوگوں کے درمیان دیکھ کر اس نے اپنی مرضی سے کچھ اندازے قائم کر لیے تھے اور اب اسے ایک کال گرل کی طرح ڈیل کر رہا تھا۔

"بکواس بند کرو۔ میں اس طرح کا کام کرنے والی لڑکی نہیں۔" اس کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ماہ بانو کو اپنی زبان کھولنی پڑی۔

"اچھا!" اس کا جواب سن کر وہ بے یقینی سے بولتے ہوئے ہنسا۔ "تم جو بھی ہو، اب میں تمہیں ایسے تو نہیں جانے دوں گا۔" اس نے ماہ بانو کو اپنی طرف کھینچا اور پھر زور لگا کر اسے زمین پر بچھے میٹرس پر گرا دیا۔ اس کی اس حرکت پر ماہ بانو کے اوسان خطا ہونے لگے۔ اسے لگا کہ سنہری بالوں اور گوری رنگت والے اس شخص کے نقش و نگار اپنا روپ بدل کر چودھری افتخار کے نقوش میں ڈھلنے لگے ہوں۔ شاید ہر ہوس پرست کا چہرہ اتنا ہی بھیانک اور مکروہ لگتا ہے۔ وہ ایک چودھری سے اپنا آپ بچا کر اس الگ تھلگ دنیا میں آکر بسی تھی تو یہاں اُس جیسے دوسرے سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ چودھری اگر ایک گاؤں کا مالک ہونے کے ناتے اپنے علاقے میں موجود ہر جان دار و بے جان شے پر اپنا حق سمجھتا تھا تو اِس وقت اُس کے سامنے موجود شخص بھی اس قوم کا فرد تھا جو پوری دنیا کو اپنا محکوم بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ محکوم قوم کی کمزور عورتیں تو فاتحین کا سب سے پہلا نشانہ ہوتی ہیں۔ وہ امریکی گورا بھی ماہ بانو کو ذہنی اور معاشی غلامی میں مبتلا قوم کی کمزور عورت سمجھ کر اس پر پل پڑا تھا۔

ماہ بانو اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس کے جسم سے لپٹا چادر الگ ہو چکی تھی اور اب لبادہ بھی جدا ہونے کو تھا۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے وہ ہاتھ پیر چلانے کے ساتھ ساتھ چیخیں بھی مار رہی تھی۔ شاید یہ ان چیخوں کا ہی نتیجہ تھا کہ اس نے خیمے میں کسی اور کی موجودگی کو محسوس کیا اور پھر اگلے ہی لمحے اس کے وجود سے لپٹا عفریت ایک جھٹکے سے دور جا گرا۔ خیمے میں آنے والا اکرم خان تھا جس نے غیر ملکی سیاح کو اپنی ٹھوکروں میں رکھ لیا تھا۔ اب وہاں ماہ بانو کے بجائے اس گورے کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ ماہ بانو نے پھرتی سے اپنا لباس درست کیا اور ایک بار پھر اپنے گرد چادر لپیٹ لی۔ اس دوران خیمے میں دو تین افراد اور بھی گھس آئے تھے۔ ان افراد کے آنے کے بعد معمول سے کافی بڑا خیمہ بھی تنگ پڑ گیا تھا۔

"اسٹاپ... اسٹاپ اٹ!" اندر آنے والے افراد

میں دو غیر ملکی اور ایک مقامی آدمی تھا۔ اکرم خان کو رکنے کا حکم غیر ملکی نے دیا تھا جسے سن کر اکرم خان تو نہیں رکا لیکن مقامی شخص نے آگے بڑھ کر اسے قابو کر لیا۔

"چھوڑ دو ہمیں۔ ہم اس گورے کو چھوڑے گا نہیں۔ اس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔" اکرم خان بپھرا ہوا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ اپنی مرضی سے یہاں آئی تھی۔ میں نے اس سے ریٹ طے کیا تھا۔" فرش پر گرا وہ امریکی سیاح اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوری ڈھٹائی سے بولا۔

"جھوٹ بولتا ہے بدبخت۔" اکرم خان چلّایا۔

"دیکھ یارا! جھگڑا مت کر۔ ہم نے بھی دیکھا تھا کہ یہ لڑکی خود آیا تھا۔ ہم پھاٹک پر سے ہٹ کر حاجت کے لیے جا رہا تھا، تب ہم نے اس لڑکی کو ادھر آتے دیکھا تھا۔ ہم جلدی میں تھا اس لیے اسے روک نہیں سکا۔ بعد میں یہ ہمیں نظر نہیں آیا تو ہم سمجھا واپس چلا گیا ہے۔ ابھی تم ادھر آیا اور پھر لڑکی کا چیخ سنائی دیا تو ہمیں پتا چلا کہ یہ ادھر صاحب کے خیمے میں ہے۔" مقامی شخص جو اس خیمہ گاہ کا چوکیدار تھا، اکرم خان کو سمجھانے لگا۔

"یہ ادھر صرف گھومنے آیا تھا۔" اکرم خان نے ماہ بانو کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ خود اس میں تو اتنی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔

"بحث مت کرو خان! اگر تم نے مزید بدمعاشی دکھانے کی کوشش کی تو میں تمہارا ایسا بندوبست کروں گا کہ اس علاقے میں نظر بھی نہیں آؤ گے۔" امریکی پوری طرح سنبھل چکا تھا اور اکرم خان کو دھمکی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھیوں کے تیور بھی خاصے خطرناک تھے۔

"جانے دے اکرم خان! کیوں خود کو مشکل میں ڈالتا ہے؟ ان لوگوں کا کتنا پہنچ ہے، تجھے بھی معلوم ہے۔ تو چپ رہے گا تو کچھ نہیں جائے گا۔ یہ لوگ تو ویسے بھی ہفتہ بھر بعد ادھر سے نکلنے ہی والا ہے۔ اگر تو نے بات بڑھائی تو تو زیادہ مشکل میں پڑ جائے گا۔" چوکیدار اب سرگوشیوں میں اکرم خان کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماہ بانو نے بھی اس کی یہ سرگوشیاں سنیں۔

"یہاں سے چلو بھائی اکرم! اللہ نے مجھے بچا لیا، کافی ہے۔ اب تمہیں مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔" بالآخر وہ آگے بڑھی اور اکرم خان کا ہاتھ پکڑ کر اسے خیمے سے باہر لے گئی۔ اب وہ دونوں چپ چاپ واپسی کے راستے پر چل رہے تھے۔

"میں یہاں صرف گھومنے آئی تھی۔ گل مینا نے مصروفیت کی وجہ سے آنے سے منع کر دیا تھا اس لیے میں اکیلی ہی آ گئی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں..." تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے اکرم خان کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ امریکی گورے نے اس پر جو الزام لگایا تھا، اس کی وجہ سے وہ اکرم خان کے سامنے بڑی سبکی محسوس کر رہی تھی۔

"ہمیں معلوم ہے۔ گل مینا نے ہمیں بتایا تھا کہ تم اس طرف آیا ہے جب ہی تو ہم تمہیں ڈھونڈتا ہوا ادھر آیا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا ورنہ ہم مشاہرم خان اور اس کے صاحب کو کیا جواب دیتا؟ ان گورا لوگ کی فطرت ہمیں اچھی طرح معلوم ہے۔ ہم دیکھتا رہتا ہے انہیں کہ یہ کیسے شراب پی کر عورتوں کے ساتھ موج مستی کرتا ہے۔ ان کے ساتھ عورت لوگ آتا ہے، وہ بھی انہی جیسا ہوتا ہے، پر ہم تمہیں جانتا ہے۔ تم ہمارا بہن جیسا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا یہ بہن بہت اچھا اور نیک ہے۔" اس کی پیش کی گئی نامکمل وضاحت کے جواب میں اکرم خان نے جو جملے کہے، وہ اُسے اپنی نظر میں سرخ رو کرنے کے لیے کافی تھے۔

☆☆☆

"میں امریکا جا رہا ہوں۔"

"اچانک کیوں؟ خیریت تو ہے چودھری صاحب؟" تارڑ اس اطلاع پر حیران ہوا۔

"ہاں ہاں، سب خیر ہے۔ بس بڑے دنوں سے اپنے پتر کی یاد آ رہی ہے۔ آٹھ ماہ ہو گئے اس سے ملا نہیں۔ خود وہ تو ادھر آنے کی گل کرتا نہیں۔ میں نے سوچا، میں آپ ہی اس سے مل کر آ جاتا ہوں۔ اس بہانے تھوڑا میموں کے ساتھ بھی وقت گزارنے کا موقع مل جائے گا۔" اپنے امریکا جانے کی وجہ بتاتے ہوئے آخر میں چودھری نے ایک اور شوشا چھوڑا اور خود ہی اپنی بات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسنے لگا۔

"میموں کی آپ کو کیا کمی چودھری صاحب! اب تو پیرآباد میں ہی آپ کو ایک میم کی اولاد مل گئی ہے۔" تارڑ نے ڈاکٹر ماریا کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ اپنی جگہ ہے۔ چیز زبردست ہے... مجھے انکار نہیں، پر سالی خالص میم نہیں۔ اس کا باپ ایشیائی تھا۔ پڑھنے کے لیے ولایت گیا تو گوری میم کو بھا گیا۔ بے چاری ایسی دیوانی ہوئی کہ اس کی خاطر ولایت چھوڑ کر ادھر آ بسی۔ شوہر کے مرنے کے بعد بھی واپس نہیں گئی۔ ان دونوں عاشقوں کی اولاد وہ ڈاکٹرنی ادھر ہمارے پاس ہے، پر پوری میم نہیں۔ پوری میم سے ملنے ہمیں اُدھر امریکا ہی جانا پڑے گا۔"

چودھری ایک بار پھر خباثت سے ہنستے ہوئے بولا۔

"پھر کب تک جا رہے ہیں؟" تارڑ نے اس کا پروگرام جاننا چاہا۔

"ویزا لگنے کے لیے دے دیا ہے۔ دو چار دن میں کام ہو جائے گا تو نکل جاؤں گا۔ آپ کو تو مالوم (معلوم) ہے کہ میرا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے اس لیے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ یہ تو اس واری ہی کچھ لمبا وقت گزر گیا ورنہ جب سے مراد اُدھر ہے، ہر چار چھ ماہ بعد جاتا ہی رہتا ہوں۔"

"چلیں اچھی بات ہے۔ آپ کچھ عرصہ بیٹے کے ساتھ انجوائے کریں۔ یہاں تو ویسے بھی بزنس ڈاؤن جا رہا ہے، اچھی خاصی فراغت ہی ہے۔ اپنے مطلب کا نیا فاریسٹ آفیسر آ گیا تو کچھ کام بن جائے گا۔ آپ بتائیں، آپ نے لیاقت رانا صاحب سے شہریار کے سلسلے میں بات کی؟ تو راوہ نچلا بیٹھے تو میں ڈی ایس پی منظور کو بھی یہاں سے کھسکاؤں۔ ابھی تو اس کے سر پر اے سی کا ہاتھ ہے اس لیے کہیں اور ٹرانسفر کرنا مشکل ہوگا۔" چودھری افتخار تو جدی پشتی جاگیردار تھا۔ الٹے سیدھے دھندوں میں نہیں پڑتا تب بھی زمینوں سے اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ تجوریاں بھری پڑی رہتی تھیں۔ وہ تو اپنی ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ سارے دھندے کرتا تھا ورنہ حقیقتاً اسے کوئی کمی نہیں تھی لیکن تارڑ کو لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ میں سے ملنے والا کمیشن بند ہو جانے سے بڑا فرق پڑ گیا تھا۔ حرام منہ کو لگنے کے بعد صرف تنخواہ میں گزارہ مشکل لگتا تھا اس لیے اسے بڑی پریشانی تھی کہ کسی طرح پچھلا سیٹ اپ دوبارہ قائم ہو جائے۔

"لیاقت رانا سے تو میں نے گل نہیں کی۔ سوچا کچھ دن اور اُس بلونگڑے کو من مانی کرنے دوں۔ واپس آ کر دیکھ لوں گا، پر تسی فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" چودھری نے بے پروا سے انداز میں اسے تسلی دی۔

"آپ کہتے ہیں تو نہیں کرتے فکر۔ آپ امریکا جا کر گوریوں کے ساتھ انجوائے کریں۔ ہمارے لیے ذرا ڈاکٹر ماریا کو اشارہ کر جایئے گا، ہم بھی کچھ دن ادھوری میم کے ساتھ گزار کر غم دوراں کو بھولنے کی کوشش کر دیکھیں گے۔" تارڑ نے موقع دیکھ کر اپنی خواہش بیان کی۔ جب سے ڈاکٹر ماریا کو دیکھا تھا، اس کی طلب ستا رہی تھی لیکن چودھری کی اس پر خاص توجہ دیکھ کر اس کا مطالبہ کرنے کی ہمت نہیں ہو سکی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں کہہ دوں گا اس سے۔ آپ جیسے دوستوں کی کہی بات کیسے ٹالی جا سکتی ہے بھلا۔" چودھری کے جواب نے ایس پی کو خوش کر دیا۔

"تھینک یو چودھری صاحب! آپ سے مجھے یہی امید تھی۔ اچھا، اب اجازت دیجیے... اور ہاں، پلیز! آپ کی سیٹ کنفرم ہو جائے تو مجھے ضرور بتایئے گا۔ میں ایئرپورٹ تک آپ کو سی آف کرنے ضرور جاؤں گا۔"

"کیوں نہیں، میں آپ کو اطلاع کر دوں گا۔" تارڑ کو یقین دہانی کروانے کے بعد چودھری نے فون بند کر دیا اور ایک نوکر کو آواز دے کر بالے کو بھیجنے کا حکم دیا۔ ذرا دیر میں بالا اس کی خدمت میں حاضر تھا۔

"دیکھ بھئی بالے! تیری پچھلی ساری غلطیاں میں نے ماف (معاف) کر دی تھیں، پر اس واری جو کام تیرے سر لگا کر جا رہا ہوں اس میں کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے، ورنہ میرے کچھ کرنے سے پہلے تو آپ ہی مارا جائے گا۔ میرے پیچھے تو نے سارا کام وڈی صفائی اور ہشیاری سے کرنا ہوگا۔"

"تسی فکر ہی نہ کرو سرکار! میں سب سنبھال لوں گا۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ ڈیریکٹ (ڈائریکٹ) ایکشن کا موقع مل جائے۔ آپ نے وڈا چنگا فیصلہ کیا ہے کہ سیدھے سیدھے اے سی پر ہی ہتھ ڈالنے کا سوچا ہے۔ اب آپ دیکھیے گا کہ میں کیسے اس کا دماغ ٹھکانے لاتا ہوں۔ غیاثے کی دھی کا پتا تو وہ میرے دو ہاتھ کھا کر فوراً ہی اگل دے گا۔ میں تو اس کے کانوں کو ہتھ لگوا دوں گا۔ آپ اپنے منہ سے کسی لفڑے میں پڑنے سے توبہ کرے گا بلکہ آپ دیکھیے گا کہ ادھر سے بھاگ ہی نکلے گا۔" بالا حسب عادت سینہ پھلا کر چودھری کو یقین دہانی کروانے لگا۔

"زیادہ بھڑکیں نہ مار۔ مجھے تیری بھڑکیں نہیں سننی۔ کم (کام) دیکھنا ہے کم... بچوں کا کھیل نہ سمجھ اے سی کے اغوا کو۔ اس کے سارے مامے چاچے اسے ڈھونڈنے کے لیے کھڑے ہو جائیں گے۔ تجھے بہت صفائی سے کام کرنا ہوگا۔ رازداری کی وجہ سے میں نے ایس پی کو بھی یہ گل نہیں بتائی، پر اسے میرا ارادہ تو مالوم ہی ہے۔ سب سے پہلے تم لوگوں پر ہی شک کرے گا، پر اسے بھی ہوا نہ لگنے دینا۔ وہ میرا ساجھے دار سہی، پر آدمی کا کیا پتا چلتا ہے کہ کب دھوکا دے جائے۔" چودھری کی اپنی فطرت میں وفا نہیں تھی اس لیے وہ دوسروں پر بھی بھروسا نہیں کرتا تھا۔

"جیسا آپ کا حکم سرکار! آپ نے کہہ دیا تو سمجھیں کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوگی۔" بالے نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی۔

"اور ہاں، دیکھ... ڈاکٹر ماریا کا بھی دھیان رکھنا۔ ایسی کام کی چیز ہاتھ لگی ہے، اسے ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہیے۔

اپنے ایس پی کی رال ٹپک رہی ہے اس پر۔ میرے جانے کے بعد بس ایک واری ڈاکٹر ماریا کو اس کے پاس لے جانا۔ ایس پی بار بار ضد کرے تو اسے بہانے سے ٹال دینا۔ سمجھ رہا ہے نا میری گل؟" بالے کو مزید ہدایتوں سے نوازتے ہوئے چودھری نے اس سے پوچھا۔

"جی سرکار!"

"چنگی گل ہے۔ میرے پیچھے تجھے ہی یہ سب دیکھنا ہے۔ منشی زمینوں کے معاملات دیکھے گا اور تجھے یہ پھڈے نمٹانے ہوں گے۔ میں پندرہ ویں دن سے زیادہ نہیں لگاؤں گا امریکا میں۔ میرے آنے تک تجھے ماہ بانو کا پتا چلا کر اسے لانا بھی ہوگا اور سنبھال کر بھی رکھنا ہوگا۔ اس واری اسے ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہیے۔ اس کے پیچھے میں اتنا رسک لینے کو تیار ہوا ہوں۔ وہ نہ ملی تو میں جان نکال دوں گا تم ساروں کی۔"

چودھری نے بالے کو دھمکایا جس کے جواب میں ظاہر ہے اسے اپنی تابع داری کا یقین دلاتے ہوئے چودھری کو سب کچھ ٹھیک ہو جانے کی یقین دہانی ہی کروانی تھی۔

☆☆☆

"اچھا مریم! میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔ مجھے واپسی میں کافی دیر ہو سکتی ہے۔ تم ممی کو بتا دینا اور خود بھی آرام سے سو جانا۔" اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دینے کے لیے سجاد رانا نے خود پر ایک بار پھر پرفیوم چھڑکا اور بستر پر لیٹی ہوئی مریم سے کہتے ہوئے باہر کا رُخ کیا۔ سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے پہنچا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی بجتی گھنٹی نے اس کے قدم روک لیے۔

"ہیلو!" اس نے ریسیور اٹھا کر کانوں سے لگایا۔

"السلام علیکم سجاد بھائی! خیریت سے ہیں آپ؟" دوسری طرف شہریار تھا جو اس کی آواز سن کر خیر خیریت دریافت کرنے لگا۔

"میں ٹھیک ہوں، تم اپنی سناؤ۔" اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی اس کے پاس کچھ وقت تھا چنانچہ وہ شہریار سے بات چیت کر سکتا تھا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس ماموں جان سے ایک کام کے سلسلے میں بات کرنی تھی اس لیے فون کیا تھا۔ خوش قسمتی سے آپ کی آواز سننے کو مل گئی ورنہ آج کل جیسے حالات ہو رہے ہیں، مجھے اندازہ ہے کہ آپ کے پاس فرصت بالکل نہیں ہوگی۔ پچھلے دنوں بھابی سے بات ہوئی تھی تو انہوں نے بھی یہی بتایا تھا کہ آپ بہت مصروف ہیں۔"

"ہاں یار! مصروفیت تو بہت ہے اسی لیے میں مریم کو لے کر یہیں شفٹ ہو گیا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں اب کم از کم اسے بالکل تنہا نہیں رہنا پڑے گا۔" سجاد رانا کی آواز میں اداسی سی در آئی تھی مگر پھر اس نے خود کو فوراً ہی سنبھال لیا اور بشاش لہجے میں بولا۔ "تم سناؤ، کوئی نئی گڑبڑ تو نہیں کر دی جس سے نمٹنے کے لیے پاپا کی مدد کی ضرورت ہے؟"

"نہیں، فی الحال تو خاصا امن و امان ہے، بس ایک بندے کے سلسلے میں ماموں جان سے بات کرنی تھی۔ عابد انصاری نام ہے اس کا۔ مجھے کسی نے تجویز دی تھی کہ باجوہ کی جگہ اس شخص کو فاریسٹ آفیسر کی جگہ دلوا دوں تو اچھے نتائج سامنے آئیں گے۔ میں نے سوچا ماموں جان سے ڈسکس کر لوں اور اگر واقعی وہ اچھا آدمی ہے تو کوشش کر کے اسے اپنے علاقے میں لے آؤں۔" شہریار نے اپنے فون کرنے کی وجہ بتائی۔

"عابد انصاری تو کافی ٹھیک ٹھاک بندہ ہے۔ میری تھوڑی بہت واقفیت ہے اس سے۔ کبھی کسی قسم کی کرپشن کے سلسلے میں اس کا نام سننے میں نہیں آیا۔" اس نے شہریار کو بتایا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے، میں ماموں جان سے کہوں گا کہ بھرپور کوشش کر کے یہ بندہ مجھے دلوا دیں۔ میں اپنے علاقے میں جو تبدیلیاں چاہ رہا ہوں اس کے لیے مجھے ایک اچھی ٹیم کی اشد ضرورت ہے۔" سجاد رانا کی عابد انصاری کے سلسلے میں اچھی رائے نے اسے خوش کر دیا۔

"اللہ تمہیں تمہارے نیک مقصد میں کامیاب کرے۔ میں بھی جدوجہد میں لگا ہوا ہوں۔ شینا کے قاتل کی تلاش میں جانے کون کون سے انکشافات ہوئے ہیں مجھ پر۔ جن مختلف قسم کے سپلائرز کو معمولی غنڈے سمجھ کر ہم پولیس والے چھوٹ دیتے رہتے ہیں، انہی کے روپ میں کیسے کیسے خطرناک ایجنٹس چھپے بیٹھے ہیں، اس سے قبل اندازہ ہی نہیں تھا۔ جسم فروشی کی آڑ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت ہی بھیانک ہے۔ ٹیلی فون پر میں تمہیں زیادہ تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ ملاقات ہونے پر بتاؤں گا۔ ابھی تم پاپا سے اپنے کام کے سلسلے میں بات کر لو۔" سجاد رانا نے یک دم ہی اس سے گفتگو کا سلسلہ ختم کر کے کال لیاقت رانا کے بیڈ روم میں موجود ایکسٹینشن پر ٹرانسفر کر دی اور باہر نکل گیا۔

باوردی ڈرائیور گاڑی سمیت اس کا منتظر تھا لیکن وہ ڈرائیور یا کسی گارڈ کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ گارڈ اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن اس کے حکم کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتے ہوئے وہ جس مقام پر پہنچا وہ شہر کا ایک مشہور فائیو اسٹار ہوٹل

تھا۔ ریسپشن سے اس نے پہلے سے بک شدہ کمرے کی چابی لی اور لفٹ کے ذریعے کمرے میں جا پہنچا۔ یہ ایک ڈبل بیڈ کمرا تھا جہاں دنیا جہان کی آسائشات جمع کر دی گئی تھیں۔ وہ اس کمرے میں کسی سے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ اس ملاقاتی کے آنے تک وہ ٹی وی کے چینلز بدل بدل کر دیکھتا رہا لیکن درحقیقت اس کا ذہن کسی بھی پروگرام کی طرف توجہ دینے سے قاصر تھا۔ وہ اپنے متوقع ملاقاتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بالآخر انتظار کے یہ بوجھل لمحات کسی نہ کسی طرح گزر گئے اور کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

"یس کم اِن۔" اندرونی بے چینی کے باوجود اس نے خود اٹھ کر دروازے تک جانے کے بجائے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔ اس کی طرف سے اجازت ملتے پر دروازہ بے آواز کھلا اور ویٹر کے یونیفارم میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ہی جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ایک شولڈر کٹ ہیئر اسٹائل والی الٹرا ماڈرن لڑکی بھی تھی۔

"آپ کا کام کر دیا ہے سر! کوئی اور حکم ہو تو بولیں؟" لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ویٹر نے مؤدبانہ پوچھا۔

"نہیں۔ فی الحال اتنا کافی ہے۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا اور پرس سے ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ویٹر نے دانت نکالتے ہوئے نوٹ وصول کیا۔

"ریفریجریٹر میں دوسری کام کی چیزیں ہیں۔ آپ کو اور جانے کی سر! اس کے علاوہ کچھ چاہیے ہو تو روم سروس پر بتا دیجیے گا۔ میں خود پہنچا دوں گا۔" وہ ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ لڑکی جو ابھی تک کھڑی ہوئی تھی، دروازہ لاک کر کے پلٹی اور اس کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے روم ریفریجریٹر کی طرف بڑھ گئی۔ ریفریجریٹر سے آئس کیوبس اور ایک سربمہر بوتل نکال کر اس نے قریب ہی رکھی ایک ٹرے میں ترتیب سے رکھے۔ اس ٹرے میں نہایت نفیس کانچ کے دو گلاس پہلے ہی سے موجود تھے۔ ان خاص لوازمات سے سجی ٹرے اٹھائے وہ سجاد رانا کی طرف آئی۔ اس کی ہر حرکت میں بڑا توازن اور اعتماد تھا۔ وہ کال گرل کی حیثیت سے اس کمرے میں آئی تھی لیکن اس کے کسی انداز میں بازاری پن نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر بس کسی پڑھی لکھی الٹرا ماڈرن لڑکی کا خیال آتا تھا۔ سجاد رانا جو بہت عمیق نظروں سے اس کی ایک ایک جنبش کو نوٹ کر رہا تھا، کافی مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے مخبروں کی اطلاع پر جن لوگوں کو چیک کرنے کا فیصلہ کیا تھا، ان کے بارے میں یہی معلوم ہوا تھا کہ ان کے لیے کام کرنے والی لڑکیاں بے حد

نفیس ہوتی ہیں۔ اعلیٰ عہدے داروں اور سیاست دانوں کے ذوق کی تسکین کے لیے کسی عام بازاری عورت کا رکھ رکھاؤ رکھنے والی عورت سے گزارہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس قسم کی لڑکیوں کے سپلائرز کے طور پر جو نام سامنے آئے تھے، ان میں سے ایک اس فائیو اسٹار ہوٹل کا ویٹر بھی تھا۔ اس نے اپنے جس آدمی کے ذریعے ویٹر سے رابطہ کیا تھا، اس نے صاف لفظوں میں ویٹر کو بتا دیا تھا کہ لڑکی ڈی آئی جی صاحب کو درکار ہے اس لیے کوئی ایسی لڑکی ہونی چاہیے جو اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ وقت گزارنے کا ٹھیک ٹھاک تجربہ رکھتی ہو۔ کمرے میں موجود لڑکی کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ویٹر نے اس کی ڈیمانڈ پوری کرنے کا مکمل اہتمام کیا ہے۔

"سوری سر! میں نے آپ سے اجازت نہیں لی لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس وقت سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہوگی۔" ٹرے اس کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے نہایت مترنم لہجے میں کہا اور پھر بڑے سدھے انداز میں پیگ تیار کرنے لگی۔ ایک جام اسے تھمانے کے بعد دوسرا اس نے خود تھام لیا۔

"تھینکس! تمہاری ایفی شینسی دیکھتے ہوئے مجھے ابھی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ تمہارے ساتھ میرا وقت بہت اچھا گزرے گا۔" سجاد رانا کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ ابھری اور اس نے اسے تعریف سے نوازتے ہوئے جام سے ایک گھونٹ بھرا۔ وہ کوئی زاہد خشک نہیں تھا۔ پارٹیز میں دوستوں کے ساتھ ڈرنک کرنا ایک معمول کی بات تھی اور اس وقت تو وہ جو رول ادا کر رہا تھا اس میں شراب کے بعد شباب کی بھی باری آنی تھی۔

"تعریف کے لیے شکریہ سر! میرا کوئی کسٹمر کبھی مجھ سے ناخوش نہیں ہوا، آپ بھی مایوس نہیں ہوں گے۔" اس نے ایک ادا سے بال جھٹکتے ہوئے اسے جواب دیا اور نہایت نزاکت سے جام سے ایک گھونٹ بھرا۔

"میں نے سن رکھا ہے کہ بڑے بڑے لوگ تمہارے کسٹمرز میں شامل ہیں۔ آج ہمیں بھی یہ اعزاز حاصل ہو گیا۔" اس نے ٹھیٹ عاشقانہ لہجہ اپنایا۔

"اعزاز تو یہ ہمارے لیے ہے سر! ہماری ساری قدر و قیمت تو آپ کے دم سے ہے۔ اس روم سے باہر ہوں تو ہم کچھ بھی نہیں۔ لیکن ابھی آپ کے ساتھ ہیں تو ہوٹل کے معمولی ویٹر سے مالک تک جس سے بھی سامنا ہو جائے، وہ جھک کر عزت سے بات کرے گا ہمارے ساتھ۔" وہ واقعی اپنے پیشے کے اعتبار سے تربیت یافتہ تھی جسے اپنے گاہک کو غبارے کی

www.pkdigest.com

طرح ہوا بھر کر پھیلانا خوب آتا تھا۔

''تم تو کافی حساس اور ذہین خاتون لگتی ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ آج کے بعد بھی میرا تم سے بار بار ملنے کا جی چاہے گا۔''

سجاد رانا بھی اپنی حکمت عملی کے مطابق خوب چل رہا تھا۔

''بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ آپ ابھی تو ہم سے مل کر دیکھیں۔'' وہ یک دم جارحانہ موڈ میں آگئی۔ اپنے دماغ کو پوری طرح الرٹ رکھنے کے باوجود بھی سجاد رانا کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ لڑکی کسی بھی مرد کے ہوش و حواس چھین لینے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ گزرنے والے اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے لیے سخت آزمائش کے تھے۔ اس آزمائش سے کسی نہ کسی طرح گزرنے کے بعد جب اس نے اس حسین فتنے کو وہاں سے رخصت کیا تو اتنا اطمینان ضرور تھا کہ اس لڑکی کی صورت میں ایک ایسا راستہ دکھائی دے گیا ہے جس پر چلتے ہوئے وہ اپنے اصل ہدف تک پہنچ سکتا ہے۔

☆☆☆

سجاد رانا سے ہوٹل کے کمرے میں کال گرل کی حیثیت سے ملنے والی اس لڑکی کا نام جولیا تھا لیکن اپنے قدر دانوں میں وہ مس جولی کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ قیامت خیز حسن رکھنے والی مس جولی جب ہوٹل سے روانہ ہوئی تو اسے پورا یقین تھا کہ وہ سجاد رانا کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اس کامیابی کا مطلب تھا کہ اسے سجاد رانا سے مزید ملاقات کے مواقع بھی میسر آئیں گے۔ اس پہلی ملاقات میں تو اُس نے احتیاطاً اسے کسی حساس موضوع پر چھیڑنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ مبادا وہ چونک جائے لیکن اسے امید تھی کہ آئندہ دو چار ملاقاتوں میں وہ اسے کھولنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ یہی اس کا مشن بھی تھا۔ ہائی سوسائٹی میں موو کرنے والی کال گرل کا بہروپ اس نے کچھ خاص مقاصد کے حصول کے لیے ہی اپنایا تھا لیکن ابھی تک اُس کے کریڈٹ پر کوئی خاص کارنامہ موجود نہیں تھا۔ ابھی تک وہ ایک آدھ ہی اعلیٰ افسر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکی تھی اور وہ بھی ایسے نہیں تھے جن سے وہ بہت زیادہ کارآمد معلومات حاصل کر سکتی۔ اسے تو اس پر بھی حیرت ہوئی تھی کہ اسے سجاد رانا سے ملاقات کے لیے کیوں منتخب کیا گیا؟ حالانکہ اس کی طرف سے واضح طور پر خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ کوئی بہت ہی تجربہ کار لڑکی ہونی چاہیے۔ وہ تربیت یافتہ بھی لیکن عملی تجربہ اتنا زیادہ نہیں تھا پھر بھی اپنے بڑوں کی ہدایت پر اس نے سجاد رانا پر یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ اس سے پہلے بھی بہت سے اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ وقت گزار چکی ہے۔ اس نے اس کی بات پر یقین بھی کر لیا تھا اور اب وہ اس سے رخصت ہو کر بہت خوشی خوشی واپس جا رہی تھی۔ سجاد رانا کے مٹھی میں آجانے کا مطلب تھا کہ وہ اس سے بہت سے قیمتی راز اگلوانے میں کامیاب ہو جائے گی اور یہ کامیابی اسے اپنے آقاؤں کے سامنے سرخ رو کر کے اس کی ترقی کا سبب بن سکتی تھی۔ کامیابی کے نشے میں چور اپنے ٹھکانے کی طرف واپس لوٹتے ہوئے اسے قطعی اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ تعاقب کرنے والے کی مہارت نے بھی اس کے بے خبر رہنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ موجود ہونے کے باوجود اس کی نظروں سے اوجھل رہا تھا۔

جولی شہر کے پوش علاقے میں رہتی تھی۔ اس کے پاس اپنی ایک چھوٹی سی گاڑی بھی موجود تھی جسے وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی گاڑی کو ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے فلیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ڈرائیونگ کے دوران ہی اس نے گلو کمپارٹمنٹ میں رکھا ایک موبائل سیٹ نکالا اور اسے آن کیا۔ اس موبائل میں موجود سم ان ڈھیروں سموں میں سے ایک تھی جو اس نے اپنی دیگر ساتھیوں کی طرح غیر قانونی طور پر بھی حاصل کی تھیں۔ کال ٹریس ہونے کے خطرے سے بچنے کے لیے اسی سم کا استعمال سب سے محفوظ رہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے فلیٹ پر پہنچنے سے پہلے اپنی کارکردگی کی رپورٹ اوپر والوں کو دینا چاہتی تھی اسی لیے موبائل باہر نکالا تھا لیکن نمبر ملانے پر اس کا اپنے مطلوبہ نمبر پر رابطہ نہیں ہو سکا۔ موبائل کی اسکرین پر روشن ہونے والے NOT AVAILABLE کے الفاظ نے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا۔ باقی کا راستہ بھی وہ بار بار نمبر ملا کر دیکھتی رہی لیکن ہر بار ایک ہی نتیجہ سامنے آتا رہا۔ اسی الجھن میں مبتلا وہ اپنی منزل تک پہنچ گئی اور اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ ہوٹل سے یہاں تک اس کا تعاقب کرتے ہوئے آنے والا شخص اس کا فلیٹ نمبر جاننے کے بعد کب چپکے سے واپس بھی پلٹ گیا۔ اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد اس نے پہلے لاؤنج کی لائٹ روشن کی اور پھر بیڈ روم کی طرف بڑھی۔ بیڈ روم مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے سوئچ بورڈ پر موجود تیسرے بٹن کو بالکل صحیح اندازے کے ساتھ اس طرح دبایا جیسے دن کی روشنی میں اسے دیکھ رہی ہو۔ بٹن دبتے ہی کمرے میں ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی پھیل گئی لیکن اس روشنی میں اس کی نظر جس چہرے پر پڑی، اس نے اسے گنگ کر دیا۔

''مس گیتا آپ؟ میں تو خود آپ کو فون پر رپورٹ کرنے والی تھی لیکن آپ سے رابطہ ہی نہیں ہو سکا۔'' اس نے خود کو لگنے والے جھٹکے سے تیزی سے سنبھلتے ہوئے کرسی پر بیٹھی تقریباً اپنی ہم عمر لڑکی سے کہا۔ لڑکی کے ہم عمر ہونے کے باوجود جولی کے لہجے میں موجود احترام بتا رہا تھا کہ وہ اس سے سینئر ہے۔

''اچھا! کیا رپورٹ ہے تمہارے پاس؟'' گیتا نے تمسخرانہ لہجے میں اُس سے دریافت کیا۔

''ابھی تو پہلی ملاقات تھی لیکن میں سجاد رانا کو متاثر کرنے میں کامیاب رہی ہوں۔ اس نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ دوبارہ بھی مجھ سے ملنا پسند کرے گا۔ میرے خیال میں وہ اتنا متاثر ہو چکا ہے کہ ایک آدھ دن میں دوبارہ رابطہ ضرور کرے گا۔'' وہ جو سجاد رانا سے ملاقات کے بعد بہت پرجوش تھی، گیتا کو اپنے فلیٹ میں پا کر خاصی کنفیوز ہو گئی تھی اور کچھ رک رک کے انداز میں اپنی کارکردگی کے بارے میں اسے بتا رہی تھی۔

''میرے خیال میں تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ سجاد رانا تو تم سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ اس نے تمہارا ٹھکانا معلوم کرنے کے لیے تمہارے پیچھے اپنا آدمی بھی بھیج دیا ہے۔'' گیتا کے چبا چبا کر بولے گئے ان جملوں نے جولی کے چہرے پر خوف دوڑا دیا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے تردید کرنے کی کوشش کی۔

''ایسا ہی ہوا ہے لیکن تمہاری بے خبری سے ظاہر ہے کہ تم نے اپنی تربیت سے کچھ نہیں سیکھا۔ اگر ہم نے تمہاری نگرانی پر احتیاطاً اپنا آدمی نہ لگایا ہوتا تو تم اپنے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سوں کو مروا دیتیں۔'' گیتا کا لہجہ زہر خند ہو رہا تھا۔ جولی اپنا سر پکڑتی ہوئی بیڈ پر ڈھے سی گئی۔

''اتنی ناقص کارکردگی کا انجام معلوم ہے نا تمہیں؟'' گیتا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا جس کے جواب میں وہ محض سر ہی ہلا سکی۔

''تمہیں یاد ہوگا کہ ہم سب کی طرح تم نے بھی ''را'' میں شامل ہوتے وقت وچن دیا تھا کہ دیش کی خاطر جان بھی دینے سے نہیں ہچکچاؤ گی۔ اس وقت کی ناکامی کا داغ دھونے کے لیے تمہیں اپنا وہ وچن پورا کرنا ہوگا۔''

''کیسے؟'' وہ بہ مشکل گیتا سے یہ سوال کر سکی۔

''یہ رائٹنگ پیڈ اٹھاؤ اور اس پر لکھو کہ میں ایک کال گرل کی زندگی گزارتے گزارتے بیزار ہو گئی ہوں اس لیے اس زندگی سے چھٹکارا پانے کے لیے خودکشی کر رہی ہوں۔''

وہ کانپتے ہاتھوں سے گیتا کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔ گیتا کی آنکھوں میں لکھی اپنی موت وہ بہت اچھی طرح پڑھ رہی تھی۔ اگر اس کی بات ماننے سے انکار کرتی، تب بھی موت سے نہیں بچ سکتی تھی اس لیے بہتر تھا کہ اس کی بات مان لے۔ کم از کم اس پر دیش دروہی (غدار) ہونے کا الزام تو نہیں آتا۔

''ویری گڈ! اب لو، یہ دودھ پی کر اچھے بچوں کی طرح بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔'' وہ نوٹ لکھ کر فارغ ہوئی تو گیتا نے پہلے سے تپائی پر رکھے دودھ کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ جولی کو اندازہ تھا کہ ہوٹل سے اس کے تعاقب کا علم ہوتے ہی اس کے اوپر والے فوراً حرکت میں آگئے ہوں گے، تب ہی تو اس کے فلیٹ پر پہنچنے سے قبل گیتا اس کی موت کا ہرکارہ بن کر پہلے ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ دودھ کی شکل میں گلاس میں موجود اپنی موت کو گلے سے نیچے اتارتے ہوئے اسے اس سوال کا جواب بھی مل گیا تھا کہ سجاد رانا جیسے افسر کے لیے کسی منجھی ہوئی ایجنٹ کے بجائے اس کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ یقینی طور پر وہ لوگ سجاد رانا کی طرف سے پہلے ہی مشکوک تھے چنانچہ کسی قیمتی ایجنٹ کو ضائع کرنے کا رسک لینے کے بجائے انہوں نے جولی کو چارہ بنا کر سجاد رانا کے سامنے ڈال دیا تھا اور اب اسے دیش پریمی ہونے کا ثبوت دینے کے لیے خود اپنی موت کو اپنے وجود میں اتارنا پڑ رہا تھا۔

☆☆☆

''کیا خبر ہے سلطیا! کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں؟''

''گڑبڑ تو کافی تھی سر لیکن ہم نے معاملہ سنبھال لیا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ہم سجاد رانا کی ایکٹیویٹیز کے بارے میں پہلے ہی خاصے الرٹ تھے ورنہ بے خبری میں مارے جاتے۔ اسے یقیناً کہیں سے کلیو مل گیا تھا کہ ہماری ورکر لڑکیاں کال گرلز کے بھیس میں بھی کام کر رہی ہیں۔ کسی طرح وہ درمیانی آدمی تک بھی پہنچ گیا تھا۔ میں پہلے ہی سے الرٹ تھی اس لیے کسی خاص ورکر کے بجائے جولیا کو اس کے پاس بھیج دیا۔ جولیا کی نگرانی پر موجود بندے نے جیسے ہی یہ اطلاع دی کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے، میں نے فوری ایکشن لے لیا۔ ویٹر فدا حسین ڈیوٹی سے واپس جاتے ہوئے ایک ٹرک کی زد میں آکر مارا گیا ہے جبکہ جولیا کی موت آتما ہتھیا ظاہر کی گئی ہے۔ دونوں کام بالکل نیچرل طریقے سے کیے گئے ہیں لیکن ظاہر ہے، سجاد رانا چونک تو ضرور جائے گا۔ اسے ملنے والے کلیوز مٹانے کے لیے اپنے دونوں ورکرز کی بلی دینا ضروری ہو گیا تھا ورنہ آئندہ اس سے بھی زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا۔''

www.pkdigest.com

سنتھیا نے مؤدبانہ لہجے میں اسے مکمل رپورٹ پیش کی۔
”ورکرز کا پرابلم نہیں۔ ایسے نچلے درجے کے کام کرنے کے لیے تو بہت لوگ مل جائیں گے لیکن اصل مسئلہ سجاد رانا کا ہے۔ بیٹی کی موت نے اسے پاگل کر دیا ہے اور وہ ہر حال میں اس کے قاتلوں تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کے اس پاگل پن کی وجہ سے اچھا خاصا بنا بنایا سیٹ اپ خراب ہو گیا ہے۔ مجھے اپنے سارے لوگ انڈر گراؤنڈ کرنے پڑے ہیں۔ اب اگر وہ تمہاری ورکر لڑکیوں کے پیچھے پڑ گیا تو ہم اور بھی کٹھنائیوں کا شکار ہو جائیں گے۔“
”اگر آپ حکم دیں تو اسے خاموش کرنے کا بندوبست کیا جائے؟“ سنتھیا نے معنی خیز لہجے میں سوال کیا۔
”میرے خیال میں ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ ہماری... گڈلک ہے کہ ذاتی انتقام کے چکر میں پڑنے کی وجہ سے سجاد رانا نے ساری انفارمیشنز اپنی ذات تک ہی محدود رکھی ہیں۔ میں اپنے سورسز سے اس بات کی تصدیق کر چکا ہوں کہ سجاد رانا اپنی کسی بھی ایکٹیوٹی کو کسی ایجنسی کے ساتھ شیئر نہیں کر رہا ہے۔ پھر بھی خطرہ تو ہے کہ وہ ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ پہلے ہی پیر آباد اور اللہ آباد والے سیٹ اپ بگڑنے کی وجہ سے اوپر والے مجھ سے ناراض ہیں۔ تم سب کی تو پھر بھی بچت ہو جاتی ہے لیکن مجھے ڈائریکٹ جواب دینا پڑتا ہے۔ اوپر والے مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مسٹر ورما! تمہارے لوگ یہ کیسی غلطیاں کر رہے ہیں؟ میرے پاس شرمندگی کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا۔“ وہ خاصا خفا لگتا تھا۔
”لیکن سر! ہماری طرف سے تو آپ کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ پچھلے دنوں ہم نے اپنے دونوں ٹاسک کتنی کامیابی سے پورے کیے ہیں۔ یہاں کی ایجنسیز یہ تک معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں کہ ایکسپلوزیو آیا کہاں سے؟“ سنتھیا نے اپنی کارکردگی جتائی۔
”اس بات سے تو مجھے بھی انکار نہیں۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری ان کارروائیوں سے ہم حکومت کو ہلانے کے علاوہ سجاد رانا کا دھیان بھی بٹانے میں کامیاب رہیں گے۔ اصولاً موجودہ سچویشن میں اسے اتنا مصروف ہو جانا چاہیے تھا کہ اپنی بیٹی کی موت کے معاملے کو بھول جاتا لیکن وہ نہیں بھولا۔ ایسے لوگوں کے لیے یہی مناسب رہتا ہے کہ ان کا کوئی مستقل انتظام کر دیا جائے۔“ ورما نے گویا سجاد رانا کی موت کے پروانے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔
”آپ کہیں تو یہ کام بھی میں کر دوں سر؟“
”نہیں، فی الحال تو تم بھی احتیاط سے کام لو۔ یہ کام کرنے کے لیے دوسرے بندے ہیں میرے پاس۔“ ورما نے سختی سے انکار کیا تو سنتھیا کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔
”یہ بتاؤ کہ شہریار کے سلسلے میں کچھ ہوا یا نہیں؟ جوانی کے جوش میں وہ بہت پر پُرزے نکال رہا ہے۔ وہ ایکٹیو نہ ہوتا تو ہمارا پیر آباد اور اللہ آباد والا سیٹ اپ تباہ نہیں ہوتا۔ سالے اشیش کو اپنی بری عادت کی وجہ سے پیر آباد کی مسجد چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ دوسرے اگر وہ اسے بچی کا بچہ اس معاملے میں نہیں کودتا تو پولیس والے اتنی انٹیلی جنسی دکھا ہی نہیں سکتے تھے کہ مسجد کے حجرے کا فرش کھود کر بچے کی لاش نکال لیتے۔ پانڈے کی حماقت کے بارے میں بھی تمہیں معلوم ہے۔ اس نے نور پور میں بلاسٹ کے لیے غلط لڑکے کا سلیکشن کیا۔ لڑکے کا مدرسے سے تعلق ظاہر ہونے کے بعد یہ سمجھنا کون سا مشکل تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے کون تھا۔ وہ تو پانڈے کی لک اچھی تھی کہ وہ پہلے ہی نکل چکا تھا اور اشیش کو بھی نکلنے کا موقع مل گیا۔“
سنتھیا رینک کے اعتبار سے ورما سے نیچے تھی لیکن اس کی کارکردگی ہمیشہ اتنی اچھی رہی تھی کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ قابل بھروسا سمجھی جاتی تھی اس لیے ورما بھی اس کے سامنے یہ ساری گفتگو کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہا تھا۔
”آپ ٹینشن مت لیں سر! دھیرے دھیرے سب معمول پر آ جائے گا۔ شہریار کو بھی قابو کر لیا جائے گا۔ وہ اپنے ضلع کی ترقی کے جو خواب دیکھ رہا ہے، وہ ہرگز پورے نہیں ہوں گے۔ اس سلسلے میں ہمیں بہت زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ آدھا کام تو وہاں کا وڈیرا افتخار عالم ہی کر دے گا۔“ سنتھیا نے اسے تسلی دی اور اس کے کشیدہ اعصاب کو آرام دینے کے لیے وِسکی کا جام تیار کرنے لگی۔
کسی زمانے میں وہ اس لائق تھی کہ خود سے کئی سال چھوٹے ورما کو شراب کے ساتھ ساتھ شباب سے بھی مستفید کر سکے لیکن جوانی ڈھلنے کے بعد ورما کے لیے اس کے وجود میں کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اگر شباب سے لطف اندوز ہونا بھی چاہتا تو اس کا انتخاب سنتھیا کے بجائے اس کے انڈر کام کرنے والی کوئی شعلہ جوالا ہوتی تھی۔ ذہین اور سمجھ دار سنتھیا نے وقت کی اس تبدیلی کو آسانی سے قبول کر لیا تھا۔
☆☆☆
”رانی! تو نے میری ساری بات اچھی طرح سمجھ لی ہے نا؟ دیکھ، کوئی غلطی نہیں کرنا ورنہ مشکل ہو جائے گی۔“ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے گیلے بالوں میں برش

پھیرتی ہوئی کشور نے رانی سے کہا۔
”تسی فکر نہ کرو بی بی! میں سب سنبھال لوں گی۔“ سرخ کام دار دوپٹے کو احتیاط سے تہ کر کے ایک بیگ میں رکھتے ہوئے رانی نے جواب دیا اور پھر بڑی محویت سے کشور کی طرف دیکھنے لگی۔ آج وہ بڑی نکھری نکھری سی لگ رہی تھی۔ پچھلے دنوں کی کیفیت کہیں اندر چھپ گئی تھی اور اندر سے جو روپ نکلا تھا وہ بڑا ہی پیارا تھا۔ اس روپ کو مزید نکھار ایک مشہور پارلر کی ماہر بیوٹیشن نے دیا تھا۔ کل جب کشور نے اسے اچانک باہر چلنے کا حکم سنایا تھا تو وہ سمجھی تھی کہ بی بی ماسٹر آفتاب سے ملنے جا رہی ہیں لیکن اس کے اندازے کے برخلاف کشور اسے لبرٹی لے گئی تھی جہاں سے اس نے بڑی چھان پھٹک کے بعد سرخ عروسی جوڑا اور اس کی میچنگ کے زیورات وغیرہ خریدے تھے۔ لبرٹی سے وہ لوگ سیدھے ایک مشہور پارلر پہنچے تھے۔ اس پارلر کے بارے میں کشور کو اخبار میں چھپنے والے اشتہار کے ذریعے علم ہوا تھا۔ پارلر میں کشور نے اگلے دن کی بکنگ کروانے کے ساتھ بیوٹیشن کے مشورے پر ضروری فیس ٹریٹمنٹ بھی کروایا تھا اور ہاتھ پیروں پر مہندی بھی لگوائی تھی۔ مہندی کو ڈرائیور کی نظروں سے چھپانے کے لیے وہ پارلر سے خود کو بہت اچھی طرح چادر میں لپیٹ کر کوٹھی واپس آئی تھی۔ کوٹھی واپس پہنچنے کے بعد کل سے آج تک کا سارا وقت اس نے اپنے کمرے میں ہی گزارا تھا کہ مبادا کوٹھی میں کام کاج کرنے والی چوکیدار کی بیوی نہ چونک جائے۔ کھانے پینے کا سامان رانی نے اسے کمرے میں ہی مہیا کر دیا تھا۔ کل سے اب تک وہ کشور کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لیتی رہی تھی۔ آفتاب سے ملنے جانے کے لیے وہ ہمیشہ ہی بڑی پُرجوش نظر آتی تھی لیکن آج تو معاملہ ہی الگ تھا۔ آج وہ صرف محبوبہ بن کر نہیں بلکہ منکوحہ کی حیثیت سے جا رہی تھی۔ اس کے انگ انگ سے چھلکتی مستی اس کی اندرونی کیفیت کے راز افشا کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر سجا حیا آلود تبسم بالکل ویسا ہی تھا جو بابل کے آنگن سے رخصت ہو کر پی کے نگر جانے والی دلہن کے چہرے پر کھیلتا ہے۔
”کیا دیکھ رہی ہے رانی؟“ اس کی محویت کو محسوس کر کے کشور نے اس سے پوچھا۔
”دِل نظروں سے آپ کی بلائیں لے رہی ہوں بی بی! آج تو آپ اتنی پیاری لگ رہی ہیں کہ آپ کے چہرے سے نظر ہٹانے کو من ہی نہیں کرتا۔“
”اچھا۔“ اس کی بات سن کر کشور خوش گوار انداز میں ہنسی۔ ”سوچ لیں ماسٹر صاحب! آج ہم آپ کے ہوش اڑا کر رکھ دیں گے۔ ابھی تو کچھ تیاری کی ہی نہیں تو رانی کی ہمارے بارے میں یہ رائے ہے، جب ہم مکمل تیاری کے ساتھ آپ کے روبرو ہوں گے تو آپ کیا کریں گے؟“ آنکھ کی چلمنوں سے آئینے میں اتر آنے والے آفتاب کے عکس کو دیکھتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں اسے چیلنج کیا اور پھر خود ہی شرما گئی۔
”شریف سے بول رانی کہ گاڑی نکالے۔ میں بھی آ رہی ہوں۔“ رخساروں پر اترتی سرخی کو رانی سے چھپانے کے لیے اس نے بہانے سے اسے کمرے سے باہر بھیجا اور تھوڑی دیر بعد خود بھی بڑی سی چادر میں اس طرح لپٹ کر کہ سوائے آنکھوں کے جسم کا کوئی عضو نظر نہیں آ رہا تھا، کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے سامان والا بیگ رانی پہلے ہی ساتھ لے گئی تھی۔ پورٹیکو میں رانی اور ڈرائیور دونوں اس کے منتظر تھے۔ شریف نامی یہ ڈرائیور گاؤں سے ان کے ساتھ ہی یہاں آیا تھا۔ اس سے قبل جب کشور انڈسٹریل ہوم کی افتتاحی تقریب چھوڑ کر بہانے سے آفتاب سے ملنے اس کے گاؤں والے گھر میں گئی تھی، تب بھی یہی ڈرائیور ان کے ساتھ تھا۔ وہ ان کا مکمل رازداں نہیں تھا لیکن جتنا دیکھتا تھا، اسے بھی قیمت وصول کرنے کے بعد بھول جاتا تھا۔ کشور کی حالیہ مصروفیات پر بھی اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور صرف حکم کا غلام بنا عمل کر رہا تھا۔
”مجھے پارلر میں کافی دیر لگ جائے گی رانی! مجھے وہاں پہنچانے کے بعد تو شریف کے ساتھ کوٹھی واپس چلی جانا اور جائزہ کا کام میں ہاتھ بٹانا۔ میرے ساتھ پارلر میں بیٹھ کر تو تجھے مکھیاں مارنے کا کام بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ میں دو ڈھائی گھنٹے بعد یا جب بھی فارغ ہوں گی، تجھے کوٹھی پر فون کر دوں گی۔ تو شریف کے ساتھ آ کر مجھے لے جانا۔“ طے شدہ منصوبے کے تحت راستے میں کشور نے بہ آواز بلند رانی کو حکم دیا۔ اصل مقصد ڈرائیور کو سنانا تھا۔
پارلر میں داخل ہو کر کشور نے پہلے اپنا سامان ایک مددگار لڑکی کے سپرد کیا، پھر اپنے موبائل سے آفتاب کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔
”آخر آپ کو ہماری یاد آ ہی گئی؟“ کال ریسیو کرتے ہی اس نے شکوہ کیا۔
”یاد آنے کے بارے میں نہ پوچھیے۔ جن کا خیال دل سے جدا ہی نہ ہوتا ہو، انہیں یہ شک ہو کہ ہم انہیں یاد کرنے کے لیے بھی فرصت کی تلاش کرتے ہیں... تو دل بڑا دکھتا ہے۔ ہم تو بس اپنا وعدہ نبھانے کی کوشش میں لگے ہوئے

www.pkdigest.com

تھے۔ کہا تھا کہ اب جب کبھی ملیں گے تو اس طریقے سے ملیں گے جو طریقہ ہمارے رشتے کے شایانِ شان ہو۔ ہم اپنا وعدہ نبھانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ بتائیں، دو گھنٹوں کے اندر آپ ایسی کسی جگہ کا انتظام کر سکتے ہیں جہاں ہم آپ سے ملنے آسکیں؟" اس نے آفتاب کے شکوے کا بھرپور جواب دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"جگہ کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اپنے دوست کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔ آپ بتائیں کہ یہاں کیسے پہنچیں گی؟ آپ چاہیں تو میں آپ کو لینے آجاتا ہوں... بتائیں کہاں ملیں گی؟" وہ سارے گلوے شکوے بھول کر اس سے ملنے کے خیال سے جوش میں آگیا۔

"بتائیں گے... ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ بس دو گھنٹے تک انتظار کیجیے پھر آپ کو جگہ بھی بتا دی جائے گی۔" اس کی بے قراری سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کشور نے شرارت سے کہا اور لائن کاٹ دی۔ اس کا خیال تھا کہ آفتاب دوبارہ کال کر کے اس سے بات کرنے کی کوشش کرے گا لیکن تیاری کے طویل مرحلے سے گزرتے ہوئے ایک بار بھی اس کے موبائل کی گھنٹی نہیں بجی۔ آفتاب کی اس بے اعتنائی پر وہ دل ہی دل میں روہانسی ہونے لگی۔

بیوٹیشن نے اسے مکمل تیار کر کے آئینے کے سامنے کھڑا کیا تو اس وقت تک وہ عجیب سے تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ جس شخص نے پلٹ کر دوبارہ پوچھا بھی نہیں اس کے لیے اتنی تیاری کرنی بھی چاہیے تھی کہ نہیں؟ وہ ابھی اسی سوچ میں گھری کھڑی تھی کہ خاموش موبائل بول پڑا۔ کال کرنے والا آفتاب کے سوا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"امتحان کے دو گھنٹے گزر گئے ہیں محترمہ! اب فرمایئے کہ کہاں حاضر ہوں؟" اس کی شوخ زندگی سے بھرپور آواز نے کشور کے تنِ مردہ میں بھی جان ڈال دی۔ اس نے فوراً آفتاب کو اس پارلر کا پتا بتایا جہاں وہ اس وقت موجود تھی۔

"بس دس منٹ انتظار کیجیے۔ میں پہنچتا ہوں۔" اس نے جواب دیا اور واقعی دس منٹ بعد وہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ پارلر سے نکلنے سے پہلے کشور نے پہلے ہی کی طرح خود کو چادر میں چھپا لیا تھا لیکن سجی بنی دلہن اور گلاب کے پھول کی یہی تو خاصیت ہوتی ہے کہ چھپانے کے باوجود ان کی مہک چھپ نہیں پاتی۔ آفتاب نے بھی اس کی تیاری بھانپ لی تھی اور زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔

"لگتا ہے آج آپ مجھے سرپرائز دینے کے موڈ میں ہیں۔" گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ساتھ بیٹھی کشور کو چھیڑا۔ جواباً وہ خاموش رہی۔ آفتاب نے بھی راستے بھر مسکراتے رہنے کے سوا اس سے دوسری کوئی بات نہیں کی۔ دس منٹ بعد وہ اپنے دوست کے دو منزلہ مکان کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ دروازے پر گاڑی روک کر اس نے ہارن دیا تو تقریباً اسی کے ہم عمر ایک مرد نے گیٹ کھول دیا۔ آفتاب کھلے گیٹ سے گاڑی اندر لے گیا۔ سامنے ہی ایک بے حد گوری اور فربہ سی خاتون کے ساتھ دو چھوٹے بچے کھڑے ہوئے تھے۔ آفتاب گاڑی سے اتر کر اس کی سائڈ والے دروازے پر آیا اور اسے ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے اتارا۔ وہ جو اسے سرپرائز دینے کے لیے آئی تھی، اب شرم و حیا اور گھبراہٹ کے مارے باقاعدہ کانپ رہی تھی۔ رہی سہی کسر اس وقت پوری ہو گئی جب استقبال کے انداز میں کھڑی خاتون اور بچوں نے پہلے اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں اور پھر خاتون نے ایک موٹا سا ہار اس کے گلے میں ڈال کر اسے خود سے لپٹا کر پیار کیا۔

"بڑی ایمرجنسی میں آئی ہو دیورانی صاحبہ... اس لیے اگر کوئی کمی رہ جائے تو نظر انداز کر دینا۔" اسے گلے سے لگائے لگائے ہی خاتون نے کہا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کی طرف لے گئیں۔ دونوں بچے بھی ساتھ ساتھ تھے۔ خاتون کشور کو ایک کمرے میں لے جانے لگیں تو بچوں میں سے ایک نے احتجاج کیا۔

"یہ کیا ممی! کیا دلہن ہمارے ساتھ ڈنر نہیں کرے گی؟"

"نہیں، دلہن ہمارے ساتھ نہیں بلکہ اپنے دولہا کے ساتھ ڈنر کرے گی۔" خاتون نے بچے کو جواب دیا اور کشور کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بولی۔ "مجھے اندازہ ہے کہ تم زیادہ وقت کے لیے یہاں نہیں رک سکو گی اس لیے تمہیں اور آفتاب کو ایک ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کا موقع دینے کے لیے میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ تم لوگ کھانا اپنے کمرے میں ہی کھالو۔ ہمارا آپس میں تفصیلی تعارف اور ملاقات بعد میں ہو جائے گی۔ ابھی تم بس یہ سن لو کہ آفتاب، افضل کو اپنے سگے بھائیوں کی طرح عزیز ہے اور اس کے حوالے سے تم بھی ہمارے لیے اتنی ہی اہم ہو۔ ہمیں بھی غیر مت سمجھنا۔" خاتون کے پرخلوص جملے کو سنتے ہوئے وہ کمرے کے اندر داخل ہوئی تو مبہوت رہ گئی۔ پورا کمرا پھولوں سے بھرا ہوا تھا اور لگتا تھا کہ نئی دلہن کے استقبال کے لیے بانہیں پھیلائے کھڑا ہو۔

"یہ سارے پھول آفتاب خرید کر لایا تھا۔ میں نے اور افضل نے اس کے ساتھ مل کر انہیں ڈیکوریٹ کیا ہے۔"

خاتون نے اسے اطلاع دی تو وہ مسکرا دی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دو گھنٹے جو اس نے پارلر میں گزارے تھے، ان میں آفتاب بھی بہت مصروف رہا تھا۔

خاتون اسے کمرے میں پہنچا کر بچوں سمیت باہر نکلیں تو فوراً ہی آفتاب چلا آیا۔ خوشی اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بن کر کھیل رہی تھی۔ گاڑی میں تو وہ حیا کی وجہ سے دھیان نہیں دے سکی تھی لیکن اب اس نے دیکھا تھا کہ وہ اپنے ہمیشہ والے لباس سے ہٹ کر بہت خوب صورت آف وہائٹ رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس ہے۔

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ کس انداز سے ملنے کے لیے آرہی ہیں۔ دو گھنٹے کے مختصر وقت میں بڑی بھاگ دوڑ کر کے یہ سارا انتظام کیا ہے۔ افضل اور مہتاب بھابی نے بھی میرا بڑا ساتھ دیا ورنہ آپ کے سرپرائز کے مقابلے میں ہماری ادھوری تیاری تو ہمیں آپ کے روبرو شرمندہ کروا دیتی۔" کشور کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے گفتگو کا آغاز کیا اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے جگر جگر کرتے ہوئے نگینوں سے مرصع نازک سی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔

"جس دن سے نکاح ہوا ہے اسے جیب میں لیے گھوم رہا تھا کہ جیسے ہی موقع ملے حق، حق دار تک پہنچا دیا جائے۔" خوشی سے بوجھل لہجہ کشور کو یقین دلا رہا تھا کہ اس نے ناحق اس شخص تک پہنچنے کے لیے اتنا کشٹ نہیں اٹھایا۔ وہ واقعی اس کا سچا قدردان تھا... بالکل اس جوہری کی طرح جس کے ہاتھوں میں آکر غیر تراشیدہ ہیرے کی قسمت جاگ اٹھتی ہے۔ اس نے بھی بہ خوشی اپنا آپ اپنے قدر شناس جوہری کو سونپ دیا۔

☆☆☆

"تو بی بی کے ساتھ ہی رک جاتی تو اچھا تھا۔" گاڑی واپسی کے راستے پر ڈالتے ہوئے شریف نے رانی سے کہا۔

"کیسے رک جاتی؟ سنا نہیں تھا تو نے کہ بی بی نے آپ مجھے کوٹھی واپس جانے کا حکم دیا تھا۔" شریف کی بات کے جواب میں رانی چمک کر بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے، پر مجھے وڈے چودھری صاحب سے ڈر لگتا ہے۔ کیا خبر انہیں بی بی کا اس طرح اکیلے کوٹھی سے باہر کہیں رہنا اچھا نہ لگے۔" وہ تذبذب کا شکار تھا۔

"اس سے ہمیں کیا؟ ادھر تو بی بی ہی ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں ان کا ہی حکم ماننا ہوگا۔ ویسے بھی وڈے چودھری کو خبر کیسے ہو گی اس گل کی... کیا تو بتائے گا انہیں؟" بے نیازی کا مظاہرہ کرتے کرتے اس نے اچانک معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"میں کیوں لوڑ پڑی ہے؟ میں تو بی بی کے خیال سے ہی کہہ رہا تھا۔" وہ برا مان کر بولا۔ پھر باقی کے راستے میں اس کے اور رانی کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ کوٹھی واپس پہنچنے کے بعد رانی چوکیدار کی بیوی حاجرہ کے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی۔ کاموں کے دوران ڈیڑھ پونے دو گھنٹے کا دورانیہ تیزی سے گزر گیا۔ کام کرنے کے ساتھ ساتھ حاجرہ سے باتوں میں مصروف رانی کا ذہن وقت کا حساب کتاب بھی کر رہا تھا۔ پونے دو گھنٹے گزرنے کے بعد اس نے چولہے پر چائے کا پانی چڑھا دیا۔

"باورچی خانے کا باقی کام میں دیکھ لوں گی حاجرہ... تو ذرا مہربانی کر کے بی بی کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر دے۔ بی بی نے گھر سے نکلتے ہوئے مجھے حکم دیا تھا، پر میں بھول گئی۔ تو جلدی سے یہ کام کر آ پھر مل کر چائے پیتے ہیں۔" چائے کا پانی کھولنے لگا تو اس نے بہانے سے حاجرہ کو وہاں سے ہٹایا۔ وہ اس کی بات مان کر باہر نکل گئی تو اس نے جلدی سے چائے تیار کر کے پہلے ایک پیالی میں اپنے لیے نکالی پھر باقی کی چائے میں اپنے گریبان میں چھپا کر رکھی پڑیا نکال کر اس میں موجود گولیاں الٹ دیں۔ یہ یقین ہونے کے بعد کہ گولیاں چائے میں پوری طرح حل ہو چکی ہیں، اس نے چائے کو تین پیالیوں میں الٹا اور کپ ٹرے میں رکھ کر باہر نکل گئی۔ سب سے پہلے اس نے گیٹ پر موجود چوکیدار کو چائے پہنچائی پھر شریف کے کوارٹر میں پہنچ گئی۔

"لے بھائی شریف! چائے پی لے۔ بی بی کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں ابھی آدھا گھنٹا ہور لگے گا۔ تو چائے پی کر تھوڑی دیر آرام کر لے۔ فیر ہم انہیں لینے چلیں گے۔"

"چنگا ہے۔" شریف نے اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ "ایک گل سمجھ نہیں آرہی۔ یہ اچانک ہی بی بی کو بننے سنورنے کا اتنا شوق کیوں چڑھ گیا کہ روز روز پولر (پارلر) جانے لگیں؟"

"کیوں، بی بی انسان نہیں ہیں کیا جو ان کا دل کسی چیز کو نہیں چاہ سکتا؟ ویسے بھی تجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت کیا ہے؟ تو اپنے کام سے کام رکھ۔" براہِ راست مخاطب نہ کیے جانے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ شریف نے اسی سے سوال کیا ہے اس لیے اسے ٹوک کر باہر نکل گئی۔ سامنے ہی حاجرہ چلی آرہی تھی۔

"کر دی صفائی؟ چل آ تیرے کوارٹر میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ تھوڑی گپ شپ بھی لگائیں گے۔" حاجرہ کو لے کر وہ اس کے کوارٹر میں چلی گئی۔ اپنی اپنی چائے پیتے ہوئے وہ

www.pkdigest.com

دونوں باتیں بھی کرتی رہیں۔ چائے ختم ہوتے ہی ماجرہ جماہیاں لینے لگی۔

"آج پتا نہیں کیوں ابھی سے نیند آنے لگی؟" منہ پر ہاتھ رکھ کر جماہی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے ماجرہ نے کہا۔

"تھک گئی ہوگی۔ تھوڑا آرام کرلے۔ میں بھی چلتی ہوں۔ ابھی شریف کے ساتھ بی بی کو لینے بھی جانا ہے۔" اسے مشورہ دے کر وہ کوارٹر سے باہر نکل گئی۔ گولیوں کی اثر انگیزی کے بارے میں اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ ان گولیوں کی مدد سے تو وہ حویلی میں موجود ملازموں اور مالکان کی بڑی تعداد کو غافل کرنے میں کامیاب ہوجاتی تھی۔ یہاں صرف تین بندوں سے نمٹنا کیا مشکل تھا؟ چائے کی ٹرے باورچی خانے میں رکھ کر وہ گیٹ کی طرف آئی۔ چوکیدار کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

"نیند آرہی ہے تو اندر اپنے کوارٹر میں جاکر سو جاؤ۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد ڈیوٹی پر واپس آجانا۔" چوکیدار کا شانہ ہلا کر اس نے اسے یہ مشورہ دیا تو وہ اونگھتا ہوا اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ اب رانی کو اطمینان تھا۔ صبح حسب پروگرام کشور رانی سمیت اُن تینوں کو اپنے سامنے بلا کر ان کی غیر ذمے داری پر ڈانٹ بھی پلاتی اور یہ بھی ظاہر کرتی کہ کوٹھی پر کسی ملازم سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے رات اسے مجبوراً ٹیکسی سے تنہا واپس آنا پڑا۔ ملازم اس صورتِ حال پر مشکوک تو ضرور ہوتے لیکن ظاہر ہے وہ مالکن سے بحث نہیں کرسکتے تھے۔ رانی بھی مالکان کی چہیتی ہونے کی وجہ سے محفوظ رہتی۔

ہر طرف سے مطمئن رانی کوٹھی میں کشور کے زیرِ استعمال کمرے میں چلی آئی۔ یہاں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ وہ احتیاطاً رات جاگ کر گزارنا چاہتی تھی چنانچہ ایک کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ اردو کے اس دلچسپ ناول میں کھوئے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ گیٹ پر کسی گاڑی کا زوردار ہارن سنائی دیا تو وہ چونکی اور پھر کتاب چھوڑ کر بھاگتی ہوئی گیٹ کی طرف دوڑی۔ خیال تھا کہ کشور واپس آئی ہوگی۔ اپنے اسی خیال کے سبب اس نے بے دھڑک گیٹ کھول دیا لیکن سامنے موجود گاڑی اور اس میں سوار افراد کو دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ گاڑی میں تاجور اور اس کا شوہر اشرف بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے گیٹ کھلا وا کیا تو گاڑی تیزی سے اندر آگئی۔ کانپتے ہاتھوں سے گیٹ بند کرکے رانی تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھی اور پچھلی نشست پر بیٹھی تاجور کی گود میں سر رکھ کر سوئے ہوئے منور کو اپنی گود میں لے لیا۔

"چوکیدار کہاں مر گیا ہے جو تجھے گیٹ کھولنا پڑا؟" اشرف نے سخت لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"اس کی طبیعت وڈی خراب ہے جی۔ اپنے کوارٹر میں پڑا لوٹ رہا ہے۔" حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اس نے چوکیدار کی گیٹ سے غیر حاضری کا بہانہ بنایا اور بچے کو لیے ہوئے کوٹھی کے اندرونی حصے میں ایک کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ حویلی سے یہاں چودھری کے علاوہ کبھی کبھار ہی کوئی آتا تھا لیکن سارے کمرے ہر وقت صاف ستھرے اور تیار رہتے تھے۔ ان کمروں میں سے ہی ایک میں اس نے تاجور کے بیٹے کو پہنچا کر آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ تاجور خود بھی پیچھے ہی چلی آئی۔

"آپ لوگوں کے لیے کھانا لگاؤں بی بی؟" رانی نے اس سے مؤدبانہ پوچھا۔

"نہیں، کھانا ہم کھا کر آئے ہیں۔ اشرف کے ایک دوست کی شادی تھی یہاں، اسی میں شرکت کرکے آرہے ہیں۔" تاجور نے اسے جواب دیا۔

"تو فیر میں آپ لوگوں کے لیے دودھ لے کر آتی ہوں۔" ایک تو اسے معلوم تھا کہ حویلی سے تعلق رکھنے والے سارے افراد رات سونے سے پہلے دودھ پینے کے عادی ہیں، دوسرے وہ زیادہ دیر تاجور کے سامنے ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی کہ مبادا وہ کشور کے بارے میں کوئی سوال نہ کرلے اس لیے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ کمرے سے باہر نکلنے کے بعد اس نے سیدھا باورچی خانے کی طرف جانے کے بجائے نشست گاہ کا رخ کیا۔ ٹیلی فون سیٹ یہیں رکھا ہوا تھا۔ اسے کشور کو فون کرکے اس نئی صورتِ حال کے بارے میں خبر دینی تھی۔ ایسی ہی کسی ایمرجنسی کے لیے ذہن نشین کروایا ہوا کشور کا موبائل نمبر ڈائل کرکے وہ بیل جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اس وقت اس پر ایسی گھبراہٹ طاری تھی کہ سیکنڈ کا ہزارواں حصہ گزارنا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ جیسے ہی پہلی بیل جانے کی آواز سنائی دی، اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہونے لگی۔

"اس وقت کسے فون کررہی ہے؟" عقب سے سنائی دینے والے اس سوال پر وہ اس بری طرح اچھلی کہ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ نیچے پڑے ریسیور پر سے نظر ہٹا کر اس نے اپنے پیچھے کی طرف دیکھا۔ ماتھے پر ڈھیروں شکنیں سجائے چودھری اشرف شاہ اسے خشونت بھری نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

حادثات و سانحات کی شکار .. پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

پیٹس شولینڈر منشیات کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ وہ جنوبی امریکا سے کوکین اور افیون جبکہ ایشیائی ممالک سے چرس اور ہیروئن منگوا کر اپنے گاہکوں کو سپلائی کرتا تھا لیکن اس کے گاہک یہ منشیات خود استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ مزید آگے فروخت کردیتے تھے۔ اس کے گاہکوں میں فلمی ستارے تک شامل تھے۔

بیورلی ہلز میں اس کا وسیع و عریض بنگلا تھا اور شہر میں کئی عالی شان عمارتیں اس کی ملکیت تھیں۔ اسے ایسی تقریبات میں مدعو کیا جاتا تھا جہاں سینیٹرز اور معروف فلمی ستاروں سے کم رتبہ لوگ شریک نہیں ہوسکتے تھے اور یہ لوگ پیٹس کے گرویدہ پروانہ وار منڈلاتے تھے جیسے وہی سب سے بڑا فلمی ستارہ یا سیاست داں ہو۔

اس کی آؤ بھگت تعجب خیز بات نہیں تھی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ سب جانتے تھے، وہ منشیات کا بین الاقوامی اسمگلر ہے اور پورے امریکا میں ہر سال لاکھوں افراد منشیات کے استعمال سے موت کے گھاٹ اتر جاتے تھے، اس میں پیٹس کا حصہ فیصد کے حساب سے دُہرے عدد میں آتا تھا۔

پیٹس شولینڈر کا حریف اینگلس کوز منشیات فروش نہیں تھا لیکن وہ بھی موت کا بیوپاری تھا۔ وہ اسلحہ فروخت کرتا تھا۔ اگرچہ امریکا میں اسلحہ خریدنے اور اپنے پاس رکھنے پر کوئی پابندی

بلامعاوضہ

ثمر عباس

خود اعتمادی اور یقین دو ایسی فولادی قوتیں ہیں جو انسان کو ہر محاذ پر کامیابی سے ہمکنار کرادیتی ہیں ...... ایک ایسے ہی شخص کی صفات جو ذہانت کی دولت سے بھی مالا مال تھا ...... ناممکن کو ممکن بنا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے ایک بے تاج بادشاہ کے انوکھے کارنامے

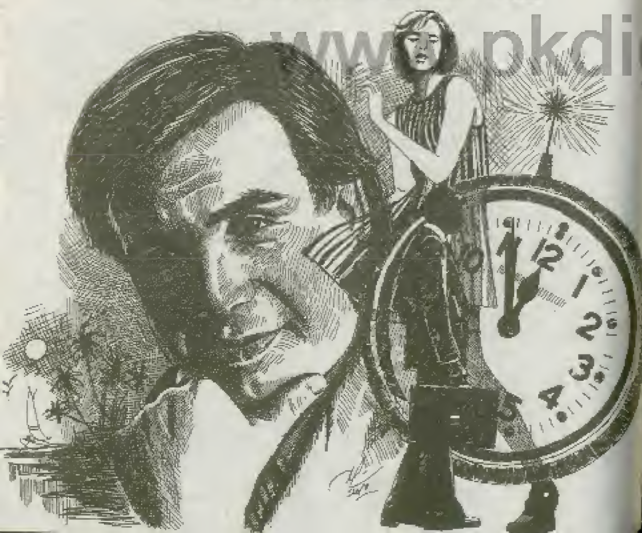

www.pkdigest.com

نہیں۔ عام شہری بھی مشین گن اور اسنائپر شاٹ جیسے مہلک ہتھیار رکھ سکتا ہے۔ ٹنوں کے حساب سے ڈائنامیٹ اور دوسرے دھماکا خیز مادے رکھ سکتا ہے لیکن اس میں ایک قباحت ہے کہ اس کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور کسی بھی قسم کی بے ضابطگی کی صورت میں پکڑے جانے میں زیادہ دیر نہیں لگتی... کیونکہ ریکارڈ سے پتا چل جاتا ہے کہ کون سی چیز کس کے پاس ہے۔

اس لیے جرائم پیشہ افراد کے لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس ایسے ہتھیار ہوں جن کا کہیں اندراج نہ ہو اور وہ انہیں بے دھڑک اپنے مخالفین پر استعمال کر سکیں۔ ان کی اس مشکل کا حل ہنگس گوز کے پاس تھا۔ ہنگس گوز بظاہر ایک قانونی ہتھیار فروش فرم کا مالک تھا جو نہ صرف دوسرے کارخانوں کا تیار کردہ اسلحہ فروخت کرتی تھی بلکہ اس کے اپنے بھی اسلحہ بنانے کے کارخانے تھے۔ ہنگس کی فرم ہر سال کروڑوں ڈالرز مالیت کا قانونی اسلحہ فروخت کرتی تھی۔ اگر وہ قانونی طریقے سے حاصل کی گئی دولت پر گزارہ کرتا، تب بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مگر یہ دولت ہنگس کا پیٹ بھرنے کے لیے ناکافی تھی اس لیے اس نے ایک اور راستہ اختیار کیا۔ اس کے کارخانوں میں ایسا اسلحہ بننے لگا جس پر کوئی نشان یا نمبر نہیں ہوتا اور ضرورت مندوں کو یہ اسلحہ عام قیمت سے کئی گنا زیادہ قیمت پر فراہم کیا جانے لگا۔ اس سے ہنگس کی آمدنی میں کئی گنا اضافہ ہوا۔ پھر وہ دوسرے کارخانوں کا ایسا اسلحہ فروخت کرنے لگا اور اسے بہت معقول کمیشن ملنے لگا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ہنگس کا کاروبار ترقی کرتا رہا۔ فی زمانہ جو کاروبار مسلسل ترقی کی جانب گامزن ہے وہ اسلحہ سازی کا کاروبار ہے۔ خام دھات کی صورت میں ایک ڈالر فی کلو گرام ملنے والا لوہا جب کسی پستول یا رائفل کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس کی مالیت میں یک دم ہی ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اتنا نفع تو منشیات کی تجارت میں بھی نہیں ہوتا۔

منشیات میں جس چیز کا آغاز ایک ہزار ڈالرز سے ہوتا ہے، وہ ایک لاکھ ڈالرز تک میں انجام پذیر ہوتی ہے... گویا نفع کی شرح صرف سو گنا ہے اور خطرے کی شرح اتنی ہی ہے جتنی کہ اسلحہ فروشی کے کام میں ہوتی ہے۔ منشیات فروخت کرنا اسلحہ فروخت کرنے سے کہیں زیادہ سنگین جرم ہے جبکہ اسلحے سے ہونے والی اموات کے مقابلے میں منشیات سے ہونے والی اموات کہیں کم ہیں۔ اس کے باوجود اسلحے کی اسمگلنگ پر نہ تو اتنی توجہ دی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی روک تمام حکومتوں کے پروگرام میں شامل ہے۔ بظاہر تو اس دوعملی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، سوائے ایک چھوٹی سی وجہ کے... اور وہ یہ ہے کہ منشیات تیسری دنیا کے کھیتوں میں اگتی ہے اور اسلحہ پہلی دنیا کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ اس لیے جو چیز پہلی دنیا میں بنے، وہ دنیا کے انسانوں اور عالمی امن کے لیے کسی صورت خطرہ نہیں۔ خاص طور سے اسلحہ! چاہے وہ ایٹم بم ہی کیوں نہ ہو... وہ کسی کے لیے خطرے کا باعث نہیں ہوتا۔ چاہے اسے استعمال کیوں نہ کر لیا جائے۔

پیٹس اگرچہ منشیات کے کاروبار سے اربوں ڈالرز کما چکا تھا۔ اس کی دولت دنیا کے بے شمار بینکوں کے بے نام اکاؤنٹس میں پڑی تھی لیکن مزید دولت کے ساتھ ساتھ اب وہ نیک نام بھی بننا چاہتا تھا۔ اس نے نوٹ کیا کہ موجودہ امریکی انتظامیہ ان لوگوں کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے جو کسی طرح بھی اسلحے یا تیل کے کاروبار سے وابستہ ہوں۔ پیٹس پہلے ہی ٹیکساس اور کیلیفورنیا میں بے شمار تیل کے کنوئیں خرید چکا تھا اور اب وہ اسلحے کے بزنس میں شامل ہونا چاہتا تھا مگر یہاں ہنگس پہلے ہی براجمان تھا اور اس کے ہوتے ہوئے اس میدان میں کسی کے لیے نمبر ون پوزیشن حاصل کرنا نہایت دشوار تھا... جبکہ پیٹس دوسرے نمبر کا قائل نہیں تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ دوسری پوزیشن سے بہتر ہے سرے سے کوئی پوزیشن ہی نہ ہو۔

جب پیٹس نے اسلحے کا کاروبار کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے پہلے ہنگس کو پیش کش کی کہ وہ اپنا کاروبار اسے فروخت کر دے مگر ہنگس نے انکار کر دیا۔ بھلا سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو کون ذبح کرتا ہے؟ یہی نہیں بلکہ ہنگس نے پیٹس سے کہا کہ وہ اپنی اوقات سے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ منشیات فروش ہے اور یہی ٹائٹل اس پر جچتا ہے۔ اس پر پیٹس سخت برافروختہ ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ہنگس سے اس توہین کا بدلہ ضرور لے گا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہنگس اس سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ نہ طاقت میں، نہ دولت میں اور نہ ہی بدمعاشوں میں... سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کی انٹیلی جنس کسی طرح پیٹس کی انٹیلی جنس سے کم نہیں تھی۔ جس طرح پیٹس اس کے بارے میں سب جانتا تھا، اسی طرح وہ بھی اس کے بارے میں تمام معلومات رکھتا تھا۔

پیٹس شولینڈر سمجھ گیا کہ جب تک ہنگس درمیان سے نہیں ہٹے گا وہ اس میدان میں قدم نہیں رکھ سکے گا کیونکہ ہر مقام پر ہنگس ہی اس کا حریف تھا۔ اسلحے کی غیر قانونی فروخت سے لے کر وائٹ ہاؤس میں جگہ حاصل کرنے تک ہر مرحلے پر ہنگس کا راج تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا اور اسے ہٹائے بغیر پیٹس اس کاروبار پر قبضہ نہیں

کر سکتا تھا۔ اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ ہنگس کو اس دنیا سے رخصت کر دے اور اس کام کے لیے اسے ایک ایسے فرد کی مدد کی ضرورت تھی جس سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو... کیونکہ ہنگس بہرحال کوئی عام آدمی نہیں تھا بلکہ سرکار کے نزدیک اس کی اہمیت پیٹس سے کہیں زیادہ تھی۔ ایسے آدمیوں کی کمی نہیں تھی جو رقم کے عوض کسی کو بھی دنیا سے رخصت کر دیتے ہیں مگر پیٹس ایسا آدمی چاہتا تھا جو یہ کام سو فی صد گارنٹی کے ساتھ کر سکے اور اس کا نشانہ خطا نہ جائے اور ساتھ ہی وہ ہمہ وقت اس کی نظر میں بھی رہے۔ پیٹس کے خیال میں ایک ہی شخص ان تمام باتوں پر پورا اترتا تھا۔

☆☆☆

پاپا اس وقت پیرس کے ایک کلب میں مہاگنی کی چمکتی میز کے سامنے سرخ لیدر کے صوفے پر براجمان بیک وقت فرانس کی نایاب شراب اور کلاسیکی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے آس پاس سارے اونگھتے ہوئے بڈھے موجود تھے۔ وہ نہ اس بے وقت کی راگنی کی طرح بجتے والی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور نہ اپنے سامنے رکھی مہنگی شراب سے۔ اس کلب کا ممبر ہونے کے لیے ارب پتی ہونے کے ساتھ ممبر کا خاندانی ہونا بھی لازمی تھا۔ ہر شخص اس کلب کا ممبر نہیں بن سکتا تھا۔ پاپا کا تعلق ایک نہایت معزز فرانسیسی خاندان سے تھا اور اس کا لکڑ دادا واٹر لو کے میدان سے نپولین کے ساتھ گرفتار ہوا تھا۔ سپہ گری پاپا کے خاندان کے خون میں شامل تھی۔ اس خاندان کے بیشتر لوگ فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے لیکن پاپا نے اپنا پیشہ ذرا مختلف رکھا تھا۔

پاپا کے نام سے دھوکا کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کوئی ستر سال کا ریٹائرڈ بوڑھا نہیں بلکہ چالیس سال کا تنومند جوان آدمی تھا۔ اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ اس کے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی نہیں تھی۔ یہ انگلی جڑ سے ذرا اوپر سے غائب تھی۔ وہ ہلکے فریم کی عینک لگاتا تھا اور چہرے سے ایک نرم مزاج پروفیسر یا کوئی مصنف لگتا تھا۔ مگر یہ روپ ایک پردہ تھا اور اس کے پیچھے چھپے اصل چہرے کو بہت کم لوگ پہچانتے تھے۔ اس کا اصل نام کچھ اور تھا لیکن ساری دنیا اسے پاپا کے نام سے جانتی تھی۔

پاپا اونچے درجے کا ایک پیشہ ور قاتل تھا اور حکومتیں تک اس کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش میں رہا کرتی تھیں مگر وہ سیاست سے اجتناب کرتا تھا۔ موساد اور ایم فائیو جیسی ایجنسیاں اسے کام کرنے کے عوض منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار رہتیں لیکن وہ ہمیشہ انفرادی کام کرتا اور وہ بھی بہت چھان پھٹک کر۔ اس کے نزدیک دو چیزوں کی بہت اہمیت تھی۔ ایک تو اپنے بے داغ ریکارڈ کی، اس پر ناکامی کا کوئی دھبا نہیں تھا اور دوسرے اسے اپنی حفاظت کی بہت پروا تھی کیونکہ اس جہانِ رنگ و بو کی ساری رنگینیاں اسی زندگی کے دم سے تھیں۔ وہ جب کوئی کام لیتا تو دو باتوں کا خیال رکھتا تھا ایک تو اس میں ناکامی کا کوئی امکان نہ ہو اور دوسرے خود اس کی زندگی کو ایک خاص حد سے زیادہ خطرہ نہ ہو۔ باقی اس کی شرائط سے سب ہی واقف تھے اور اسے دھوکا دینے کے انجام سے بھی۔ اس لیے اس سے وہی رابطہ کرتے تھے جنہیں اس سے صحیح معنوں میں کام لینا ہوتا تھا۔

پاپا سے کام لینے والے اس سے بہت آسانی سے رابطہ کر سکتے تھے۔ پاپا سے اس کے ای میل ایڈریس پر رابطہ کیا جا سکتا تھا۔ پاپا ایک بہت محفوظ قسم کا انٹرنیٹ استعمال کرتا تھا جو ایک سیٹلائٹ چینل سے لنک کرتا تھا اور اس کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔ اس کا ای میل بھی خاص طور سے اسی کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس قسم کا محفوظ رابطہ اس کے گاہکوں کے اطمینان کے لیے بھی لازمی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاپا کے گاہک اس اطمینان کے ساتھ اس سے رابطہ کرتے تھے کہ ان کا راز

ہر ضرورت مند اپنے دلی مقاصد میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے

خدانخواستہ اگر آپ بھی تنگی ☆ مشکلات اور پریشانیوں کی زندگی بسر کر رہے ہیں ☆ ممکن ہے آپ کی الجھنوں میں کسی دشمن کا خفیہ ہاتھ کام کر رہا ہو ☆ بالوجہ حسد و بغض آپ کے دنیاوی امور میں رکاوٹ ڈال کر ناکامیوں کو آپ کا مقدر بنانا چاہتا ہو ☆ مثلاً کاروبار میں نقصان / شادی میں رکاوٹ ☆ گھریلو لڑائی جھگڑے، رشتوں میں رکاوٹ ☆ دوستی ☆ محبت میں ناکامی ☆ نافرمان اولاد اور ازدواجی زندگی کے کامیاب حل کے لیے ابھی فون کریں contact : faith healer

ماہر عملیات و تعویزات: این اے جوہری
0300-2222567

www.pkdigest.com

کوئی نہیں جانے گا۔

ان احتیاطی تدابیر کی وجہ سے پاپا اب تک ایک کامیاب ترین پیشہ ور قاتل تھا۔ اس کا کوئی کیس ناکام نہیں ہوا اور نہ ہی وہ آج تک پکڑا گیا۔ بلکہ پکڑا جانا تو ایک طرف رہا، کوئی اس پر انگلی بھی نہیں اٹھا سکا تھا۔ سوائے چند مخصوص حلقوں کے... اس کی شخصیت مکمل طور پر راز میں تھی۔ پاپا کا بیشتر وقت اسی کلب میں گزرتا تھا۔ جن دنوں وہ پیرس میں ہوتا تو اس کی کوئی شام یہاں سے خالی نہیں جاتی تھی۔ اسے عورت اور جوئے کا شوق نہیں تھا۔ اس کی ایک ہی گرل فرینڈ تھی جو پیرس کے ایک عالی شان اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ جب اس کا دل چاہتا، وہ اس کے پاس چلا جاتا۔

وہ موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اس کی جیب میں موجود سیل فون میں تھرتھراہٹ ہوئی۔ اس نے موبائل نکال کر دیکھا۔ اس پر لکھا آرہا تھا۔ "آپ کی ایک میل آئی ہے۔" اس نے فون واپس جیب میں رکھا اور ڈرنک ختم کر کے کھڑا ہو گیا۔ جب اس کے ای میل پر کوئی نئی میل آتی تھی تو اسے اسی طرح سیل فون پر پیغام مل جاتا تھا۔ اس نے پارکنگ سے اپنی کار نکالی اور پیرس کے نواح میں واقع اپنے عالی شان محل نما گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی محافظ نہیں رکھتا تھا لیکن یہ کار مکمل طور پر محفوظ تھی، اس پر گولی تو کیا بم بھی اثر نہیں کرتا تھا۔ وہ کسی کھلی جگہ شاذ ہی جاتا تھا۔ اس کے گھر میں صرف ایک بٹلر تھا جو اس کے اعتماد کا آدمی تھا اور وہی اس کے سارے کام کرتا تھا۔

پاپا والا محل اپنے خاص کمرے میں آیا۔ یہ کمرا بجائے خود کسی تجوری سے کم نہیں تھا۔ اسے کھولنا کسی تجوری کو کھولنے سے زیادہ مشکل تھا۔ پاپا کا ریکارڈ اور تمام اہم چیزیں اسی کمرے میں محفوظ تھیں۔ اس نے اپنا کمپیوٹر آن کیا۔ انٹرنیٹ آن کر کے اس نے میل اتاری اور پھر اسے کھولنے سے پہلے اسکین کیا۔ جب کمپیوٹر نے اسے اوکے کر دیا تو اس نے اسے کھولا۔ اس میں صرف ایک سطری پیغام تھا۔

"ایک کام ہے اگر تمہارے پاس وقت ہے تو اس نمبر پر رابطہ کرو۔"

نمبر ایک سیٹلائٹ فون کا تھا اور اس بات کا پتا چلانا ممکن نہیں تھا کہ یہ دنیا کے کس حصے میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس نے سوچا اور کمرے میں موجود ایک فون اٹھایا اور اس سے نمبر ملایا۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے ایک پیغام آیا تو اس نے فون رکھ دیا۔ کوئی ایک منٹ بعد اس کے فون کی گھنٹی بجی، اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے بھی بیل جانے کی آواز آرہی تھی۔ یہ ایک خاص فون تھا جس کا ملانے والا حصہ کہیں اور تھا اور یہ اس کا ایکسٹینشن تھا۔ اس پر براہ راست نہ تو کال آسکتی تھی اور نہ کی جا سکتی تھی۔ دوسری طرف سے بھی کال ریسیو کر لی گئی۔ پاپا نے ہیلو کے جواب میں کہا۔

"میں پاپا بات کر رہا ہوں۔"

"مجھے تم سے کام ہے۔" دوسری طرف موجود شخص نے کہا۔

"بولو۔"

"ایک شخص کا ٹرانسفر کرنا ہے۔"

"تمہیں میری شرائط کا پتا ہے۔" پاپا کا لہجہ سرد ہو گیا۔

"ہاں پتا ہے۔"

"لہٰذا اب بات بالمشافہ ہوگی۔"

"اس کے لیے تمہیں لاس اینجلس آنا ہوگا۔"

"میں تیار ہوں، دس لاکھ امریکی ڈالرز کا ڈرافٹ اس پتے پر بھیج دو اور خیال رہے یہ صرف ملاقات کے اخراجات ہیں میری فیس نہیں ہے۔"

"ڈرافٹ چوبیس گھنٹے میں مل جائے گا۔" دوسری طرف سے پتا نوٹ کرنے کے بعد کہا گیا۔ پاپا نے کال کاٹ دی۔ اب اسے لاس اینجلس جانا تھا۔

☆☆☆

لاس اینجلس کے اس سیون اسٹار ہوٹل کے 12 [illegible] میں جینس شو لینڈر کے سامنے جو شخص بیٹھا، وہ اس پاپا سے بہت مختلف تھا جو چند دن پہلے پیرس میں موجود تھا۔ اس کے سر پر بال نہیں تھے اور ناک تلے ہلکی سی سنہری مونچھیں تھیں۔ اس نے سیاہ بھاری فریم کی موٹے شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ جینس اسے صرف نام سے جانتا تھا۔ وہی کیا اکثر لوگ اسے نام سے جانتے تھے اور وہ جس حلیے میں اپنے گاہکوں کے سامنے آتا، وہ حلیہ دوبارہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ جس پاسپورٹ پر سفر کرتا تھا، کام ہونے کے بعد اسے دوبارہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا۔ وہ پاسپورٹ ضائع کر دیا کرتا تھا۔ اس کے پاس بے شمار پاسپورٹ تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے انہیں استعمال کرتا رہتا تھا۔

جینس نے ایک لفافہ پاپا کی طرف بڑھایا۔ "اس میں سب ہے۔"

پاپا نے لفافے میں سے ایک تصویر اور ایک کاغذ نکالا۔ تصویر اینکس کی تھی اور کاغذ پر اس کے بارے میں تمام بنیادی معلومات لکھی تھیں۔ اس نے تصویر دیکھی اور پوچھا۔

"یہ کوئی سیاست داں تو نہیں ہے؟"

"نہیں میرا کاروباری حریف ہے۔" جینس نے

جواب دیا۔

"لیکن جہاں تک مجھے علم ہے، یہ واشنگٹن کے سیاسی حلقوں سے تعلق رکھتا ہے۔" پاپا نے سرد لہجے میں کہا۔

"وہ دوسرا معاملہ ہے اس کا سیاست سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔" جینس نے جلدی سے کہا۔

پاپا کچھ دیر سوچتا رہا۔ "لیکن حکومت اس معاملے میں ملوث تو ہو سکتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" جینس نے اس بار اعتماد سے کہا۔ "ورنہ تم خود سوچو میں اس میں کیسے ملوث ہو سکتا ہوں۔ میری پوزیشن تم سے کہیں زیادہ نازک بنتی ہے۔ تم اپنا کام کر کے چلے جاؤ گے مجھے یہیں رہنا ہے۔"

پاپا ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا۔ جینس اسے پُرامید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ یہی ایک شخص تھا جو اسے اینکس سے نجات دلا سکتا تھا۔ خاصی دیر بعد پاپا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے لیکن معاملہ ذرا الگ ہے اس لیے میں نارمل سے تیس فی صد زیادہ معاوضہ لوں گا۔"

"کیا اس لیے کہ اس کی سیکیورٹی..."

پاپا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "میرے لیے وی وی آئی پی سیکیورٹی بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس شخص کی سیاسی حلقوں سے قربت کی وجہ سے میں نے تیس فی صد زیادہ طلب کیا ہے۔"

"مجھے منظور ہے، اپنا معاوضہ اور اسے ادا کرنے کا طریقہ بتاؤ۔"

"چھبیس ملین ڈالرز۔" پاپا نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "ایڈوانس اور دو دن کے اندر، ڈرافٹ کی صورت میں۔ اگر میں ناکام رہا تو ساری رقم تمہیں واپس مل جائے گی۔"

یہ بہت بڑی رقم تھی لیکن جینس جیسے آدمی کے لیے زیادہ نہیں تھی اور اینکس سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ اس سے بھی بڑی رقم خرچ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے سامنے رکھا گلاس اٹھایا۔ "ڈن۔"

پاپا نے صرف سادہ پانی لیا اور اثبات میں سر ہلایا۔ "ڈرافٹ دو دن میں اسی جگہ نہیں ملا تو میں سمجھوں گا کہ تم نے معاہدہ کینسل کر دیا ہے۔"

اس وقت پاپا امریکی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا اور اسے کوئی فرانسیسی نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے نہ تو جینس سے ہاتھ ملایا اور نہ اس کی طرف دیکھا بلکہ ہوٹل کی لابی کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں وہ کسی اور نام سے مقیم تھا اور اسی نام سے ایک جعلی پاسپورٹ پر امریکا آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد جینس بھی وہاں سے اٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی یہ ملاقات کسی کے علم میں نہیں آئے گی۔ خود اس کے بھی صرف دو آدمیوں کو اس بارے میں معلوم تھا جو پارکنگ میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ چھبیس ملین ڈالرز یعنی دو کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالرز کی ادائیگی کے باوجود وہ خوش تھا کہ اس کا دشمن کچھ عرصے میں نہیں رہے گا اور اس کی جگہ وہ اسلحے کے غیر قانونی کاروبار پر قابض ہو جائے گا۔ پاپا کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ جینس جیسا آدمی بھی اس سے متاثر تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اینکس کو ضرور اس دنیا سے رخصت کر دے گا۔

دو دن بعد اس نے پاپا کو ایک بینک ڈرافٹ بنا کر دے دیا۔ پاپا نے اسے بتایا تھا کہ وہ عام طور سے دو مہینے میں اپنا کام مکمل کر لیتا ہے۔ لیکن ایک مہینے تک وہ اس سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہ کرے ہاں اس دوران میں کام نہ ہوا تو وہ اس سے رابطہ ضرور کر سکتا ہے۔ دو مہینے بعد وہ چاہے تو معاہدہ ختم کر کے اس سے اپنی رقم واپس مانگ سکتا ہے۔ اس سے پہلے اس نے معاہدہ ختم کیا تو اسے فیس کی رقم واپس نہیں ملے گی۔ جینس نے اس کی ساری شرائط منظور کر لی تھیں۔

پاپا ڈرافٹ ملتے ہی واپس چلا گیا۔ یہ ڈرافٹ اس کے ایک ایسے سوئس اکاؤنٹ میں جاتا جس کے بارے میں کوئی معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ رقم جمع کرانے کے لیے وہ خود نہیں جاتا تھا بلکہ ڈرافٹ کوریئر کے ذریعے بھیج دیتا تھا جہاں بینک والے خود اسے پاپا کے خفیہ اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتے.... اور اسے انٹرنیٹ بینکنگ سے معلوم ہو جاتا کہ رقم اس کے اکاؤنٹ میں آگئی ہے یا نہیں۔ پاپا کو جب رقم مل جاتی.... تو وہ اس کا بیشتر حصہ اپنے دوسرے اکاؤنٹس میں منتقل کر دیتا۔ اس اکاؤنٹ کو وہ کبھی کسی ادائیگی کے لیے استعمال نہیں کرتا تھا۔ وہ کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑتا تھا جو اس کی پاپا والی شخصیت اور اس کی اصل شخصیت کو آپس میں جوڑ سکے۔

پاپا کو علم نہیں تھا کہ جینس کا ایک آدمی فرانس جانے والے طیارے میں اس کے ساتھ سوار ہوا۔ اور وہ اس کا پیچھا کر رہا تھا لیکن پاپا اس معاملے میں بھی محتاط رہتا تھا۔ جب وہ کسی سے مل کر آتا تھا تو اس کے ذہن میں یہ یقین ہوتا تھا کہ اس کا تعاقب کیا جائے گا۔ اس کے لیے بھی اس نے ایک طریقہ کار طے کر رکھا تھا۔ پیرس ائرپورٹ پر اترنے کے بعد پاپا نے سب سے پہلے ایک کیسینو کا رخ کیا۔ جینس کا آدمی بھی اس کے پیچھے تھا۔ کیسینو میں داخل ہو کر پاپا نے منیجر کے کمرے کا رخ کیا۔ منیجر اسے دیکھتے ہی چوکنا ہو گیا۔ اس نے گرم جوشی سے اور فدویانہ انداز میں پاپا کا استقبال کیا۔

"آپ نے بہت دن بعد چکر لگایا جناب۔" منیجر

www.pkdigest.com

بولا۔ وہ اسے مختلف حلیوں میں دیکھنے کا عادی تھا اور اس نے بھی آج تک پاپا کو اس کے اصل حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔

"سب ٹھیک ہے؟" پاپا نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

"سب ٹھیک ہے جناب۔" منیجر نے بتایا۔

یہ کیسینو اصل میں پاپا کی ملکیت تھا۔ منیجر کے کمرے سے ایک خفیہ راستے سے وہ ایک عمارت کے فلیٹ میں داخل ہوا۔ وہاں اس نے اپنا حلیہ بدلا اور باہر نکل کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ احتیاط وہ ہر سفر سے واپسی پر کرتا تھا اور اسے پتا نہیں تھا کہ پینس کا آدمی بے چارہ اس کا انتظار کرتا رہ گیا ہوگا۔

☆☆☆

"جناب! میں نے اس کا سراغ کھو دیا ہے۔" جاسوس نے فون پر پینس کو آگاہ کیا۔

"مجھے اسی بات کی امید تھی۔ وہ دنیا کا چالاک ترین آدمی ہے۔ تم فکر مت کرو، یہ بتاؤ کہ تم نے اس کا سراغ کہاں کھویا؟"

"ایک کیسینو میں جناب۔ وہ اندر داخل ہوا اور وہاں سے باہر نہیں نکلا۔ میں دو گھنٹے اندر رہا پھر باہر بھی کیسینو بند ہونے تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ اگر وہ بھیس بدل کر نکل گیا تو میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"اس نے ایسا ہی کیا ہوگا اور یہ کیسینو بھی اسی کا سیٹ اپ ہوگا۔ بہرحال تم پریشان مت ہو اور وہیں رک کر اسے تلاش کرو۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے جناب، وہ پیرس میں ہی ہوتا ہے۔" جاسوس نے سکون کا سانس لیا کہ پینس نے پاپا کی گمشدگی کو اس کی غفلت قرار نہیں دیا۔

"اسے عام جگہوں کے بجائے خاص جگہوں پر تلاش کرو۔" پینس نے مشورہ دیا۔

"میں ایسا ہی کروں گا۔" جاسوس نے کہا۔

☆☆☆

پاپا نے آتے ہی اس کیس پر کام کا آغاز کر دیا...... اس کا پہلا اصول تھا کہ اپنے شکار کے بارے میں ہر ممکن معلومات حاصل کرو۔ اس نے آن لائن ایک امریکی جاسوس ایجنسی سے رابطہ کیا اور اس سے اینگس کے بارے میں مکمل معلومات طلب کیں۔ اس ایجنسی کی فیس بھی اس نے آن لائن ادا کی تھی۔ اسے ایک ہفتے بعد اینگس کے بارے میں معلومات کا ایک انبار موصول ہوا۔ یہ سیکڑوں صفحات پر مشتمل رپورٹ تھی۔ وہ اسے دیکھنے میں لگ گیا۔

معلومات حاصل کرنے اور ادائیگی کا انتظام اس نے ایک بالکل الگ ای میل سے کیا تھا۔ اس طرح وہ سامنے آئے بغیر اپنا مطلب حاصل کر لیتا تھا۔ جب پاپا نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تو انٹرنیٹ اپنے ابتدائی مرحلے میں تھا مگر پاپا نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا کہ محفوظ رہ کر کام کرنے کے لیے انٹرنیٹ سے بہتر رابطے اور معلومات کے حصول کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد ایک طریقۂ کار وضع کیا اور اسی کے مطابق عمل کرتا تھا۔ دولت کی اس کے پاس شروع سے کوئی کمی نہیں تھی۔ جب اس کا باپ خلیج کی جنگ میں مارا گیا تو اس کی ساری دولت اور جائداد پاپا کو ملی تھی۔ پیشہ ور قاتل وہ اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے بنا تھا۔ اسے ترکہ وراثت میں ملا تھا لیکن وہ فوج میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس میں اول تو قتل کرنے کا چانس کم ملتا ہے اور وہ بھی حدود میں رہ کر اور پھر یہ قتل بے لذت ہوتا کیونکہ اسے اس کے بدلے فوج کی روکھی پھیکی تنخواہ ملتی جس سے تین گنا زیادہ تنخواہ اس کا خاندانی بٹلر لے رہا تھا۔ اس لیے اس نے پیشہ ور قاتل بننے کا فیصلہ کیا۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی جبلت کی تسکین کر سکتا تھا اور اس سے بے پناہ دولت بھی کما سکتا تھا۔ پھر یہ بات بھی اس کے لیے باعثِ اطمینان ہوتی کہ وہ کسی ایسے شخص کو شکار کر رہا ہے جس کی بہت زیادہ حفاظت کی جاتی ہو۔ شروع میں اسے کام ملنے میں کچھ دشواری پیش آئی کیونکہ اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ کام دینے والے پیشہ ور قاتل کا سابق ریکارڈ دیکھتے ہیں۔ مگر پہلے کام کے بعد اس کے لیے راہ کھلتی چلی گئی اور...... دو تین کیسز کے بعد اسے ماسٹر کلر تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے بعد وہ اپنی شرائط پر اور منہ مانگے معاوضے کے ساتھ کیس لینے لگا۔

اسے اینگس کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ ایک غیر قانونی اسلحہ فروش ہے اور خطرناک آدمی ہے۔ اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں کیونکہ وہ باہر نکلتا تو اس کے گرد محافظوں کا جھرمٹ ہوتا تھا۔ پھر اس کا گھر کسی قلعے سے کم نہیں تھا جس میں کسی غیر متعلقہ فرد کا داخل ہونا اتنا ہی مشکل اور ناممکن تھا جتنا کہ کسی کا وائٹ ہاؤس میں داخل ہونا۔ پھر اس میں خطرہ بہت زیادہ تھا۔ جبکہ پاپا بھی کام کو اس طرح نہیں کرتا تھا کہ اس کی ذات کو ایک حد سے زیادہ خطرہ لاحق ہو جائے۔

پاپا نے محسوس کیا کہ اینگس کو عام طریقے سے شکار کرنا ممکن نہیں، اس کے لیے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا تھا جو اس کے گرد موجود دفاعی حصار کو ناکام بنا دے۔ خاصے غور و خوض کے بعد پاپا نے اس کے بارے میں ایک اور ایجنسی سے تحقیق کروائی کہ آنے والے ایک مہینے میں اینگس کن تقریبات میں شریک ہوگا۔ اسے دو دن بعد رپورٹ مل گئی

...... اسے پتا چلا کہ اینگس اس دوران میں تین اہم تقریبات میں شرکت کرے گا۔ ایک سیاسی نوعیت کی تقریب تھی۔ کیلیفورنیا کے گورنر کی جانب سے ریاست کی اہم شخصیات کو عشائیہ دیا جا رہا تھا۔ ایک معذور بچوں کے حوالے سے منعقد کی جانے والی تقریب تھی۔ اینگس اس میں مہمان خصوصی تھا۔ تیسری تقریب جس نے پاپا کی توجہ حاصل کر لی، وہ ایک فلمی تقریب تھی۔ جس میں عمائدین شہر کے ساتھ معروف فلمی ستارے بھی شریک ہوتے۔ یہ تقریب کوئی تین ہفتے بعد تھی اور ابھی پاپا کے پاس تیاری کا وقت تھا۔

پینس کے آدمی نے پیرس میں پاپا کا سراغ کھو دیا تھا اور پینس نے اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے وہ بے نقاب ہو جائے اور پاپا کو پتا چل جائے کہ پینس اس کی جاسوسی کروا رہا ہے۔ اس لیے جب جاسوس نے کیسینو میں پاپا کا سراغ کھو دیا تو اس نے غیر ضروری تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا کیونکہ اتنی عقل اس کے پاس تھی کہ پاپا یہاں سے غائب ہوا ہے تو اس کا اس جگہ سے تعلق ہے اور اگر اس نے یہاں پاپا کے بارے میں پوچھا تو وہ مشکوک ہو جائے گا۔ وہ صبر سے پیرس میں گھومتا رہا۔ پینس نے اس سے کہا تھا کہ وہ ہر قیمت پر پاپا کا سراغ لگائے۔ پیرس بہت بڑا شہر ہے اس لیے یہاں کسی کو تلاش کرنا جس کا اتا پتا معلوم نہ ہو، بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ دشوار کام ہے۔

لیکن جاسوس نے منطق سے کام لیا۔ اس نے سوچا کہ پاپا جس کلاس کا آدمی ہے وہ اسی کلاس میں اٹھتا بیٹھتا ہوگا۔ اس نے پیرس کے کلبوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور ان کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ اس نے ایک صحافی بن کر ان کلبوں میں جانا شروع کر دیا۔ وہ دریافت کرنے پر بتاتا کہ وہ کلبس کے بارے میں ایک فیچر تیار کر رہا ہے۔ دو ہفتے بعد اس کی کوشش رنگ لے آئی اور اسے ایک کلب میں ایک ایسا شخص نظر آ گیا جو پاپا سے مشابہ تھا۔ وہ پاپا سے مشابہ نہیں تھا بلکہ پاپا ہی تھا۔ لیکن یہاں اس کا نام جوشن ڈائیگر تھا۔ وہ اس کلب کا ممبر تھا۔ جاسوس نے اس کی تصویریں اتار کر پینس کو روانہ کیں جس نے کمپیوٹر کی مدد سے ان تصاویر کا موازنہ پاپا کی ان تصویروں سے کیا جو پینس کے آدمیوں نے لاس اینجلس ایئرپورٹ پر لی تھیں۔ کمپیوٹر نے تصدیق کی کہ تصویریں ایک ہی آدمی کی ہیں۔

جب پینس نے پاپا سے کام لینے کا فیصلہ کیا تھا تب ہی اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ کام ہو جانے کے بعد وہ پاپا سے بھی چھٹکارا پا لے گا اور اس طرح خطرے کی تلوار اس کے سر پر نہیں لٹکی رہے گی۔ پیشہ ور قاتل کی حیثیت آلۂ قتل سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ جس طرح کسی واردات کے بعد آلۂ قتل کو تلف کرنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح پیشہ ور قاتل سے بھی کام کے بعد چھٹکارا لازمی ہو جاتا ہے۔ ورنہ پکڑے جانے کا خطرہ ہمہ وقت موجود رہتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ پاپا کے بارے میں سب کچھ جانتا ہو۔ اس نے فوراً اپنے جاسوس کو حکم دیا۔ "اس شخص کو کسی صورت نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا۔ اس کے بارے میں احتیاط سے سب معلوم کرنے کی کوشش کرو۔"

جاسوس نے اپنا کام بہت ہوشیاری سے کیا تھا۔ اس نے چند دن میں جوشن ڈائیگر کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا۔ وہ فرانس کے ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور پُراسرار قسم کا شخص تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کے ذریعۂ روزگار کے بارے میں اس کے قریبی لوگ بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ ایک عالی شان ولا میں رہتا تھا اور بہت لگژری قسم کی زندگی گزار رہا تھا۔ جاسوس نے پاپا کی محبوبہ کے بارے میں بھی جان لیا تھا کیونکہ اس دوران پاپا ایک بار اس کے پاس بھی گیا تھا۔ جاسوس بہت ہوشیاری سے ہر جگہ شک کا موقع دیے بغیر اس کا پیچھا کرتا رہا۔

دوسری طرف پاپا نے فلمی تقریب میں شامل ہونے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس نے کچھ دستاویزات بنوائیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ فرانس کا ایک آرٹ فلم ڈائریکٹر ہے۔ آرٹ فلمیں سب نہیں دیکھتے ...... اور نہ ہی ان کے بنانے والے زیادہ مشہور ہوتے ہیں۔ ہالی ووڈ کی فلمی تقریب ایک پروموٹر کر رہا تھا۔ وہ سال میں ایک بار پارٹی دیتا تھا جس میں سارے ہی اہم فلمی ستاروں کے ساتھ دوسرے اہم افراد بھی شریک ہوتے تھے۔ اس کی پارٹی میں مستقبل کی فلموں کی منصوبہ بندی ہوتی تھی اور بزنس کے امور نمٹائے جاتے تھے۔ ظاہر ہے اس کا بہت بڑا فائدہ اس پروموٹر کو بھی ہوتا تھا۔ اس کے ہالی ووڈ سے لے کر میڈیا تک وسیع تعلقات تھے اور وہ ان تعلقات کو اپنے بزنس میں پوری طرح استعمال کرتا تھا۔

پاپا نے اس پروموٹر سے رابطہ کر کے اسے لاس اینجلس میں اپنی آمد کی اطلاع دی اور خواہش ظاہر کی کہ اس کی ملاقات ہالی ووڈ کے فلمی ستاروں اور ڈائریکٹرز سے کرائی جائے۔ پاپا نے اسے لالچ بھی دیا کہ ممکن ہے وہ اپنی آنے والی فلم کے لیے اس پروموٹر کے توسط سے کچھ اداکار منتخب کر لے۔ پروموٹر نے فوری جواب دیا تھا کہ وہ اس کی آمد کا

www.pkdigest.com

منتظر ہے۔ پاپا نے اس سے تقریب کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس نے بے نیازی سے اطلاع دی تھی کہ وہ زیادہ دن نہیں رکے گا۔ حسب توقع دوسری میل میں پروموٹر نے اسے تقریب میں آنے کی دعوت دے دی کیونکہ فرداً فرداً سب سے ملاقات مشکل تھی۔ یہاں اس کی تقریباً تمام فلمی ستاروں اور پروڈیوسرز و ڈائریکٹرز سے ملاقات ہو جاتی۔ پاپا نے جوابی میل میں اسے اپنی رضامندی سے آگاہ کر دیا۔

اپنا پہلا پاسپورٹ وہ تلف کر چکا تھا۔ اگلی بار کے لیے اس نے ایک اور پاسپورٹ نکالا اور اس کے مطابق اپنا حلیہ بنانا شروع کر دیا۔ تصویر میں اس کا حلیہ ایک آرٹ فلمی ڈائریکٹر کا سا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بکھرے بال اور پیچھے کی طرف ڈھلکتی مونچھیں اور ہلکی سی فرنچ کٹ! اس نے آنکھوں میں نیلے رنگ کے لینس لگائے جو دیکھنے میں بالکل بھی لینس نہیں لگتے تھے۔ ایک خاص تیل کی مالش سے اس کا رنگ سرخی مائل سے ہلکا گندمی ہو گیا تھا۔ اب وہ دیکھنے میں اس پاپا سے بالکل مختلف لگ رہا تھا جو چینس سے ملنے گیا تھا۔ اس نے بال بکھیرنے اور بے ترتیب کرنے کے لیے ایک مخصوص کیمیکل استعمال کیا تھا ورنہ اس کے بال گھنے اور جمے رہنے والے تھے۔ ایک ہفتے کے اندر اس کا حلیہ مکمل طور پر پاسپورٹ والی تصویر کے مطابق ہو گیا۔

اس دوران میں اس نے ای میل پر پروموٹر سے مستقل رابطہ رکھا تھا اور اس نے اسے اپنی کچھ فلموں کے کلپس بھی بھیجے تھے جو فرانسیسی زبان میں تھیں اور ساری آرٹ موویز تھیں۔ اسے امید تھی کہ پروموٹر اس کی چالاکی بالکل نہیں سمجھ سکے گا۔ اس نے یہ کلپس بنوائے تھے اور اس پر اس کی بھاری رقم خرچ ہوئی تھی لیکن کام اس کی مرضی کے مطابق ہو گیا۔ ان کلپس اور اس کی جعلی تصاویر نے پروموٹر کو بالکل.. پر یقین کر دیا تھا اور اس بار اس نے پاپا کو آنے جانے اور لاس اینجلس میں قیام کا خرچ دینے کی پیشکش بھی کر دی تھی جو پاپا نے فوراً قبول کر لی۔

پاپا کو بالکل خبر نہیں تھی کہ اس کی باقاعدگی سے نگرانی کی جا رہی ہے۔ جب وہ لاس اینجلس کے لیے روانہ ہوا تو چینس کو اس کی خبر ہو گئی۔ اب وہ منتظر تھا کہ پاپا آ کر اپنا کام کرے اور اس کے بعد وہ اس کا کام تمام کر دے لیکن یہ کام اسے اس وقت کرنا تھا جب پاپا اپنا کام کر کے واپس فرانس آ جائے۔ چینس نہیں چاہتا تھا کہ پولیس ان دونوں اموات میں کوئی تعلق تلاش کر سکے۔ اس لیے پاپا کا لاس اینجلس سے دور اپنے ملک میں مرنا ضروری تھا۔

پاپا عام پیشہ ور قاتلوں کی طرح صرف مروجہ ہتھیاروں کے استعمال پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ موقعے کی مناسبت سے ہتھیار استعمال کرتا تھا اور عام طور سے اس کا ہتھیار غیر روایتی ہوتا تھا۔ اس بار بھی اس نے ایک ایسے ہتھیار کے استعمال کا فیصلہ کیا جو ابھی زیادہ مروج نہیں تھا۔ اس کی مدد سے اب تک کسی کو کھلے عام قتل کرنے کا ایک ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ یہ ہتھیار عام دستیاب نہیں تھا لیکن اس کا حصول بہت زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔ اس نے سب سے پہلے ایک ایسے شخص سے رابطہ کیا جو اسے مطلوبہ چیز مطلوبہ مقدار اور شکل میں فراہم کر سکتا تھا۔ اس شخص نے پاپا کو بیس ہزار امریکی ڈالرز کے عوض مطلوبہ چیز فراہم کر دی اور اسی شکل میں جیسا کہ پاپا چاہتا تھا۔ اب اسے استعمال کرنے والا اوزار تیار کروانا تھا۔

پاپا نے انٹرنیٹ پر سرچ کیا اور پھر امریکا میں ایک شخص سے رابطہ کیا..... یہ رابطہ بھی انٹرنیٹ کی مدد سے کیا گیا۔ پاپا نے اس سے ایک چیز بنانے کی فرمائش کی تھی۔ یہ شخص کاریگر تھا اور آرڈر پر سونے کی چیزیں بناتا تھا اور ظاہر ہے بڑے لوگوں کے لیے بھاری معاوضے کے عوض بناتا تھا۔ پاپا نے اس سے ایک خاص لائٹر بنانے کی فرمائش کی تھی۔ اس نے پاپا کو بتایا کہ وہ بارہ ہزار ڈالرز کے عوض اس کی مطلوبہ چیز ایک ہفتے میں تیار کر دے گا۔ یہ بات پاپا نے لاس اینجلس جانے سے پہلے کر لی تھی اس لیے جب وہ لاس اینجلس کے اس ہوٹل میں پہنچا جہاں اسے قیام کرنا تھا تو کاؤنٹر پر اس کے نام سے پارسل پہلے ہی موجود تھا۔

پاپا نے کام کی ادائیگی پہلے کر دی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے سب سے پہلے پارسل کھولا۔ اندر بڑا خوب صورت اور نفاست سے بنا ہوا سونے کا لائٹر تھا جس پر اس کا نام بھی کھدا ہوا تھا۔ لیکن اس میں آگ لگانے کے علاوہ ایک فنکشن اور بھی تھا۔ پاپا نے اس فنکشن کا تجربہ کر کے دیکھا، وہ سو فیصد ٹھیک کام کر رہا تھا۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ اب وہ کام کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

☆☆☆

اینگلس فلمی تقریبات میں شرکت کا شوقین تھا کیونکہ وہاں اس کی ملاقات نت نئی فلم اداکاراؤں سے ہوتی تھی اور ان میں سے اکثر اس کی دوست بن جاتی تھیں۔ وہ ان کی قربت سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ لیکن یہ سب بہت رازداری سے ہوتا تھا۔ اپنی دولت کے بل بوتے پر وہ اداکاراؤں سے اپنے تعلقات پوشیدہ رکھنے میں کامیاب رہتا تھا۔ ہالی ووڈ کی شاید ہی ایسی کوئی اداکارہ یا ماڈل ہو جس سے اس کے

تعلقات نہ رہے ہوں۔ اس کے لیے وہ بے دریغ اپنی دولت خرچ کرتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ ہالی ووڈ سے کماتا بھی تھا۔ وہ یہاں کے بدمعاش قسم کے لوگوں کو ان کا مطلوبہ اسلحہ منہ مانگے داموں مہیا کرتا تھا۔ اس طرح وہ جتنا یہاں خرچ کرتا، اس سے کہیں زیادہ کما لیا کرتا تھا۔

ان دنوں اینگلس کو سن گن مل رہی تھی کہ چینس اس کی جگہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے اسے پہلے بھی منہ توڑ جواب دیا تھا لیکن اس نے چینس کو معمولی نہیں لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چینس جرائم کی دنیا کا ایک بڑا آدمی ہے اور اس سے مخاصمت اچھی بات نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے آئندہ کے ارادوں سے باخبر رہنے کے لیے اینگلس نے چینس کا اندر کا ایک آدمی توڑ لیا تھا۔ یہ چینس کے بہت قریب تو نہیں تھا لیکن اسے اندر کی ایسی بہت ساری باتوں کا علم ہو جاتا جو کسی اور صورت باہر نہیں آ سکتی تھیں۔ اینگلس کے آدمی بہت دن سے اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور بالآخر انہوں نے اسے بھاری معاوضے کا لالچ دے کر اپنا جاسوس بنا لیا..... یہ شخص چینس کی رہائش گاہ میں فون آپریٹر تھا اور باہر کی ساری کالز اسی کے توسط سے ہوتی تھیں۔ اگرچہ چینس کے اپنے خاص فون کا ایکسچینج سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن کبھی کبھی چینس اسے بھی استعمال کر لیتا تھا۔ یہ شخص میورن تھا جو چینس کی کالز سن سکتا تھا۔ اینگلس کو امید تھی کہ یہ کبھی نہ کبھی اس کے کام آئے گا اور اس کی سرمایہ کاری ضائع نہیں جائے گی۔

کچھ عرصے تک تو اینگلس کو اس سے کوئی کام کی اطلاع نہیں ملی لیکن ایک دن میورن نے اسے ایک ریکارڈنگ کی گفتگو لکھ کر میل کی۔ یہ گفتگو چینس اور اس کے کسی آدمی کے درمیان ہوئی تھی جو فرانس میں کسی پاپا نامی شخص کی جاسوسی کر رہا تھا۔ اس نے چینس سے میورن کے توسط سے رابطہ کیا تھا اور میورن نے ساری بات سن لی تھی۔ اینگلس نے جب یہ گفتگو دیکھی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ پاپا کا نام اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ سو اینگلس بھی چوکنا ہو گیا۔ چینس کا آدمی پاپا کی نگرانی کیوں کر رہا تھا؟ اسے معلوم تھا کہ پاپا ایک بین الاقوامی پیشہ ور قاتل ہے۔ جس کے نام سے تو بہت سارے لوگ واقف ہیں لیکن اس کی شخصیت سے کوئی بھی واقف نہیں ہے۔

چینس پاپا کی نگرانی کیوں کروا رہا تھا؟ اس کا ایک پیشہ ور قاتل سے کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ جب اینگلس نے اس معاملے کو ذرا گہرائی میں جا کر سوچا تو اسے پسینہ آ گیا کیونکہ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ چینس نے پاپا کی خدمات حاصل کی ہیں۔ وہ ایسا شخص نہیں جو کسی کی خدمات حاصل کرے اور اس سے بے خبر ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ اسی وجہ سے پاپا کی نگرانی کروا رہا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ اس نے پاپا کی خدمات کس کے لیے حاصل کی تھیں؟ اینگلس کو اس کا جواب بھی مل گیا۔ فی الحال تو چینس کا اس سے تنازع چل رہا تھا اور وہ اسی کے لیے پاپا کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔ اینگلس فکرمند ہو گیا کیونکہ پاپا جیسا قاتل کسی کی تاک میں ہو تو اسے فکرمند ہونا ہی چاہیے۔ وہ اندھیرے کا تیر تھا اور کسی طرف سے بھی وار کر سکتا تھا۔

اس نے فوری طور پر اپنی سیکیورٹی دگنی کر دی مگر اینگلس جانتا تھا کہ یہ مسئلے کا حل نہیں۔ خاص طور سے جب معاملہ پاپا جیسے خوفناک شخص کا ہو جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کا کوئی شکار زندہ نہیں بچا اور اس نے ہمیشہ کامیابی سے اس شخص کو ٹھکانے لگایا تھا جسے قتل کرنے کا کنٹریکٹ کیا تھا۔ اس کے کیریئر میں ناکامی کا کوئی لفظ نہیں تھا۔ دوسرا قدم اس نے یہ اٹھایا کہ فوری طور پر اپنی ساری بیرونی مصروفیات ختم کر دیں۔ وہ عملاً اپنے قلعہ نما مکان میں محصور ہو گیا۔ اسے آنے والے دنوں میں تین تقریبات میں شرکت کرنا تھی اور اس نے سوائے ایک تقریب کے باقی دو تقاریب میں شرکت منسوخ کر دی اور یہ تھی فلمی ستاروں کی تقریب!

اس تقریب کو اینگلس کسی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس میں ہالی ووڈ کی نئی اسٹار میلیسی بھی شرکت کرنے آ رہی تھی۔ اینگلس اس حسینہ پر پہلی نظر میں فریفتہ ہو گیا تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ اس کے بیڈروم کی زینت ضرور بنے۔ اس کا ارادہ اسی تقریب میں میلیسی کو دانہ ڈالنے کا تھا۔ میلیسی کو آنے والی دو فلموں کے لیے کوئی پروڈیوسر نہیں مل رہا تھا۔ اینگلس کا ارادہ ان فلموں میں سرمایہ کاری کرنے کا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس سرمایہ کاری کے بدلے وہ اس پر مہربان ہو جائے گی۔

اینگلس نے اپنے سیکیورٹی آفیسر سے کہہ دیا تھا کہ اس تقریب میں اس کی شرکت کے لیے فول پروف اقدامات کرے۔ اس کے سیکیورٹی آفیسر نے اپنے طور پر تقریب کی سیکیورٹی کی تفصیلات حاصل کیں اور اینگلس کو اوکے کی رپورٹ دی۔ "سر! اس میں کوئی بھی غیر متعلقہ فرد شریک نہیں ہے۔ سب جانے پہچانے فلم سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔"

سیکیورٹی افسر نے اسے مہمانوں کی فہرست بھی پیش کی تھی۔ اینگلس مطمئن ہو گیا کہ تمام افراد یا تو فلم ٹریڈ سے تعلق رکھتے تھے یا اس کے جانے پہچانے تھے۔ اس فہرست میں شامل ایک نام نے اسے چونکا دیا۔ یہ نام چینس کا تھا اور اسے پہلے نہیں معلوم تھا کہ وہ بھی اس تقریب میں شریک ہو رہا